ماہنامہ

حکایت

لاہور

[illegible] 2015ء

مسلسل اشاعت کا

46

واں سال

نورِ مبین

تمہارا معبود تو اکیلا خدا ہے۔ تو جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اُن کے دل انکار کر رہے ہیں اور وہ سرکش ہو رہے ہیں (۲۲) یہ جو کچھ چھپاتے ہیں اور جو ظاہر کرتے ہیں خدا ضرور اس کو جانتا ہے۔ وہ (خدا) سرکشوں کو ہرگز پسند نہیں کرتا (۲۴) (اے پیغمبر ان کو بکنے دو) یہ قیامت کے دن اپنے (اعمال کے) پورے بوجھ بھی اٹھائیں گے اور جن کو یہ بے تحقیق گمراہ کرتے ہیں اُن کے بوجھ بھی (اٹھائیں گے) سُن رکھو کہ جو بوجھ یہ اٹھا رہے ہیں بُرے ہیں (۲۵)

سورہ نحل

اس شمارے میں

اس شمارے میں

پیٹ یا پاکستان؟

کیا کوئی ایسا گوشہ رہ گیا ہے جہاں ہم جا بیٹھیں اور کہیں کہ یہاں کچھ سکون ہے؟ کوئی نہیں۔ اب تو دم بھر کے سکون کے لئے بھی ہمیں قطار میں کھڑا ہونا پڑے گا مگر سکون ملے گا نہیں۔ محفل شادی کی ہو یا ماتم کی، رونا مہنگائی کا ہی ہوتا ہے۔ صرف مہنگائی ہوتی تو کم از کم وہ لوگ تو باعزت زندگی جی سکتے جن کی آمدنی قدرے معقول ہے۔ یہاں تو چیزیں ہی غائب کر دی گئی ہیں۔ تاجروں اور دکانداروں نے ایسی فضا پیدا کر دی ہے کہ روزمرہ ضرورت کی کوئی چیز مل جائے تو یہ افسوس نہیں ہوتا کہ ایک روپے کی چیز پانچ روپے سے ملی بلکہ خوشی ہوتی ہے کہ یہ چیز مل گئی ہے۔ یہ انتہا ہے مہنگائی اور چور بازاری کے بداثرات کی۔ وہ لوگ جو معاشرے کی فلاح و بہبود اور قوم کی تعمیرِ نو کی باتیں کیا کرتے تھے، اب مویشیوں کی طرح بازاروں میں سونگھتے پھرتے ہیں کہ سستی اشیاء کہاں ہیں۔ پھر جہاں کہیں وہ کسی چیز کی بو پا لیتے ہیں وہاں ٹوٹ پڑتے ہیں، دھکے دیتے اور دھکے کھاتے ہیں۔ ان کے درمیان کوئی بچہ آجائے تو اسے روند ڈالتے ہیں، کوئی عورت آجائے تو اسے دھکیل کر پیچھے کر دیتے ہیں۔

رواداری نہیں رہی، تحمل اور بردباری نہیں رہی۔ وہ اخوت نہیں رہی جو ملت کا طرۂ امتیاز تھا۔ قوم کا کردار اس قدر شدید زخمی ہو گیا ہے کہ جن کے کردار کی قسمیں کھائی جاتی تھیں وہ بھی چند روپے فالتو کمانے کے لئے یا بازار کے تہہ خانے سے کوئی چیز حاصل کرنے کے لئے ناجائز طریقوں پر اتر آئے ہیں۔ گھروں میں چوریاں عام ہو گئی ہیں۔ اکثر بیوہ عورتیں جو اپنے یتیم بچوں کو باعزت ذرائع آمدنی سے پال رہی تھیں اب کھاتے پیتے گھروں میں برتن مانجھتی اور جھاڑ پونچھ کرتی پھر رہی ہیں اور بعض آمدنی کے ناجائز طریقے بھی اختیار کر بیٹھتی ہیں۔ بچے گلیوں میں مارے مارے پھر رہے ہیں۔ وہ پڑھنا چاہتے ہیں مگر سکول میں داخل نہیں ہو سکتے، بیمار پڑ جائیں تو کسی ڈاکٹر کے کلینک میں داخل نہیں ہو سکتے۔ وہ اب ایک ہی جگہ داخل ہوں گے اور وہ جگہ جیل خانہ ہے۔ مہنگائی اور چور بازاری قوم کو نئے چور، اٹھائی گیر، گرہ کٹ اور ڈاکو دے رہی ہے۔

مہنگائی کا سب سے زیادہ تکلیف دہ پہلو یہ ہے کہ اس کی روک تھام کے لئے کوئی کارروائی نہیں کی جا رہی، سوائے بیان بازی کے۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ملک میں کوئی قانون نہیں رہا۔ تاجر اور دکاندار من مانی کر رہے ہیں۔ جس چیز کا بھاؤ چڑھانا ہوتا ہے وہ بازار سے غائب کر دی جاتی ہے۔ حکومت تک خبر پہنچتی ہے تو وزیر بیانوں

کے تیر چلاتے ہیں۔ ''قلت نہیں ہونے دی جائے گی۔ قیمتیں نہیں چڑھنے دی جائیں گی''۔ قلت بھی بدستور رہتی ہے اور قیمتیں بھی چڑھتی رہتی ہیں۔ کہیں رُکتی نظر نہیں آتیں چڑھتی ہی جاتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو مہنگائی کو روک سکتے ہیں وہ مہنگائی کے اثرات سے محفوظ ہیں۔ انہیں ہر چیز گھر بیٹھے مل رہی ہے۔ وہ اس فاقہ کشی اور ذلت سے ناآشنا ہیں جس میں گر کر قوم اپنی عظمت کھو بیٹھی ہے۔

اگر وزیروں اور متعلقہ افسروں کو کوٹھیوں سے نکال کر متوسط اور غریب لوگوں میں رہنے کا حکم دے دیا جائے۔ انہیں، ان کے بچوں اور ان کی عورتوں کو انہی لوگوں کے ساتھ (جنہیں وہ عوام کہا کرتے ہیں) یوٹیلٹی سٹوروں کی قطاروں میں کھڑا کیا جائے۔ اس ہجوم میں وہ اسی طرح ذلیل و خوار ہوں جس طرح ہم اور ہمارے بچے ہو رہے ہیں۔ اُن سے سرکاری کاریں لے لی جائیں اور انہیں بس سٹاپوں پر بس کے انتظار میں کھڑا کر دیا جائے۔ گھنٹہ بھر انتظار کے بعد انہیں بھیڑ بکریوں جیسے ''عوام'' سے اَٹی ہوئی بسوں میں ٹھونسا دیا جائے۔ انہیں پینے کے پانی تک کے لئے قطاروں میں کھڑا کیا جائے۔ اُن کے بچے بیمار ہو جائیں تو انہیں کسی ڈاکٹر کے پاس جانے کے قابل نہ چھوڑا جائے۔ انہیں سودا سلف خریدنے کے لئے کوئی نوکر نہ دیا جائے تاکہ اُن کا واسطہ دُکانداروں سے پڑے اور جب وہ بھاؤ کی زیادتی کی شکایت کریں تو دُکاندار انہیں اسی طرح دھتکار دے جس طرح ہمیں دھتکارا کرتا ہے۔ وہ دودھ کو پانی کہیں تو اُن کی کوئی نہ سُنے۔ کسی سرکاری دفتر سے واسطہ پڑ جائے تو منہ کی مانگی رشوت کے بغیر اُن کی کوئی بات نہ سُنے۔ ان کی بہو بیٹیوں کو رکشا اور ٹیکسی میں بٹھایا جائے اور اگر وہ کہہ بیٹھیں کہ میٹر تیز ہے تو ڈرائیور بھرے بازار میں، ٹریفک پولیس کے کانسٹیبل کے سامنے اُن کی بے عزتی کرے اور پیسے وصول کر کے چلتا بنے۔ ان وزیروں کی زبانوں کو تالے لگا دیئے جائیں۔ اُن کے بیان اور تصویریں اخباروں میں شائع نہ کی جائیں۔ ان وزیروں اور افسروں کو اسی ذلت میں رہنے کا حکم دیا جائے جو قوم کا مقدر بن چکی ہے تو اُمید کی جاسکتی ہے کہ یہ لوگ مہنگائی، ملاوٹ، چور بازاری اور معاشرتی بے انصافی کا قلع قمع کر دیں گے یا مستعفی ہو جائیں گے۔

آج قوم اُس عمرؓ کو ڈھونڈ رہی ہے جو رات کے وقت بھیس بدل کر گلی گلی، کوچہ کوچہ پھرتے تھے اور رعایا کے گھروں کی دیواروں اور دروازوں سے کان لگا کر سنتے تھے کہ کوئی گھرانہ کسی وجہ سے پریشان تو نہیں، تنگدست اور بدحال تو نہیں، کسی ایسی سہولت سے محروم تو نہیں جو اس کا حق ہے۔ مگر آج کا عمر رات کو گلی گلی، کوچہ کوچہ پھرنے سے ڈرتا ہے، پولیس آوارہ گردی میں پکڑ لے گی اور جیب میں جو پیسے ہیں وہ دھرا کر چھوڑے گی۔ آج کا عمر کسی کے دروازے کے ساتھ کان نہیں لگائے گا ورنہ محلے والے پکڑ کر اسے اتنا ماریں گے کہ بھرکس نکال دیں گے۔ آج کا عمر رات کو اکیلا پھرے گا تو کوئی رہزن سینے پر پستول یا چاقو رکھ کر اس کے کپڑے بھی اُتروا لے گا۔ اس کے علاوہ آج کے عمر کی دشواری یہ ہے کہ وہ گلی گلی، کوچے کوچے نہیں جاسکتا کیونکہ اس کی کار بہت بڑی ہے اور اس کار کے ساتھ پولیس کی دس جیپیں بھی ہوتی ہیں۔ یہ میکانکی جلوس صرف مال روڈ پر چل سکتا ہے۔

مہنگائی اور چور بازاری اس حد تک جا پہنچی ہے جہاں قوم کے وہ گھوڑے بھی بک گئے ہیں جو اس نے بحرِ

ظلمات میں دوڑائے تھے۔ وہ جذبے مر گئے ہیں، وہ نعرے مر گئے ہیں جنہوں نے کبھی کرۂ ارض کو ہلا ڈالا تھا۔ اب تو یوں لگتا ہے جیسے ہم میں قومیت کا احساس ہی نہیں رہا۔ قوم کا خالی پیٹ قوم کو ہی اپنے اندر ڈال کر اسے ہضم کر رہا ہے۔ قوم گل سڑ رہی ہے۔

اگر ہم یہ کہیں کہ آیئے، ہم خود بھوک سے تڑپتے رہیں، جذبے کو بھوکا نہ مرنے دیں تو آپ کہیں گے کہ آندھی میں اگر دیا جل سکتا ہے تو ایسے تباہ کن حالات میں جذبے کو بھی زندہ رکھا جا سکتا ہے۔ پھر بھی ہم کہیں گے کہ جذبے کو زندہ رکھیں۔ یہی ہماری متاع ہے، یہی ہمارے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ورثہ ہے، اسے پیٹ کے لئے نیلام نہ کریں۔ اب یہ تجزیہ اور تحقیقات محض بیکار ہیں کہ ہمیں اس حال تک پہنچانے کا ذمہ دار کون ہے۔ وہ جو کوئی بھی ہے یا ہیں آپ ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ ہم حزب اقتدار اور حزب اختلاف کی دھینگا مشتی کے متعلق بھی کوئی بات نہیں کریں گے۔ آپ نے سب کچھ نہیں دیکھ لیا ہے۔ قوم میں خرابی یہی رہی ہے کہ وہ ان سب کو دیکھتی رہی ہے، اپنے آپ کو نہیں دیکھا۔ جذبات اور نعرہ بازی میں الجھی رہی، جس کے ہاتھ میں لاٹھی دیکھی اس کے آگے بھینس بن گئی۔

اب ہمیں دو چیزوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہے...... پیٹ یا پاکستان...... ہم یقیناً پاکستان کا انتخاب کریں گے۔ ذرا پیٹ سے ہٹ کر سوچیں اور ملک کا جائزہ لیں تو ہمیں ہر طرف سے پاکستان کے دشمن سرگرم نظر آتے ہیں۔ وہ دیکھ رہے ہیں کہ یہ قوم اپنے ہی پیٹ میں ہضم ہو رہی ہے۔ اسے ملی وقار اور ملک کی سلامتی کی کچھ خبر نہیں رہی۔ لہٰذا دشمن ہماری جڑوں میں اترتے جا رہے ہیں۔ وہ ہماری کمزوریوں، کوتاہیوں، مجبوریوں اور بدبختیوں سے پورا پورا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ ہمارے دلوں پر قبضہ کرنے کی کوششیں کر رہے ہیں۔ ان کے ایجنٹ ہمیں الفاظ کے طلسم میں گرفتار کر رہے ہیں اور یہ آواز سرحد پار سے بھی آنے لگی ہے۔ ''پاکستان ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا''۔ امریکہ، اسرائیل اور ہندوستان ''پاکستان کے ٹکڑوں'' کو سمیٹنے کے لئے تیار بیٹھے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اب انہیں ہم پر فوجوں سے حملہ کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔

ذرا اس صورت حال پر غور کیجئے اور اپنے آپ سے پوچھیے۔ ''کیا ہمیں امریکہ، اسرائیل اور ہندو کی غلامی منظور ہے؟'' ہمیں یقین ہے کہ آپ اس تصور سے ہی لرز اٹھیں گے لیکن مہنگائی، چور بازاری، معاشرتی بے انصافی اور بے اطمینانی نے ہمارے جذبے کو بھی مجروح کر دیا ہے۔ خدا کے لئے اس وار کو سہہ جایئے۔ ہم نے اس سے بھی مشکل وقت دیکھے ہیں۔ ہم نے متحد ہو کر اس سے بھی بڑی آفات کا مقابلہ کیا ہے۔ یہ حالات بھی عارضی ہیں۔ یہ حالات پیدا کرنے والے بھی عارضی ہیں۔ انہیں برا بھلا کہنے سے کچھ حاصل نہ ہو گا۔ رہے گا تو اللہ کا نام اور پاکستان رہے گا۔ پاکستان کو زندہ رکھنے کے لئے ہمیں باہمی پیار کی ضرورت ہے۔ ایک دوسرے کے دشمن نہ بنتے۔ اپنی صلاحیتوں اور اپنے جذبے کو مرنے نہ دیجئے۔ اللہ ہمارا حامی اور مددگار ہے!

صالحہ ساجد بنت عنایت اللہ

پاکستان بحرانوں کی سرزمین

○ قوم بحرانوں کا شکار ہے نہ بجلی، نہ پانی، نہ گیس اور نہ پٹرول۔
○ ملک 55 ارب ڈالر کے غیر ملکی قرضوں تلے دبا ہوا ہے۔
○ معیشت تباہ اور 80 فیصد غریب اپنی روٹی روزی پوری کرنے سے محروم لیکن سیاست دانوں، حاکموں، سرکاری افسران کے اللے تللے زور و شور سے جاری۔
○ اسے کہتے ہیں گھر پھونک تماشا دیکھنا۔

☆ ---------------------- afzalmazhar@gmail.com ------------ افضال مظہر انجم

آج سے 67 سال پہلے بابائے قوم قائداعظم محمد علی جناح نے کروڑوں مسلمانوں کے رہنے کے لئے ایک ملک بنایا تھا لیکن بعد میں آنے والے خودغرض، نالائق، نااہل سیاست دانوں، جمہوری اور فوجی ڈکٹیٹروں نے اس کا حال اس طرح کر دیا کہ آج کے جدید دور میں بھی یہاں بجلی میسر نہیں، گیس ہونے کے باوجود دستیاب نہیں۔ کروڑوں کی تعداد میں عوام بنیادی ضروریات، تعلیم، روزگار، علاج معالجہ سے محروم ہیں۔ اس ملک میں ہر شے کی فراوانی ہونے کے باوجود عوام کو ہر چیز سے محروم کر کے رکھ دیا گیا ہے۔ گویا اسے ریگستان میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ آئے روز کوئی نہ کوئی نیا بحران سر اٹھاتا ہے۔ کبھی آٹے، چینی کے لئے ماؤں بہنوں کو قطاروں میں لگنا پڑتا ہے۔ گیس اور بجلی کا بحران تو بیس بائیس سال سے جاری ہی ہے۔ حالیہ پٹرول بحران نے لوگوں کا باہر نکلنا ہی دوبھر کر کے رکھ دیا۔ پٹرول اور دیگر بحرانوں کے پیچھے کون سا مافیا کارفرما تھا حقائق سامنے آنے سے آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔

پی ایس او، اوگرا، وزارت پٹرولیم بحران کے ذمہ دار ہیں

پاکستان سٹیٹ آئل (پی ایس او) حکومتی سرکاری ادارہ ہے جس کے ذمہ تیل کی ترسیل کا بڑا کام ہے۔ عرصہ دراز سے حکومت کے دوسرے محکموں سٹیل ملز، پی

آئی اے، واپڈا، ریلوے کی طرح پی ایس او بھی شدید مالی بحران کا شکار ہے اور وقتاً فوقتاً حکومت سے مالی امداد طلب کرتا رہتا ہے۔ پی ایس او نے حالیہ دنوں میں مالی بحران سے نکلنے کے لئے اربوں روپے امداد طلب کی تھی۔ پی ایس او کے مالی بحران میں مبتلا ہونے کی دو وجوہات ہیں۔ ایک تو اس کی واجب الوصول رقوم جن کی مالیت اربوں روپے میں ہے، مختلف حکومتی محکموں کے پاس پھنسی ہوئی ہیں۔ دوسرے بھاری تنخواہوں اور مراعات پر افسران کی کثیر تعداد بھی اس مالی بوجھ کا باعث ہے۔ صرف وزارت پانی و بجلی نے ہی اس ادارے کے 171 ارب روپے دینے ہیں۔ اسی طرح سے دوسرے اداروں نے پی ایس او کے اربوں روپے ادا کرنے ہیں جس کی وجہ سے پٹرول فراہم کرنے والا یہ ادارہ طویل عرصے سے مالی بحران کا شکار ہے۔

ادارے کے گردشی قرضے بھی 250 ارب روپے سے زائد کے ہو چکے ہیں۔ نادہندہ اداروں سے رقوم وصول ہوتی ہیں تو ادارہ پٹرول کی خریداری کی ادائیگی کرتا ہے یا درآمد کی صورت میں بنکوں سے لیٹر آف کریڈٹ (ایل سی) کھلواتا ہے۔ اوگرا یعنی آئل اینڈ گیس ریگولیٹری اتھارٹی گیس اور تیل کی ترسیل کے لئے متعلقہ اداروں کے اوپر ایک ادارہ اس کام کی نگرانی کرتا ہے کہ ملک میں گیس اور تیل کی سپلائی کے معاملات ٹھیک طرح سے چل رہے ہیں۔ تیل کا ذخیرہ کتنا رہ گیا ہے یہ کہاں سے درآمد کرنا ہے۔ کن کن علاقوں میں گیس اور پٹرول کی کمی کو کس طرح سے دور یا پورا کرنا ہے کیونکہ ایک محکمہ بنایا ہی خالصتاً اسی مقصد کے لئے گیا ہے کہ وہ گیس اور پٹرول کی طلب و رسد کی اس کمی کو پورا کرنے کے انتظامات بروقت کرے۔ ہوا یہ کہ جب تیل کا ذخیرہ صرف چند دنوں کا رہ گیا تو شور و غوغا مچ گیا اور نو دس روز کے لئے پنجاب کے شہروں خصوصاً لاہور میں اس کی قلت پیدا ہو گئی۔ بیرون ملک سے تیل کے بحری جہاز پہنچنے پر ہی یہ قلت پوری ہو سکتی تھی جس میں کئی روز درکار تھے۔ اوگرا، وزارت پٹرولیم اور پی ایس او کے اعلیٰ حکام ایک دوسرے کو اس بحران کا مجرم ٹھہراتے رہے حالانکہ سبھی اس بحران میں برابر کے مجرم ہیں۔ پی ایس او کے حکام برابر چیختے رہے کہ وہ شدید بحران کی وجہ سے مزید سپلائی جاری رکھنے یا درآمد کرنے سے قاصر ہے۔ نہ ہی اوگرا حکام نے اس کی پروا کی اور نہ ہی وزارت پٹرولیم کے اعلیٰ حکام اور وزیر خاقان عباسی نے اس واویلے پر توجہ دی اور تو اور ادارے کو فنانس فراہم کرنے والی اسحاق ڈار کی فنانس منسٹری نے بھی ادارے کو مطلوبہ مالی امداد فراہم نہیں کی کیونکہ رقم موجود ہونے پر ہی پی ایس او تیل کی خریداری کا کام انجام دے سکتا تھا۔ سو اعلیٰ افسران اور وزراء حضرات کی اس غفلت، بے حسی اور نااہلی کی وجہ سے ملک کے کروڑوں عوام کو مسلسل دس روز تک اس بحران سے گزرنا پڑا۔

حیرت کی بات ہے کہ ہمیشہ ہی ایسے بحرانوں کے پیش آنے کے بعد چند افسران کو معطل کر کے دوبارہ بحال کر دیا جاتا ہے اور کروڑوں عوام کو مصیبت اور تکلیف میں مبتلا کرنے والے پھر سے اپنے عالیشان دفاتر میں بیٹھے کام میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ جب تک بازپرس اور احتساب کا کڑا نظام نافذ نہیں ہو گا قوم اس قسم کے بحرانوں سے دوچار ہوتی رہے گی۔ پٹرول بحران کے اصلی چہرے تو بے نقاب نہیں ہو سکے جیسا کہ ہمیشہ ہی ہوتا رہا ہے کہ پٹرول مافیا سرکاری افسران سے مل کر سستے داموں پٹرولیم خرید کر مہنگے داموں مال بناتا رہا۔ وزیراعظم کے پٹرول مشیر زاہد مظفر کا نام بھی اس سکینڈل یا بحران میں گردش کرتا رہا جنہیں ایک وزیر نے مشیر کے عہدہ پر فائز کروایا ہے اور پٹرولیم کے وفاقی وزیر خاقان عباسی بھی اُن کے سامنے بے بس نظر آتے ہیں۔ ابھی

مشیر صاحب نے وفاقی وزیر خزانہ کو ایک میٹنگ میں بتایا کہ ملک میں صرف 18 روز کا پٹرول باقی ہے جبکہ حقیقت میں ایسا نہیں تھا۔ اکنامک کوآرڈی نیشن کمیٹی کو اس طرح سے اندھیرے میں رکھا گیا۔

عالمی مارکیٹ میں خام تیل کی قیمتوں میں جاری مسلسل کمی کی وجہ سے تیل مارکیٹنگ کمپنیوں نے مطلوبہ ذخائر برقرار نہیں رکھے حالانکہ یہ 13 کمپنیاں 20 روز کے تیل کے ذخائر رکھنے کی پابند ہیں۔ زاہد مظفر کے اللے تللے اور شاہانہ دفاتر کے اخراجات وزراء کے دفاتر کو بھی مات کر گئے ہیں۔ اسی زاہد مظفر کو وزیراعظم نے دو رُکنی تحقیقاتی کمیٹی کا بھی رُکن بنا دیا جس نے اوگرا کو اس بحران کا ذمہ دار قرار دیا۔ اس موقع پر سابق وزیر داخلہ رحمان ملک کے انکشافات بھی تہلکہ خیز ہیں کہ اس بحران میں چار بڑی کمپنیاں ملوث ہیں جنہیں پٹرول درآمد کرنے کی اوگرا نے اجازت دے رکھی ہے۔ پٹرول بحران میں ایران سے سستا پٹرول سمگل کرنے والا مافیا بھی ملوث تھا جو جعلی کاغذات کے ذریعے پٹرول و ڈیزل ملک میں لا رہا ہے۔ اس میں جرائم پیشہ گروہ ملوث ہیں۔ پی ایس او ہو یا اوگرا یا وزارت پٹرولیم ان شعبوں اور وزارتوں میں ہونے والی لوٹ مار اور کرپشن کے علاوہ سکینڈلوں اور خورد برد کے سلسلے میں بڑے بڑے افسروں کو کبھی سزائیں نہیں دی گئیں اور خود ان افسران کے طاقتور ہونے کی وجہ سے برسر اقتدار سیاسی اور فوجی حکومتیں ان کو ہمیشہ ہی بچاتی رہیں۔

جنگ کیے بغیر ہی پاکستان کو تباہ و برباد کرنے کا خوفناک منصوبہ

ملک کو معاشی طور پر اپاہج بنا کے رکھ دیا گیا ہے۔ جب سے یہ ملک بنا ہے اسلام دشمن قوتیں اسے صفحہ ہستی سے مٹانے کی مذموم حرکات میں مصروف ہیں۔ دشمن نے دو بڑی جنگیں بھی کر کے دیکھ لی ہیں لیکن میدان جنگ میں اس قوم کو شکست دینے میں انہیں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ تبھی ایسے پوشیدہ اور نظر نہ آنے والے حربے استعمال کر کے اس ملک کو اتنا نقصان پہنچانے کی منصوبہ بندی کی گئی جس سے ملکی معیشت برباد ہو جائے۔ قوم آپس میں لڑتی جھگڑتی رہے اور معیشت کو سنبھالا دینے کے لئے قرضہ دینے والے ممالک کے شکنجے میں اسے مزید جکڑ کر رکھ دیا جائے اور ایسا کرنے میں ملک دشمن طاقتیں کامیاب بھی ہو چکی ہیں۔ ایسے حالات پیدا کر دیئے گئے ہیں کہ ملک توانائی یعنی بجلی اور گیس کی فراہمی سے محروم ہو گیا ہے۔

آج سے اکیس بائیس برس پہلے بے نظیر بھٹو کے دور میں ملک میں بجلی پیدا کرنے کی بجائے پرائیویٹ اداروں یا کمپنیوں سے بجلی خریدنے کا سلسلہ شروع کیا گیا تھا جو نواز شریف کے 1997ء کے دور کے بعد جنرل پرویز مشرف کے 9 سالہ طویل دور اور آصف زرداری کے پانچ سالہ جمہوری دور میں بھی جاری رہا اور اس کے بعد تیسری مرتبہ اقتدار میں بیٹھنے والے حکمران نواز شریف کے دور میں گزشتہ ڈیڑھ سال سے جاری ہے۔ یعنی ملک میں دنیا کی سستی ترین بجلی پیدا کرنے والے پاکستان کو بجلی پیدا کرنے کے منصوبے بنانے سے ہی محروم کر کے رکھ دیا گیا۔ ان اعداد و شمار پر ذرا غور کریں تو صورت حال کی

فرمانِ قائداعظمؒ

مسلمان ایک متحدہ قوم ہے۔ پاکستان ایک نعمت ہے۔ آیئے! اس نعمت کے لئے ہم عاجزی اور انکساری سے خدا تعالیٰ کا شکر بجا لائیں اور دعا کریں کہ وہ ہمیں اس نعمت کے لائق بنا دے۔

(جمعتہ الوداع 17 اگست 1947ء)

حقیقت اور ملکی معیشت کو پہنچنے والا نقصان دوسرے لفظوں میں اس قوم کو ہونے والا نقصان سامنے آ جائے گا۔

بجلی پیدا کرنے کے ذرائع اور لاگت فی یونٹ

بجلی پیدا کرنے کے ذرائع مختلف ہیں جن میں:
ہائیڈل (پانی کے ذریعے)، تھرمل، آئی پی پی ایز (بجلی تیار کرنے والی نجی کمپنیاں) نیوکلیئر انرجی، کوئلہ۔
آج کل بجلی کی پیداوار کے ذرائع کی لاگت فی یونٹ اس طرح سے ہے:
پانی (ہائیڈل) ایک روپیہ 65 پیسے فی یونٹ
رینٹل پاور پراجیکٹس = 12 روپے 31 پیسے فی یونٹ
پن بجلی سے = 11 روپے فی یونٹ
شمسی توانائی سے = 19 روپے فی یونٹ
آئی پی پی ایز (نجی کمپنیوں سے خرید) 9.07 روپے یونٹ
(یہ اعداد و شمار 2012ء تک کے ہیں اب ان میں اضافہ ہو چکا ہے)

20 سال پہلے 75 فیصد انحصار ہائیڈل (سستی بجلی) پر تھا

اب ہائیڈل سے صرف 35 فیصد بجلی پیدا کی جا رہی ہے۔ بیس بائیس سال پہلے جنرل ایوب خان کے بنائے گئے دو ڈیم تربیلا اور منگلا نہ صرف پورے ملک کی بجلی کی ضروریات پوری کر رہے تھے اور سستی ترین بجلی ملک کے کروڑوں باسیوں اور انڈسٹری کو مہیا کر رہے تھے۔ پانی یا ڈیموں کے ذریعے بجلی کا فی یونٹ نرخ 10، 20 اور اس کے بعد 0.50 پیسے فی یونٹ تھی۔ آج کل بجلی کی لاگت 1.65 روپے فی یونٹ آ رہی ہے۔ 100 فیصد سستی بجلی پر انحصار کرنے والے غریب ملک کے ساتھ ایسا گھناؤنا کھیل کھیلا گیا کہ اب ہائیڈل سے صرف 35 فیصد اور دیگر مہنگے ذرائع سے 65 فیصد بجلی پیدا کی جا رہی ہے اور کھربوں روپے عوام کی جیب سے اس پرائیویٹ مافیا کی جیبوں میں جا رہے ہیں۔ ملکی معیشت کو کھربوں روپے کا نقصان الگ ہو رہا ہے۔

مختلف ذرائع کا بجلی پیدا کرنے میں حصہ

بجلی کے مختلف ذرائع جن سے بجلی پیدا کی جا رہی ہے اُن کا ملکی معیشت میں حصہ اس طرح سے ہے:
ہائیڈل 35.7 فیصد۔ تیل سے 35 فیصد
گیس سے 29 فیصد۔ کوئلہ سے 0.1 فیصد

پاکستان پن بجلی سے ایک لاکھ یونٹ بجلی پیدا کر سکتا ہے

واپڈا کی ایک رپورٹ کے مطابق پاکستان کا شمار دنیا کے اُن ممالک میں ہوتا ہے جہاں پہاڑوں کے درمیان جگہوں پر پانی روک کر انتہائی سستی بجلی پیدا کی جا سکتی ہے۔ 1947ء سے لے کر 50 سال تک یہی ڈیم ملکی ضرورت پوری کرتے رہے ہیں۔ بجلی کی پیداوار کے لئے کالا باغ ڈیم بنانے کا مسئلہ 44 سال سے لٹکتا آ رہا ہے۔ تبھی نجی کمپنیوں اور دیگر مہنگے ذرائع سے بجلی خریدنی پڑتی ہے۔ ہمارا ملک ایک لاکھ یونٹ پن بجلی سے پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے جو ملکی ضرورت 20، 21 ہزار میگا واٹ پوری کرنے کے بعد ایکسپورٹ بھی کی جا سکتی ہے لیکن مالیاتی ایجنٹوں، سیاست دانوں، نالائق حکمرانوں اور سرکاری افسران نے اس ملک کے غریب عوام اور معیشت کو ہر طرح سے نقصان پہنچانے کا تہیہ کر رکھا ہے اور ایسے سستے منصوبے بنانے سے اُن کی خودغرض طبقہ ... کمیشن کی رقم کی آمد آڑے آتی ہے۔

سیاسی اور قوم پرست جماعتیں ڈیم بنانے پر سیاست کرتی رہیں

اس ملک کے ماضی کے ایک ہزار سال پر نظر ڈالیں تو سخت ڈکٹیٹر یا بااصول حکمران اس لئے ہمیشہ کامیاب رہا کیونکہ یہاں پر ہر علاقے میں بھانت بھانت کی بولی بولنے والے اور پلے کچھ نہ ہونے کے باوجود ملکی مفاد کے منافی مسائل پر سیاست چمکانے والوں اور خود غرضوں کی کمی نہیں رہی۔ بجلی کا بحران جس نے چاروں صوبوں کے علاوہ آزاد کشمیر تک کے 18 کروڑ لوگوں کو ذہنی کوفت میں جکڑا ہوا ہے۔ ملکی معیشت توانائی کی کمی کی وجہ سے برباد ہو کر رہ گئی ہے۔ بے روزگاری میں اضافہ ہو رہا ہے لیکن اس ملک کی سیاسی پارٹیاں اور قوم پرست جماعتیں ڈیم کی مخالفت پر ہی سیاست کرتی جا رہی ہیں۔ ڈیم تو اُسی صوبہ میں بنے گا جہاں پہاڑوں کے درمیان اس قسم کا قدرتی ماحول موجود ہو گا لیکن اس کے فوائد سے ہر صوبہ کے کروڑوں عوام کو فائدہ ہو گا اور نہ ہونے کے نقصانات بھی اس ملک کے کروڑوں عوام کو اٹھانا پڑیں گے۔ اس ملک میں سیاست کے انوکھے انداز دیکھیں کہ ڈیم پر بھی سیاست کی جا رہی ہے۔ بلوچستان میں سوئی گیس کی پائپ لائنوں کو اڑا کر اسے احتجاج کا نام دیا جا رہا ہے۔ یعنی ہر وہ کام جس سے اس ملک کے عوام کو نقصان پہنچ رہا ہو سیاسی اور قوم پرست جماعتیں اپنے سیاسی مفادات کی خاطر کر رہی ہیں اور تو اور انڈیا کی ایجنسی ''را'' ڈیم کی مخالفت کرنے والوں کو کروڑوں روپے فراہم کرتی رہی ہے تاکہ جب بھی ڈیم بنانے کا سلسلہ شروع ہو جلسے جلوسوں کے ذریعے اس کی مخالفت شروع کر دی جائے گویا ملک دشمن عناصر کا پیسہ بھی اپنا اثر دکھا رہا ہے۔ تبھی عوام عرصہ دراز سے توانائی کے بحران کا مسلسل 24 گھنٹے شکار رہتے ہیں جس نے کروڑوں عوام کا جینا دو بھر کر کے رکھ دیا ہے۔ کبھی گیس نہیں، کبھی بجلی ناپید اور کبھی تیل کا بحران۔ یہ سارے بحران ہمیں صرف اس لئے برداشت کرنا پڑ رہے ہیں کہ ہم بحیثیت قوم بے حسی اور مایوسی کا شکار ہیں اور اپنے مسائل کے حل کے لئے خود آگے بڑھنے کی بجائے یا میدانِ عمل میں آنے کی بجائے ہمیشہ دوسروں پر انحصار کرتے ہیں۔

سستی بجلی پیدا نہ ہونے سے کھربوں روپے کے نقصانات

پوری قوم اور ملکی معیشت برداشت کر رہی ہے۔

☆ غازی بروتھا ڈیم نے 8 برس (2005ء تا 2013ء) میں ملکی خزانے کو 226 ارب روپے کا فائدہ پہنچایا۔ اس دوران پن بجلی سے 53 ارب سستے یونٹ کی بجلی پیدا کی گئی۔

☆ ڈیم نہ بننے سے 2 کروڑ 8 لاکھ ایکڑ اراضی بنجر ہو چکی ہے۔

☆ صرف 5 سالوں (2008ء تا 2012ء) کے دوران 819 ارب روپے کی بجلی چوری ہوئی۔ صرف ایک سال کے عرصہ میں ہی 220 ارب روپے کی بجلی ضائع ہوئی۔

☆ نندی پور ڈیم مکمل نہ ہونے کی وجہ سے ملک کو 23 کروڑ روزانہ نقصان اس کا مطلب ہے کہ دوسرے ڈیم نہ بننے سے یہ نقصان 100 کروڑ روزانہ ہے اور 9000 کروڑ یا 900 ارب ماہانہ ہے تو سالانہ 10800 ارب روپے کے اس خطیر نقصان ہونے سے ملکی معیشت اور عوام کو پہنچنے والے نقصان اور مہنگائی، اشیاء کی لاگت میں اضافہ کی وجہ سے ایکسپورٹ متاثر ہونے سے اس کا نقصان کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

☆130 ارب یونٹس سے زائد بجلی استعمال ہونے کی وجہ سے نجی کمپنیوں یا مہنگے ذرائع سے 8 سے 10 روپے فی یونٹ قیمت زائد دینے سے ہونے والے نقصانات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

اربوں روپے کا نقصان تو چھ سات برسر اقتدار حکومتیں اور عوام برداشت کرتے آرہے ہیں جن کی مالیت 3.000 ارب روپے سے زائد ہے اس سے کم مالیت میں ضروری ڈیم پایہ تکمیل تک پہنچائے جا سکتے تھے۔

یہ کام کس کو کرنا ہے، کب کرنا ہے؟ ابھی تک قوم کو حقائق سے آگاہ کرنے کی بجائے بھول بھلیوں میں رکھا جا رہا ہے اور قوم اور معیشت کا بیڑہ غرق پروگرام زور شور سے جاری ہے۔

ملک بحرانوں کا شکار 55 ارب ڈالر کے غیر ملکی قرضوں تلے سیاست دانوں کے اللے تللے جاری عوام بدحال، معیشت تباہ، بنگلوں کی سجاوٹ پر کروڑں خرچ

یہ کہانیاں آپ نے تاریخی واقعات میں تو پڑھی ہوں گی کہ روم جل رہا تھا تو نیرو بانسری بجا رہا تھا۔ اس قسم کے واقعات ہر قوم کے بے حس حکمرانوں کے ہاں اکثر دیکھنے کو ملتے ہیں کچھ اس قسم کے واقعات تواتر کے ساتھ مذہبی اور سیاسی قیادت اور عوامی نمائندوں کے ہاں دیکھنے کو آرہے ہیں۔ قوم بحرانوں کا شکار ہے نہ بجلی، نہ پانی، نہ گیس اور نہ پٹرول۔ ملک 55 ارب ڈالر کے غیر ملکی قرضوں تلے دبا ہوا ہے۔ معیشت تباہ اور 80 فیصد غریب اپنی روٹی روزی پوری کرنے سے محروم لیکن سیاست دانوں، حاکموں، سرکاری افسران کے اللے تللے زور و شور سے جاری۔ اسے کہتے ہیں گھر پھونک تماشا دیکھنا۔

مولانا فضل الرحمٰن احسن اقبال، خورشید شاہ، خواجہ سعد کے بنگلوں پر 87 لاکھ خرچ، اسحاق ڈار، رانا تنویر، سرتاج عزیز کے بنگلے 36 لاکھ روپے کھا گئے۔ قوم کو سادگی کا درس دینے والے مذہبی و سیاسی لیڈروں نے صرف اپنے بنگلوں کی سجاوٹ پر ہی کروڑوں روپے خرچ کر دیئے ہیں۔ یہ رقم صرف دو سال کے دوران 6 کروڑ روپے بنتی ہے۔ نومبر 2013ء سے 23 جون 2014ء تک وزراء کالونی کے گھروں کی تزئین و آرائش پر 3 کروڑ 38 لاکھ 88 ہزار 314 روپے اور اس کے بعد اتنی ہی رقم خرچ کی گئی۔

مولانا فضل الرحمٰن ہاؤس نمبر 22۔ 6 لاکھ اکانوے ہزار 172 روپے

وفاقی وزیر مذہبی سردار یوسف بنگلہ نمبر 24۔ 8,48,535 روپے

وفاقی وزیر کامران مائیکل مکان نمبر 26۔ پندرہ لاکھ 87 ہزار 167 روپے

جمال خان مکان نمبر 25۔ 18 لاکھ 58 ہزار 117 روپے

اپوزیشن لیڈر سید خورشید شاہ = 6 لاکھ 50 ہزار 86 روپے

انوشہ رحمان = 60 لاکھ 8 ہزار 293 روپے

وفاقی وزیر ریلوے خواجہ سعد رفیق = 6 لاکھ سات ہزار 800 روپے

ڈپٹی چیئرمین سینٹ صابر بلوچ = مکان نمبر 16۔ 8 لاکھ 61 ہزار 326

وفاقی وزیر رانا تنویر حسین کوٹھی نمبر 17-4 لاکھ 33 ہزار 633 روپے

وفاقی وزیر خزانہ اسحاق ڈار کوٹھی نمبر 18- 4 لاکھ 29 ہزار روپے

(مزید 6 لاکھ 54 ہزار 704 روپے ان کی منشاء کے مطابق خوبصورت بنانے پر خرچ کیے گئے)

وزیر خارجہ سرتاج عزیز بنگلہ نمبر 30- 8 لاکھ 42 ہزار 409 روپے

امتیاز شیخ رہائش نمبر 31- 7 لاکھ 41 ہزار 739 روپے

محمد اکرم درانی بنگلہ نمبر 32 پر 7 لاکھ 12 ہزار 757 روپے

(موصوف بھی مذہبی جماعت جمعیت العلمائے اسلام کے وزیر اعلیٰ بھی رہے ہیں)

وزیر مملکت امین الحسنات بنگلہ نمبر 33-6 لاکھ 41 ہزار 923 روپے (موصوف بھی مذہبی پیر ہیں)

وزیر مملکت تعلیم بلیغ الرحمان بنگلہ نمبر 34- 8 لاکھ 25 ہزار 533 روپے۔

محترمہ سائرہ افضل تارڑ 35 نمبر رہائش- دس لاکھ 56 ہزار 341 روپے

مرتضیٰ جاوید عباسی 9 لاکھ 2 ہزار آٹھ روپے۔

وفاقی وزیر احسن اقبال کے بنگلے پر اٹھارہ لاکھ 31 ہزار 360 روپے

(عوام کو سادگی اور وژن کا درس دینے والے وزیر کا خود اپنا حال یہ ہے)

یعنی ہاتھی کے دانت کھانے کے اور دکھانے کے اور قوم جائے بھاڑ میں بجلی نہیں، گیس ناپید، پٹرول نایاب ہمارے للّے تللّے تو پورے ہو ہی رہے ہیں۔ اسی کو قوم پر نازل ہونے والا عذاب شمار کیا جاتا ہے۔

اربوں روپے کے وسائل غیر ترقیاتی سکیموں پر ضائع کیے جا رہے ہیں

بجلی، گیس، تیل کے منصوبوں کی تکمیل کو ترجیح نہیں دی جا رہی۔ اس ملک میں حکمرانوں سیاست دانوں اور سرکاری افسروں کی ریت رہی ہے کہ اربوں روپے کے فنڈز غیر ترقیاتی اور ملکی اور عوام کے لئے غیر اہم اور غیر فائدہ مند منصوبوں اور سکیموں پر ضائع کر دیے جاتے ہیں اور ایسے اہم منصوبے جن سے ملک کی معیشت کی زندگی وابستہ ہے کی تکمیل کے لئے فنڈز موجود نہیں ہوتے یا خفیہ ہاتھوں ایسے اہم ترین منصوبہ جات کی تکمیل کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ نندی پور اور نیلم جہلم پراجیکٹ کی تکمیل نہ ہونے سے ملک کو سالانہ اربوں روپے کا نقصان برداشت کرنا پڑ رہا ہے۔ ان منصوبوں کی تکمیل چند سال پیشتر ہونا تھی لیکن اب 2017ء میں ہوگی۔ ہر سال فنڈز کی کمی کی وجہ سے ملک کو اربوں روپے کی سستی بجلی فراہم کرنے والے یہ پراجیکٹ اب تک لٹکتے جا رہے ہیں۔ اس کی بجائے وزیر اعلیٰ پنجاب نے 31 ارب روپے کی خطیر رقم بے روزگاروں کو ٹیکسیاں اور دیگر گاڑیاں فراہم کرنے کے لئے مختص کی ہے۔ عوام کے پاس روٹی کھانے کے پیسے نہیں ٹیکسیوں پر کون سفر کرے گا؟ نہ ہی اس سے بے روزگار کو روزگار مہیا ہو سکے گا۔ لوگ 70 ہزار روپے سستی گاڑی بعد میں فروخت کر دیں گے اور سرکاری بنکوں کے اربوں روپے اس سکیم میں پھنس جائیں گے۔ پہلے بھی دو مرتبہ شریف برادران ٹیکسی سکیموں پر قومی بنکوں دوسرے لفظوں میں قومی خزانے کے اربوں روپے ضائع کر کے قومی بنکوں کا دیوالیہ نکال چکے ہیں۔ اس کی بجائے ملکی معیشت کے لئے اہم بجلی اور گیس کے منصوبوں کی تکمیل کو ترجیح نہ دے کر ملکی معیشت کو نقصان پہنچانے کا باعث بن رہے ہیں۔

ہم عجیب بھیڑ بکریاں ہیں کہ جن کی ہم خوراک ہیں انہی سے ہم یہ
امید باندھ لیتے ہیں کہ یہ ہمارے لئے چارے کا اہتمام کریں۔

ابدال بیلا

ہم نسل در نسل سے چلے آئے بھیڑ بکریوں کا ایک ریوڑ ہیں۔

اس سے بھی بڑا المیہ یہ ہے کہ ہم بکریوں نے بھیڑیوں کو اپنا گڈریا مانا ہوا ہے۔

یہ بڑا گھمبیر، پیچیدہ اور بگڑی قدروں کا عجیب سا پرتو ہے۔ یہ اور کچھ نہیں صدیوں سے اپنے گلے میں زیور سمجھ کے پہنا ہوا غلامی کا وہ نولکھا ہار ہے جسے ہم اپنے لئے ایک شانِ دلبری سمجھ بیٹھے ہیں۔ غلامی کا یہ طوق ہم نہ صرف برضا و رغبت بڑی تگ و دو کے بعد حاصل کرتے ہیں۔ الٹا اسے چمکا کے اپنی مٹی، اپنی دھرتی ماں کی کوکھ سے نکلے اصلی اصیل ہیروں، موتیوں اور مونگوں سے مزین کر کے اپنی بدیسی قبا کے اوپر سجاتے ہیں۔ پہنتے ہیں۔ اسے پہن کے ہم ایک عجیب لاحاصل معتبری کے زعم میں خود اپنی ہی نسل کی بھیڑ بکریوں سے نہ صرف خود کو ممتاز اور قد آور سمجھنے لگتے ہیں بلکہ خودسری کا سودا سر میں سما کے اپنی نسل کی بھیڑ بکریوں کی رکھوالی کے لئے بدیس سے منگوائی بھیڑیے کی کھال پہن کے گڈریے کا سوانگ بھی رچاتے ہیں۔ ہم بھیڑ بکریاں بھی اس قدر سادہ احمق اور بے مغز ہیں کہ ہم اپنے گروہ سے کوئی اپنے جیسی بھیڑ اپنی رکھوالی کے لئے متعین نہیں کرتیں۔ الٹا اپنی نسل سے الگ دور سے شکار پہ آئے بھیڑیوں اور لومڑیوں کے آگے دست بستہ بیٹھ جاتے ہیں۔

ہم بھول جاتے ہیں کہ یہ بھیڑیے، لومڑ، لومڑیاں، شیر، شیرنیاں، چیتے ہماری نسل سے نہیں ہیں۔

ہمارا کھانا پینا اور ہے اور ان کا اور۔

ہمارے دانت اور طرح کے ہیں، ان کے اور۔

ہم چارے کی دو مٹھی سے اپنے تین دن گزار لیتے ہیں۔

یہ لہو پیتے ہیں، گوشت کھاتے ہیں۔

یہ جبڑے کھولتے ہیں تو ان کے دانتوں سے ہمارا پیا ہوا لہو ٹپکتا ہے۔

ہم عجیب بھیڑ بکریاں ہیں کہ جن کی ہم خوراک ہیں انہی سے ہم یہ امید باندھ لیتے ہیں کہ یہ ہمارے لئے چارے کا اہتمام کریں۔

بھیڑ بکریوں کا نصیب کبھی جاگے تو خدا انہیں اصلی "گڈریا" دیتا ہے۔

کہتے ہیں گڈریا وہ نہیں ہوتا جو خود چھاؤں میں بیٹھے اور اپنی بکریاں دھوپ میں جلنے کے لئے چھوڑ دے۔

گڈریا کبھی بکریوں کے آگے نہیں چلتا کہ مبادہ پیچھے چلی آتی بھیڑیں کسی بھیڑیے کا لقمہ بنیں۔ گڈریا ہمیشہ بکریوں کے جتھے میں سب سے پیچھے رہتا ہے۔

گڈریا وہ ہوتا ہے جسے علم ہو کہ اس کی امان میں آئی بکریوں میں سے کون کمزور اور لاغر ہے اور کون بے بس اور مہین ہے۔ کون زخمی اور گھائل ہے۔ کون کم سن اور کومل ہے اور کون طاقت اور گھمنڈ کے زور میں اپنی ہی نسل کی بھیڑوں کو سینگ مارتی ہے۔ کس کے حصے میں سبز کھلیان کی گھاس آتی ہے اور کون خاردار جھاڑیوں پر چڑھی بکری پتے پتے کو سونگھ کر اپنا پیٹ پال رہی ہے۔ اچھا گڈریا پیچھے پیچھے چلتے ہوئے اپنی زیر کمان تمام تر بکریوں کو ان کی ضرورتوں کے مطابق خوراک، آرام اور تحفظ فراہم کرنے کا پابند ہوتا ہے۔ اگر کسی گڈریے کے ایسے کوائف نہیں تو وہ گڈریے کے مقام سے گر کے بھیڑیے کا روپ دھار لیتا ہے۔

آج کل نہ تو بکریاں چرانے کا رواج عام رہا۔ نہ ہمیں ہانکنے والوں کو گڈریے بننے کی خواہش ہوئی۔

کبھی ایسا زمانہ تھا جب خدا انسانوں کی فلاح، تربیت اور تحفظ کے لئے آسمان سے پیغمبر اتارا کرتا تھا تو ہر پیغمبر کی تربیت میں گڈریے کی شان ہوا کرتی تھی۔ بھیڑیوں بکریوں کو چراتے چراتے خدا اپنے برگزیدہ پیغمبروں کو انسانوں کی رہبری کے رموز سے شناسائی دیتا تھا۔ گڈریے اپنی "غرض" سے بے نیاز ہو کے بکریوں، بھیڑوں کی اجتماعی فلاح کے لئے جیا کرتے تھے۔ خدا نے اپنے گڈریوں کے نام اور کام رہتی دنیا تک محفوظ کر دیئے، امر کر دیئے۔

آج کل زمانہ اور ہے۔

آج ہم بھیڑ، بکریاں ہوتے ہوئے بھی صرف انہیں اپنا رکھوالا بنانے پر تلے بیٹھے ہیں، جن کے جبڑوں میں کنہائن دانت ہیں۔ جو ہمارے خون اور گوشت کے ذائقوں کے شوقین ہیں۔ وہ مجمع لگاتے ہیں بکریاں اپنے گرد اکٹھی کرتے ہیں اور پھر جتھے سے اپنی اپنی پسند کی بے زبان بکریاں نکال کے اپنی زبان کے ذائقے پالتے ہیں۔ یہ آج کے گڈریے اصل میں نہ ہماری نسل کی بھیڑیں ہیں نہ بکریاں، یہ بھیڑیوں اور شیروں، چیتوں اور لگڑ بگڑ کی نسل کی پیوندکاری سے پیدا ہوئے، انہی کے مکتب سے پڑھے، اُن کے وفادار سند یافتہ نوکیلے دانتوں والے ہیں جو اپنی چکنی چپڑی باتوں سے ہمیں پھسلا کے ہمیں سے ہمارا خون پینے کو مانگتے ہیں۔

یہ ڈریکولا نسل کے وہ انسان ہیں جسے ایک بار چکھ لیں اسے اپنی نسل میں شامل کر لیتے ہیں۔

ہمیں مان لینا چاہئے کہ ہم بھیڑ بکریاں ہیں۔

تقسیم ہند کی روداد لکھنے والی ایک عالمی شہرت یافتہ ادیبہ نے "فریڈم ایٹ مڈ نائٹ" لکھی۔ وہ لکھتی ہیں کہ تقسیم ہند کے وقت مشترکہ برٹش ہندوستان میں لگ بھگ چالیس کروڑ عوام تھے۔ مگر ان کے سات سمندر پار سے آئے ہوئے گورے آقا اپنے ڈھائی سو سالہ اقتدار میں کبھی بھی لاکھ سوا لاکھ سے زیادہ نہ ہوئیں وہ بڑے فخر سے لکھتی ہیں کہ اگر کمبائنڈ ہندوستان میں انسانوں کی بجائے گائیں، بھینسیں، بکریاں اور میمنے ہوتے تو انہیں ہانکنے کے لئے بھی لاکھ ڈیڑھ لاکھ گوروں سے کہیں زیادہ گڈریوں کی ضرورت تھی۔ وہ بڑی حیران ہوتی ہیں کہ یہ کیسا علاقہ ہے۔ جہاں کے باسی برضا و رغبت اپنی غلامی کا طوق گلے میں سجائے دور سے آئے آقاؤں کے لئے

وفاداری کمانے کے لئے ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی خاطر، اپنے ہی بھائی بندوں کی ٹانگیں کھینچ لیتے ہیں۔

ایک دوسرے کے کندھوں پہ چڑھ کے اپنے آقاؤں کو گلدستے پیش کرتے ہیں۔

ہر کوئی یہ ثابت کرنے پر تلا ہے کہ مجھے کھائیے، میں زیادہ مزیدار ہوں۔

وہ خاتون دانشور صرف تقسیم کے وقت کے چالیس کروڑ لوگوں میں سے ایک مرد آہن بچے اور کمرے لیڈر کے لئے رطب اللسان ہے۔ صرف جس نے اپنے ہی آقاؤں کے بنائے ہوئے ہر قانون کو عقل اور خرد سے ایسی ضرب لگائی کہ اپنے دیس پہ زبردستی ناحق قبضہ کرنے والے مغرور آقاؤں کو انہی کی ہر عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کر کے حریت اور آزادی کا سبق پڑھا کے ظالم ثابت کر دیا۔

پوری چالیس کروڑ بھیڑ، بکریوں کو انسانوں کا رینک دلوا دیا۔

انہی کی کوشش سے یہ پورا خطہ آزاد ہوا۔

یہ محسن قائداعظم محمد علی جناح ہیں جنہوں نے صرف مسلمانوں کو آزادی کی نعمت نہیں دی بلکہ باقی ہندوستان کی قوموں کو بھی آزادی سے ہمکنار کیا۔ یونہی تو نہیں ہندوستان کے بڑے لیڈر پنڈت جواہر لعل نہرو کی نابغہ روزگار دانشور بہن سروجنی نائڈو نے برملا ریکارڈ پر کہا تھا کہ کاش ہم پینتیس کروڑ ہندوؤں سکھوں کے پاس صرف ایک محمد علی جناح ہوتا اور مسلمانوں کے پاس ہمارے سارے لیڈر: مہاتما گاندھی جی، پنڈت جواہر لعل نہرو، پٹیل اور دیگر ہوتے تو کبھی ہم اپنا مقدمہ نہ ہارتے۔

وہ ہار گئے۔

قائداعظم جیت گئے۔

انہوں نے ہمارا اسٹیٹس ہندوستان کی اچھوت قوم سے بڑھا کے اشرف المخلوق بنا دیا۔ ہمیں آزادی دلا

حسبِ حال

سیدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے کہ: جب لوگوں کا یہ حال ہو جائے کہ وہ برائی دیکھیں اور اسے بدلنے کی کوشش نہ کریں۔ ظالم کو ظلم کرتے پائیں تو اس کا ہاتھ نہ پکڑیں تو قریب ہے کہ اللہ اپنے عذاب میں سب کو لپیٹ لے۔ اللہ کی قسم، تم کو لازم ہے کہ بھلائی کا حکم دو اور برائی سے روکو ورنہ اللہ تم پہ ایسے لوگوں کو مسلط کر دے گا جو تم میں سب سے بدتر ہوں گے اور وہ تم کو سخت تکلیف دیں گے۔ پھر تمہارے نیک لوگ اللہ سے دعائیں مانگیں گے مگر وہ قبول نہ ہوں گی"۔ (ترمذی)

دی۔ وہ آزادی جو آج کی دنیا میں محکوم چلی آتی قوموں کی زندگی میں ہزارہا مہینوں اور برسوں کی جدوجہد سے بھی آتی دکھائی نہیں دے رہی۔

مگر ہم نے اس آزادی کی نعمت کو سمجھا ہی نہیں۔

ہم پھر بھیڑ بکریاں بن گئے۔

اور اپنی دودو آنے کی غرض ہاتھ میں لے کر اپنے ہی شکار پہ آئے بھیڑیوں اور لومڑیوں کے دام میں پھنس گئے۔ جنہیں صرف ہمارا گوشت نوچنا ہے اور لہو پینا ہے۔ کچھ ادھر رہ کے ہمیں شکار کرنے کو منہ کھولے رکھتے ہیں۔

ایک کام میں یہ سب متفق ہیں۔

ان سب نے ہمیں شکار کر کے ہماری بوٹیوں کے بدلیں میں کارخانے لگوانے ہیں۔ ہم بے ذائقہ بے وقت بھیڑ بکریوں کا خون کشید کر کے میٹھی شوگر کی فیکٹریاں بنانی ہیں اور ہم سے صرف یہی سننا ہے۔ بھیڑیے زندہ باد!

***

فلسفۂ انقلاب

انقلاب کی کامیابی کی ضمانت وہ سچے انقلابی ہوا کرتے ہیں
جن کا مقصد حصولِ اقتدار نہیں، حصولِ رضائے الٰہی ہو۔

ڈاکٹر پروفیسر سلیم احمد شاہ ------------ 0300-9242724 ------------

مفہوم انقلاب

انقلاب نام ہے تبدیلی کا۔ ایسی تبدیلی جو انسان کی اُس خواہش سے متعلق ہوتی ہے جو اُس کے دل کو اپنی حالت کو تبدیل کرنے کے لئے آمادہ کرتی ہے۔ جب کوئی فرد اپنی موجودہ حالت اور معیارِ زندگی سے بے اطمینانی یا بیزاری کا اظہار کرتا ہے تو اُس کے ہمدرد یہ کہتے ہیں کہ اس فرد کو اپنی زندگی میں انقلاب لانا چاہئے تا کہ وہ ایسی حالت میں آ جائے کہ مطمئن ہو جائے اور اس کی بے اطمینانی ختم ہو جائے۔ جس بیزاری کا وہ شکار ہے اس بے زاری سے نکل آئے۔ اس کی ڈپریشن ختم ہو جائے۔ اگر اس کو کوئی ایسا ہمدرد مل جائے جو اس کی راہنمائی کرے، زندگی کو بہتر بنانے کے گُر سکھائے تو وہ مایوس فرد کی زندگی میں انقلاب لانے کا موجب بن جاتا ہے لیکن یہ تب ممکن ہوتا ہے اگر اپنی زندگی کو بہتر بنانے کا خواہش مند فرد اپنے ہمدرد کے بتائے ہوئے گُر استعمال کرے اور پھر اپنے اندر انقلابی تبدیلی لانے کی کوشش بھی کرے۔

قیام انقلاب

بہت سے لوگ اس خواہش کا اظہار کرتے ہیں کہ اُن کی زندگی میں بہتر تبدیلی آ جائے۔ ایک انقلاب آ جائے اور وہ اپنی گری ہوئی حالت سے نکل کر مضبوط اور قائم ہو جائیں لیکن اُن کی خواہش الفاظ کے ذریعے اظہارِ خواہش سے آگے نہیں بڑھتی۔ اس لئے وہ انقلاب کی خواہش کرتے کرتے دنیا سے چلے جاتے ہیں لیکن اُن کی زندگی میں انقلاب نہیں آتا۔ اس کے برعکس کچھ لوگ اپنی قوتِ ارادی کو کام میں لا کر انقلاب کی خواہش

کو جذبے کی حالت میں لے آتے ہیں پھر وہ جذبہ ان کو عملی اقدام کے لئے ابھارتا ہے۔ وہ کوشش شروع کرتے ہیں اور ثابت قدمی سے کوشش جاری رکھتے ہیں۔ ان کی ثابت قدمی اور ہمت اُن کو انقلاب کی منزل تک پہنچا دیتی ہے۔ وہ اپنی گری ہوئی پست حالت کی غلامی سے نکل آتے ہیں اور آزادی کی منزل پر قدم رکھتے ہیں۔ پھر ان کی کوشش کا جذبہ ان کو سست نہیں ہونے دیتا۔ وہ مزید آگے بڑھتے ہیں اور مزید بہتری کے لئے کوشش جاری رکھتے ہیں اور بہتر سے بہتر درجات آزادی حاصل کرتے چلے جاتے ہیں۔ ایک نئی منزل کے بعد پھر ایک اور نئی منزل کی خواہش کرتے ہیں اور یہ سلسلہ زندگی بھر جاری رکھتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو کامیاب زندگی گزارتے ہیں۔

کامیاب زندگی وہ ہے جو کہ آزادی کی زندگی ہوتی ہے۔ دراصل اصل آزادی بذات خود ایک دولت ہے۔ آزادی دولت سے نہیں ملتی اور نہ ہی دولت کے ذریعے آزادی قائم رکھی جاسکتی ہے۔

آزادی کی زندگی سے محروم لوگ ہمیشہ زندگی سے غیر مطمئن رہتے ہیں ان کے پاس دولت بھی ہوتی پھر بھی زندگی کی اصل خوشیاں ان سے دور رہتی ہیں۔ اس کے برعکس آزاد زندگی انسان کو سچی خوشیوں سے ہمکنار کرتی ہے۔

تبدیلی

تبدیلی کی خواہش سے انقلاب کا آغاز ہوتا ہے۔ ہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ تبدیلی، انقلاب اور آزادی باہم جڑے ہوئے ہیں۔ تبدیلی کو ہم انقلاب کہتے ہیں اور انقلاب کو ہم آزادی کہہ سکتے ہیں۔ تبدیلی ہو کہ انقلاب ظاہر ہو تو آزادی ملتی ہے اور آزادی سے خوشحالی آتی ہے۔

قومی انقلاب

جس طرح انفرادی زندگی کے لئے تبدیلی، انقلاب اور آزادی کی مثال درست ہے اسی طرح قومی زندگی کے لئے بھی یہ مثال درست سمجھی جائے گی۔

مثلاً جب ایک قوم تبدیلی چاہے گی تو انقلاب ظاہر ہوگا اور جب انقلاب اپنی منازل طے کرے گا تو آزادی حاصل ہوگی۔

آزادی حاصل بھی انقلاب کے ذریعے ہوتی ہے اور آزادی کو حاصل کرنے کے بعد اس کی حفاظت کے لئے ایک تسلسل کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ جب کوئی قوم غلام ہوتی ہے تو وہ اپنی حالت کو تبدیل کرنے کے لئے غلامی سے نجات حاصل کرنے کا سوچتی ہے۔ جب یہ سوچ کوشش کی شکل اختیار کرتی ہے تو پھر قوم آزادی کے حصول کی منزل کی طرف بڑھنے لگتی ہے۔ جیسے کہ ہماری قوم کے اندر گزشتہ صدی میں غلامی سے بیزاری کی سوچ پیدا ہوئی۔ انگریزوں کی غلامی سے بیزاری کی سوچ نے قوم کے اندر تبدیلی کی خواہش پیدا کی۔ قوم کی خواہش نے تبدیلی کے جذبہ کی شکل اختیار کی اور پھر تبدیلی کے جذبہ نے انقلاب آزادی کی شکل اختیار کی اور قوم نے آزادی حاصل کرلی جو کہ تقسیم ہند کی شکل میں ظاہر ہوئی۔

ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہ خواہش آزادی ایک دم سے انقلاب آزادی میں تبدیل نہیں ہوا کرتی بلکہ اس میں کافی وقت لگتا ہے۔ کچھ ایسے واقعات ہمارے خطے میں رُونما ہوئے کہ اس خطے کے اندر بسنے والے انسانوں میں تبدیلی کی خواہش پیدا ہونے لگی۔ یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ آزادی ایک انسانی جذبہ ہے مذہبی جذبہ نہیں۔ مذہب آزادی کی منزل کی جانب لے جاتا ہے اور اس جذبہ کو بیدار کرتا ہے لیکن آزادی کی خواہش ایک انسانی خواہش ہے۔ اگر ہم سوچیں تو آزادی کا جذبہ اور خواہش زندگی کی علامت ہے۔

زندگی-آزادی

زندگی کا آزادی کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ جانور بھی اپنی زندگی کی بقا کے لئے آزادی پسند کرتے ہیں اور آزادی سے ہی خوش ہوتے ہیں لہٰذا آپ آزادی کے جذبے کو زندگی کے جذبے کا نام بھی دے سکتے ہیں۔

آزادی ایک احساس کا نام ہے۔ انقلاب آزادی بھی احساس کی بنیادوں پر ہی اپنی منازل طے کرتا ہے اور آزادی کی خواہش مند قوم کو آزادی کی نعمت تک لے جاتا ہے۔ یہ اس طرح ہوتا ہے کہ خواہش کی تکمیل کوشش سے ہوتی ہے۔ خواہش آزادی کو جب کوشش کی طاقت ملتی ہے تو قوم کی قوت عمل مضبوط ہوتی ہے۔ قوت عمل جب تک مضبوط رہتی ہے کوشش جاری رہتی ہے اور جب کوشش انتہا تک پہنچ جاتی ہے تو آزادی کی نعمت قوم کو نصیب ہو جاتی ہے۔ قوم ایک آزاد قوم کہلاتی ہے لیکن یہاں پہنچ کر اگر قوم مطمئن ہو جائے اور پھر آزادی کی نعمت کو سنبھال نہ سکے تو پھر سے قوم غلامی کی طرف لوٹنے لگتی ہے۔ تب دنیا کہتی ہے کہ یہ قوم ایسی قوم ہے جس نے آزادی حاصل تو کر لی تھی لیکن اس آزادی کی نعمت کا تحفظ نہ کر سکی۔ اس کو سنبھال نہ سکی۔ آزادی نعمت کا خود کو قومی طور پر اہل ثابت نہ کر سکی۔ آزادی کی نعمت اس سے ناراض ہو جاتی ہے۔

یوں سمجھیں کہ آزادی ایک ایسی دلہن ہے کہ اگر وہ ناراض ہو جائے تو واپس اپنے باپ کے گھر چلی جائے گی۔ گویا آزادی کے تقاضے پورے کرنے پڑتے ہیں اور مستقل تقاضے پورے کرنے پڑتے ہیں۔ یہ نہیں کہ کچھ عرصہ تک تو جوش قائم رہے پھر جوش ختم ہو جائے کہ جیسے دودھ کا ابال۔ ایسا جوش جو دودھ کے ابال والا جوش ہوگا۔ دودھ کو ضائع کر دے گا اس دودھ کے اوپر بالائی نہیں آئے گی۔ گویا قوم کو مستقل طور پر آزادی بچانے کی کوشش جاری رکھنی پڑتی ہے۔

آزادی کی نعمت کی ایک مثال پھل دار باغ سے ہے۔ جب تک مالک باغ کی حفاظت اور دیکھ بھال کرے گا وہ باغ کے پھلوں کی نعمت سے فائدہ اٹھاتا رہے گا۔ مستقل دیکھ بھال کا عمل جاری رکھے گا تو مستقل پھلوں کا حصول ہوگا۔ جب دیکھ بھال چھوڑ دے گا باغ کو پانی وقت پر باقاعدگی سے نہیں دے گا اور اپنے باغ کے پھل دار درختوں کو بیماریوں سے نہیں بچائے گا تو باغ اجڑنا شروع ہو جائے گا۔ ملک اگر باغ ہے تو عوام اپنے ملک کے باغ کے پھلدار درخت ہیں ملکی حکومت ملک کے باغ کی مالک ہوتی ہے۔ اگر مالک اپنے باغ کی حفاظت نہ کرے تو باغ اجڑنے لگتا ہے۔ ہمارے ملک کے باغ کے ساتھ بھی گزشتہ 68 برسوں میں یہی ہوا۔ باغ کے مالک بدلتے رہے لیکن باغ کی حفاظت نہ کر سکے۔ جو نتیجہ ظاہر ہوا دنیا کے سامنے ہے۔

بیداریٔ احساس

کچھ لوگوں میں یہ احساس پیدا ہونے لگتا ہے کہ اس باغ کی حفاظت ہونی چاہئے اسے کرپشن کی بیماری سے بچایا جائے اور وہ ساری خرابیاں دور کردی جائیں کہ باغ پھر سے ہرا بھرا ہو جائے اور اجڑنے سے بچ جائے۔ جس طرح پھل دار باغ کو مالک کوشش سے بچا سکتا ہے۔ اسی طرح ملک کے باغ کو حکومت اپنی کوششوں سے بچا سکتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ملک کے باغ کو بچایا جا سکتا ہے اگر پُرخلوص جدوجہد کی جائے۔ اگر صرف مالک بدلتے رہیں اور پُرخلوص کوشش باغ کو بچانے کے لئے نہ ہو تو باغ اجڑنے سے نہیں بچایا جا سکتا۔

سوچ کی تبدیلی-سوچ کا انقلاب

جب کسی قوم کی سوچ میں تبدیلی پیدا ہو جائے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ قوم انقلاب کی طرف

بڑھ رہی ہے۔ سوچ کی تبدیلی کو سوچ کا انقلاب کہا جاتا ہے لیکن اس سوچ کی تبدیلی یا انقلاب کے لئے بھی کچھ وقت درکار ہوتا ہے۔ اگر قوم بحیثیت مجموعی بے حس مزاج کی ہو جائے تو اس قوم کے اندر تبدیلی یا تو پیدا ہی نہیں ہوتی یا اگر اس قوم کے چند افراد جو بے حس مزاج نہیں رکھتے بلکہ احساس کی روح ان کے اندر تازہ رہتی ہے۔ ایسے چند افراد اکٹھے ہو جاتے ہیں اور انقلاب کی خواہش ان کے دل میں پیدا ہو جاتی ہے۔

انقلاب کی ضرورت

انقلاب کی ضرورت اس قوم کو محسوس ہوتی ہے جس کے اندر احساس ہو اور وہ عزتِ نفس سے محروم نہ ہوں۔ اگر کوئی قوم اپنے ماضی کی محرومیوں اور حال کی بدحالی کی وجہ سے عزتِ نفس سے محروم ہو جائے اور بے حس ہو جائے۔ تو ایسے لوگ انقلاب کی باتیں تو سکرتے ہیں لیکن انقلاب کی روح ان کے اندر کبھی نہیں پیدا ہو گی۔ انقلاب کی روح ان افراد ہی ہوتی ہے جو عزت نفس کی دولت سے مالا مال ہوتے ہیں اور دنیا کی دولت کی وہ پرواہ کبھی نہیں کرتے بلکہ دنیا کی دولت اور مال و اسباب کو وہ لات مارتے ہیں اور اپنی عزتِ نفس کی دولت کو بچا لیتے ہیں۔ بدحالی کی غلامی سے پسے ہوئے لوگ حالات کی غلامی کا شکار رہتے ہیں۔ حالات کی غلامی کی زنجیروں کو توڑنا بھی اتنا ہی مشکل ہوتا ہے جتنا کہ کسی قوم کے لئے اپنے سر پر سوار غیر ملکی حکمرانوں کی مسلط کردہ غلامی کی زنجیروں کو توڑنا ہوتا ہے۔ برصغیر کی مثال سامنے ہے۔ انگریز کی غلامی کی زنجیریں کاٹنے میں کس قدر وقت لگا اور کتنی کوششیں ہوئیں تب برصغیر غیر قوم کی غلامی سے آزاد ہوا۔

(باقی اگلے ماہ)

پنجابی ادب سے انتخاب

ارشد میر مرحوم کے شاہکار اور سدا بہار پنجابی انشائیوں کے مجموعہ سے ایک کا اردو ترجمہ قارئینِ "حکایت" کے لئے بطور خاص پیش کیا جا رہا ہے

دیباچے

☆تحریر: ارشد میر مرحوم ---------- مترجم: خادم حسین مجاہد

دیباچے لکھنے کا رواج کب ہوا، کہاں ہوا، کیسے ہوا اس بارے میں کچھ پتہ نہیں چلتا۔ اگر شک کا فائدہ اٹھایا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ شروع شروع میں جب اندرون خانہ و بیرون خانہ ادیبوں کی مٹی پلید ہوتی تھی تو انہوں نے گھبرا کر اپنی بیگار لینے کے لئے اناڑی اور ناپختہ قسم کے الٹے سیدھے لفظ لکھنے والوں کو قابو کر کے دیباچے لکھنے پر لگا دیا۔

یہ تو ابتدائی ہیرا پھیری ہوئی بعد میں جب جمہوریت کا بے سُرا ڈھول باجا بجنے لگا تو جلد ہی واضح ہو گیا کہ یہاں دو بے وقوف بھی اکٹھے ہو کر تیسرے اچھے خاصے دانا و بینا کو اُلو بنا لیتے ہیں اس موقع سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے ادیب اور دیباچہ نگار نے ملی بھگت کی اور سُر ملا کر قاری کے گوڈے گٹوں میں یوں بیٹھے کہ اسے اچھے بُرے ادب کی تمیز کرنے کی ہوش ہی نہ رہی اور ابھی تک اس کا اپنا دماغ کام ہی نہیں کرتا وہ پٹری سے اتر کے ادیب یا دیباچہ نگار کے بتائے ہوئے رستوں پر اندھا دھند چلا جا رہا ہے اور کیا خبر یونہی اپنے آپ کہاں تک چلتا جائے گا۔

جب سے دنیا بنی ہے نت نئے نظریات سے واسطہ پڑتا ہے جو کبھی اونچی ہواؤں میں اڑتے اڑتے اچانک منہ کے بل آ گرے لیکن ان میں سے کاسہ لیسی کا نظریہ ایسا معلوم ہوتا ہے جس کی شان میں کبھی کمی نہیں آئی جیسے جیسے آثار قیامت قریب آتے جا رہے ہیں اس کا بول بالا ہو رہا ہے۔ اس نظریے کو جس نے بھی سینے سے لگایا ہے وہ اپنی اگلی پچھلی نسلیں سنوار گیا ہے۔ کئی ادیب اور دیباچہ نگار اس گر کو استعمال کر کے حاجی اور ملاں بن بیٹھے ہیں اور اندھے کی ریوڑیوں کی طرح گھوم پھر کر اپنوں کی جھولیاں ہی بھرتے رہتے ہیں اور اک دوسرے کو مکھن لگا

لگا کر یوں بانس پر چڑھ جاتے ہیں کہ پھر وہ من مرضی کی چوٹی سے نیچے اترنے کا نام ہی نہیں لیتا۔

جب نیا نیا کام تھا تو لکھاری ایک آدھ دیباچہ سے ہی سیر ہو جاتے تھے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ان کا ہاضمہ کافی تیز ہوتا گیا اور لکھاڑی نے یہی سمجھ لیا کہ اچھے خاصے دیباچے ہوں تو فوراً شہرت کی سیڑھی چڑھا جا سکتا ہے۔ خیر یہ عرب اور اونٹ والا قصہ بھول گئے ہیں۔ ابھی تو ہم دیکھ رہے ہیں کہ کتاب درمیان میں اٹکی ہوئی ہے اور آگے پیچھے پے در پے دیباچوں کا شکنجہ کسا ہوا ہوتا ہے اور کچھ ورق گردانی کرنے سے کتاب کا سرپیر مل جاتا ہے۔ آئندہ ایسا وقت آنے ہی والا ہے جب پہلی دفعہ کتاب کے متن جتنا رقبہ دیباچہ گھیرا کریں گے اور دوسرے تیسرے ایڈیشن میں صرف دیباچے اور تبصرے ہی چھپا کریں گے اور کتاب درمیان سے ایسے گول ہو جائے گی کہ اس کا بالکل ٹنا ہی نکل جائے گا۔

دور جانے کی ضرورت نہیں اب بھی کتاب بغیر دیباچے کے کوڑی کی نہیں ہوتی اور تو اور قاری کو اپنا بیڑہ غرق کرا کے بھی دیباچوں کی ایسی چاٹ لگی ہے کہ وہ کتاب پڑھنے کا تکلف ہی نہیں کرتا اور دیباچے میں سے منتخب جملوں کا رٹا لگا کر بعد میں وقت پڑنے پر اپنی علمی قابلیت کا ملبہ دوسروں پر پھینک دیتا ہے اسی لئے کتاب اب بغیر دیباچے کے چاہے کتنی ہی دلچسپ اور اعلیٰ وارفع ہو اس کی کوئی قدر نہیں ہوتی جن ادیبوں کو اپنے متعلق زیادہ خوش فہمی ہو خالی خالی کتاب چھاپ دیکھیں اگر ان کا دیوالیہ نہ پٹ جائے تو ہمیں قدموں میں بٹھا کر مو ماریں اور ایک گنیں اگر اُف بھی کر جائیں تو ہم جھوٹے۔

دیباچے لکھنے کی رسم تو بن گئی ہے لیکن موزوں اور اچھا دیباچہ لکھنا بھی ایک آرٹ ہے جس کا اپنا ہی ایک طریقہ اور رنگ ڈھنگ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس فن کے ماہر کاریگر تو پیدا ہو گئے ہیں پر وہ انگلیوں پر ہی گنے جا سکتے ہیں جنہوں نے کئی ٹکریں مار کر اور پاپڑ بیل کر اپنا مقام بنایا ہے۔

دیباچہ لکھنے والوں میں چاہے پگڑی شیرینی لے جا کر استادی شاگردی کا رواج نہیں لیکن پھر بھی ان غریبوں کا علیحدہ ٹولہ شاعروں اور افسانہ نگاروں کی طرح ہی بن جاتا ہے جو اک دوسرے کے دشمن بھی نہیں اور اپنے اپنے مقام پر کسی کونے میں بیٹھ کر دیباچے لکھنے کا دھندا ہی کر رہے ہیں۔ ان میں سے اکثر کے بڑے ٹھاٹ باٹھ ہیں جو ڈرائی کلین والوں کی شرطوں کی طرح گھنٹے دو گھنٹے سے لے کر ایک آدھ دن میں کئی دیباچے گھسیٹ کر رکھ دیتے ہیں جیسے سہرے، قصیدے، مرثیے، نظمیں اور غزلیں آرڈر پر یا ہنگامی حالتوں میں فوری سپلائی کرنے والے شاعر چپے چپے پر ملتے ہیں اور جیب گرم کرنے کے لئے اپنے پاس موجود تیار مال میں سے سہرے میں دولہے دولہن کا نام اور آخری شعر میں سہرا پیش کرنے والے کا نام ہی ٹانکنا باقی ہوتا ہے، ٹانک کر سائل کے حوالے کر دیتے ہیں۔ ایسے ہی کچھ گھاگ اور تجربہ کار دیباچہ نگار بھی ہر موضوع پر الگ الگ دیباچے لکھ چھوڑتے ہیں اور کسی وقت اپنا سٹاک ختم نہیں ہونے دیتے اور جب کوئی گاہک لگ جائے تو منٹوں میں ہر سائز اور ڈیزائن کے دیباچوں کا ڈھیر لگا دیتے ہیں اور یوں سبز باغ دکھا کر اپنی جیبیں بھرتے ہیں اور سائلوں کو مطمئن کر دیتے ہیں۔ ان سے بھی دو ہاتھ آگے وہ لکھاڑی ہیں جو کتاب لکھنے سے پہلے ہی دیباچہ لکھوا کر پلے باندھ لیتے ہیں۔

دیباچوں کی یوں تو بے شمار صورتیں ہیں جن میں سے اکثر ایک دوسرے کو مکھن لگانے والے ہوتے ہیں ان سب کی تفصیل بھی شیطان کی آنت کی مانند لمبی اور پیچیدہ ہے۔ قصہ مختصر یوں سمجھ لو کہ کبھی تو کتاب حجم اور موضوع دیکھ کر ہی دیباچے کے ذریعے سمندر کوزے میں

بند ہو جاتا ہے اور کبھی کتاب کے متن سے آٹھ گنا زیادہ دیباچہ لکھ کر بھی تسلی نہیں ہوتی۔ یہاں سے نتیجہ یہ نکلا کہ دیباچہ لکھاتے وقت کتاب گھر بھول جاؤ اس سے ذرا بھی فرق نہیں پڑتا بلکہ کتاب کے بغیر لکھے گئے دیباچوں کی زیادہ دھوم مچتی ہے اور سوچ سمجھ کر پڑھ پڑھا کر لکھے گئے دیباچوں کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی۔ اصل میں کامیاب دیباچہ وہی سمجھا جاتا ہے جس سے پڑھنے والے کا دماغ ہی چکرا جائے اور اس کے پلے بھی کچھ نہ پڑے۔ جب قاری کے پلے ہی کچھ نہ پڑے گا تو وہ اپنی ناسمجھی کو چھپانے کے لئے کتاب سے زیادہ دیباچے کی تعریف کیسے نہ کرے گا۔

کبھی تو وہ دیباچہ نگار شاذ و نادر ملتے تھے لیکن اب اینٹ اکھاڑیں تو سو سے کم نہیں نکلتے۔ اللہ کے کرم سے یہ بھی دکیلوں، سیاسی لیڈروں اور شاعروں کی طرح ترقی پذیر ہے اور وہ دن دور نہیں جب یہ کانوں پر قلم رکھ کر اور کنستر بجا بجا کر بستی بستی ''دیباچہ لکھا لو'' کی آوازیں لگاتے پھریں گے۔ جیسے سیاسی پابندیاں لگنے سے پیشہ ور مقرر زبان کی کھجلی دور کرنے کے لئے ادبی محاذ کی طرف منہ اٹھا کر آ جاتے ہیں جہاں جلد ہی ان پر آشکار ہو جاتا ہے کہ تخلیقی کام ان کے بس کا روگ نہیں۔ اس لئے دیباچے میں اِدھر اُدھر کی ہانک کر کچھ دھوم دھڑکا کر لیتے ہیں اور یوں لہو لگا کر شہیدوں میں ملنے کی کوشش کرتے ہیں اور کئی دفعہ اپنے تئیں بمباٹ دیباچے لکھ کر اچھی بھلی کتابیں ضبط کرا کے ادبی محاذ پر زلزلہ برپا کر دیتے ہیں کہتے ہیں کہ چور چوری سے جائے ہیرا پھیری سے نہ جائے اور جس کے منہ کو ادبی چاٹ کا خون لگ جائے اسے پھر سیاسی کڑک چائے اور شربت کا مزہ آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیا خبر اسی لئے یا کسی اور وجہ سے اچھے لکھاریوں کی نظریں سیاسی ادیبوں پر نہیں ٹکتیں۔ دوسری باتوں پر مٹی ڈال کر اندر کی بات کی طرف آئیں تو پتہ چلتا ہے کہ کچھ لکھاری دیباچے کو بھی سلامی اور لین دین کی رسم سمجھتے ہیں اور باری باری ایک دوسرے کی کتاب کا بہترین اور دلچسپ دیباچہ لکھ کر بدلہ اتار لیتے ہیں۔ کئی بار تو وٹے سٹے کے رشتے کی طرح ایک وقت میں ہی دونوں دیباچے تیار ہو جاتے ہیں۔

آپ کو علم ہے کہ ادب کے میدان میں نفسا نفسی کا عالم ہوتا تھا یا یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ یہ مُردوں کی منڈی ہوتی ہے جہاں ادیبوں کی چلتی پھرتی نیم مُردہ لاشیں نیلام ہوتی ہیں اور یہ گرتے پڑتے روتے بسورتے چائے پانی چلانے کے لئے چیختے چلاتے پھرتے ہیں۔ جب خرچے سے بالکل مجبور ہوں تو اپنے مطلب کا شکار ہو کر کسی نو دولتیے کو علم و ادب کی چاٹ لگا کر اپنا اُلو سیدھا کرنے کے لئے اس اَن پڑھ کے نام کے ساتھ دیباچہ ٹانک دیتے ہیں۔ یوں بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ کئی لکھاری خود ہی دیباچہ لکھ کر کسی شہرت یافتہ دیباچہ نگار یا کسی نمایاں یار دوست کے نام اپنے پاس سے ہی جڑ دیتے ہیں پھر بھی کبھار منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے دیباچے لکھ لکھا کر پڑھے لکھے ''اَن پڑ'' افسروں کے دستخطوں کے ساتھ بھی چھپوائے جاتے ہیں۔ مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ ایسے ان کا ماتحت عملہ اور سائل اپنے کام نکلوانے کے لئے کچھ کتابیں تو خریدیں گے جو ادیب کی اضافی بچت ہی بچت ہوگی ورنہ تو اکثر کتابیں مفت کھاتے میں ہی چلی جاتی ہیں۔ اسی کے ساتھ ملتے جلتے معاملے کا ایک مشہور واقعہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ ایک مشہور ادیب کو اس کا ایک لنگوٹیا یار پندرہ بیس سال بعد ملنے آیا۔ گرم جوشی سے گلے ملنے کے بعد اس نے اس کی خاطر خدمت یہ کی کہ خوشی خوشی لکڑی کے صندوق میں سے مسودے نکال نکال کر میز پر ڈھیر لگا دیا۔ دوست نے پوچھا کوئی مسودہ بکا نہیں، منہ بسور کر بولا۔ ''مسودہ تو نہیں البتہ ہینگر پر لٹکے ہوئے جس فرکوٹ کی تعریف تم کیا کرتے تھے وہ بھی اپنے پیٹ کی

آگ بجھانے کے لئے اور خاندان کا ایک آدھ دن گزارا چلانے کے لئے بیچ دیا ہے اور اب پیٹ پوجا چھوڑ کر بالکل ہی پھانک ہو گیا ہوں اور کاغذ پنسل بھی ادھار کھاتے نہیں ملتے۔

یہ سن کر یار کا جسم سن ہو گیا اور اس نے ماتھے سے پسینہ پونچھا اور آہ بھر کے بولا۔ احمق اسی میز کرسی کے ساتھ بمبئی کی مرہم کی طرح چمٹ گیا ہے، باہر کی ہوا لے کسی افسر کی شان میں قصیدہ لکھ۔ کسی نامی گرامی لیڈر کا دامن پکڑ کچھ رسائل واخبارات کے مدیروں سے یاری لگا اور پھر چل کر کسی نئے فوت شدہ رئیس کے بیٹے سے دیباچے کے چار لفظ لکھوا کر دستخطوں کی چڑیا بٹھا چاہے پورا انگوٹھا لگوا اور پھر خدا کی بخشش کے نت نئے رنگ دیکھ۔ اس نے اس ہدایت پر عمل کیا پھر جیسے بھلے وقتوں میں جھوٹے کے سر پر جوتے پڑتے تھے اس کی جیب میں روپے پڑنے لگے۔ لہٰذا اب نئے لکھاریوں کو اپنی قدر و قیمت بنانے کے لئے کسی وڈیرے کا پلہ پکڑنا پڑے گا یا کسی نہ کسی افسر کے آگے پیچھے ہونا پڑے گا اور نئے اور مسکین ادیبوں کو یہ کام کی بات پلے باندھ لینی چاہئے کہ انہیں کسی گھاگ اور چلتے پھرتے دیباچہ نگار کے گھر ہی چھاؤنی ڈال کر اس کا دُم چھلا بن کر ہی دیباچے لکھوانے پڑا کریں گے۔

ان دھوبی گھاٹ کے علاوہ سب گھاٹوں کا پانی پینے والے دیباچہ نگاروں سے لکھوانے کا فائدہ یہ ہو گا کہ اس مستند دیباچے کے پہلے پھڑکتے ہوئے فقرے کے ساتھ ہی کتاب لائبریریوں اور کالجوں کے لئے منظور ہو کر بک سٹالوں سے آگے بڑھ کر فٹ پاتھوں پر بھی عام فروخت ہونے لگے گی۔ کئی دفعہ ایسی شہرت عام والی کتابیں کئی اداروں اور محکموں کی طرف سے انعام کی حقدار بھی ہو جاتی ہیں ویسے سینہ گزٹ کی اطلاع کے مطابق انعام دیتے وقت کتاب کے موضوع سے بڑھ کر گروہ بندی اور یاری دوستی نبھانے کے لئے اندرونِ خانہ میل ملاپ کر کے اپنے بنائے ہوئے دوست ادیبوں کے گلے میں ہی ہار پڑنے لگتے ہیں اور یوں غیر مستحق کے لئے بھی حق حق کے نعرے لگنے لگ جاتے ہیں۔ آج کے دور میں ایسے پاپڑ بیلنے بڑے ضروری ہیں۔ خیر یہ تو باتوں میں سے بات نکل آئی ہے ویسے تو اپنی جگہ پر آپ بھی دانا و بینا ہیں سوچ کر بتائیں کہ یہ کوئی تک ہے کہ ایک تو لکھاری بھی اناڑی ہو اوپر سے دیباچہ نگار بھی ماٹھا ہی ملے تو بات کیا بنی یہ تو تیلی سے شادی کر کے بھی روکھی سوکھی کھانے والی بات ہے۔

اردگرد کے ان حالات کو سامنے رکھتے ہوئے ہمارے سکہ بند دیباچہ نگاروں کو بھی چاہئے کہ وہ خود ہی فراخ دلی کا ثبوت دیتے ہوئے چھوٹے لکھاریوں کو اجازت دے دیں کہ خود ہی ان ادیبوں کے نام سے کچھ سوچی کی طرح لفظوں کے ٹانکوں کی چار سطریں ٹانک کر اپنی ضرورت کا قالب چڑھا کر ہی پوری کر لیا کریں۔ اگر یوں نہ کریں تو بیچارے یہ لکھاری نہ گھر کے رہیں نہ باہر کے۔ دوسری طرف کوئی اچھا خاصا مشہور و معروف لکھاری کسی گئے گزرے اور ناکارہ سے بھی دیباچے کے چار لفظ ڈلوا لے تو وہ اس ننھے دیباچے کے ذریعے علم و ادب میں زندہ رہتا ہے۔ اگر اس کا نمونہ دیکھنا ہو تو کئی ادبی کتابیں ملیں گی جن میں اکیلے دیباچے نے ہی بھائی صاحب کو سرخاب کا پر لگا دیا ہو گا لکھاریوں کو تو قسمت سے ہی کچھ ملتا ہے اکثر اوقات دیباچہ نگار ہی فائدے میں رہتے ہیں۔

آپ کے مشاہدے میں کئی بار آیا ہو گا کہ کچہری میں مقدمے باز گھر بار بیچ کر اندھے انصاف کے ہاتھوں یا اپنی چالاکی ہوشیاری کی بناء پر جیتا ہوا مقدمہ بھی ہار جاتے ہیں اور برادری رشتہ داروں میں ناک الگ کٹوا لیتے ہیں لیکن کتابوں کے مقدمے بازوں کا دستور نرالا ہی ہے انہوں نے کبھی ہار کا منہ دیکھا ہی نہیں، کچھ بڑبولے تو جو منہ میں آئے لکھنے کا سامان کرتے ہیں لیکن جو زیادہ چالاک ہوتے ہیں وہ چپ چاپ دیباچے میں کوئی ہوائی

بھی چھوڑ جاتے ہیں اور باتوں باتوں میں اپنی بھی شان گھٹا لیتے ہیں جیسے نامی گرامی پہلوان اگر گٹے گوڈوں سے رہ جائیں تو پھر اپنا ٹھرک پورا کرنے کے لئے خلیفے بن کے اکھاڑے سے باہر بیٹھ کر داؤ پیچ سکھانے کے ہو رہتے ہیں۔ ایسے ہی جب اچھے بھلے ادیبوں کا خیالی خزانہ ختم ہو جائے تو وہ استادی طریقے سے پینترا بدل کر دیباچہ نگار بن جاتے ہیں۔ ان پرانے پاپیوں نے ایک اور فریب بھی جاری کیا ہوتا ہے کہ یہ خود ہی چل پھر کے یا پھر شاگردوں کو ذلیل و خوار کرا کے پرانے کرم خوردہ نسخوں کو ڈھونڈ کر یا مشہور ادیبوں اور مرحوم عالموں کی کتابوں کا سراغ لگا کر چھوٹے موٹے الٹے سیدھے دیباچے ٹانک دیتے ہیں اور پھر ہولے ہولے علم و فضل کا تاج سر پر لگا کر مفت کی واہ واہ کرا لیتے ہیں کئی بار مذاق مذاق میں اگر تکا لگ جائے تو دیکھتے دیکھتے کئی پی ایچ ڈی بھی ہو جاتے ہیں اور کئی ان پڑھ ٹائپ بیٹھے بٹھائے جوڑ توڑ کر کے بروقت ایسا دھکا لگا کر یونیورسٹی میں گھستے ہیں کہ پھر جب تک انہیں اعزازی ڈاکٹریٹ کا دُم چھلا نہ لگ جائے وہ باہر نکلنے کا نام ہی نہیں لیتے۔

آپ شاید اس سچ مچ کی بات کو بھی پھبتی اور مذاق سمجھیں کہ کئی دیباچہ نگار بھولے بھالے ادیبوں سے چار پیسے بھی نکلوا لیتے ہیں اگر دیباچہ مفت لکھنا پڑ جائے تو بالکل ہی جی چھوڑ بیٹھتے ہیں اور دیباچہ پس پشت ڈال کر وعدے پر وعدہ کر کے چکر پہ چکر لگواتے ہیں اور اگر ادیب کی کوئی نیکی کام آ جائے تو پھر وہ دیباچے کا منہ بھی دیکھ لیتا ہے ورنہ کئی بار تو اصل مسودے سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا ہے جسے دیباچہ نگار اپنی لاپروائی اور مبارک ہاتھوں سے گم کر کے ادیب کو بڑے آرام سے کہتا ہے۔ ”آپ کے پہلے مسودے کو میری ہی نظر لگ گئی ہے اور لکھ لائیں گھبرانے اور دل چھوٹا کرنے کی ضرورت نہیں۔ اللہ جو کرتا ہے بہتر ہی کرتا ہے، اس میں بھی اس کی کوئی حکمت معلوم ہوتی ہے اور آپ کو پتہ ہی ہے کہ نقشِ ثانی نقش اوّل سے تو بہتر ہی ہوتا ہے“۔ ایسے دردناک صدمے سہہ کر بھی ادیب دیباچوں کا ٹھرک پورا کرنے سے باز نہیں آتے پر کیا کیا جائے اگر کچھ لکھاری دیباچے کے فیشن والے پھڈے سے بچنے کی کوشش بھی کریں تو مارکیٹ میں ان کی دال نہیں گلتی۔

اسی طرح لکھاریوں کی ایک مجبوری اور بھی ہے جیسے کئی بار ادیب نمایاں دیباچہ نگاروں کے پیچھے جوتے گھسا دیتے ہیں ایسے ہی کچھ گھٹیا دیباچہ نگار بھی نئی کتابوں کی سن گن رکھتے ہیں اور اس کا پتہ چلتے ہی آندھی اور طوفان کی طرح مصنف کے پاس پہنچ کر دیباچہ لکھنے کی ضد کرتے ہیں۔ ایسے لیچڑ دیباچہ نگار محض دردِ سر اور مصیبت ہوتے ہیں اگر یہ گلے پڑ جائیں تو یا تو ان کو اسی وقت کورا جواب دے دیں کہ سخی سے کنجوس اچھا ہوتا ہے جو کورا جواب دیتا ہے اور اگر یہ نہیں کر سکتے تو پھر اسی وقت دوسرا نسخہ استعمال کریں کہ بھائی صاحب آپ بڑی محبت اور چاہت سے فقیر کے گھر میں بادشاہ بن کر آئے ہیں آپ کی شفقت اور الفت کا مجھے بڑا احساس ہے لیکن میرا ہاتھ کچھ تو پہلے ہی تنگ تھا کچھ اس کتاب نے مقروض کر دیا ہے، آپ تھوڑا سا ہاتھ بٹائیں اور دیباچے کے لئے دو رم کاغذ اپنی جیب سے لے آئیں اور اگر وہ ذمہ داری لے لیں تو پھر پو بارہ ورنہ شرمسار بھی وہی ہوں گے۔

دیباچہ نگاروں سے جان چھڑانا بڑا مشکل کام ہے۔ یہ کمبل بھلا چھوڑتے ہیں ایک تو مفت کی چودھراہٹ دوسرے کئی دیباچہ نگاروں نے دیباچے لکھ لکھ کر ہی اچھی خاصی قیمتی ذاتی لائبریریاں بنا لی ہیں۔ ناشروں کو جب اس خفیہ کمائی کا علم ہوا تو انہوں نے بہت دانت پیسے اور پیٹ میں مروڑ اٹھنے لگے اور پھر دیباچہ نگاروں کی کاپیاں بجانے کے لئے خود ہی دھڑا دھڑ کتابوں میں اوٹ پٹانگ جملوں کے ذریعے دیباچوں کو

منہ مارنا شروع کر دیا۔ کہتے ہیں جس کا کام اس کو ساجھے۔ کئی بار کتاب میں مضمون اور ہوتا ہے اور دیباچہ کسی اور طرف چلا جاتا ہے لیکن لوگوں کو ان باتوں سے کیا واسطہ وہ تو الٹا ایک ٹکٹ میں دو مزے لے لیتے ہیں۔

جب کوئی مائی کا لال حق سچ کی بات کر کے دیباچہ میں سے کھرا کھوٹا الگ کرنے لگے، اس کا دیباچہ ہی اشاعت کے وقت کتاب میں سے گول ہو جاتا ہے اور آئندہ کا سلسلہ بھی ختم ہو جاتا ہے اور اس لئے دیباچہ نگار کی دکانداری سیدھی سادی تعریف کے ساتھ ہی چلتی ہے۔ اگر کوئی شامت کا مارا سیدھا سادہ احمق اور گاؤدی ادیب ان کے ہتھے چڑھ جائے تو اسے اندرونی مار دینے سے باز نہیں آتے اور حسد کے مارے بیچارے کے کئے کرائے پر پانی پھیر دیتے ہیں۔ چاہے اس کی کتاب موضوع اور سواد کے اعتبار سے کتنی ہی اعلیٰ معقول اور مبنی برحقیقت ہو یہ جاتے ہوئے جن کی طرح نشانی دے کر دوسرے کی دیوار گرا کے جان چھوڑتے ہیں۔

ہم دوسری زبانوں کے کوئی ٹھیکیدار نہیں ہمیں تو آجا کر اپنے گلی محلے کے ادب کی فکر ہے یہاں بھی ڈھیرے ڈھیرے دیباچہ نگار پنجابی ادیبوں کے خون سے ہولی کھیل رہے ہیں اور خواہ مخواہ پنجابی ادیبوں کو بدنام کرنے کے لئے ان کا تعلق واسطہ یورپ کے ادب سے قائم کر رہے ہیں۔ یوں دوسروں سے مستعار خیالات کو بڑی اہمیت دینے لگ گئے ہیں۔ ہر نئی کتاب کے نصف درجن سے پورے درجن دیباچوں میں سے ایک دو دیباچے یہ بات ثابت کرتے ہیں کہ یہ ادیب انگلستان، فرانس، امریکہ اور روس کے فلاں اعلیٰ لکھاری سے میل ملاپ رکھنے والا لگتا ہے اور ان کے خیالات کو ہاتھ کی صفائی کے ساتھ ڈنڈی مار کر اور دھو دھلا کر اپنا رندہ پھیر کر صاف ستھری شکل میں پیش کر سکتا ہے۔ یہ پڑھ کر لکھاری بہت خوش ہوتے ہیں کہ ہم بین الاقوامی سطح پر سوچتے ہیں لیکن ان کو یہ پتا نہیں چلتا کہ اندر سے یار لوگوں نے بڑے خوبصورت طریقے سے ان کا پتّا ہی صاف کر دیا ہے۔

غلامی کا یہ مہلک احساس نہ جانے کب ختم ہوگا، نئی نسل کو اگر کبھی پڑھنے کی توفیق ملے اور دیکھے کہ پنجابی کے پرانے لکھاری بغیر لگی لپٹی کے بہت رواں اور شستہ لکھتے تھے قاری کو دیباچے والی جگہ اللہ رسولؐ اور صحابہ کرام کی مدح اور حمد نعت ملتی تھی یوں کتاب کا پڑھنا علم سے بڑھ کر ثواب کا کام بھی ہو جاتا تھا۔ یعنی آم کے آم اور گٹھلیوں کے دام۔ ایسی کتابوں کو ہر عمر اور عقیدے کے لوگ پڑھ سکتے تھے۔ پنجابی گھبرو جوان، دوشیزائیں اور عورتیں ان کو چومتے اور آنکھوں سے لگاتے تھے اور ان کے بول بڑے پیار سے گاتے اور میٹھی میٹھی سُروں کے ساتھ الاپتے پھرتے لیکن اب نئی روشنی کے طفیل آوے کا آوا ہی بگڑ گیا ہے لیکن ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا جو تھوک کے حساب سے دیباچے لکھے گئے ہیں انہیں گلے پڑا ڈھول سمجھ کر بجائیں لیکن آئندہ ہوش کی دوا لیں اور کتابوں میں سے دیباچوں کو آہستہ آہستہ کم کر کے پہلی سطح پر لائیں اور بڑا نقصان نہ کریں۔

ہم دیباچوں کو بالکل ختم کرنے کے حق میں بھی نہیں اگر کسی کا بازو شکنجے میں کسا ہوا ہو، جان عذاب میں پھنسی ہو یا کسی کو مکھن لگانے کا چارہ کرنا ہو تو بے شک ایک آدھ ٹوٹا پھوٹا دیباچہ لکھوا لے کیونکہ کچھ مفتیوں نے بھی بعض حالتوں میں شراب اور سوّر جائز کئے ہوئے ہیں لیکن ہم یہ نہیں چاہتے کہ دیباچے بھی افیم چرس کی طرح چٹ ہی جائیں کیونکہ یہ بھی ایک سوچی سمجھی اور بنی بنائی سکیم کے تحت کی گئی سازش ہے لہٰذا تھوک دیباچوں کا انسداد کریں ورنہ یاد رکھیں کہ ان کے ہاتھوں ادیبوں کی دین دنیا خطرے میں پڑنے کا زبردست خدشہ ہے جس سے ان کا دانہ پانی ختم ہو جائے گا۔

پنجاب پر سکھوں کا قبضہ کیسے ہوا؟ مغلیہ سلطنت کیسے برباد ہوئی؟

مغلانی بیگم

رفیق ڈوگر قسط: 6

وسیع و عریض حویلی میں چھڑکاؤ ہو چکا تو کنیزوں نے صحن میں غالیچوں کا فرش بنا کر اس پر تخت پوش جما دیا بلند مکانوں کے سائے دھوپ کے تعاقب میں کافی دور نکل گئے تھے۔ تخت پوش پر ریشمی قالین بچھا کر مخمل کے گاؤ تکیے سجائے تو معلوم ہوتا تھا ابھی کوئی پری اڑتی ہوئی آئے گی اور اس تخت پر بیٹھ کر اسے اڑا لے جائے گی۔ گل بنفشہ نے گہری نگاہ سے جائزہ لیا اور ہلکی سی مسکراہٹ سے اردگرد کھڑی کنیزوں کو ان کی سلیقہ شعاری کی داد دی کنیزیں خوش ہو گئیں۔

''پنکھا ہلانے والیوں کو حاضر کرو، بیگم عالیہ کی نمود کا وقت ہو رہا ہے''۔ اس نے ایک ادھیڑ عمر موٹی کنیز سے کہا۔

وہ جلدی سے مڑی اور تیز تیز قدموں سے ایک طرف کو چلی گئی۔

مردانہ کی طرف سے میاں خوش فہم نمودار ہوا اور کنیزوں کو دیکھ کر رک گیا۔

''تشریف لائیں میاں صاحب آپ تو ایسے رک گئے جیسے اجنبی ہوتے ہوں''۔ گل بنفشہ نے دیکھ کر کہا۔

''دیکھنے آیا تھا بیگم حضور کا نمود ہو چکا بچیاں جمع تھیں رکنا لازم ہو گیا''۔ خوش فہم نے جواب دیا۔

''خدا کرم کرے میاں کس بدنصیب کی شکایت درپیش ہے؟'' گل بنفشہ نے بوڑھے خواجہ سرا کو تنگ کرنے کو کہا۔

کنیزیں میاں خوش فہم پر چوٹ سے خوش ہو گئیں۔

''پرانا بدنصیب حاضر ہے حکم ہو تو اس کا شکوہ حضور کو پیش کر دوں؟'' خوش فہم نے جوابی وار کیا۔

گل بنفشہ چوٹ سمجھ گئی تھی مگر کنیزوں کی موجودگی میں بات بڑھانے کا موقعہ نہیں دینا چاہتی تھی۔ ''بیگم حضور نمود فرمانے والی ہیں ہم آپ کو اطلاع کروا دیں گے؟''

''مناسب نہ ہو گا بدنصیب کا شکوہ حضور ہی سن لیں۔ بیگم عالیہ کے حضور پہنچا تو خدانخواستہ وہ سزا ہی نہ سنا دیں۔ شکوہ کافی بجا معلوم ہوتا ہے''۔ خوش فہم گل بنفشہ کی چال سمجھ گیا۔

گل بنفشہ جواب دینے کی بجائے گھوم کر ایوان کی طرف چل دی اسی وقت موٹی سیاہ کنیز پنکھا ہلانے والیوں کے ساتھ واپس آ گئی، میاں خوش فہم مڑے اور مردانہ کی طرف چلے گئے۔

پنکھا ہلانے والیاں تخت کے عقب میں کھڑی ہو گئیں۔

دیوان کی طرف سے بیگم کے نمود کی آواز سن کر سب کنیزیں سامنے قطار میں کھڑی ہو گئیں اور جیسے ہی مغلانی بیگم قریب آئی سب نے ادب سے سر جھکا دیئے بیگم نہایت وقار سے چلتی ہوئی تخت پوش تک آئی اور چوکی پر پاؤں لٹکا کر نشست پر بیٹھ گئی کنیزیں پنکھے ہلانے لگیں۔

بیگم نے سرسری سا جائزہ لیا اور سامنے کی دیوار پر بیٹھے چڑیوں کے جوڑے کو دیکھنے لگی کوؤں کی ڈار اوپر سے کائیں کائیں کرتی گزری تو چڑیاں اڑ گئیں۔

''میاں خوش فہم کوئی عرض پیش کرنا چاہتے ہیں اجازت ہو تو اطلاع کروا دیں''۔ گل بنفشہ نے عرض کیا۔

''میاں خوش فہم کے بعد ہم شہباز کی حاضری ضروری سمجھتے ہیں''۔ بیگم نے ایسے انداز میں کہا جیسے اس ماحول سے بے تعلق ہو۔

گل بنفشہ نے اشارہ کیا، موٹی سیاہ کنیز مڑی اور اپنا جسمانی بوجھ گھسیٹتی مردانہ کی طرف چلی گئی۔

مغلانی بیگم پھر اس دیوار کی طرف دیکھنے لگی جہاں سے چڑیوں کا جوڑا اڑ گیا تھا۔

میاں خوش فہم نے رکوع سے سر اٹھایا تو اسے احساس ہوا کہ کنیزیں اس کے انداز پر معنی خیز نظروں سے

ایک دوسری کی طرف دیکھ رہی ہیں۔
''ہم سمجھتے ہیں تمہارے پاس کوئی عرض ہے؟'' بیگم نے پوچھا۔
''طہماس خاں کی حاضری کی عرض ہے حضور!'' خوش فہم نے جواب دیا۔
مغلانی بیگم نے جواب دینے کی بجائے موٹی سیاہ کنیز کی طرف دیکھا تو اس نے آگے بڑھ کر دستی پنکھا ان کے پاس رکھ دیا اور سب کنیزیں منتشر ہو گئیں۔
''طہماس خاں پر اعتماد غلطی ہو گی اور یہ شبہ کہ اس حویلی کے باسی اس پر اعتماد نہیں کرتے عظیم تر غلطی سمجھی جائے گی''۔ بیگم نے میاں خوش فہم کو خبردار کیا۔
''حضور کے خادموں سے کبھی ایسی غلطی سرزد نہ ہو گی''۔ میاں خوش فہم نے یقین دلایا۔
''طہماس سے پہلے ہم شہباز کی حاضر چاہتے ہیں''۔ بیگم نے حکم دیا۔
''شہباز حاضر ہے''۔ میاں خوش فہم آداب بجالایا اور مردانہ کی طرف چلا گیا۔
بیگم نے مڑ کر اردگرد کا جائزہ لیا کہ کسی دیوار نے اس کی طرف کان تو نہیں لگا رکھے۔
''طہماس خاں کہاں تک کارآمد رہا؟'' بیگم نے مڑ کر دیکھا تو شہباز سامنے کھڑا تھا۔
''شہر اور قلعہ کی کچھ خبریں لایا ہے''۔ اس نے بتایا۔
''ہم جاننا چاہیں گے کیا خبریں''۔
''وہ خود حاضر ہو کر پیش کرنا چاہتا ہے''۔
''ہم چاہتے ہیں تم اس سے ایسی دوستی ظاہر کرو کہ وہ تمہیں وہ خبریں بھی بتا دے جو ہمیں نہ پیش کر سکے''۔ بیگم نے ہدایت کی۔
''خادم پوری کوشش کرے گا''۔ شہباز خاں نے سر جھکا دیا۔
''لازم نہیں اس کی سب خبریں درست ہوں مگر اسے یہ کبھی شبہ نہ ہو کہ تم اس کو سچا اور مخلص نہیں سمجھتے''۔
''بہت بہتر حضور!''
''خواجہ عبداللہ خان کی مرضی کے بغیر وہ اس حویلی میں داخل نہیں ہو سکتا اور خواجہ بلاسبب اسے اجازت نہیں دے سکتا''۔ بیگم نے اسے سمجھایا۔
''حضور کا فرمان ہمیشہ کی طرح اس غلام کے لئے راہنما ہے''۔ شہباز خان نے کہا۔
''اس سے دوستی کرو اور ظاہر کرو کہ ہم اس سے اسی طرح محبت کرتے ہیں جس طرح ان سب بچوں سے جو ہمارے محل میں پرورش پاتے ہیں''۔
''بہت بہتر حضور''۔
''اس کو پیش کرو اور ہمارے حکم کا انتظار کرو''۔
شہباز خاں آداب عرض کر کے مردانہ کی طرف مڑ گیا۔
مغلانی بیگم سنبھل کر بیٹھ گئی۔
طہماس خاں داخل ہوتے ہی رکوع میں چلا گیا وہ خاموش بیٹھی دیکھتی رہی وہ اٹھا اور تخت پوش کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔
''ہمیں بتایا گیا ہے کہ تمہیں کچھ عرض کرنا ہے''۔ بیگم نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔
''حضور! ایک ہی عرض ہے کہ بندہ کی جان اور آن حاضر ہیں۔ حکم دیں کہ انہیں حضور کی آن پر نثار کر کے حق نمک ادا کروں''۔ وہ آہیں بھرنے لگا۔
''تمہاری جان ہم سلامت دیکھنا چاہتے ہیں، وقت ضرورت ضرور حکم دیں گے، ہمیں خوشی ہے کہ میر منو مغفور کے خادم ان کے کرم کو نہیں بھولے''۔ بیگم نے کہا۔
''خاکسار حضور کا غلام ہے اس کا دین اور دنیا حضور ہی ہیں''۔ وہ آہیں بھر رہا تھا۔
''ہم تم سے خوش ہیں اور خوش دیکھنا چاہتے ہیں اگر

وقت جلد کروٹ نہ لیتا تو ہم تمہاری اور شہباز کی شادیوں سے فارغ ہونا چاہتے تھے تمہارے لئے ہم نے گل بنفشہ کا انتخاب کیا ہے، ہمیں یقین ہے کہ تم ہمارے فیصلہ پر خوش ہو گے''۔

''غلام کے لئے باپ بھی حضور ہیں اور ماں بھی حضور ہی، حضور نے جس شفقت سے غلام کی پرورش کی حقیقی ماں باپ بھی نہ کر سکتے۔ حضور کا فیصلہ خاکسار پر کرم ہے''۔ طہماس خاں کا دل خوشی سے بلیوں اچھلنے لگا مگر وہ اس کا اظہار نہیں کر سکتا تھا۔

''ہم گل بنفشہ کی بھی رضامندی چاہیں گے، ہم خوش ہیں تم نے ہمارا فیصلہ قبول کیا اور امید کرتے ہیں کہ گل بنفشہ بھی ہماری خوشی کے لئے ہمارا فیصلہ قبول کر لے گی، ہم جلد اپنے بچوں کے فرض سے فارغ ہونا چاہتے ہیں''۔

''حضور کے اس کرم کا اس نوازش کا غلام شکر کیونکر ادا کر سکے گا''۔

''نوازش نہیں، یہ ہم پر فرض ہے کہ اس گھر کے بچوں کے حال اور مستقبل کا خیال کریں''۔

''غلام ایک خبر پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہے''۔ طہماس خاں نے موضوع بدلنے کو کہا تا کہ وہ اپنی اندرونی خوشی پر قابو رکھ سکے اور مغلانی بیگم کو خوش کر سکے۔

''خبر کے لئے تمہیں کبھی اجازت کی ضرورت نہیں رہی''۔

''بھوانی داس لاہور سے بھاگنے میں کامیاب ہو گیا ہے غدار عبداللہ خاں نے اس سے روپیہ حاصل کرنے کے لئے اسے بھی بہت تنگ کیا تھا، وہ وعدے کرتا رہا کہ نواب آدینہ بیگ جلد رقم بھیج دیں گے اور پھر بال بچے لاہور ہی میں چھوڑ کر جالندھر بھاگ جانے میں کامیاب ہو گیا''۔

''نواب عبداللہ خان کا ظلم اتنا کمزور ہو گیا کہ بھوانی داس لاہور سے باہر نکل جائے؟'' مغلانی بیگم نے حیرانی ظاہر کی۔

''لوگ کہتے ہیں اس نے فقیر کا بھیس بدلا اور نکل جانے میں کامیاب ہو گیا''۔ طہماس خاں نے خوشی کا اظہار کیا۔

''کسی کے تعاون کے بغیر اس کا باہر نکلنا دشوار ہوتا''۔ مغلانی بیگم اہلِ شہر کے بارے میں جاننا چاہتی تھی۔

''اہل شہر نمک حرام عبداللہ خاں کے سوا ہر کسی سے تعاون کر رہے ہیں، کسی نے شاہی مسجد کے دروازے پر لکھ کر لگا دیا ''راج خواجہ عبداللہ چکی پچی نہ چلہا'' تمام حکام اسے تلاش کرتے رہے مگر وہ ابھی تک مل نہیں سکا جو کوئی سنتا ہے پرچہ پر لکھ کر قریبی دیوار پر لگا دیتا ہے ''راج خواجہ عبداللہ چکی پچی نہ چلہا''۔

''ہم سنتے ہیں سرفراز خان اور نادر بیگ جیل میں بند ہیں''۔ مغلانی بیگم نے نوشتہ دیوار پر کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔

''جس کسی نے حضور کو بتایا غلط، حضور کے دونوں جاں نثاران کے ہاتھ نہ آ سکے، کوششیں جاری ہیں مگر شاید وہ بھی کہیں دور چلے گئے ہیں''۔

''ہماری خواہش ہے جب تک ہم خود اعلان نہ کریں کسی دیوار تک کو گل بنفشہ سے تمہاری نسبت کا علم نہ ہونا چاہئے۔ حویلی میں بعض مفسد موجود ہیں''۔ مغلانی بیگم نے موضوع بدل دیا۔

''حضور کا غلام جان دے سکتا ہے ایسی غلطی نہیں کر سکتا''۔ طہماس خاں مجرا ادا کر کے مردانہ کی طرف جانے کو مڑ گیا۔

وہ مغلانی بیگم کا ہر اشارہ اچھی طرح سمجھتا تھا۔

اس کا دل چاہتا تھا کہ زنانہ اور مردانہ حصوں کے درمیان کا راستہ کبھی ختم نہ ہو۔ اسے کبھی گمان تک نہ گزرا

تھا کہ مغلانی بیگم خود گل بنفشہ سے اس کی شادی کا فیصلہ کر سکتی ہے۔ ترقی اور گل بنفشہ سے شادی اس کے دو ایسے خواب تھے جن کی تعبیر کے لئے وہ بڑی سے بڑی قربانی دینے کو تیار تھا۔ کوئی بھی قربانی دے سکتا تھا، کشمیری حُسن کا نادر شاہکار گل بنفشہ بھی بیگم کے محل میں پل کر جوان ہوئی تھی مگر بچپن کی حدود پھلانگتے ہی اس نے طہماس خاں سے نفرت کرنا شروع کر دی تھی اور اس اظہار کا کوئی موقع ضائع نہیں ہونے دیتی تھی۔ گل بنفشہ صحیح معنوں میں مغلانی بیگم پر جان قربان کرنے تک کے لئے تیار رہتی تھی۔ طہماس خاں کے ایسے وعدے اور عہد بیگم کو دھوکہ دینے کے لئے ہوتے تھے، بیگم اس فرق کو بخوبی سمجھتی تھی۔ طہماس خاں کے لئے اب فیصلہ کرنا دشواری ہو گیا تھا کہ دل کا ساتھ دے یا دنیا حاصل کرنے کے لئے دل کی خواہشات کو قربان کر دے۔ دل کی خواہش مغلانی بیگم سے پُرخلوص تعاون سے پوری ہو سکتی تھیں اور دنیاوی عروج خواجہ عبداللہ خان سے وفاداری سے حاصل ہو سکتا تھا۔ اسی کشمکش میں وہ سر جھکائے مردانہ کی طرف چلا جا رہا تھا کہ سامنے شہباز کھڑا مل گیا۔ ''اندھیرا گہرا ہو رہا ہے مناسب نہ ہوگا رات ادھر ہی رہ جاؤ؟'' اس نے تجویز پیش کی۔

شہباز کے سوال پر اس کی سوچ کا دھاگا ٹوٹ گیا، اس نے جلدی سے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھنے کی کوشش کی مگر اس کی آنکھیں شہباز کی آنکھوں کا سامنا کرنے سے کترا رہی تھیں۔ ''آپ کا حکم ہو تو بندہ ہمیشہ ادھر ہی رہ جانے پر خوشی محسوس کرے گا''۔ اس نے کہا اور آگے بڑھ گیا۔ شہباز اس کے رویہ میں تبدیلی سمجھ نہ سکا، ایسی کیا بات ہوئی کہ طہماس خاں آنکھ ملانے سے کترا رہا ہے اور بات کرتے ہوئے گھبرا رہا ہے۔

شہباز نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا تو اس کی گردن آگے کو اتنی جھکی تھی کہ سر نابود ہو گیا تھا۔

طہماس خاں کے لئے فیصلہ کرنا بہت دشوار ہو رہا تھا کیونکہ وہ کسی سے مشورہ بھی نہیں کر سکتا تھا جو بھی فیصلہ اسے کرنا تھا خود ہی کرنا تھا، اپنے آپ سے ہی مشورہ کر سکتا تھا اس لئے یہ زندگی کا مشکل ترین مرحلہ تھا۔

بھوانی داس کا فرار معمولی واقعہ نہ تھا، وہ نواب آدینہ بیگ کا خاص نمائندہ تھا۔ آدینہ بیگ شمالی ہندوستان میں سب سے مضبوط اور مستحکم منصب دار تھا۔ قطب خاں روہیلہ کی بغاوت کچل کر اس نے بادشاہ عالمگیر ثانی کے دربار میں بہت مرتبہ حاصل کر لیا تھا۔ سرہند فتح کر کے آدینہ بیگ نے اپنے علاقہ میں شامل کر کے دریائے جمنا اور بیاس کے درمیانی علاقہ پر مشتمل ایک نیم خود مختار ریاست قائم کر لی تھی۔ سیاسی طور پر وہ دربار لاہور کے ماتحت تھا مگر عملی طور پر نہ مغل بادشاہ کی کوئی پروا کرتا تھا نہ احمد شاہ ابدالی کے مقرر کردہ حاکم پنجاب کا حکم مانتا تھا۔ مغلانی بیگم اس فرار کے اثرات اور نتائج معلوم کرنے میں دلچسپی رکھتی تھی لیکن اس نے زیادہ کچھ نہیں پوچھا تھا کہ ایسا نہ ہو وہ خواجہ عبداللہ خان کو اس کی دلچسپی کے بارے میں بتا دے۔ اس نے شہباز خان کو ہدایت کی کہ وہ طہماس خاں سے اس بارے میں تفصیلات حاصل کر کے فوری طور پر اسے آگاہ کرے۔ خواجہ عبداللہ خاں نے اسے بالکل بے دست و پا بنا دیا تھا مگر وہ حالات اور مشکلات کے سامنے ہتھیار ڈالنے کے لئے تیار نہیں تھی۔

***

شدید حبس اور گرمی کی وجہ سے حویلی پر متعین فوج کے سپاہی اپنے اپنے خیموں میں لیٹے سمرقند و بخارا کے موسم کی یادوں کا تبادلہ کر رہے تھے۔ کماندار تکیہ سے ٹیک لگائے آنکھیں بند کئے پڑا تھا، اس کے سرہانے کی طرف پنکھا ہلانے والا سپاہی پیشانی سے پسینہ پونچھ کر پھر سے پنکھا ہلانے لگا تو بھاگتے سپاہی کو دیکھ کر رک گیا۔ ''پہرہ والا سپاہی بھاگا آتا ہے کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے''۔

کماندار جلدی سے سیدھا ہو کر بیٹھ گیا، سپاہی اس کے سامنے پہنچ چکا تھا۔

"بیگم نے اپنے ایک خادم کو ہلاک کر دیا ہے"۔ اس نے کماندار کے پوچھنے سے پہلے ہی چلا کر اطلاع دی۔

"کیا بکواس کر رہے ہو؟" کماندار چلایا جیسے وہ اس اطلاع پر یقین نہ کرنا چاہتا ہو۔

"حضور! میں سچ عرض کر رہا ہوں"۔

"کس کو ہلاک کیا ہے، کہاں ہے وہ، کس نے بتایا ہے تمہیں؟" کماندار نے ایک ہی سانس میں جو اور جیسا بھی سوال ذہن میں آیا اُگل دیا۔

"کسی نے نہیں بتایا حضور اس کے ہاتھ پاؤں بندھے ہیں، کپڑے خون آلود ہیں، سانس بند ہے"۔ سپاہی بدحواسی میں کہے جا رہا تھا۔

"میں پوچھتا ہوں وہ کون ہے اور کہاں ہے" کماندار اور بھی زور سے چلایا۔

"بیگم صاحبہ کا ملازم ہے حضور! اور حویلی کے دروازے کے باہر پڑا ہے، بیگم کے آدمی پھینک گئے ہیں"۔

کماندار اچھل کر کھڑا ہو گیا اور جوتے تلاش کرنے لگا۔ خیمے کے آس پاس کے خیموں سے سپاہی دوڑے ہوئے آئے اور کماندار کی قیادت میں حویلی کے دروازے کی طرف دوڑ پڑے۔

"شہباز خان"۔ وہ اسے دیکھ کر گھبرا گیا۔ "جلدی کرو اس کے ہاتھ پاؤں کھولو"۔ اس نے جھک کر شہباز خان کی نبض ٹٹولتے ہوئے حکم دیا۔

اس کی نبض ابھی چل رہی تھی مگر سانس معدوم تھی۔

سپاہیوں نے جلدی جلدی اس کے ہاتھ پاؤں کی رسیاں کاٹ دیں اور اسے اٹھا کر کماندار کے خیمے سے ملحق خیمے میں لے گئے اور اس کے ہاتھوں اور پاؤں کے تلوؤں پر مالش کر کے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگے۔ شہباز کے دانت ایک دوسرے میں اس سختی سے پیوست تھے کہ منہ میں پانی ڈالتے تو دونوں طرف سے بہہ جاتا۔ کماندار اس کے پاس بیٹھ گیا، اس کو حویلی کی حفاظت کا فرض سونپا گیا تھا۔ یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ اگر بیگم اپنے کسی ملازم کو نیم مردہ حالت میں حویلی سے باہر پھینک دے تو اسے کیا کرنا چاہئے۔ بیگم نے اپنے معتمد خادم کو کس جرم کی پاداش میں اتنی کڑی سزا دی ہے؟ وہ صرف سوچ سکتا تھا کسی سے پوچھ نہیں سکتا تھا۔ کسی سپاہی یا کماندار کو حویلی کے اندر پاؤں رکھنے کی اجازت نہیں تھی، ہوتی بھی تو وہ اس کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔

بہت دیر بعد شہباز خان نے آنکھ کھول کر اپنے اردگرد کھڑے سپاہیوں کی طرف دیکھا تو ان کی جان میں جان آئی۔ اگر وہ کچھ بتائے بغیر مر گیا ہوتا تو خواجہ عبداللہ خان کے سوالات کا ان کے پاس کوئی جواب نہ ہوتا۔

شہباز کی سانس بحال ہونے لگی اور قطرہ قطرہ پانی اندر جانے لگا تو کماندار کو خیال آیا کہ اسے خواجہ عبداللہ خان کو اس کی اطلاع دینا چاہئے تھی، شہر سے معالج منگوا کر اس کی مرہم پٹی کروانا بھی لازم تھا۔ اس نے تیز رفتار سواروں کو قلعہ روانہ کیا اور ہدایات اور معالج بھیجنے کی درخواست کی۔

خواجہ عبداللہ خان نے اس واقعہ کو کوئی اہمیت نہیں دی، شہباز خان مر بھی جاتا تو وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ معالج بھیج کر وہ خاموش ہو گیا البتہ طہماس خاں کے لئے یہ بڑا پریشان کن حادثہ تھا۔ وہ بھاگتا ہوا آیا اور کافی دیر تک شہباز کے پاس بیٹھا رہا جو تھوڑی دیر کے لئے آنکھیں کھولتا تھا اور پھر بند کر لیتا تھا۔ معالج اگر کوئی بات پوچھتے تو وہ منہ دوسری طرف کر کے آنکھیں بند کر لیتا۔

طہماس خاں پہریداروں اور میاں خوش فہم سے اجازت حاصل کر کے حویلی کے اندر چلا گیا۔ وہ شہباز کا

جرم جاننا چاہتا تھا لیکن براہ راست کسی سے کچھ پوچھنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ میاں خوش فہم نے اس کی آمد پر خلافِ معمول کسی خوشی کا اظہار نہیں کیا، وہ اسے دیکھ کر زنانہ کی طرف چلا گیا۔ حویلی میں ایک ہی فرد ایسا تھا جس سے وہ ایسی بات پوچھ سکتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد خدام کے درمیان میں بیٹھ کر وہ حویلی سے باہر نکل آیا اور شہباز خان کے پاس جا بیٹھا۔ رات کا دوسرا پہر شروع ہو چکا تھا جب شہباز خاں کی حالت اس قابل ہوئی کہ وہ اپنے زخموں اور درد کے بارے میں بتا سکے۔

خواجہ عبداللہ خاں اور قلعہ کے حکام کا ردِعمل دیکھ کر کماندار بھی شہباز کے بارے میں بے فکر ہو کر اپنے خیمہ میں آرام کر رہا تھا لیکن مغلانی بیگم نے شہباز کو اتنا کیوں پٹوایا اور اس طرح جکڑ کر حویلی سے باہر کیوں پھنکوا دیا؟ یہ جاننے میں اس کی دلچسپی قائم تھی، وہ یہ بھی سوچتا تھا کہ اگر کسی وقت اس سے پوچھ لیا گیا تو وہ کوئی جواب نہیں دے سکے گا کہ اس نے پوچھا ہی نہیں تھا۔ اس نے معالجوں کو ہدایت کی تھی کہ وہ جتنی معلومات حاصل کر سکیں اسے بتائیں اور طہماس خاں کو بلا کر کہا کہ وہ بھی پوچھنے کی کوشش کرے۔

نیم کے پتوں سے شہباز کے زخم دھو کر زخموں پر مرہم لگا کر پٹیاں باندھ دی گئیں۔ چہرہ ہاتھ اور پاؤں دھو کر جراح خیمے سے باہر آیا اور کوئی ہلکی خوراک لانے کو کہہ کر اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرنے لگا۔ خیمے کے اندر سے شہباز کے چیخنے کی آواز آئی تو وہ بھاگ کر اندر گئے تو پاس بیٹھے سپاہیوں نے بتایا کہ طہماس خاں نے شہباز سے کوئی بات کرنے کی کوشش کی تھی اور اسے دیکھتے ہی وہ چیخ مار کر بے ہوش ہو گیا ہے۔ انہوں نے طہماس خاں کو خیمے سے نکال دیا اور پھر سے اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگے اور ہدایت کی کہ طہماس کو خیمے میں داخل نہ ہونے دیا جائے۔

طہماس خاں نے وہ رات سپاہیوں کے خیموں میں سوتے جاگتے گزاری، پہلے وہ یہ سوچتا تھا کہ شہباز کو بیگم نے یہ سزا کیوں دی؟ اب یہ سوچنے لگا کہ اسے دیکھ کر شہباز نے چیخ کیوں ماری اور بے ہوش کیوں ہو گیا؟ وہ بڑی بے چینی سے صبح اور حویلی کا دروازہ کھلنے کا انتظار کرنے لگا تاکہ کسی سے کچھ معلوم کر سکے۔ مغلانی بیگم کے روبرو حاضری کے بعد اس نے دنیا کی بجائے دل کی آواز کا ساتھ دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ گل بنفشہ کے لئے ہر قسم کی قربانی دینے کا فیصلہ کر چکا تھا مگر اس نئے واقعہ نے اس کی سوچ کو نئی راہوں پر ڈال دیا تھا۔ اسے شہباز سے قطعاً کوئی ہمدردی نہ تھی، عام حالات میں اس کی اس سزا اور حالت پر سب سے زیادہ وہی خوش ہوتا مگر ایسے حالات میں جب بیگم کے معتمد، منصب دار اور حکام سب اس سے جدا ہو گئے تھے۔ بیگم نے شہباز کو ہلاک کرنے کا حکم کیوں دیا، اس کا کیا قصور ہو سکتا ہے؟ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

صبح حویلی کا دروازہ کھلتے ہی وہ اجازت لے کر اندر چلا گیا اور مردانہ میں جا کر بیٹھ گیا۔ ملازمین اپنے اپنے کاموں میں مصروف رہے، کسی نے سلام دعا سے زیادہ اس سے کوئی بات نہیں کی اور نہ ہی اس کی طرف کوئی توجہ دی۔ وہ پھر بھی بیٹھا رہا کہ شاید میاں خوش فہم ادھر آ جائے اور اس کی پریشانی دور کرنے میں کوئی مدد دے سکے۔

سورج کی دھوپ اور روشنی کافی پھیل چکی تھی جب میاں خوش فہم زنانہ کی طرف سے برآمد ہوئے، ان کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ طہماس خان نے انہیں دیکھتے ہی آگے بڑھ کر سلام کیا۔ میاں خوش فہم نے سلام کا جواب دیا اور کنی کترا کر آگے چل دیا۔ طہماس اس کے ساتھ چلنے لگا۔

''خدا اس حویلی پر کرم کی بارش کرے، ہم اس لائق بھی نہیں رہے کہ کچھ جان سکیں؟'' اس نے آہستہ کہا۔

''میاں! تم نے ہمیں کچھ بتانے کے لائق سمجھا ہوتا تو اس حویلی پر اتنی آفت نہ آتی''۔ میاں نے اس کی بات کاٹ دی۔

''اس آفت کا سبب ہم بنے تو اپنی جان حاضر کئے دیتے ہیں مگر کچھ جانیں بھی کہ اس غلام سے کیا جرم سرزد ہوا اور شہباز کو کیوں سزا ملی؟'' اس نے سرگوشی کی۔

''تم عشق تو چھپا نہ سکے، شادی کی خوشی چھپانے چل پڑے۔ بھلا ایسی بات بھی چھپتی ہے؟ ہم تو جانیں نواب مغفور کے گھر کے نمک میں ہی اثر نہ رہا جس نے کھایا نمک حرامی کی۔ اس گھر کے ٹکڑوں پر پلنے والے نمک حرام کو پتہ چلا تو بیگم حضور کے فیصلہ کے خلاف لونڈیا کو بھگانے چل پڑا، اس نے جو کہا لونڈیا نے بیگم کے حضور بتا دیا۔ حضور کا تو حکم تھا اسے بھکاری بنا کر پھینک دو باہر۔ وہ تو ہمیں جرأت نہ ہو سکی اپنے ہاتھوں میں پال پوس کر جوان کیا تھا، معلوم نہیں اس کوتاہی کی کیا سزا ملے؟''

طہماس خاں کو رات ہی کچھ کچھ شک پڑ گیا تھا، اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا، اس کا دل چاہتا تھا ابھی جا کر شہباز کا سر تن سے جدا کر دے۔

''بیگم حضور کا حکم تھا منہ نہ کھولنا مجبوری تھی، معاف فرما دیں''۔ اس نے منت کی۔

''ہم کون ہوویں معاف کرنے والے، ہم تو خود گناہگار ٹھہرے۔ زندگی بھر جس سے بھی کی، نیکی ہی کی۔ آپ ہمارے حق میں دعا کریں۔ کیا جانیں اس نمک حرام سے نیکی کی کیا سزا ملے؟'' میاں پریشان تھے۔

''آپ کا وجود اس گھر کے لئے رحمت ہے، ایسا مت کہو۔ بیگم عالیہ کے حضور آپ کی جو عزت ہے کسی اور کو نہ مل سکی''۔ طہماس خان نے اسے تسلی دی۔

''ہم کیا اور ہماری عزت کیا، سب بیگم حضور کا کرم ہے۔ سزا کیا سر مانگیں تو طشتری میں سجا کر پیش کر دیں، ہمارے خون میں نمک حرامی نہیں۔ ہم تو ہمیشہ دعا کرتے ہیں زندگی اسی خدمت میں بسر ہو جائے''۔

''یہ غلام اس مشکل وقت میں کیا خدمت کر سکتا ہے؟ بیگم عالیہ سے پوچھ کر حکم دیں تو غلام زندگی بھر آپ کا مشکور رہے گا''۔

''میاں ہم میں تو ہمت نہیں آتے جاتے رہو، بیگم عالیہ نے ضرورت جانی تو ہم تمہیں بتا دیں گے''۔

میاں یہ کہہ کر اپنے کمرے کی طرف چلا گیا اور طہماس خاں سر جھکائے حویلی سے باہر نکل آیا۔ اس کی حالت عجیب ہو رہی تھی، کبھی وہ یہ سوچ کر خوشی سے ہوا میں اڑنے لگتا کہ بیگم نے اس کی وجہ سے اپنے معتمد خادم کو جان سے مار دینے کا حکم دے دیا اور کبھی شہباز خاں کی شکل چشم تصور میں ابھرتے ہی آگ میں جلنا شروع ہو جاتا۔

حویلی سے نکل کر وہ کماندار کے خیمے کی طرف نہیں گیا، اس میں شہباز کو دیکھنے کا حوصلہ بھی نہ تھا۔ ایسا نہ ہو وہ اس کے منہ پر تھوک ہی دے اور دیکھنے والوں کو شبہ پڑ جائے۔ خیموں کا چکر کاٹ کر وہ سب سے آخری خیمہ میں لیٹے سپاہیوں کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔

تین چار روز میں شہباز خان چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا۔ اس کی کمر اور بازوؤں پر کوڑوں کے زخم بھرنے لگے تھے، درد ختم ہو گیا تھا لیکن اب بھی وہ کسی سے بات نہیں کرتا تھا۔ کماندار نے سپاہیوں کی ڈیوٹی لگا رکھی تھی کہ وہ اس سے کچھ معلوم کریں۔ خود بھی ایک دو بار کوشش کی مگر شہباز نے کوئی جواب نہیں دیا۔ طہماس خان اب زیادہ وقت حویلی کے اندر گزارتا تھا، کبھی باہر آتا بھی تو کماندار سے ملنے سے گریز کرتا تھا۔ نواب عبداللہ خان کی طرف سے کماندار کو شہباز کے بارے میں کوئی ہدایت موصول نہیں ہوئی تھی کہ اس کا کیا کیا جائے۔ کماندار خود کچھ فیصلہ نہیں کر سکتا تھا کہ اسے قلعہ بھیج دے یا اپنے پاس رکھے

اور اگر نہ قلعہ بھیجے نہ اپنے پاس رکھے تو کہاں بھیجے؟ حویلی کا دروازہ ہمیشہ کے لئے اس پر بند ہو گیا تھا۔

شہباز خاں کے بارے میں اسے صرف یہ معلوم ہو سکا کہ اسے خود بھی معلوم نہیں ہو رہا کہ وہ کیا کرے اور کہاں جائے۔ اس کے پاس نہ کوئی روپیہ پیسہ ہے، نہ کپڑا ہے، اس کی زندگی بھر کی جمع پونجی حویلی میں اس کے کمرہ میں تھی، لاہور میں اس کا کوئی عزیز رشتہ دار بھی نہیں تھا وہ جس کے پاس چلا جائے، اسے کسی سے کسی قسم کی مدد ملنے کی امید بھی نہ تھی، وہ ہمہ وقت پریشان گھومتا رہتا یا خیمے میں خاموش پڑا رہتا۔

پھر ایک شام اطلاع ملی کہ شہباز ظہر کی نماز کے لئے مسجد گیا تھا اور ابھی تک واپس نہیں آیا۔ سپاہیوں نے اِدھر اُدھر ڈھونڈا مگر زیادہ تلاش نہیں کیا اس کی کسی کو ضرورت تو تھی نہیں۔ خس کم جہاں پاک۔

شہباز کے جانے کے بعد طہماس خاں کماندار کے پاس زیادہ آنے جانے لگا مگر شہباز کے جرم کے بارے میں اس نے بھی کسی کو کچھ نہ بتایا۔ البتہ خواجہ عبداللہ خاں کو وہ حویلی کے معاملات سے کچھ کچھ آگاہ رکھتا تھا کیونکہ اس کے بغیر اس کی اندر آنے جانے کی آزادی ختم ہو سکتی تھی۔

****

مغلانی بیگم کی نظر بندی کے دو ماہ مکمل ہو گئے تھے لیکن سرفراز خان اور نادر بیگ کا کچھ سراغ نہیں مل سکا تھا۔ حویلی سے باہر کی دنیا سے اس کے رابطہ کا واحد ذریعہ اب طہماس خان تھا مگر وہ اس پر اعتماد نہیں کر سکتی تھی۔ شہباز خان کو جب سے حویلی سے باہر پھنکوایا تھا اس کی زبان پر کبھی اس کا نام تک نہ آیا تھا۔ حویلی کے ملازمین نے بھی ان کے سامنے کبھی اس کا ذکر نہیں کیا تھا۔ بیگم اب عملاً قید تنہائی کی سی زندگی گزار رہی تھی، اس کے باوجود اس نے اپنی بیٹیوں اور ملازموں پر کبھی ظاہر نہیں ہونے دیا کہ وہ مصائب کے سامنے ہتھیار ڈال چکی ہے اور اپنے مستقبل سے مایوس ہو چکی ہے۔ جب کبھی اس پر مایوسی غالب آ جاتی تھی تو وہ کمرے کا دروازہ بند کر کے دیوان حافظ کھول کر بیٹھ جاتی، کبھی فال نکالتی، کبھی ویسے ہی ورق گردانی کرتی رہتی۔ ایک دو شعر اس صفحہ سے پڑھے دو چار اگلے صفحہ سے تاکہ کنیزیں اس کی حالت سے اس کی پریشانی کا اندازہ نہ کر سکیں۔

اسوج کا مہینہ شروع ہو چکا تھا اور لاہور کی راتیں سرد ہونا شروع ہو گئی تھیں مگر دن کے وقت جب سورج نصف النہار پر ہوتا تو گرمی ناقابل برداشت ہو جاتی تھی۔

ایک روز گل بنفشہ پردے کے پیچھے کھڑی تھی، مغلانی بیگم کمرے میں بے چینی سے ٹہل رہی تھی کہ چلتے چلتے وہ کمرے کے درمیان میں اچانک رک گئی پھر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی نشست پر جا کر بیٹھ گئی اور گل بنفشہ کو آواز دی، گل بنفشہ نے پردہ کے پیچھے سے برآمد ہو کر سلام کیا اور سر جھکا کر کھڑی ہو گئی۔

"میاں خوش فہم کو جلدی پیش کرو"۔ اس نے گردن اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

میاں خوش فہم نے فرشی سلام سے سر اٹھایا تو بیگم نے دیوان حافظ کی ورق گردانی کرتے ہوئے پوچھا۔ "موسم کا مزاج بدل رہا ہے تم نے سرما کے مقابلہ کا انتظام تو کر لیا ہوگا؟"

"حضور کا غلام یہ اطلاع دے کر اطمینان محسوس کرتا ہے کہ وہ حضور کے اعتماد پر پورا رہا"۔ میاں خوش فہم نے عرض کیا لیکن اسے سمجھ نہیں آیا کہ بیگم کو یہ پوچھنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی کیونکہ پہلے کبھی بیگم نے ایسے امور کے بارے میں نہیں پوچھا تھا۔

"گرمی کا زور کب تک رہے گا؟" بیگم نے پوچھا۔

"گرمی کا زور تو پندرہ بیس دن چلے گا پھر دن بھی ٹھنڈے ہو جائیں گے"۔ میاں نے جواب دیا۔

"پندرہ بیس دن!" بیگم نے زیر لب دہرایا۔

''تم جاسکتے ہو''۔ بیگم نے کہا اور آنکھیں بند کر کے ایک بار پھر ''پندرہ بیس دن'' دہرایا۔

بیگم نے آنکھیں کھولیں تو گل بنفشہ سامنے سر جھکائے کھڑی تھی۔

''میاں خوش فہم کوئی ضروری پیغام پہنچانے کی اجازت چاہتے ہیں''۔

''حاضر کرو''۔ مغلانی بیگم نے کہا اور سوچنے لگی کہ لمحہ بھر میں کون سا اتنا ضروری پیغام انہیں حاضری پر مجبور کرسکتا ہے۔

میاں خوش فہم نے جلدی جلدی آداب کے مراحل طے کئے اور اکھڑی اکھڑی سانسیں لیتے ہوئے بولے۔

''خواجہ عبداللہ خان کی فوجیں جنگی سامان کے ساتھ موچی دروازہ کے سامنے جمع ہورہی ہیں''۔

''تمہیں یہ خبر کس نے دی؟'' مغلانی بیگم نے بظاہر لاپروائی سے پوچھا لیکن اس کے چہرے کے تاثرات سے پتہ چلتا تھا کہ وہ اسی خبر کی منتظر تھی۔

''طہماس خاں خبر لایا ہے اور حاضری کی اجازت چاہتا ہے''۔ خوش فہم نے جواب دیا۔

''حاضر کریں اور خود باہر ہمارے حکم انتظار کریں''۔ بیگم نے حکم دیا۔

میاں جلدی سے باہر نکل گیا۔

طہماس خان نے دروازے کے سامنے کنیزوں کے جھرمٹ میں کھڑی گل بنفشہ کو دیکھا تو اس کا دل چاہا کہ وہ کسی بہانے چند لمحے رک جائے مگر خبر اتنی اہم تھی کہ وہ دل بھر کر اس کی طرف دیکھ نہ سکا۔

''ہم سنتے ہیں خواجہ کی فوجیں لڑائی کی تیاری کر رہی ہیں؟'' بیگم نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔

''حضور کا غلام یہی خبر لے کر حاضر ہوا ہے''۔ اس نے جواب دیا۔

''کیا یہ درست ہے کہ فوجیں موچی دروازہ کے سامنے جمع ہیں؟'' بیگم نے پوچھا۔

''غلام نے بھی دیکھا ہے''۔ وہ ایک بار پھر جھک گیا۔

''کس کی فوجوں سے لڑنے کی تیاری ہے؟'' مغلانی بیگم نے پوچھا۔

''سب لب بستہ ہیں، کچھ معلوم نہیں ہو سکا''۔ طہماس خاں نے جواب دیا۔

''میاں خوش فہم کو حاضر کرو''۔ بیگم نے حکم دیا جس کا مطلب وہ سمجھتا تھا۔

بیگم کو فوجوں کے آنے کی امید ہی نہیں یقین تھا مگر خواجہ عبداللہ کے موچی دروازہ کے سامنے جمع ہونے سے اس کے دل میں شبہات پیدا ہونے لگے۔ ''طہماس خاں حویلی سے باہر نہیں جائے گا، اسے اطلاع دو کہ یہ ہمارا حکم ہے''۔ مغلانی بیگم نے میاں خوش فہم کو دیکھتے ہی حکم دیا۔ ''عمدہ بیگم اور وقار بیگم کو ہمارے پاس بھجوا دو، گل بنفشہ سے کہو مغرب کی نماز کے بعد تمام کنیزیں اور حویلی کی خواتین زنانہ میں جمع ہو جائیں، خواجہ سرا اور خدام سب ڈیوڑھی پر پہرہ دیں گے، ہماری اجازت کے بغیر کسی کو اندر آنے کی اجازت نہ ہوگی، حویلی کا دروازہ بند کر دیا جائے''۔

قلعہ نما حویلی کا دروازہ بند ہوتے ہی زنانہ اور مردانہ میں ہنگامی صورت حال پیدا ہوگئی۔ طہماس خاں اور خوش فہم کے علاوہ کسی کو کچھ پتہ نہیں تھا کہ اس کی وجہ کیا ہے مگر سارے خواتین و حضرات بھاگے پھر رہے تھے۔

مغرب کی نماز کے لئے بھی حویلی کا کوئی باسی مسجد نہیں گیا۔

حویلی میں مقیم خدام اور ملازمین کے اہل و عیال زنان خانہ میں جمع ہو چکے تو مغلانی بیگم خود حفاظتی انتظامات دیکھنے گئی، ڈیوڑھی اور دیواروں پر متعین ملازمین کو ہدایات دیں اور اپنے کمرہ میں واپس چلی گئی۔

وقار بیگم اس صورتِ حال سے پریشان دکھائی دیتی تھی۔ ”جانِ مادر! یہ غم کی نہیں خوشی کی رات ہے“۔ مغلانی بیگم نے اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

”خوشی میں پریشانی ہماری سمجھ میں نہیں آ رہی“۔ وقار بیگم نے کانپتی آواز میں پوچھا۔

”خوشی کی حفاظت غم سے زیادہ تندہی سے کرنا لازم ہے“۔ اس کے چہرے کے تاثرات میں خوشی نمایاں ہونے لگی۔

وقار بیگم بھی مسکرا دی۔

عمدہ بیگم نے باہر نکل کر تمام خواتین کو خوشی کی خوشخبری دی اور سب کو نامعلوم خوشی کی حفاظت کے لئے تیار رہنے کا حکم دیا۔

میر منو کی وفات کے بعد سے عمدہ بیگم نے پہلی بار کسی صورتِ حال میں کوئی عملی یا زبانی حصہ لیا تھا۔

رات بھر حویلی کا کوئی باسی نہیں سویا، مغلانی بیگم کئی دفعہ باہر آئی اور حفاظتی انتظامات کا خود معائنہ کیا، خواجہ سرا اور گھریلو ملازمین تلواریں اور بندوقیں اٹھائے ڈیوڑھی اور برجیوں پر پہرہ دے رہے تھے۔

آخر شب برجیوں پر متعین پہریداروں نے اطلاع دی کہ حویلی سے باہر متعین خواجہ عبداللہ خان کی فوج اپنے خیمے لپیٹ رہی ہے تو مغلانی بیگم نے پہریداروں کو اور بھی ہوشیار رہنے کا حکم دیا اور ایک برج پر چڑھ کر صبح کی پھیلتی روشنی میں خواجہ کے دستوں کو شہر کی طرف بھاگتے دیکھ کر اپنے کمرے میں واپس آ گئی۔

جب سورج کی دھوپ مغربی منڈیروں کو روشن کر چکی تو بیگم نے برجیوں پر پہریداروں کی ڈیوٹیاں بدل دیں اور ہنگامی حالات ختم کر کے خواتین اور کنیزوں کو ان کے گھروں اور کمروں میں واپس بھیج دیا۔

میاں خوش فہم اور طہماس خان بیگم پورہ کی گلیوں اور بازاروں میں گھوم پھر کر واپس آ گئے مگر کسی سے کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ حملہ آور فوج کدھر سے آ رہی ہے اور خواجہ عبداللہ خان کی فوج مقابلہ کرنے کس طرف جا رہی ہے۔

اگلے روز خبر ملی کہ آدینہ بیگ نے شہر اور قلعہ پر قبضہ کر لیا ہے اور خواجہ عبداللہ خان اس کے آنے سے پہلے ہی اپنی فوج کے ساتھ ملتان کی سمت بھاگ گئے تھے۔

مغلانی بیگم کی امیدوں پر اوس پڑ گئی۔

خواجہ عبداللہ خان اور مغلانی بیگم کے اختلافات کی خبروں سے آدینہ بیگ کو اپنے خواب پورے ہوتے ہوئے دکھائی دینے لگے تو اس نے سکھ جتھے داروں کو لوٹ مار اور غارت گری تیز کرنے کا مشورہ دیا۔ حاکم لاہور کے ضلع داروں میں کسی کے پاس اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ سکھوں کو قوت سے دبا سکے۔ جسا سنگھ کلال کے گروہ نواح لاہور میں دن کے وقت بھی لوٹ مار کرنے لگے تھے۔

خواجہ عبداللہ خان کو مزید فوج بھرتی کرنے کے لئے مزید روپیہ کی ضرورت تھی، روپیہ کے حصول کے لئے اس نے عوام پر جبر شروع کر دیا جس سے عوام و خواص میں اس کے خلاف شدید نفرت پیدا ہو گئی۔ آدینہ بیگ کا ایجنٹ بھوانی داس لاہور واپس آ چکا تھا اور بڑی تفصیل سے لاہور کے حالات کے بارے میں اسے مراسلے بھیج رہا تھا۔ اس ساری صورتِ حال کا جائزہ لے کر آدینہ بیگ نے موقع سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا تو اس کی فوج کی آمد کی خبر پا کر خواجہ اپنی فوج سمیت فرار ہو گیا اور آدینہ بیگ بلا لڑائی کے لاہور اور قلعہ پر قابض ہو گیا۔ خواجہ عبداللہ خان کو احساس تھا کہ وہ آدینہ بیگ کی فوجوں کا مقابلہ نہیں کر سکے گا اور لوگ اس کا ساتھ نہیں دیں گے، وہ اپنے اہل و عیال تک ساتھ نہ لے جا سکا۔ لاہور پر آدینہ بیگ کے قبضہ سے عام لوگوں کو تحفظ کا احساس ہونے لگا، اس کی فوجی قوت اور انتظامی صلاحیتوں سے سب واقف تھے۔ اس نے شہر کے امراء اور شرفاء کو جمع کر کے تعاون

کی درخواست کی تو اہالیان شہر نے بخوشی اس کی حمایت کا وعدہ کیا۔ آدینہ بیگ کو جس طرح بنا لڑے شہر پر قبضہ کی امید نہیں تھی اسی طرح اسے اہل لاہور کی طرف سے اتنی حمایت کا بھی یقین نہیں تھا۔ اس وعدہ سے اسے خوشی بھی ہوئی اور حالات کی خرابی کا اندازہ بھی۔

آدینہ بیگ شرقپور کے ایک غریب ارائیں خاندان میں پیدا ہوا اور بچپن میں ہی ایک ترک خاندان کے گھریلو ملازمین میں شامل ہو گیا تھا۔ اسی گھر میں اس نے معمولی تعلیم حاصل کی اور امراء کی خلوت اور جلوت کے آداب سیکھے اور انتشار میں اقتدار کے حصول کی منزل کی طرف چل پڑا۔ اس سفر میں کوئی اصول یا اخلاقی قدر اس کی راہ میں کبھی رکاوٹ نہ بن سکی۔ دھوکہ، بددیانتی، بدعہدی، بے وفائی، چاپلوسی، رشوت، سازش جس سے بھی کام نکلتا وہ جائز سمجھتا تھا۔ روپیہ اور طاقت جمع کرتا اور بچا کر رکھتا۔ جس شہر میں اس نے گھریلو خادم سے زندگی کا آغاز کیا تھا اس کا حکم اور صوبیدار بن جانے کے بعد اس نے حالات و واقعات کا جائزہ لیا تو خود وہاں قیام کرنا پسند نہ کیا اور اپنے جرنیل صدیق خان کو لاہور میں اپنا نائب مقرر کر کے واپس جالندھر لوٹ گیا۔

جالندھر اس کی طاقت کا سرچشمہ تھا، اس نے احمد شاہ ابدالی کی طرف سے مقرر کردہ حاکم پنجاب خواجہ عبداللہ خان کو لاہور سے بھگا دیا تھا مگر اب اسے مغل بادشاہ کی سند اور سرپرستی کی ضرورت تھی جس کے لئے اس نے پھر سے پنجاب کے شاہجہان آباد کے ساتھ الحاق کا اعلان کر دیا اور بادشاہ کو اپنی وفاداری اور ماتحتی کا یقین دلایا۔ بادشاہ عالمگیر ثانی پنجاب کی واپسی سے بہت خوش ہوئے۔ وزیراعظم عمادالملک کو اپنی خوشدامن کے اقتدار سے اس طریقہ سے علیحدہ کئے جانے کا دکھ تھا مگر مغلیہ سلطنت کے بااختیار حاکم کی حیثیت میں پنجاب کا حصول اس کی بھی شدید آرزو تھی، آدینہ بیگ نے اس کی یہ آرزو بھی پوری کر دی تھی۔

آدینہ بیگ ایک طرف مغل دربار سے اپنے تعلقات مضبوط کرنا چاہتا تھا اور دوسری طرف دوآبہ جالندھر اور سرہند میں کوئی مضبوط نائب مقرر کر کے خود سکھوں کے خلاف مہم شروع کرنا چاہتا تھا تا کہ اس کی حاکمیت کی بنیادیں مضبوط ہو سکیں۔ صدیق خان اس کا بااعتماد جرنیل تھا اور لاہور اور اردگرد کے پرگنوں میں امن بحال کرنے کی پوری صلاحیت رکھتا تھا اسی لئے وہ خود واپس جالندھر چلا گیا تھا۔

***

ملک سجاول نے گھوڑے کی لگامیں کھینچیں تو طہماس خاں نے آگے بڑھ کر رکاب تھام لی، دیگر ملازمین نے ملک سجاول کے ساتھیوں کے گھوڑوں کی رکابیں تھام کر انہیں گھوڑوں سے اترنے میں مدد دی۔ ملک سجاول اور ان کے ساتھی بھاگتے گھوڑوں پر سواری کرنے اور اچھلتے گھوڑوں سے کود جانے کے ماہر تھے مگر بیگم کے ملازمین ان پر ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ ان کی مالکہ کے ہاں ان کی کس قدر عزت اور احترام ہے۔ ملازم گھوڑوں پر سے ساز اتارنے سے پہلے باگیں تھام کر انہیں گھمانے لگے اور طہماس خاں، ملک سجاول اور ان کے ساتھیوں کو حویلی کے اندر لے گیا۔ میاں خوش فہم نے جھک کر سب کو خوش آمدید کہا۔ ''یہ حویلی تو آپ کے قدم چومنے کو ترس گئی''۔

''انسانوں کی مانند زمینوں کے بھی اپنے مقدر ہوتے ہیں، ہمارے قدموں کے مقدر میں اس زمین کا ملاپ ہوتا تو کوئی نہ ترستا''۔ ملک سجاول نے مسکرا کر جواب دیا۔

''امید رکھیں کہ حضور کے قدموں کی برکت سے حویلی کے بعد اس کے باسیوں کے مقدر بھی جاگ اٹھیں گے''۔ میاں خوش فہم کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ بیگم

نے ملک کے احترام کی زیادہ ہی سخت ہدایات دے رکھی ہیں۔

''یوں نہ کہو، میاں! مقدر بدلنا اس کے بس میں ہے جس کی کتاب میں سب کے مقدر درج ہیں''۔ ملک نے اس انداز کو پسند نہیں کیا۔

میاں خوش فہم نے موضوع بدل دیا، وہ اس کے انداز گفتار سے سمجھ گیا تھا کہ راوی کا ڈوگر درباری آداب اور گفتگو سے دلچسپی نہیں رکھتا۔ ''بیگم عالیہ کل سے حضور کی منتظر ہیں اجازت ہو تو اطلاع کر دوں؟''

''بیگم صاحب جب بھی اجازت دیں بندہ حاضری کے لئے موجود ہے''۔ اس نے مہمان خانہ کی فرشی نشست پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

طہماس خان اب تک خاموش کھڑا تھا، جب سے بیگم نے گل بنفشہ سے اس کی شادی کا ارادہ ظاہر کیا تھا وہ میاں خوش فہم کے سامنے بہت محتاط اور مؤدب رہتا تھا۔ میاں کے جانے کے بعد اس نے ملازمین کو احکام جاری کر کے اپنی اہمیت جتانا شروع کیا۔ ''معزز مہمان تشریف رکھ چکے اور تم نے ابھی کچھ پیش نہیں کیا''۔

اس کے بات ختم کرنے سے پہلے ہی ملازم دسترخوان بچھا کر اس پر خشک میوے کی طشتریاں چننے لگے تھے، ملک سجاول نے ان کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ وہ دائیں ہاتھ سے اپنی موٹی مونچھوں کو تاؤ دے رہا تھا اور مہمان خانہ اور ملازمین کے انداز سے مغلانی بیگم پر قید و بند کے اثرات کا جائزہ لینے کی کوشش کر رہا تھا۔

ملک سجاول کمرے میں داخل ہوا تو مغلانی بیگم نے کنیزوں کی طرف دیکھا وہ تیزی سے باہر نکل گئیں۔

''ہم سمجھتے ہیں آپ کی آمد بادشاہ کا پیام ہے''۔ مغلانی بیگم نے انہیں سامنے کی نشست پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''آفتاب کی آنکھ کی سرخی سے اندازہ ہوتا ہے باد شاہ کی آمد میں اس بار کچھ تاخیر ہوگی''۔ ملک سجاول نے اطمینان سے جواب دیا۔

مغلانی بیگم شاید اس جواب کے لئے تیار نہیں تھی۔

''ہم سخت موسم کے عادی ہو چکے ہیں''۔ اس نے ذرا توقف کے بعد جواب دیا۔

''موسموں پر خالق کائنات کا اختیار ہے، انسان اس کے سامنے بے بس ہے''۔ ملک نے کہا۔

''ہم خوش بخت ہیں کہ ہمارے جاں نثار اور احباب ہمارے دکھ سے خود دکھی ہیں''۔

''دکھ اور موسم ہمیشہ ایک جیسے نہیں رہتے۔ حضور کا کرم ہے کہ آپ اپنے جاں نثاروں کے دکھ کا احساس رکھتے ہیں''۔

''ہم ابھی تک اپنے مجرم کے بارے میں کچھ نہیں سن سکے''۔

''حضور کا مجرم جلاوطنی کی سزا کاٹ کر واپس آ چکا ہے اور ہماری حراست میں ہے، جب حکم ہو پیش کر دیں گے''۔

''ہماری خواہش ہے کہ وہ ابھی حراست میں رہے اور بادشاہ کے ساتھ رہائی پائے''۔

''جیسا حضور کا حکم۔ حضور کے مجرم بھی اپنی جانیں حضور پر فدا کرنے کو تیار رہتے ہیں، بندہ دیکھ کر حیران رہ گیا''۔

''ہم سوچتے ہیں میر منو مغفور کے گھر کے نمک کا اثر ہوگا''۔ بیگم نے جواب دیا۔

''ہمارے جو نوجوان مجرم کے ساتھ قندھار گئے تھے، حاضر ہیں۔ حضور پسند فرمادیں تو وہ خود احوال بیان کر دیں گے''۔ ملک نے بتایا۔

''یہ آپ نے اچھا کیا''۔ مغلانی بیگم نے کہا اور گل بنفشہ کو بلا کر حکم دیا کہ میاں خوش فہم ملک سجاول کے ساتھیوں کو پیش کریں۔

''ہم سمجھتے ہیں سفر میں انہیں زیادہ دشواری پیش نہ آئی ہوگی''۔ اس نے بات جاری رکھتے ہوئے پوچھا۔

''سفر کی دشواری اور آسانی مقصد سفر کے حوالہ سے متعین ہوتی ہے، مقصد سفر کو دیکھیں تو کوئی دشواری مقصد سے بڑی نہ تھی۔ سب خیریت سے واپس آ گئے، حسن ابدال سے آگے جہان خاں کے کارندوں ن انہیں پہنچایا''۔ ملک سجاول نے جواب دیا۔

ملک سجاول کے تینوں ساتھی کمرے میں داخل ہوئے تو مغلانی بیگم کی نظریں ان کے چہروں پر جم گئیں جیسے زندگی میں پہلی دفعہ کسی نوجوان کو دیکھا ہو۔ سروقد، مہلک نقوش اور موٹی مونچھوں کے اوپر بے تاب چشم آہو۔ وہ انہیں بیٹھنے کا اشارہ کرنا بھی بھول گئی۔ میاں خوش فہم انہیں حاضر کر کے واپس ہوا تو اس نے روک لیا۔

''یہ میر منو مغفور کے مہمان ہیں، مرحوم کی روح کو شکوہ نہیں ہونا چاہئے''۔ پھر اس نے تینوں نوجوانوں کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

جوان اس بے نیازی سے قالین پر لگے گاؤ تکیہ کو گھٹنوں کے نیچے دبا کر بیٹھ گئے جیسے پنجاب کے مرحوم حاکم کی بیگم اور سابق حاکم پنجاب کے سامنے نہیں، گاؤں کے تکیہ میں اپنے دوستوں میں بیٹھے ہوں۔

''یہ تینوں سفر میں شہباز کے ساتھ تھے، بادشاہ کے حضور قاسم اور شہباز پیش کئے گئے تھے''۔ ملک سجاول نے قاسم کی طرف اشارہ کر کے بتایا۔

''انہیں دیکھ کر ہم موسم کی سختی بھولنے لگے ہیں، ہم خوش قسمت ہیں کہ ایسے جاں نثار رکھتے ہیں''۔ مغلانی بیگم نے ملک سجاول کی بات پر غور کئے بغیر کہا۔

''نواب جانی خان اور اپنے بزرگوں کے تعلقات ہمیں حضور کے حکم پر جاں نثاری پر مجبور کرتے ہیں''۔ ملک سجاول نے جواب دیا۔

''ہم سمجھتے ہیں بادشاہ معظم احمد شاہ ابدالی نے ہمارے لئے پیغام بھیجا ہوگا''۔ مغلانی بیگم نے ملک قاسم سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا۔

''جنرل جہان خاں نے ہمارے ساتھ جو آدمی بھیجا تھا، بادشاہ سے وہی باتیں کرتا رہا۔ کبھی کوئی بات ہم سے پوچھی تو ہم نے جواب دیا، وہ بادشاہ کو سمجھا دیتا تھا''۔ قاسم نے بتایا۔ ''ملاقات کے بعد بادشاہ نے ہمیں وہاں روک لیا۔ بادشاہ جہان خان کو لاہور بھیجنا چاہتا تھا مگر جب آدینہ بیگ کے قبضہ کی خبر پہنچی تو ہمیں واپس بھیج دیا گیا اور اتنا پیغام دیا کہ ہماری بیٹی سے کہہ دیں کہ ہم اس کی تکلیف پر پریشان ہیں اور جلد اس کا مداوا کریں گے''۔

''کوئی پرچہ؟'' مغلانی بیگم نے بے چینی سے پوچھا۔

''نہیں کوئی پرچہ نہیں دیا، ہمیں بس اتنا پیغام دیا تھا''۔ ملک قاسم نے جواب دیا۔

مغلانی بیگم کو اس جواب سے مایوسی ہوئی لیکن اس نے دل کا حال چہرے پر نہیں آنے دیا۔ ''ہم نے احمد شاہ ابدالی کو ہمیشہ قول کا پکا پایا، ہم امید کرتے ہیں کہ ان دیواروں نے آپ کا پیغام نہیں سنا''۔

''دیواروں کا تو علم نہیں ہم میں سے بھی کسی نے کچھ نہیں سنا''۔ ملک سجاول نے جواب دیا۔

''ہم نہیں چاہتے صدیق خاں کو ہمارے بارے میں کوئی شبہ گزرے۔ اسے نظم اور شورش کی مشکلات درپیش ہیں، ہوسکتا ہے کسی روز اس کا دستہ حویلی کے باہر خیمہ زن ہوجائے اور ہم آپ سے رابطہ نہ کرسکیں۔ شہباز کا وجود کسی پر ظاہر نہ ہونا چاہئے۔ ہم امید کرتے ہیں سرفراز خاں اور نادر بیگ جلد ہم سے رابطہ کریں گے۔ ہم نہیں چاہتے وہ لاہور میں رہیں، وہ بھی آپ کے پاس آسکتے ہیں۔ ہمیں معتمد پہرہ دینے والوں کی ضرورت ہے، ہم امید کرتے ہیں آپ ایسے آدمی فراہم کردیں گے''۔

''حضور کے ہر حکم کی تعمیل ہوگی، پہرہ کے لئے دو

روز میں آدمی پہنچ جائیں گے"۔

خدام نے دستر خوان بچھا کر اس پر میوے اور پھل چن دیئے تھے، ہر مہمان کے سامنے قہوہ اور فنجان رکھوا کر میاں خوش فہم سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

"ہماری خوشی کے لئے ماحضر قبول فرماویں"۔ مغلانی بیگم نے کہا اور خوش فہم کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔

"یہ خواجہ جانی خان مرحوم کا گھر ہے، ان کے دوستوں کا اپنا گھر ہے۔ ہم تو خود آپ کے مہمان ہیں"۔ مغلانی بیگم نے کہا۔ "اور امید کرتے ہیں کہ جب تک ہم آپ کے گھر میں مہمان رہنے پر مجبور ہیں۔ آپ ہماری اسی انداز میں مہمان نوازی اور حفاظت کریں گے جس انداز میں آپ کے والد اپنے گھر میں ہمارے والد کی مہمان نوازی اور حفاظت کیا کرتے تھے"۔

"خاندان کی روایات کا تحفظ ہماری مجبوری ہے"۔ ملک سجاول نے جواب دیا۔

"ہماری خواہش تھی کہ عمدہ بیگم اور وقار بیگم کو چند روز کے لئے آپ کے پاس بھیجیں، خانہ بندی سے وہ گھبرا رہی ہیں۔ پھر سوچتے ہیں صدیق خاں کے پرچہ نویس فتنہ کھڑا کر دیں گے، ان کے لئے راستہ بھی دشوار اور غیر محفوظ ہو گا؟" بیگم نے کہا۔

"خواجہ جانی خان کی نواسیوں کی مہمان نوازی ہمارے لئے باعثِ فخر ہو گی"۔ ملک سجاول نے جواب دیا۔

"ہم نے فیصلہ کیا تو آپ کو آگاہ کر دیں گے"۔

ملک سجاول اور اس کے ساتھیوں نے اجازت کی درخواست کی تو مغلانی بیگم کے حکم پر خوش فہم نے تین چھوٹی چھوٹی ریشمی تھیلیاں ملک کے ساتھیوں کو دینا چاہیں۔ "یہ نوجوان پہلی بار نواب مرحوم کے گھر آئے ہیں"۔

"ہماری درخواست ہے کہ ہمیں اپنی روایت کی خلاف ورزی پر مجبور نہ کیا جاوے"۔ ملک سجاول نے معذرت کی۔

بیگم نے اشارہ کیا، خوش فہم تھیلیاں واپس لے گیا۔

ملک اور اس کے ساتھی آداب بجالا کر کمرے سے باہر نکل گئے۔

مغلانی بیگم نشست سے اٹھی اور کمرے کی کھڑکی سے پردہ ہٹا کر باہر دیکھنے لگی، سامنے حویلی کی فصیل نما دیوار تھی جس کے سر پر ڈوبتے سورج کی سرخی پھیل رہی تھی۔ اس نے پردہ گرا دیا، اس کے تخیل کا شاہوار فصیل نہیں پھلانگ سکا تھا۔ اس نے محسوس کیا لڑائی کے میدان میں اس کا پاؤں سرپٹ دوڑتے گھوڑے کی رکاب میں پھنس گیا ہے اور وہ زمین پر گھسٹتی چلی جا رہی ہے۔ آہستہ چلتی ہوئی وہ نشست تک پہنچی اور بیٹھ کر آنکھیں بند کر لیں، سر دونوں ہاتھوں میں تھام کر سانس بحال کرنے لگی۔

"اماں حضور! ہم آ سکتے ہیں؟" ننھی وقار بیگم دروازے پر نمودار ہوئی۔

"جان مادر! ہم آپ کے منتظر ہیں"۔ اس نے سر اٹھا کر بیٹی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا مگر اسے سینے سے لگانے کے لئے اٹھ نہیں سکی۔

وقار بیگم اس خلاف معمول رویہ سے گھبرا گئی۔

"اماں حضور! آپ کی طبیعت تو بفضل خدا ٹھیک ہے؟"

"جان مادر! ہم خدا کے فضل سے بالکل ٹھیک ہیں"۔ اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

"آپ نے ہمیں سینے سے نہیں لگایا"۔ وقار بیگم جھک کر ماں سے لپٹ گئی۔

گل بنفشہ شمع لے کر کمرے میں داخل ہوئی اور ماں بیٹی کو دیکھ کر دہیں رک گئی۔

***

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی، آدینہ بیگ کا

نائب صدیق خان قلعہ کے دیوان خاص میں اپنے فوجی سرداروں سے مشاورت میں مصروف تھا۔ جالندھر سے اتنی جلد فوج اس کی مدد کو نہیں آ سکتی تھی اگر وہ قلعہ بند ہو کر بیٹھ جائے تو افغان فوج کا کب تک مقابلہ کر سکے گا، شہر میں موجود اناج اور گھوڑوں کی خوراک کے ذخائر کب تک چل سکیں گے؟ لاہور کے شمال مشرقی افق پر جہان خان اور جنوب مغرب میں خواجہ عبداللہ خان کی فوجوں کے اچانک نمودار ہونے کی خبروں کے بعد اس نے ناظم شہر اور قلعہ دار سے سب معلومات حاصل کی تھیں اور شام سے اپنے سرداروں کے ساتھ مشورہ کر رہا تھا۔ آدینہ بیگ ہمیشہ افغان فوجوں سے لڑائی سے بچتا رہا تھا، جب بھی ابدالی کی افواج نمودار ہوتیں وہ اپنی فوج سمیت علاقہ خالی کر کے ان سے دور چلا جاتا تھا۔ کیا اب وہ اس کی درخواست پر افغانوں سے لڑنے لاہور آئے گا؟ کسی سردار نے بھی اس امید کے سہارے جہان خان اور عبداللہ خان کی فوجوں سے لڑنے کی حمایت نہیں کی تھی۔ شاہجہان آباد نے آج تک احمد شاہ ابدالی کی فوجوں کے مقابلہ کے لئے فوج پنجاب نہیں بھیجی تھی، وہ ان پہلوؤں پر غور کر رہے تھے۔

صورت حال ہر لحاظ سے خراب تھی لیکن آدینہ بیگ نے لاہور کا نظم و دفاع اس کے سپرد کر کے اس پر جو اعتماد کیا تھا صدیق خاں اس پر پورا اترنا چاہتا تھا اور لاہور خالی کر کے جالندھر کی طرف واپس چلے جانے کا مشورہ ماننے کے لئے تیار نہیں تھا۔

''اگر ہم لڑ کر شکست اٹھاتے ہیں تو شہر پر قبضہ بھی ہو جائے گا اور ہماری فوجی طاقت بھی کچل دی جائے گی۔ اگر قلعہ بند ہو کر لڑتے ہیں اور کسی طرف سے کوئی مدد نہیں آتی تو آخر افغانوں سے صلح کرنا پڑے گی اور وہ ہمیں گرفتار کر کے قندھار لے جائیں گے اور فوج منتشر ہو جائے گی''۔ ایک سردار نے رائے دی۔

''صدیق خان اپنے دامن پر کمزوری کا دھبہ لگوانے کی بجائے میدان جنگ میں لڑتے ہوئے موت پسند کرے گا''۔ اس نے جواب دیا۔

''سوال صدیق خاں کی زندگی یا موت کا نہیں، نواب آدینہ بیگ کی فوجی قوت کو بچانے کا ہے۔ انہوں نے خود ہمیشہ یہی طریقہ اختیار کیا ہے۔ فوج سلامت رہی تو ہم پھر لاہور پر قبضہ کر سکتے ہیں، شکست سے ہو گئی یا ہتھیار ڈالنا پڑے تو دوآبہ جالندھر میں بھی نواب کی حیثیت متاثر ہو گی''۔ دوسرے سردار نے کہا۔

صدیق خان کسی رائے سے اتفاق کئے بغیر اور کوئی فیصلہ کئے بن اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ''ہم چاہتے ہیں آپ مزید سوچیں اور کوئی بہادروں والا منصوبہ بنائیں، کل شب نئی سوچ پر غور کر کے کوئی فیصلہ کریں گے''۔

باقی فوجی سردار بھی کھڑے ہو گئے، دیوان خاص سے باہر آئے تو پوہ کی سرد صبح میں آسمانوں سے دھند کے بادل قلعہ کے در و دیوار پر نازل ہو رہے تھے۔ ہوا کے دوش پر اترتی دھند میں وہ اپنی سواریوں کی طرف چلے تو ان کے چہروں اور پیشانیوں پر اوس پڑنے لگی۔

خواجہ عبداللہ خان کے فرار اور آدینہ بیگ کے قبضہ سے طہماس خاں کے بہت سے فرائض اور روابط ختم ہو گئے تھے۔ جب تک صدیق خاں نے مغلانی بیگم کی حویلی کے باہر اپنی فوج کا دستہ متعین نہیں کیا تھا وہ پہریداروں کی نگرانی کرتا تھا۔ صدیق خاں کے دستہ کے آ جانے سے اس کی یہ ڈیوٹی ختم ہو گئی تو وہ شہر اور قلعہ کی خبریں جمع کرنے کے کام پر لگ گیا۔ پرانے ملازمین اور شہر کے ترک امراء سے اس کے تعلقات تھے اور یہ دونوں طبقے آدینہ بیگ ک قبضہ اور صدیق خاں کی حکومت سے ناخوش تھے۔ ترک امراء کی ناراضگی کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ پنجاب کا نائب حاکم ان میں سے نہیں تھا اور ان کی مدد اور مشورہ کے بغیر حکومت چلانے کی کوشش کر رہا

تھا۔ قلعہ سے جو خبریں ملتیں وہ ایک دوسرے تک پہنچاتے۔ صدیق خاں کی مشکلات اور کامیابیوں کے بارے میں اپنی حویلیوں اور بیٹھکوں میں تبادلہ خیال کرتے رہتے تھے۔ طہماس خاں یہ معلومات مغلانی بیگم کو پہنچا دیتا تھا۔ جب اس نے لاہور کے افق پر جہان خان اور خواجہ عبداللہ خان کی فوجوں کے طلوع ہونے کی خبر دی تو ملانی بیگم کے ذہن میں احمد شاہ ابدالی کا پیغام تازہ ہو گیا۔

''ہماری بیٹی سے کہہ دیں ہم جلد اس کی تکلیف کا مداوا کریں گے''۔ وہ مستقبل کے امکانات کا خاکہ بُننے لگی۔

حویلی کے دروازے پر متعین صدیق خان کے دستہ کا کمانداربیگم کی اہمیت اور ہوشیاری سے واقف نہیں تھا، وہ یہ ڈیوٹی حفاظتی پہرہ سمجھ کر دیتا تھا۔ اس لئے مغلانی بیگم کے ملازمین کو باہر آنے جانے کی مکمل آزادی تھی جس کا فائدہ اٹھا کر مغلانی بیگم نے خبر رسانی منظم کر لی تھی مگر جہان خان کی فوجوں کی آمد اتنی اچانک تھی کہ ملک سجاول بھی اسے پہلے سے آگاہ نہیں کر سکا تھا۔ اس نے حویلی کے اندرونی انتظامات کا جائزہ لیا اور اپنے ملازمین کو ہوشیار رہنے کا حکم دے کر نئی خبر کا انتظار کرنے لگی۔

دوسرے روز خبر پہنچی کہ جہان خان کی فوجوں نے راوی عبور کر کے محمود بوٹی کے میدان میں کیمپ لگا دیا ہے تو اس نے دیوان حافظ سے فال نکالی اور شیش محل میں واپسی کی گھڑیاں گننے لگی۔ قلعہ سے صدیق خان کے ارادے کے بارے میں کوئی تازہ خبر نہیں آئی تھی۔ اگر اس نے افغان فوج کا شہر سے باہر نکل کر مقابلہ کرنا ہے تو اب تک قلعہ میں کیوں بند ہے اور اگر قلعہ بند ہو کر آدینہ بیگ کا انتظار کرنا ہے تو اس کی حویلی سے باہر متعین دستہ ابھی تک واپس کیوں نہیں بلوایا؟ وہ صدیق خان کے ارادوں اور منصوبوں کے بارے میں سوچتی ہوئی نیند کی آغوش میں چلی گئی۔

نصف رات گزرے شور کی آواز سے آنکھ کھلی تو

جواہر ریزے

○ دلوں کو فتح کرنے کے لئے تلواروں کی نہیں بلکہ عمال کی ضرورت ہوتی ہے۔

○ جو شخص اپنی زندگی میں کوئی بھی کارنامہ انجام نہیں دیتا وہ اس دنیا میں نہ آنے کے مترادف ہے۔

○ تعجب ہے اس شخص پر جو خود تو یہ چاہتا ہے کہ لوگ اس کو پسند کریں مگر عمال ایسے کرتا ہے کہ لوگ اس سے نفرت کریں۔

(جواد حیدر)

حویلی میں ہنگامہ بپا تھا، پہریدار شمعیں اٹھائے ادھر اُدھر بھاگتے پھر رہے تھے، بچے اور عورتیں سراسیمگی کی حالت میں زنانہ میں جمع تھے اور حویلی کے باہر سے گولیاں چلنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ کمرے کی کھڑکی سے لگی حالات کا اندازہ کرنے کی کوشش کرنے لگی اور پھر دروازہ کھول کر باہر آ گئی۔ ''حوصلہ رکھیں شب کی سیاہی چھٹنے والی ہے''۔ اس نے گولیوں کے رخ کا اندازہ کرتے ہوئے کہا اور واپس خواب گاہ میں چلی گئی جہاں عمدہ بیگم اور وقار بیگم دروازے سے لگی کھڑی تھیں۔ مغلانی بیگم نے انہیں بستروں میں جانے کو کہا اور خود برآمدے میں ٹہلنے لگی۔

طہماس خاں اور میاں خوش فہم مردانہ کی طرف سے نمودار ہوئے، ان کے ہاتھوں میں شمعیں تھیں، بیگم کو برآمدے میں ٹہلتے دیکھ کر وہ وہیں رک گئے۔

''ہم جاننا چاہتے ہیں یہ ہنگامہ کیسا تھا؟'' بیگم نے انہیں قریب بلا کر پوچھا۔

''دوست فوج نے دشمن کے پہریدار دستہ کو ختم کر دیا ہے''۔ انہوں نے خوشی سے اطلاع دی۔

''تم نے کیسے اندازہ کیا دشمن کو دوست نے ختم کیا ہے؟'' مغلانی بیگم نے پوچھا۔

"فاتح دستہ کا کماندار دروازے پر کھڑا ہے اور حضور کے لئے سلامتی اور خوشی کا پیغام بھیجا ہے"۔ طہماس خاں نے بتایا۔

"ڈیوڑھی اور دروازے پر پہریدار چوکس رہیں اور انہیں پیغام دیں کہ ہم صبح خوشخبری وصول کریں گے"۔ بیگم نے حکم دیا۔

"ملک قاسم بھی ان کے ہمراہ ہے اور سلام بھیجا ہے"۔ طہماس خاں نے بتایا۔

مغلانی بیگم کوئی جواب دیئے بغیر ڈیوڑھی کی طرف چل دی۔ طہماس خاں اور میاں خوش فہم پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ ڈیوڑھی میں متعین پہریداروں نے بیگم کو آتے دیکھا تو مستعد کھڑے ہو گئے۔ طہماس خاں نے بیگم کی ہدایت پر موٹے کواڑ میں بنے گول سوراخ پر سے لکڑی ہٹائی اور سوراخ پر منہ رکھ کر بلند آواز میں کہا۔ "ملک قاسم کے دوست ان سے بات کریں گے"۔

پھر اس نے ان جوانوں میں سے ایک کو اشارہ کیا جو ملک سجاول نے پہرہ کے لئے بھیجے تھے۔ جوان نے آگے بڑھ کر سوراخ پر منہ رکھ کر ملک قاسم کا نام لے کر سلام کیا اور جواب سننے کے لئے کان سوراخ سے لگا دیا۔ آواز پہچان کر اس نے تصدیق کر دی کہ ملک قاسم بذات خود باہر موجود ہے۔

بیگم نے اسے قریب بلایا اور آہستہ سے کان میں کچھ کہا۔ وہ واپس مڑا اور سوراخ پر منہ رکھ کر اونچی آواز میں کہا۔ "بیگم حضور کے مجرم کا نام کیا ہے اور وہ کس حال میں ہے"۔

اور جواب کے لئے اپنا کان سوراخ پر رکھ دیا باہر سے جواب سن کر اس نے بیگم کو بتایا۔ "حضور کا مجرم شہباز دست بستہ باہر کھڑا ہے اور معافی کا خواستگار ہے"۔

شہباز کا نام سن کر طہماس خاں کا سر چکرانے لگا۔ بیگم واپس زنانہ کی طرف چل دی۔ "ملک قاسم اور ان کے آدمیوں کو مہمان خانہ میں پہنچا دیں۔ ان کے ہمراہ افغان فوجی ہوں تو انہیں باہر خیموں میں ٹھہرائیں، ہم صبح ملک قاسم سے ملنا چاہیں گے"۔

صدیق خان اس شب کی سیاہی میں اپنی فوجوں کے ساتھ قلعہ سے فرار ہو گیا تھا۔ اس نے بھاگنے کا فیصلہ اتنا اچانک کیا کہ بھوانی داس کو بھی ساتھ نہ لے جا سکا۔ شہر کے دروازوں پر متعین محافظوں کو اس کے فرار کا اس وقت پتہ چلا جب صبح کی ڈیوٹی والے انہیں فارغ کرنے نہیں آئے۔ انہوں نے جلدی جلدی سامان باندھا اور دروازے باہر سے مقفل کر کے اسی راستے پر بھاگ گئے جس سے صدیق خاں اپنی فوج اور عمال کے ساتھ قصور کی طرف بھاگ گیا تھا۔ جہان خان کی فوج کا ہراول دستہ پہنچا تو قلعہ کے دروازے کھلے تھے اور شہر کے مقفل۔ اہلِ لاہور کو صدیق خاں کے فرار کی سند ان افغان سپاہیوں نے دی جو سب طرف سے شہر میں داخل ہو گئے تھے اور بازاروں میں فاتحانہ گھومتے پھر رہے تھے۔ دکانداروں نے جلدی جلدی دکانیں بند کر دیں، اہل شہر گھروں کے دروازے بند کر کے بیٹھ گئے، جو دکان کھلی رہ گئی افغانوں نے لوٹ لی۔

جہان خان نے نادر بیگ کو ہراول دستہ کے ساتھ بھیج دیا تھا۔ اس نے قلعہ کا نظم اپنے ہاتھ میں لے لیا اور جو کچھ صدیق خان اپنے ساتھ نہیں لے جا سکا تھا اس کی حفاظت کے لئے قلعہ کے اندرونی مکانات اور دیوانوں کو مقفل کروا کر پہریدار مقرر کر دیئے۔

خواجہ عبداللہ خان اپنی افواج کے ہمراہ نیاز بیگ کے قریب خیمہ زن تھا جہاں خان نے اسے پیغام بھجوایا کہ جب تک نیا پیغام نہ پہنچے وہ وہیں مقیم رہے۔ چمن لعل کو جلد از جلد شہر کا نظم بحال کرنے کا حکم اور سپاہ دے کر بھیجا جس نے آتے ہی اعلان کروا دیا کہ عام و خواص کے جان و مال کی حفاظت اس کا فرض ہے اور وہ اسی طرح اپنا

فرض ادا کرے گا جس طرح پہلے کیا کرتا تھا۔

***

بیگم پورہ سے شاہی قلعہ تک سڑک کے دونوں طرف جہان خان کی فوج کے سوار اور پیادہ قطاریں باندھے کھڑے تھے۔ دردانہ بیگم کی حویلی کی ڈیوڑھی سے قلعہ کے مستی دروازہ تک پوہ کی چمکیلی دھوپ میں افغان سپاہیوں کی پگڑیاں خوبصورت منظر پیش کر رہی تھیں، شہر اور نواحی بستیوں کے لوگ جگہ جگہ جمع تھے۔ نئے حکمرانوں کا آنا اور پرانے حکمرانوں کا جانا ایک معمول سا بن چکا تھا۔ ایسے موقعوں پر لوگ اپنے جان و مال کی فکر میں رہتے تھے مگر آج ہر طرف میلے کا سا سماں تھا۔ مغلانی بیگم کی سواری حویلی سے برآمد ہوئی تو دروازے کے سامنے متعین سوار دستہ نے انہیں سلامی دی اور پیچھے چلنے لگا۔ جس راستہ پر سے اس کے ماموں عبداللہ خاں کے سپاہی اسے پالکی میں بند کر کے حویلی میں قید کرنے لائے تھے اسی پر وہ فاتحانہ جلوس کے ساتھ قلعہ کی طرف رواں تھی۔ راستہ کے ساتھ کھڑے فوجی اسے سلام کر رہے تھے اور شہری تالیاں بجا بجا کر اپنی خوشی کا اظہار کر رہے تھے مگر اس کے اپنے چہرے پر فتح یا خوشی کا کوئی تاثر نہیں تھا۔

اپنی ماں کی حویلی میں بند اس نے کئی بار شیش محل میں واپسی کے خواب دیکھے تھے۔ متعدد بار حالات کی رفتار اور انداز نے اس کے خوابوں کو دھندلا دیا تھا مگر اس نے ہمت اور حوصلہ کبھی نہیں چھوڑے تھے۔ سخت پہرے اور پرانے عمال سے محرومی کے باوجود وہ حالات کو اپنے حق میں بدلنے کی کوشش کرتی رہی تھی اور ایک بار پھر ان کوششوں میں اسے کامیابی ہوئی تھی۔ احمد شاہ ابدالی نے اس کے مرحوم خاوند سے جو عہدِ وفا باندھا تھا ایک بار پھر پورا کر دکھایا تھا۔ اس کے باوجود افغان فوجوں کے تعظیم و تکریم کے جذبہ کو دیکھ کر اس کے دل کے کسی گوشے میں شک کا بیج جڑ پکڑنے لگا تھا۔

جلوس قلعہ کے دروازے پر پہنچا تو سورج غروب ہو رہا تھا۔ نادر بیگ اور جہان خاں کے نائب نے دروازے پر اس کا استقبال کیا، شیش محل کو جانے والے راستوں کو خوبصورت انداز میں سجایا گیا تھا، جلوس کے ساتھ آنے والا دستہ قلعہ کے دروازے پر رہ گیا اور نادر بیگ کے دستہ نے اس کی جگہ لے لی۔ شیش محل کے دروازے پر پہنچ کر وہ سواری سے اتری اور رکوع کی حالت میں کھڑے پہریداروں اور خدام کی قطاروں کے درمیان سے ہوتی ہوئی شیش محل کے احاطہ میں داخل ہو گئی۔ نادر بیگ اور دیگر فوجی اور سول حکام سر جھکائے اس کے پیچھے چل رہے تھے۔

اس کے گھریلو ملازمین، خدام اور کنیزوں کو صبح ہی شیش محل پہنچا دیا گیا تھا، ان کے بعد عمدہ بیگم اور وقار بیگم کو بھی شیش محل بھیج دیا گیا تھا۔ اس لئے جب وہ محل میں داخل ہوئی تو سب خدام اور کنیزیں اپنے اپنے مقام پر مجرا ادا کرنے کے لئے موجود تھے۔ نشست گاہ کے دروازے پر پہنچ کر نادر بیگ اور سردار رک گئے اور ان کے اندر جانے تک دروازے پر مؤدب کھڑے رہے۔ پردے کے پیچھے گل بنفشہ، گلنار اور دیگر کنیزیں پھول لئے کھڑی تھیں جیسے ہی بیگم نے اندر قدم رکھا انہوں نے ان کے پاؤں کے آگے پھول بکھیرنا شروع کر دیا۔ نشست گاہ کو ان کے پسندیدہ انداز میں سنوارا جا چکا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی سامنے کی دیوار تک گئی اور اسی کھڑکی کے سامنے کھڑی ہو گئی جس کا پردہ ہٹا کر وہ راوی اور اس کے اس پار کی راہوں میں کچھ تلاش کیا کرتی تھی۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ پردہ ہٹا کر کھڑکی کھول دے مگر پھر کچھ سوچ کر واپس نشست پر آ کر بیٹھ گئی۔ گل بنفشہ نے عمدہ بیگم اور وقار بیگم کی حاضری کی خواہش سے آگاہ کیا تو اس کی سوچ نے راستہ بدل لیا۔

عمدہ بیگم اور وقار بیگم کے چہرے پھول کی مانند کھلے

ہوئے تھے، ان کے پیچھے کنیز گلدستے لئے کھڑی تھی، بیٹیوں کو دیکھتے ہی وہ اپنی جگہ پر کھڑی ہوگئی۔ بیٹیوں نے آگے بڑھ کر آداب عرض کیا اور گلدستے پیش کیے۔ مغلانی بیگم نے گلدستے وصول کر کے سرما کے پھولوں کی مہک سونگھی، پھولوں کو غور سے دیکھا تو تعریف کی اور کنیز کو واپس تھما کر بیٹیوں کو سینے سے لگالیا۔

وقار بیگم نے نظریں اٹھا کر ماں کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے معصومانہ انداز میں پوچھا۔ ''اماں حضور! آپ کو ہمارے پھول پسند نہیں آئے؟''

''جانِ مادر! یہ کیوں سوچا؟'' اس نے جھک کر اس کی پیشانی چوم لی۔ ''ہم تو ان کی تعریف کے لئے مناسب الفاظ نہ ڈھونڈ سکے''۔ اس نے چہرے پر مسکراہٹ اوڑھنے کی کوشش کی۔

کنیز سنہری طشتری میں قہوہ کی پیالیاں اور کوزہ مصری سجائے نمودار ہوئی، دوسری کنیز نے بڑھ کر دسترخوان بچھایا اور قہوہ سجا کر دروازے کے سامنے جاکر کھڑی ہوگئی۔ مغلانی بیگم نے فنجان اٹھائی تو عمدہ بیگم اور وقار بیگم بھی مصری کی ڈلیاں منہ میں رکھ کر قہوہ چسکنے لگیں۔

''اماں حضور! نانی اماں کی حویلی کے قہوہ سے اس قہوہ کا ذائقہ خوشگوار ہے، یہ شاہ قندھار نے تو نہیں بھیجا؟'' وقار بیگم نے پوچھا۔

''جانِ مادر! قہوہ تو وہی ہے مگر مقام بدل گیا ہے، مقام کے بدلنے سے انسان اور اس کے منہ کا ذائقہ بھی بدل جاتا ہے''۔ مغلانی بیگم مسکرائی۔

عمدہ بیگم نے محسوس کیا کہ ان کی ماں آج اتنی خوش نہیں جتنی خوش انہیں ہونا چاہئے تھا اور وہ ان کی باتوں میں ویسی دلچسپی نہیں لے رہی جیسی لیا کرتی تھی۔ ''اماں حضور! آپ نے ہمیں ملک سجاول کے گاؤں بھیجنے کا وعدہ کیا تھا، شاہ قندھار نے اپنی بیٹی سے وعدہ پورا کر دیا۔ حاکم پنجاب اپنی بیٹیوں سے وعدہ کب پورا فرمائیں گی؟'' اس نے ماں کی سوچ بدلنے کو کہا۔

''ملک قاسم کی سزا پوری ہوگی تو ہم بھی اپنا وعدہ پورا کرنے کی کوشش کریں گے''۔ بیگم نے جواب دیا۔

''کیسی سزا؟ اماں حضور! ملک قاسم نے کیا جرم کیا ہے؟'' وقار بیگم حیرانی سے چلائی۔

''ہم نے قلعہ دار کو حکم دیا ہے کہ قاسم اور ان کے ساتھیوں کو کالے برج میں قید کر دیا جائے''۔ وہ اب بھی سنجیدہ تھی۔

''اماں حضور! ملک قاسم اور ان کے ساتھیوں کا تو ہم پر احسان نہیں؟'' وقار بیگم پریشان ہوگئی۔

''انہوں نے ہماری بیٹی کو اس رات پریشان کر دیا تھا، ہم ان کا یہ جرم معاف نہیں کر سکتے''۔

''ہم تو اس رات ہرگز پریشان نہیں تھے''۔ وقار بیگم نے جواب دیا۔

''اگر آپ گواہ پیش کر سکیں تو ہم اسے معاف کرنے کے بارے میں سوچ سکتے ہیں''۔

''خواہر عزیز ہماری گواہ ہیں۔ حضور کا حکم نہ ہوتا تو ہم تو ڈیوڑھی میں جاکر خود بندوق چلانا چاہتے تھے''۔

''اس نے گولیاں چلا کر ہماری بیٹی کی نیند خراب کی، ہمیں اس کی اس حرکت پر سخت غصہ ہے''۔

''اس پر تو ہمیں بھی غصہ ہے، اسے آدینہ بیگ کے فوجیوں کو گولیوں کی بجائے پھولوں سے زخمی کر کے گرفتار کرنا چاہئے تھا''۔ وقار بیگم کی موٹی موٹی آنکھوں میں شرارت تھی۔

مغلانی بیگم مسکرا دی۔ ''آپ معاف کر دیں تو ہم بھی اسے معاف کر سکتے ہیں ورنہ اسے جیل جانا ہوگا''۔

''خواہر محترم سفارش کریں تو ہم معاف کر سکتے ہیں ورنہ کوئی ارادہ نہیں''۔

''ہم حضور سے ملک قاسم اور ان کے ساتھیوں کے

لئے معافی کی درخواست کرتے ہیں''۔ عمدہ بیگم نے ہاتھ باندھ کر درخواست گزاری۔

''آپ کے احترام میں ہم نے ملک قاسم اور اس کے ساتھیوں کو معاف کیا''۔ وقار بیگم نے خوشی سے اعلان کرنے کے انداز میں کہا۔ مغلانی بیگم اور عمدہ بیگم کے چہروں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

''وقار بیگم اور عمدہ بیگم اجازت لے کر نشست گاہ کا پردہ ہٹا کر باہر نکل گئیں۔

''مغلانی بیگم دیر تک اس دروازے کی طرف دیکھتی رہی۔ عمدہ بیگم کا حسن اور جوانی دیکھ کر وہ حاکم پنجاب سے ایسی ماں بن گئی جس کی جوان بیٹی گھر میں بیٹھی تھی جس کے لئے وہ ماں بھی تھی اور باپ بھی۔ حکمرانی کے جھمیلوں اور قید و بند کے مرحلوں میں وہ اس فرض کی ادائیگی کے لئے مناسب وقت کا انتظار کرتی رہی تھی لیکن اب زیادہ انتظار نہیں کر سکتی۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ حالات اچھے ہوں یا بُرے وہ بیٹی کو اس کے گھر بھیج دے گی لیکن اس کے جانے کے بعد وہ خود جدائی برداشت کر لیں گی؟ اندیشہ ہائے دور و دراز کے وسوسوں نے اس کا محاصرہ کر لیا اور وہ ذاتی المیوں اور انسانی محرومیوں کے بحرِ بے کراں میں غوطے کھانے لگی۔

گل بنفشہ نے پردے کے پیچھے جھانکنے کی کوشش کی تو اسے احساس ہوا کہ وہ پھر سے حاکم پنجاب ہیں اور حاکموں کا اپنے ذاتی المیوں اور محرومیوں کے بارے میں سوچنا امور ریاست کے لئے نقصان دہ ہوا کرتا ہے۔

گل بنفشہ نے بتایا کہ میاں خوش فہم کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں۔

''حاضر کریں''۔ وہ تکیہ سے سیدھی ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

''نادر بیگ اور ملک قاسم کی درخواست ہے کہ انہیں حاضری کی اجازت دی جائے''۔ میاں خوش فہم نے جھک کر اطلاع دی۔ اس کے انداز سے محسوس ہوتا تھا کہ وہ ہواؤں میں اڑتا پھر رہا ہے۔

''ہم سمجھتے ہیں انہیں بیک وقت حاضری پسند ہو گی؟'' مغلانی بیگم نے استفہامیہ انداز میں کہا۔

''حضور کی رضا ان کے لئے خوش بختی ہو گی''۔ خوش فہم نے کہا اور دروازے کی طرف مڑ گیا۔

جہان خان نے ابھی تک ان کے حضور حاضری نہیں دی تھی۔ بیگم پورہ سے شیش محل تک راستہ کے دونوں طرف افغان فوجیوں کے اجتماع سے اس نے گمان کیا تھا کہ بادشاہ نے خواجہ عبداللہ خان اور مہدی خان کی زیادتیوں کو پسند نہیں کیا اور جہان خان پہلے کی طرح ان کا مقام و احترام بحال کرنا چاہتا ہے اسی لئے اس نے خواجہ عبداللہ خان اور اس کی سپاہ کو بھی ابھی تک شہر میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی تھی لیکن خود جہان خان نے ابھی تک ان کے حضور حاضری کیوں نہیں دی؟ نادر بیگ کی کیا رائے ہے؟ وہ جاننا چاہتی تھی۔

''ہم سمجھتے ہیں قلعہ کا نظم تم نے بحال کر دیا ہے؟'' مغلانی بیگم ملک قاسم اور نادر بیگ کو سامنے کی نشستوں پر بیٹھنے کا اشارہ کر کے نادر بیگ سے مخاطب ہوئی۔

''حضور کا غلام اثبات میں جواب دے کر خوشی محسوس کرتا ہے''۔ نادر بیگ نے جواب دیا۔

''جنرل جہان خان کہاں فروکش ہیں، ہمیں ابھی تک بتایا کیوں نہیں گیا؟''

''بادشاہ معظم کے جرنیل شالامار باغ میں اپنی فوجوں کے کیمپ میں فروکش ہیں اور غلام یہ خبر دینے آیا ہے کہ وہ حضور کے روبرو حاضری کی اجازت چاہتے ہیں اور پیامبر بھیجا ہے کہ کب حاضر ہوں''۔

''ہماری خواہش ہے کہ دیوان خاص میں ان کے لئے خاص نشست کا اہتمام کیا جائے اور امرائے شہر کو اس میں شرکت کے لئے طلب کیا جائے''۔ بیگم نے حکم دیا۔

"بندہ ان کے پیامبر کو حضور کے حکم سے آگاہ کر دے گا"۔

"ہم سمجھتے ہیں تم اس حکم اور دربار کے لوازمات کے معنی سمجھ گئے ہو گے"۔

"حضور کی بندہ پروری ہے"۔ نادر بیگ نے تعظیماً سر جھکا دیا۔

"ملک قاسم اور ان کے نوجوان ساتھی بھی دربار میں موجود ہوں گے"۔ بیگم نے کہا۔

"ہم حضور سے واپسی کی اجازت لینے آئے تھے، صبح چل کر ہم دوپہر تک ملک پور پہنچ جائیں گے"۔ نادر بیگ کے جواب سے پہلے قاسم بول پڑا۔

"آپ ہمارے دکھ میں ساتھ رہے، مسرت میں شریک ہو کر ہماری خوشی میں اضافہ نہیں کریں گے؟"

"حضور کے حکم کی تعمیل فرض ہے"۔ ملک قاسم کے لئے انکار کا چارہ نہ تھا۔

***

بادِ شمال نے پوہ کی سیاہ رات کو اور بھی سرد کر دیا تھا، اہالیان لاہور گہری نیند سو رہے تھے لیکن مغلانی بیگم ابھی تک جاگ رہی تھی۔ فرشی شمعدان کے پاس بیٹھی وہ احمد شاہ ابدالی کا فرمانِ خاص ایک بار پھر پڑھ کر اس کے معانی و مطالب کو معروضی حالات پر منطبق کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ بادشاہ کے فرمان میں پنجاب آدینہ بیگ کے غاصبانہ قبضہ سے واگزار کر کے بیگم کا اختیار بحال کرنے کا ذکر تو تھا مگر خواجہ عبداللہ خاں کے مہدی خان کی مدد سے اقتدار پر قبضہ کرنے اور بیگم کو اس کی والدہ کی حویلی میں قید کرنے کا ذکر نہیں تھا اور نہ ہی اس جانب کوئی اشارہ تھا۔ جہان خاں کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ لاہور میں مقیم رہیں اور اگر واپس پشاور آنا لازم ہو جائے تو کوئی مناسب بندوبست کر کے آئیں۔ خواجہ عبداللہ خاں نے لاہور سے صدیق خاں کے اخراج میں جہان خان کے ساتھ حصہ لیا تھا اور اب تک لاہور سے باہر اپنی فوجوں کے ساتھ خیمہ زن تھا۔ جہان خان کے بعد اس خطہ میں فوج اسی کے پاس ہو گی۔ اگر جہان خان واپس جاتا ہے تو لازماً اس کی جگہ خواجہ عبداللہ خان لے گا۔ مغلانی بیگم کے نقطۂ نظر سے حالات زیادہ خوش کن نہیں تھے۔ احمد شاہ ابدالی نے لازماً خواجہ عبداللہ خان کو سرزنش کی ہو گی اس نے سوچا اگر وہ جہان خان کی جگہ لیتا ہے تو بادشاہ کو دوبارہ ناراض کرنے کی جرأت نہیں کرے گا لیکن اگر اس کا رویہ بہتر نہیں ہوتا تو اسے کیا کرنا ہو گا اور موجودہ حالات میں وہ کیا کیا کر سکتی ہے؟ عماد الملک نے کبھی اس کی مدد نہ کی تھی، نہ کبھی کر سکے گا۔ اس کے پاس احمد شاہ ابدالی کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں اگر ہوئی بھی تو شاید وہ مغل بادشاہ کی مرضی کے خلاف اسے پنجاب کی حاکمیت پر بحال نہ رکھ سکے گا۔ مغل دربار کے ترک امراء عماد الملک کو اس کی اس طرح کھل کر مدد نہیں کرنے دیں گے جس طرح احمد شاہ ابدالی اب تک کرتا رہا ہے۔ اس نے شمعدان کے شعلے کے پار دیکھنے کی کوشش کی تو شعلہ میں عمدہ بیگم کھڑی نظر آئی۔ اب مجھے سب سے پہلے اس فرض سے فارغ ہونا ہے۔ اس نے اپنے آپ کو جیسے حکم سنایا ہو۔

***

آدھی رات کا زرد چاند تالاب کے ساقط پانی میں اور بھی زرد ہو گیا تھا۔ جہان خان تالاب کے درمیانی چبوترے تک پہنچ کر ٹھنڈے یخ پانی میں غوطے کھاتے، چاند کی طرف دیکھنے لگا۔ سرد ہوا کا جھونکا آیا، پانی میں ہلکا سا ارتعاش پیدا ہوا تو چاند زندگی کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ اس نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی تو چاند کی بڑھیا اپنے چرخہ کے سامنے بیٹھی سوت کات رہی تھی۔ جب وہ بچہ تھا تو رات کو چاند کی بڑھیا کے چرخے کی آواز سننے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ اب وہ جوان تھا، حاکم تھا، ایک

زبردست فوج کا کماندار تھا۔ بچپن اور جوانی حاکمیت اور غلامی زمین اور آسمان کے فاصلے اور فرق کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔

''چاند کی بڑھیا ازل سے سوت کات رہی ہے مگر اتنا دھاگہ کہاں گیا، مائی نے اس کا کیا بنایا؟'' ایک روز اس کی بیٹی نے اس سے معصومانہ سوال کیا تھا اور وہ اسے مطمئن نہیں کر سکا تھا۔ مسلمان ہندوستان پر صدیوں سے حکومت کر رہے ہیں اور آج بھی اپنے تحفظ کے لئے بیرونی مدد کے محتاج کیوں ہیں؟ ان میں اور چاند کی بڑھیا میں کیا فرق ہے؟ وہ سوچنے لگا ہلکے سے سیاسی ارتعاش سے عظیم مغلیہ سلطنت کا چاند زندگی کے لئے اسی طرح ہاتھ پاؤں مارنا شروع کر دیتا ہے جس طرح آسمانوں کا چاند تالاب کے پانی میں غوطے کھا رہا ہے اور مغل بادشاہ چاند کی بڑھیا کی مانند وقت کی لہروں میں بے وجود معلوم ہونے لگتا ہے۔ وہ سرد مرمریں فرش پر بیٹھ گیا پشاور کی حکومت اور پنجاب پر حملوں کی وجہ سے اسے پنجاب سے آگے شاہجہان آباد تک اور اس سے آگے ہندوستان کے کناروں تک کے حالات جاننے اور حاکموں اور امراء کو قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا جو موقع ملا تھا اس نے اسے پریشان کر دیا تھا۔ وہ کوئی ایسا انتظام کر کے جلد واپس جانا چاہتا تھا جس سے پنجاب میں پائیدار حکومت قائم ہو سکے اور اہالیان پنجاب کو سکھوں کی غارت گری سے نجات دلائی جا سکے مگر اسے کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ سابقہ حملے کے دوران وہ ان تمام ترک سرداروں اور امراء کو اپنے ساتھ قندھار لے گیا تھا جو نظم میں خلل کے ذمہ دار تھے۔ اس کے باوجود حالات بہتر نہ ہو سکے تھے اب احمد شاہ ابدالی نے اسے مغلانی بیگم کی تکریم اور بحالی کا حکم دے کر بھیجا تھا وہ حالات کا جائزہ لیتا رہا تھا۔ اسے اندازہ ہوا تھا کہ حالات کی اصلاح بیگم کے بس میں نہیں ہوگی۔ وہ اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرتا رہا تھا جن کی اکثریت نے کسی تجربہ کار مرد کو بیگم کے نائب کے طور پر پیچھے چھوڑنے کی رائے کی تائید کی تھی اور اس وقت لاہور اور پنجاب میں خواجہ عبداللہ خان ہی ایسا مرد تھا جس کے پاس فوج بھی تھی، تجربہ بھی اور مقامی حالات کا علم بھی۔ تو کیا ایک بار پھر خواجہ عبداللہ خاں کو بیگم کا نائب مقرر کرنا مناسب ہوگا؟ وہ اس بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکا تھا۔

چاند کی بڑھیا کو تالاب کے ٹھنڈے پانی میں غوطے کھاتا چھوڑ کر وہ سیڑھیاں چڑھ کر شالامار باغ کے آخری تختہ پر پہنچ گیا جہاں نہر کے دائیں طرف اس کے خیمہ میں خدام منتظر تھے، اس نے گرم پانی منگوایا اور وضو کر کے جانماز پر کھڑا ہو گیا۔

***

سکوت صبح میں سورج کی شعاعیں نہایت خاموشی سے باغ کی فصیل سے نیچے اتر آئی تھیں اور ناتراشیدہ اونچی گھاس میں سے رینگتی ہوئی افغان جرنیل کے خیمے کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ افغان فوج کے سردار دربار میں اس کے منتظر تھے۔ وہ گزشتہ شب کی بحث کی روشنی میں مزید بحث ومباحثہ میں مصروف تھے۔

''عبداللہ خان بہتر ہے، بیگم کا ماموں ہے اور اسے سمجھتا بھی ہے''۔ ایک سردار نے کہا۔

''مگر وہ لڑ بھی تو پڑے ہیں، اس کا کیا بنے گا؟'' دوسرے نے اعتراض کیا۔

''عورت تو لڑے گی جس کو مردوں پر حکمرانی کی عادت پڑ جائے وہ جو بھی آئے گا لڑے گی۔ اس کا غم نہ کرو اور اللہ کا نام لو''۔ اور نے کہا۔

''اللہ کا نام تو خان نے لینا ہے، ہم نے تو صرف باتیں کرنا ہیں''۔ پہلے سردار نے کہا۔

محفل میں قہقہہ پر خدام چونک پڑے۔

''اللہ کا نام تو خان ساری رات لیتا رہا، اب

دیکھیں کس کا نام لیتا ہے آ کر"۔ ایک اور سردار بولا۔

"ہمارا خان فوجوں سے نہیں ڈرتا، مغلانی بیگم سے کیوں ڈرے گا؟ اس نے جو کرنا ہے اپنی مرضی سے کرے گا"۔

"جس عورت ذات کے سر پر اس کا مرد نہ ہو اور اسے اپنی مرضی کرنے کی عادت پڑ جائے وہ جہاں ہو گی بربادی لائے گی"۔

"بربادی تو ہو چکی اور کیا کرے گی؟"

خادم نے جہان خان کے لئے خیمے کا پردہ اٹھایا تو وہ سب کھڑے ہو گئے۔ جہان خان سیدھا چلتا ہوا اپنی نشست پر جا کر بیٹھ گیا۔ سردار بھی اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔

"خواجہ عبداللہ خان کو بیگم کا نائب اور امیر لشکر بنا دیا جائے تو کیسا رہے گا؟" وہ پردے کے پیچھے کھڑا اپنے سرداروں کی باتیں سن چکا تھا۔

"ہم تو بہت بہتر سمجھتے ہیں، بیگم صاحبہ سے پوچھ لیں پھر تو نہیں لڑیں گے"۔ ایک سردار نے سپاہیانہ بے تکلفی سے کہا۔

"ہاں سانپ سے پوچھو تمہیں کس لاٹھی سے مارا جائے"۔ دوسرے سردار نے کہا۔

جہان خان اور دیگر سرداروں کے چہروں پر مسکراہٹ دیکھ کر ایک اور بولا۔ "ماموں بھانجی پنجاب نہ چلا سکے تو پھر کسی افغان کو بھیجنا پڑے گا، انہیں بتا دیں پھر نہیں لڑتے"۔

"جس کو بھی بنانا ہے زوردار بنانا ہے۔ جو عورت ذات کی حکمرانی میں ڈرے گا صوبہ نہیں چلے گا اس سے"۔ پہلا بولا۔

"ہم آپ کی رائے سے اتفاق کرتے ہیں۔ ابھی خواجہ عبداللہ خان کے لئے دستہ بھیجیں، شام کو ہم اس سے بات کریں گے"۔ جہان خان نے فیصلہ سنایا تو ان کا نائب اٹھ کر باہر نکل گیا۔

باقی سردار واپسی کے انتظامات پر تبادلہ خیال کرنے لگے۔

اگلی شام نادر بیگ نے مغلانی بیگم کو خواجہ عبداللہ خان کی جنرل جہان خان سے ملاقات کی خبر دی تو اس نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ کیا حالات و واقعات کے تجزیہ سے وہ ذہنی طور پر پہلے ہی یہ خبر سننے کے لئے تیار تھی۔

خواجہ عبداللہ خان کو نائب حاکم اور امیر لشکر مقرر کرنے کے بعد جہان خان خود قلعہ میں حاضر ہوئے اور مغلانی بیگم کو احمد شاہ ابدالی کی خواہش اور صوبہ کی بگڑتی ہوئی حالت سے آگاہ کیا۔ "حضور کی مجبوریوں کے پیش نظر سلطان معظم نے حکم دیا تھا کہ لاہور میں کوئی افغان نمائندہ نہیں رہے گا۔ خواجہ عبداللہ خان حضور کے حکم اور مشورہ کے مطابق شاہ قندھار کی نمائندگی کریں گے۔ فوج ان کی کمان میں ہو گی اور وہ امن و امان کا ذمہ دار بھی ہو گا"۔

مغلانی بیگم جہان خان کا مطلب اچھی طرح سمجھ رہی تھی مگر اس سے اختلاف نہیں کر سکتی تھی اور نہ ہی خواجہ عبداللہ خان کو پہلے سے بھی زیادہ اختیارات دینے پر اعتراض کر سکتی تھی، وہ خاموش بیٹھی سنتی رہی۔

"آدینہ بیگ کی شرارتوں اور سکھوں کی سرکشی کو اچھی طرح کچلنے کے لئے خواجہ کے پاس مضبوط فوج کی ضرورت ہے۔ سلطان معظم کی خواہش کے مطابق ہم نے انہیں ہدایت کی ہے کہ وہ جلد از جلد فوج کی تعداد میں اضافہ کریں"۔ جہان خان نے بات جاری رکھی۔

"فوج بھرتی کرنے کے لئے روپے کی ضرورت ہو گی اور ہمارے پاس خزانہ میں کچھ نہیں"۔ مغلانی بیگم نے خواجہ کی طاقت بڑھانے پر فنی اعتراض کیا۔

"روپے کا انتظام کرنا خواجہ کی ذمہ داری ہے، اس بارے میں حضور کو غم نہ ہونا چاہئے"۔ جہان خان نے اس

کا اعتراض مسترد کر دیا۔

"ہماری خواہش تھی کہ افغان فوج کا کچھ حصہ لاہور میں رہ جاتا اس سے آدینہ بیگ اور سرکشوں کو خوف رہتا"۔ بیگم نے پینترا بدلا۔

"حضور جب بھی ضرورت محسوس کریں شاہ قندھار کی فوج لاہور پہنچنے میں تاخیر نہیں کرے گی، یہ بادشاہ معظم کا حکم ہے۔ فی الحال مجھے فوج یہاں چھوڑ کر جانے کی اجازت نہیں"۔ جہان خان نے جواب دیا۔

"کشور پنجاب سلطان معظم کی سلطنت کا حصہ ہے، ہم ان کے بے حد مشکور ہیں کہ انہوں نے اس کی حاکیت کا فرض ہمیں سونپا اور جب بھی ہم پر کوئی مصیبت آئی ہماری مدد کے لئے آپ کو بھیجا۔ ہم شاہ قندھار کی سلطنت اور رعایا کی حفاظت کے لئے اپنی طرف سے پوری کوشش کریں گے اور ان کے احکامات اور خواہشات کی تعمیل ہم پر دین کی مانند فرض ہوگی"۔ مغلانی بیگم نے جہان خان کے کئے انتظام کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا۔

خواجہ عبداللہ خان کی فوجیں نیاز بیگ سے قلعہ منتقل ہوگئیں تو اس نے خود مغلانی بیگم کے حضور حاضری دی اور بادشاہ اور اس کے جرنیل جہان خان کے احکامات اور خواہشات کے مطابق صوبے کا نظم چلانے میں تعاون اور کوشش کا یقین دلایا۔

خواجہ عبداللہ خان کی باتوں اور اطوار سے بیگم نے اندازہ کیا کہ پہلے کی نسبت وہ زیادہ اعتماد سے اور زیادہ کھل کر بات کرنے لگا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو جہان خان کی طرف سے اسے کشور پنجاب کا نائب حاکم اور امیر لشکر مقرر کرنا تھی لیکن اس سے بھی بڑی وجہ مغلانی بیگم کی فوجی اور انتظامی کمزوری تھی کیونکہ اب اس کے ساتھ پرانے تجربہ کار عمال اور اپنی فوج نہیں تھی۔

مغلانی بیگم نے خواجہ عبداللہ خان کی باتوں میں کوئی مداخلت نہیں کی، وہ بھی اپنی پہلی اور موجودہ حیثیت میں فرق جانتی تھی۔

خواجہ عبداللہ خان نے اگلے ہی روز اقدامات شروع کر دیئے، شہر کے بعد صوبہ کے نظم کے بارے میں ہدایات جاری کیں اور مالیہ کے بقایا جات کی وصولی کے لئے ضلع داروں کو چٹھیاں لکھوائیں۔

مغلانی بیگم نے اس کے انتظامی اور مالی امور میں کوئی مداخلت نہیں کی۔

جہان خان نے اپنا کیمپ شالامار سے راوی کے اس پار مقبرہ جہانگیر میں منتقل کر لیا اور دو روز قیام کے بعد پشاور روانہ ہوگیا۔

***

آدینہ بیگ کو بھوانی داس کی بہت فکر تھی، پورے شہر میں اس کے مال و دولت کا شہرہ تھا۔ عام و خاص سب جانتے تھے کہ وہ آدینہ بیگ کا خاص نمائندہ ہے اگر وہ افغان فوجوں یا خواجہ عبداللہ خاں کے عمال کے ہاتھ لگ گیا تو اس کی جان خطرہ میں ہوگی۔ یہ سوچ کر وہ اسے لاہور سے نکالنے کی تدابیر سوچنے لگا۔ صدیق خان کا نوجوان واروغہ ولایت حسین لاہور اور مضافات کے احوال کو اچھی طرح جانتا تھا اور سکھ جتھے دار اسے جانتے تھے۔ آدینہ بیگ نے ولایت حسین کو ایک دستہ کے ساتھ لاہور بھیجنے کا حکم دیا تاکہ وہ بھوانی داس اور اس کے اہل و عیال کو نکال لائے۔ ولایت حسین اور اس کے ساتھی سفر تیزی سے طے کر کے لاہور پہنچے اور مغلپورہ میں رک گئے اور ایک مخبر کو بھوانی داس سے رابطہ کے لئے بھیجا۔ مخبر نے واپس جا کر اطلاع دی کہ شہر میں کسی بھوانی داس کے بارے میں کچھ علم نہیں، اس کی حویلی خالی پڑی ہے اور اس کے ملازمین میں سے کوئی وہاں موجود نہیں۔ اس کے پڑوسیوں نے بتایا ہے کہ ناظم شہر کے ملازمین بھی اسے ڈھونڈ رہے تھے، وہ اسے پکڑ کر لے گئے یا بھوانی داس شہر سے نکل جانے میں کامیاب ہوگیا، کسی کو کچھ علم نہیں۔

ولایت حسین کی پریشانی بڑھ گئی اگر بھوانی داس شہر سے نکل کر جالندھر جاتے ہوئے سکھوں کے ہتھے چڑھ گیا تو وہ اس سے مال واسباب چھین لیں گے اور اگر ناظم نے اس کو گرفتار کر لیا ہے تو رہائی مشکل ہو گی۔ وہ لکھپت رائے اور بھوانی داس کے تعلقات سے آگاہ تھا۔ یہ سوچ کر کہ شاید لکھپت رائے کو کچھ علم ہو وہ کوٹ لکھپت پہنچ گیا۔ بھوانی داس اپنے اہل وعیال سمیت وہاں چھپا ہوا تھا اور اپنا نقد زر اور سونا چاندی بھی بچا لے گیا تھا، ولایت حسین کو خوشی ہوئی۔ اگلی صبح وہ بھوانی داس اس کے بیوی بچوں اور مال وزر کے ساتھ جالندھر روانہ ہو گیا لیکن پہلی ہی منزل میں سکھوں نے لوٹنے کی غرض سے ان پر حملہ کر دیا۔ ولایت حسین بھوانی، داس، اس کے بیٹے اور دستہ کے ارکان مارے گئے۔ صرف ایک سپاہی بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوا۔ سکھ مال وزر کے علاوہ بھوانی داس کی بیوی اور بیٹی کو بھی اٹھا لے گئے۔

آدینہ بیگ کے لئے یہ نقصان بہت تکلیف دہ تھا۔ بھوانی داس نے زندگی بھر اس کا ساتھ دیا تھا، اس کی کامیابیوں میں اس کا بہت حصہ تھا۔ پنجاب کے راستوں پر درجنوں افراد سکھوں کے ہاتھوں ہر روز مارے جاتے تھے لیکن اس کے اپنے خاص آدمی کے اپنے ہی حلیفوں کے ہاتھوں اس طرح مارے جانے کا اس نے کبھی خیال نہ کیا تھا مگر وہ ایسا آدمی نہیں تھا جو ایسے نقصانات کا غم لے کر بیٹھ جائے۔ اس نے خبر سنی اور بھوانی داس کی جگہ لاہور میں تعین کے لئے مناسب آدمی کی تلاش میں لگ گیا۔ وہ کوئی ایسا آدمی لاہور بھیجنا چاہتا تھا جو خواجہ عبداللہ خاں کا اعتماد حاصل کر سکے اور ترک امراء کے حلقوں میں اثر ورسوخ رکھتا ہو۔ بھوانی داس جو معلومات اپنے مال و دولت کے ذریعے حاصل کرتا تھا نیا آدمی تعلقات سے حاصل کر کے اس تک پہنچا سکے۔

بھکاری خان کی ہلاکت کے بعد اس کے بہت سے عزیز و اقارب لاہور سے بھاگ گئے تھے۔ ان کا ایک رشتہ دار سید رحیم خان جالندھر میں مقیم تھا اگر وہ آمادہ ہو جائے تو اس سے مناسب کوئی آدمی نہ ہوگا۔ آدینہ بیگ کو بتایا گیا تو اس نے سید رحیم خاں کو بلا کر اس خدمت کے لئے بھاری معاوضہ اور انعامات کی پیشکش کی۔ بھکاری خان کی ہلاکت کے بعد سے اس کے عزیز و اقارب سرکار دربار سے دور ہو گئے تھے۔ آدینہ بیگ کی ملازمت میں آنے سے اس کے لئے کھویا ہوا مقام پھر سے حاصل ہو جانے کا امکان تھا۔ رحیم خان اس خدمت کے لئے راضی ہو گیا۔ آدینہ بیگ نے راستہ میں پڑنے والے تمام جتھے داروں کے نام خصوصی پیغام بھجوائے اور سید رحیم خاں کو بھاری رقم دے کر لاہور بھیج دیا۔

لاہور پہنچ کر رحیم خان نے ایک سرائے میں قیام کیا۔ دن کا بیشتر حصہ وہ اپنے کمرہ میں گزارتا تھا اور عصر کی نماز کے بعد پرانے دوستوں اور ملنے والوں میں گھوم پھر کر معلومات حاصل کرتا تھا۔ اسے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ خواجہ عبداللہ خان اور مغلانی بیگم میں جہان خاں کے جاتے ہی شدید اختلافات پیدا ہو گئے ہیں اور صوبہ کا نظم و نسق عملاً خواجہ عبداللہ خان کے ہاتھ میں ہے۔ مغلانی بیگم اگرچہ قلعہ میں مقیم ہے مگر اس کی نگرانی اسی طرح کی جا رہی ہے جس طرح بیگم پورہ کی حویلی میں قید کے وقت کی جاتی تھی۔ اس کے ملازمین کی بھی نگرانی کی جا رہی ہے۔ چمن لعل کو ناظم لاہور کے عہدہ سے ہٹا دیا گیا ہے اور اس کی جگہ خواجہ عبداللہ خان نے اپنا آدمی لگا دیا ہے۔ نادر بیگ اگرچہ ابھی تک قلعہ دار ہے مگر اس کے ماتحت عملہ میں خواجہ عبداللہ خان کے آدمی ہیں۔ مغلانی بیگم اس صورت حال سے بہت پریشان ہے مگر اب اسے احمد شاہ ابدالی سے اس سے زیادہ امداد اور حمایت کی توقع نہیں رہی۔ اس کے باوجود بیگم نے ہمت نہیں ہاری اور اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کرنے کی کوششوں میں مصروف ہے۔

ایک روز شام کی نماز ادا کر کے وہ مسجد وزیر خان سے باہر نکلا تو بازار میں اس کا پرانا واقف ریاست علی مل گیا، ریاست علی مغلانی بیگم کا بااعتماد ملازم تھا۔ سید رحیم خان بھکاری خان کے وقت سے اسے جانتا تھا لیکن اب خواجہ عبداللہ خان نے شہر کے دروازے بند ہونے کے بعد قلعہ میں اس کے داخلہ پر پابندی لگادی تھی۔

''ہم آپ کو شیش محل کی بجائے کشمیری بازار میں دیکھ کر حیران ہوئے ہیں''۔ سید رحیم خان نے بے تکلفی سے کہا۔

''اور ہم آپ کو لاہور میں دیکھ کر پریشان ہوئے ہیں''۔ ریاست علی نے جواب دیا۔ دونوں نے قہقہہ لگایا۔

''آپ کے زیر سایہ چند عزیز زندہ تھے، ان کی خیریت معلوم کرنے آنا پڑا، جلد واپس چلا جاؤں گا''۔ رحیم خان نے کہا۔

''ہم حضور کے عزیز نہ سہی اقارب جان کر ہمارے غریب خانہ کو رونق بخشیں''۔ ریاست علی نے اس کے طنز کے جواب میں کہا۔

''اقارب تو کیا، حضور عزیز از جان ہیں مگر جان سلامت جالندھر لے جانا چاہتا ہوں''۔ رحیم خان چاہتا تھا کہ ریاست علی کھل کر بات کرے۔

''تب جانیں جو غریب خانہ پر چند لمحے گزاریں''۔ ریاست علی نے جالندھر واپسی کا سن کر ضد کی۔

رحیم خان راضی ہو گیا، وہ پہلے ہی اس سے باتیں کرنا چاہتا تھا۔

ریاست علی کی بیٹھک میں کھانے کے بعد وہ ماضی کی یادوں سے مستقبل کے ارادوں تک پہنچ گئے مگر قلعہ کی باتیں کم ہوئیں۔ سید رحیم خان نہیں چاہتا تھا کہ ریاست علی کو کسی قسم کا شبہ پڑ جائے۔ اس کے باوجود رحیم خان مغلانی بیگم اور خواجہ عبداللہ خان کے باہمی تعلقات کے بارے میں کافی مفید معلومات حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

''اگر ہم آپ کے ساتھ جالندھر جانا چاہیں تو آپ کو اعتراض تو نہ ہوگا''۔ ریاست علی نے اچانک پوچھا۔

''ہم حضور کو سر پر اٹھا کر لے جانے کو تیار ہیں، آپ چلیں گے؟'' رحیم خان نے اس انداز میں کہا جیسے مذاق کر رہا ہو۔

''ایک دو روز تک جانا چاہوں گا''۔ ریاست علی نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''نواب آدینہ بیگ نے تو نہیں بلوایا؟'' رحیم خان نے مذاق کیا۔

''آپ ان کے ہاں نوکری دلوا دیں تو سامان بھی بندھوالوں گا''۔ ریاست علی نے قہقہہ لگایا۔

ملازم نے اطلاع دی کہ میاں ارجمند تشریف لائے ہیں۔

ریاست علی نے سید رحیم خان کی طرف دیکھا تو وہ بات سمجھ گیا۔ ریاست علی نے جلدی سے دروازہ کھول کر اسے دوسرے کمرے میں بھیج دیا۔ ملازم میاں ارجمند کے ساتھ بیٹھک میں داخل ہوا تو ریاست علی نے جھک کر اس کا استقبال کیا اور ملازم کو باہر بھیج دیا۔

''زادِ راہ اور بیگم حضور کی امانت وصول فرمادیں''۔ میاں ارجمند نے سرگوشی میں کہا۔

''بندہ بیگم حضور کی امانت کی حفاظت جان سے بڑھ کر کرے گا، اس تکلیف کے لئے شکریہ''۔ ریاست علی نے جواب دیا۔

''بیگم عالیہ کا حکم ہے۔ جلد روانہ ہوں اور ہفتوں کا سفر دنوں میں مکمل کریں، واپسی پر انعام و اکرام کو منتظر پائیں گے''۔ میاں نے کہا۔

''صبح نہیں تو اگلی صبح بندہ روانہ ہو جائے گا اور اڑ کر

شاہجہان آباد پہنچنے کی کوشش کرے گا"۔ ریاست علی نے جواب دیا۔

"خدا آپ کو سلامتی کے ساتھ لے جائے اور خوشی کے ساتھ واپس لائے"۔ میاں ارجمند نے دعا کی اور اٹھ کھڑا ہوا۔

ریاست علی دروازے تک اسے رخصت کرنے گیا اور واپس آ کر سید رحیم خاں کو بیٹھک میں بلا لیا۔

"ہم ڈرتے تھے شیش محل سے بلاوا آ گیا تو یہیں بند نہ رہ جائیں"۔ رحیم خاں نے اسے مذاق کیا۔

"جالندھر والوں کا خیال نہ ہو تو اس سے بھی محفوظ جگہ میں بند کروایا جا سکتا ہے۔ ہمارے خواجہ عبداللہ خان "نواب" کہلانے لگے ہیں اور بہت سے افراد کو محفوظ جگہ پہنچا چکے ہیں"۔ ریاست علی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"گویا حکم ہے کہ ہم لاہور چھوڑ دیں۔ ایک روز کے لئے ہمارے قیام میں توسیع فرما دیں، اس کے بعد دیکھیں تو اپنے خواجہ کو اطلاع کر دیں یا نواب عبداللہ خاں کے مخبروں کے حوالے کر دیں"۔ سید رحیم خاں نے قہقہہ لگایا۔

"ہم آپ کی درخواست قبول فرماتے ہیں اور پرسوں صبح سے شروع ہونے والے سفر میں شمولیت سے سرفراز فرمانے کی درخواست کرتے ہیں۔ امید رکھتے ہیں کہ حضور مایوس نہیں فرمادیں گے"۔ ریاست علی نے جواب دیا۔

دونوں نے قہقہہ لگایا اور بیک آواز "بابدولت آپ کی درخواست قبول فرما کر خوشی محسوس کرتے ہیں"۔ کہا۔

مغلانی بیگم کا اغوا

سہ پہر کی چمکدار دھوپ میں ہرنوں کا گہرا بھورا رنگ مزید گہرا ہو گیا تھا۔ ملک سجاول نے اپنے ساتھی کو اشارہ کیا تو وہ بھی درخت کی اوٹ میں ہو گیا۔ ہرنوں کا ایک خوبصورت جوڑا اپنے بچوں کے ساتھ تالاب کی ڈھلوان پر چلتا ہوا پانی تک پہنچا گردنیں اٹھا کر چاروں طرف دیکھا اور پھر اطمینان سے پانی پر منہ رکھ دیئے۔ ملک سجاول کے ساتھی نے اس کی طرف دیکھا اور کمان میں تیر چڑھانے لگا۔ ملک نے منہ سے کچھ کہے بغیر ہاتھ بڑھا کر اس کی کمان پکڑ لی۔ ہرنوں نے پانی پیا، ایک بار پھر گردنیں اٹھا کر چاروں طرف دیکھا اور قدم جما جما کر تالاب کی ڈھلوان پر چڑھنے لگے۔ کنارے پر پہنچ کر وہ قلانچیں بھرتے ہوئے بیلے میں روپوش ہو گئے۔ وہ درخت کی اوٹ سے نکلے اور آہستہ آہستہ اپنے گھوڑوں کی طرف چل دیئے جو تھوڑے فاصلے پر قبرستان میں ایک مزار کے عقب میں بندھے تھے۔

"ہرن اتنے نشانہ پر تھے کہ بچ کر نہ جاتے"۔ نوجوان نے ملک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ حیران تھا کہ اس نے اسے تیر چلانے سے منع کیوں کر دیا تھا۔ ملک نے کوئی جواب نہیں دیا، بیر اور کریر کی جنگلی جھاڑیوں نے قدیم پختہ قبروں کو اپنی آغوش میں چھپا رکھا تھا، وہ جھاڑیوں میں سے راستہ بناتے ہوئے ایک اونچی محراب کے پاس جا کر رک گئے جس کی بلندی پر فارسی اور عربی تحریریں تھیں اور نیچے چھوٹے سے احاطہ میں تین چار پرانی قبریں۔ ملک نے فاتحہ کے لئے ہاتھ اٹھائے تو اس کے ساتھی نے بھی ہاتھ اٹھا دیئے۔ فاتحہ پڑھنے کے بعد وہ چار دیواری کی منڈھیر پر بیٹھ گئے۔ ملک کے ساتھی کو ابھی تک سمجھ نہیں آیا تھا کہ اس نے اسے تیر چڑھانے اور اتنے موٹے تازے ہرن شکار کرنے سے منع کیوں کر دیا تھا۔

"تم جانتے ہو یہ کن لوگوں کی قبریں ہیں؟" ملک نے اپنے ساتھی سے پوچھا۔

"آپ نے اتنے خشوع سے فاتحہ پڑی آپ ہی بتائیں، آپ تو جانتے ہوں گے"۔ اس کے ساتھی نے

جواب دیا۔

"فاتحہ پڑھنے کے لئے یہ جاننا ضروری نہیں ہوتا کہ قبر کس کی ہے"۔ ملک نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"ایک ایک چاردیواری میں دو دو قبریں چاردیواریوں کے چھوٹے چھوٹے دروازے، یہ اونچی محرابیں، مزار اور ان کے پاس جنگل کے درمیان میں تالاب۔ جن لوگوں نے یہ سب کچھ بنایا یقیناً وہ ہم میں سے نہیں ہوں گے"۔ نوجوان نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اگر وہ ہم میں سے ہوتے تو آج بھی ہم میں موجود ہوتے اور ایسی شان و شوکت والی قبریں بنانے کے لئے ان کے پاس پیسہ بھی نہ ہوتا"۔ ملک نے جواب دیا۔

"پھر وہ کون لوگ تھے جو یہ سب کچھ بنا کر چھوڑ گئے، وہ خود کہاں چلے گئے؟" نوجوان نے پوچھا۔

"میں نہیں جانتا وہ کون تھے اور کہاں گئے، بچپن سے میں نے یہ نشانات اسی طرح دیکھے ہیں۔ یہ کسی کے اقتدار اور اختیار کے نشانات ہیں، اختیار اور اقتدار کبھی دیرپا نہیں ہوئے، ان کے سہارے زندہ رہنے والے بھی دیرپا نہیں ہوتے۔ اقتدار نہ رہا نشان چھوڑ کر چلے گئے۔ اتنی مضبوط قبریں بنائیں مگر ان پر فاتحہ پڑھنے والا کوئی نہ چھوڑ سکے"۔

نوجوان ابھی تک ہرنوں پر تیر چلانے سے منع کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ملک کی باتیں سن کر وہ قبریں چھوڑ کر چلے جانے والوں کے بارے میں سوچنے لگا۔

"ان قبروں والوں کے پس ماندگان ان کی آل اولاد میں سے کبھی بھی کوئی فاتحہ پڑھنے یا ان پر مٹی ڈالنے نہیں آیا؟" اس نے پوچھا۔

"اقتدار کی قبر پر نہ کبھی کوئی مٹی ڈالتا ہے، نہ فاتحہ پڑھنے آتا ہے"۔ ملک نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

نوجوان خاموشی سے اس کے پیچھے چلنے لگا۔

"معلوم ہے، میں نے تمہیں ہرن پر تیر چلانے سے کیوں منع کیا تھا؟" اس نے چلتے چلتے مڑ کر نوجوان سے پوچھا۔

"میں تو اب تک سمجھ نہیں سکا، ہم شکار کرنے آئے اور شکار کو نشانہ پر چڑھا چھوڑ کر خالی ہاتھ واپس جا رہے ہیں"۔ نوجوان نے جواب دیا۔

"آج صبح میں نے حویلی میں تمہیں اپنے بیٹے سے کھیلتے ہوئے دیکھا تھا"۔ ملک نے اس کی طرف دیکھ کر بتایا۔

نوجوان نے نظریں اٹھا کر اپنے سردار کی آنکھوں میں جھانکا اور سر جھکا کر خاموش چلنے لگا جیسے اسے کمان میں تیر چڑھانے پر افسوس ہوا۔

"اس سامنے کے میدان میں خیموں کے آباد شہر کے حکمران کو ایک صبح میں نے اپنے بیٹے سے کھیلتے دیکھا پھر وہ اپنے سرداروں اور امراء کے ساتھ ہرن کے شکار پر نکل گیا اس نے ایک ہرن پر بندوق چلائی + ہرن تڑپنے لگا اس کی مادہ اور بچے بہت روئے بہت کرلائے اور پھر اگلی رات اس شہر کا ہر فرد بہت رویا تھا تم نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا"۔ ملک سجاول نے کہا۔

نوجوان کا سر جھک کر سینے سے لگ گیا۔

وہ اپنے گھوڑوں کے قریب پہنچ چکے تھے، ان کے ساتھی نے گھوڑوں کی لگامیں کھول کر انہیں تھما دیں۔ رکاب تھام کر سردار کو گھوڑے پر سوار کرایا اور اپنے گھوڑوں پر سوار ہو کر ان کے پیچھے چلنے لگے۔ نوجوان اب بھی خاموش تھا، وہ کوئی بات کرنا چاہتا تھا مگر کوئی موضوع نہیں مل رہا تھا۔

گاؤں کے قریب پہنچے تو لاہور کی طرف سے دو سوار آتے دکھائی دیے، وہ سرپٹ گھوڑے دوڑاتے

ہوئے آرہے تھے، وہ وہیں رک گئے، قریب پہنچ کر سواروں نے اپنے سروں اور منہ پر سے کپڑے اتار دیئے۔ ملک نے آگے بڑھ کر ان کو خوش آمدید کہا اور اپنے ساتھ لے کر حویلی کی طرف چل دیا۔ سورج ابھی غروب نہیں ہوا تھا، چھوٹے چھوٹے بچے حویلیوں کے سامنے کھیل رہے تھے، ان کا نوجوان ساتھی ہر بچے کے چہرے پر ایسے نظریں گاڑھ دیتا جیسے کچھ تلاش کر رہا ہو۔

***

زمین کے مقدر کا اندھیرا اس کے جسم پر اچھی طرح پھیل چکا تو ملک سجاول اور اس کے دو ساتھیوں نے اپنے گھوڑے بیلے میں ڈال دیئے۔ وہ آزمودہ راستوں پر تیز چلنا چاہتے تھے لیکن ان کے گھوڑے جگہ جگہ بدک رہے تھے، پوہ کی سردی کے مارے سرکنڈے اور درخت جگہ جگہ راستہ روک لیتے تھے، گھوڑوں کے سموں اور نتھنوں کی آواز سے خوابیدہ پرندے ہڑبڑا کر جاگ جاتے اور پھڑ پھڑا کر بیلے پر بلند ہو جاتے، تھوڑی دیر بعد وہ دریا کے کنارے پہنچ گئے، پانی کی گہرائی اور راستے کے رخ کا اندازہ کیا اور یخ بستہ پانی میں گھوڑے ڈال دیئے۔ دوسرے کنارے پہنچ کر انہوں نے کپڑے تبدیل کئے خشک سرکنڈوں کو جلا کر ہاتھ پاؤں گرم کئے اور گھوڑوں کی پیٹھ سے چمٹ کر چابک لہرانے لگے۔ رات کے سرد سکوت میں ان کے گھوڑوں کے سموں کی آواز میلوں دور پہنچ رہی تھی۔

شاہدرہ کے حفاظتی برج کی روشنی دیکھ کر انہوں نے گھوڑوں کی لگامیں کھینچ لیں اور گاؤں سے ہٹ کر دریا کے کنارے کنارے نیچے کی طرف چلنے لگے۔ شاہی قلعہ کے برابر پہنچ کر گھوڑوں کی لگامیں مقبرہ جہانگیر کی طرف موڑ دیں۔

اکبری سرائے میں بخارا کے تاجروں کا قافلہ اترا ہوا تھا۔ تاجر اور ان کے ساتھ چلنے والے مسافر مختلف کوٹھریوں میں ٹولیوں کی صورت میں آگ کے گرد بیٹھے اپنے اپنے شہر اور علاقہ کے حالات بیان کر رہے تھے۔ اپنے اپنے حکمرانوں کی کامیابیوں اور ناکامیوں سے دوسروں کو آگاہ کر رہے تھے اور راستہ کی مشکلات بیان کرنے میں مصروف تھے۔

ملک سجاول کے ساتھی نے سرائے کے رجسٹر میں اپنا نام پتہ درج کرایا اور بتایا کہ اسے معلوم ہوا ہے کہ اس کا ایک دوست اس قافلے کے ساتھ سفر کر رہا ہے۔ وہ اسے ملنے آیا ہے اور تھوڑی دیر میں شاید واپس چلا جائے گا۔ ڈیوڑھی کی ڈیوٹی والے نے اس کے کوائف درج کر کے اسے سر سے پاؤں تک غور سے دیکھا مگر منہ سے کچھ نہیں کہا پھر وہ جلد ہی واپس آ گیا اور بتایا کہ اس کا دوست مل نہیں سکا۔

رات کے ساتھ ساتھ سردی بھی بڑھ رہی تھی، سرائے کے مرکزی دروازہ کے پہریدار انگیٹھیوں میں کوئلے سلگائے اونگھ رہے تھے کہ ایک درویش نے حکم دیا کہ بیرونی دروازہ کھول دیا جائے۔ وہ دوپہر سے سرائے کی مسجد میں مراقبہ کی حالت میں بیٹھا تھا۔ عشاء کی نماز کے بعد اس نے سرائے کا چکر مکمل کیا اور پھر وہیں جا کر بیٹھ گیا تھا۔

پہریدار نے لکڑی کے بھاری دروازے میں بنی چھوٹی سی کھڑکی کھول دی۔

درویش نے اس میں سے گزرنے سے انکار کر دیا۔ ”درویش کا سر اور گردن خالق حقیقی کے سوا کسی کے سامنے نہیں جھک سکتے، دروازہ کھولو۔“

پہریدار نے معذرت کی، درویش جلال میں آ گیا۔ ”یہ دنیا دار کا سر نہیں کہ عورت کہے تو اس کے حضور جھک جائے، مرد آئے تو اس کے سامنے جھکا رہے۔ اگر تم نے فوراً کواڑ نہ کھولے تو درویش سروں کے خالق و مالک سے دعا کرے گا کہ وہ تمہیں چوٹیاں والے سروں

کے حوالے کردے''۔

پہریدار گھبرا گئے اور فوراً بڑے بڑے کواڑ دھکیل کر دروازہ کھول دیا۔

''چھوٹی سی کشتی پانی کے بہاؤ کے رخ خود ہی بہی جا رہی تھی، ملاح نے بہت اوپر جا کر کشتی چھوڑی تھی اور بے آواز رفتار سے دریا عبور کر کے اب خاموش بیٹھا اس کی سمت درست کر رہا تھا۔ رات کے گھپ اندھیرے میں پانی اور خشکی دریا اور کنارے کی تمیز مٹ گئی تھی۔ قلعہ کی دیوار کے نیچے پہنچ کر اس نے کشتی روک لی۔ تینوں سواروں کو کنارے پہنچا کر خود پھر سے بہاؤ کے ساتھ خاموش سفر پر چل پڑا۔ تینوں سوار کشتی سے اتر کر ایک قطار میں چلنے لگے۔ انہوں نے جوتے نکال کر ہاتھوں میں پکڑ لئے تھے کہ پاؤں کی آہٹ پیدا نہ ہو۔ تھوڑا چل کر سب سے آگے چلنے والا بیٹھ گیا تو پیچھے آنے والے ٹھہر گئے۔ آگے چلنے والے نے انہیں بھی بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ گھوڑوں کے قدموں کی آواز ان کی طرف آ رہی تھی، سوار آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ انہوں نے اندازہ کیا کہ وہ گشت پہرہ والے ہیں۔ جب سوار ان کے قریب پہنچے تو وہ زمین پر لیٹ گئے، سوار دور جا چکے تو وہ پھر سے شیش محل کی بیرونی دیوار کے سایہ میں چلنے لگے۔ ایک کھڑکی کے سامنے پہنچ کر ان میں سے ایک نے ہلکی سی دستک دی۔ اندر سے کسی نے شمعدان اٹھا کر سوراخ میں سے دیکھا اور کھڑکی کھول کر تینوں کو اندر بلا کر کھڑکی بند کر دی۔ تنگ راہداری سے ہو کر وہ سیڑھیاں چڑھ کر ایک چھوٹے سے کمرے میں پہنچ گئے جہاں شہباز خان اور میاں خوش فہم گرم پانی اور صاف لباس لئے کھڑے تھے۔ انہوں نے جلدی جلدی ہاتھ منہ دھوئے، لباس تبدیل کئے اور میاں خوش فہم کی قیادت میں مغلانی بیگم کے حضور پیش ہو گئے۔

''ہمیں امید تھی کہ کوئی رکاوٹ ملک سجاول کا راستہ نہ روک سکے گی۔ ہم خوش ہیں کہ ہماری امید پوری ہوئی''۔ مغلانی بیگم نے انہیں دیکھتے ہی کہا۔

''خدا کا شکر ہے ہم حضور کے حکم کی تعمیل میں کامیاب رہے''۔ ملک سجاول نے جواب دیا۔

''سرفراز خان نے اس مہارت سے منصوبہ بنایا کہ مخبروں کی آنکھوں میں پوہ کی سیاہی بھر دی''۔ ملک کے بعد وہ درویش سے مخاطب ہوئی۔

''خدا کرے یہ سیاہی ان کے مقدر کی سیاہی بن جائے''۔ سرفراز نے دعا کی۔

''ہم امید رکھتے ہیں یہ ہو کر رہے گا، ہمارے جاں نثاروں کے لئے اچھا وقت آنے والا ہے''۔ بیگم نے کہا۔

ملک سجاول نے غور سے اس کی طرف دیکھا، بیگم کی آنکھوں میں خاص چمک تھی، وہ فیصلہ نہ کر سکا کہ وہ خوشی کی چمک ہے یا غصے کی۔

''ہم جانتے ہیں آپ کو بہت زحمت اٹھانا پڑی مگر شاہجہان آباد کے سفر کے لئے ہم کسی اور پر اعتماد نہ کر سکے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ کشور پنجاب اور اس کے باسیوں کی خاطر آپ یہ مشقت گوارا کریں گے''۔ اس نے کسی تمہید کے بغیر بات شروع کی۔

ملک سجاول ذہنی طور پر کسی سفر کے لئے آمادہ نہ تھا، مغلانی بیگم نے جب بھی کوئی سفارت بھیجی قندھار کی طرف بھیجی تھی، شاہجہان آباد کا نام سن کر وہ چونک سا گیا۔

''سلطنت مغلیہ کے وزیر اعظم عمادالملک لاہور کو شرف قیام بخشنا چاہتے ہیں، کشور پنجاب شاہ قندھار کی مملکت کا حصہ ہے۔ مغلیہ سلطنت کے وزیر اعظم اور اس کی فوج کی آمد سے فتنی کوئی فساد پیدا کر سکتے ہیں، آپ ان کے ساتھ ہوں گے تو وہ کہہ سکیں گے شکار کی غرض سے پنجاب جا رہے ہیں''۔ بیگم نے بتایا۔

ملک سجاول کو عمادالملک کی لاہور آمد کے عزم سے

مزید حیرانی ہوئی لیکن وہ خاموشی سے سنتا رہا۔

''ہم چاہتے ہیں آپ اپنے چند جوانوں کے ساتھ جلد از جلد شاہجہان آباد روانہ ہو جائیں۔ سرفراز خاں اور اس کے ساتھی بھی آپ کے ہمراہ ہوں گے، عمادالملک آپ کا منتظر ہے''۔

''حضور کے حکم کی تعمیل ہوگی، چند روز کی مہلت مل جائے تو ہم تیاری کر سکیں گے''۔ ملک سجاول نے عمادالملک کے منتظر ہونے کی خبر پر اپنی حیرانی چھپاتے ہوئے کہا۔

''ہمارے پاس وقت بہت کم ہے، زادِ راہ تیار ہے، لوازمات شکار عمادالملک کے عمال فراہم کر دیں گے، گھوڑے اور تلواریں تو ہمہ وقت تیار ہوتے ہیں اور دونوں چیزیں آپ کے پاس ہیں۔ ہم نہیں سمجھتے کسی مزید تیاری کی ضرورت ہے''۔ مغلانی بیگم نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

ملک سجاول کے لئے سر تسلیم خم کرنے کے سوا چارہ نہ تھا۔

مغلانی بیگم نے ایک مہر بند لفافہ اس کی طرف بڑھایا۔ ''اسے بہت احتیاط سے رکھیں اور عمادالملک کے علاوہ کسی اور کے حوالے نہ کریں''۔

ملک سجاول نے دونوں ہاتھوں سے لفافہ وصول کیا۔

''عمادالملک کے ارادے کا کسی کو علم نہیں، آپ کے سفر کا بھی کسی کو علم نہیں ہونا چاہئے''۔ مغلانی بیگم نے ہدایت کی۔

''عمادالملک کے ارادے کا ہمیں بھی علم نہیں، ہمارے سفر کا حضور کے علاوہ کسی کو علم نہیں ہوگا''۔ ملک نے یقین دلایا۔

''راوی میں کشتی آپ کی منتظر ہے، ہم آپ کی سلامتی اور کامیابی کے لئے دعا گو ہیں''۔ مغلانی بیگم نے کہا۔

ملک سجاول اور اس کے ساتھی نے سلام کیا اور سرفراز خاں کے ہمراہ کمرے سے باہر نکل گئے۔

ان کے جانے کے بعد وہ کچھ دیر خاموش بیٹھی سوچتی رہی پھر عمادالملک کا خط نکال کر ایک بار پھر پڑھنا شروع کر دیا۔ خط مکمل پڑھ کر اس نے نہایت احتیاط سے طے کیا اور ایک طرف رکھ کر شمعدان کے شعلے کو غور سے دیکھنے لگی۔

''دولہا سلطنت مغلیہ کا وزیراعظم اور دلہن شاہی قلعہ میں محبوس بیوہ کی بیٹی۔ جب میر منو نے اپنی بیٹی عمادالملک سے منسوب کی تھی تو وہ خود پنجاب کا حاکم تھا اور اس کا بھائی سلطنت مغلیہ کا وزیراعظم تھا۔ اس وقت کون جانتا تھا مقدر کے ستارے کس انداز میں طلوع و غروب کی منزلیں طے کریں گے۔ اقتدار اور اختیار کی سب سے بلندی کرسی تک پہنچ کر جہاں مغل بادشاہ بھی اس کے سامنے کٹھ پتلی سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا، عمادالملک نے اس تعلق کا احترام کیا ہے۔ ذاتی اور سیاسی دشمنوں نے مجھ پر انگلیاں اٹھائیں، خطوط لکھے، سفارتیں بھیجیں، قید و حکمرانی کے مراحل میں بھی عمادالملک نے اس احترام میں فرق نہ آنے دیا اور اب اپنی امانت لے جانے کے لئے احمد شاہ ابدالی کی سلطنت میں بلا اجازت فوج کے ساتھ آنے کا پروگرام بنا رہا ہے، اس کا نتیجہ ایک اور لڑائی بھی ہو سکتا ہے۔ دکن میں مرہٹوں کے ساتھ جنگ کے باوجود وہ بیوہ کی بیٹی کو بیاہ لے جانے کو خود لاہور آ رہا ہے۔ اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں موتی چمکنے لگے۔

''اگر آج میر منو زندہ ہوتے تو وہ وزیراعظم کی بارات کا کس شان سے استقبال کرتے اور اپنی بیٹی کو کس طرح رخصت کرتے وہ کتنے خوش ہوتے۔ اب یہ ساری ذمہ داری اس کے اپنے نازک کندھوں پر آن پڑی ہے''۔ اس نے آنکھوں سے موتی صاف کئے اور کمرے میں اسی کھڑکی کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی جس سے وہ سمرقند جانے والے راستوں کو چشم تصور سے ناپا کرتی تھی۔

(جاری ہے)

مجھے ایک جعلی عامل کے بارے میں کسی نوجوان نے فون کر کے بتلایا ہے کہ ان کے علاقے میں ایک عامل ہے جو سانپ حاضر کرتا ہے اور وہ سانپ باقاعدہ عورت کی آواز میں باتیں کرتا ہے۔

آخری قسط ---------- 0314-4652230, 0303-9801291 ---------- محمد افضل رحمانی

میرے حواس کچھ بحال ہوئے تو میں نے پوچھا
جب فقیر لوکو! تم نے ماجے پہلوان کو دیکھا ہے؟
''ہاں جی، میں نے اس کے کئی معرکے بھی اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں''۔ اس نے کہا۔ ''اس نے ہر اکھاڑے میں اپنے مدِمقابل کو شکست دی ہے۔ اس کا ستارہ بھی عروج پر ہے، ویسے میں آپ کو مشورہ دوں گا کہ ایک دفعہ اس جوان کا درشن ضرور کرنا، اللہ قسم دیکھنے والی چیز ہے۔ زورآور، خوبصورت، فیاض و رحم دل، غریبوں کا ہمدرد، اس کا درشن کر کے آدمی کو سرور آ جاتا ہے۔ اتنا رحم دل ہے کہ گھوڑی پر نہیں بیٹھتا''۔
''کیوں؟'' میں نے جانتے بوجھتے پوچھا۔
''بس جی ہاتھی کی جسامت رکھتا ہے، کہتا ہے گھوڑی میرا بوجھ برداشت نہیں کر سکتی۔ کسی جاندار کو تکلیف دینے کو جی نہیں چاہتا''۔
''فقیر لوکو! تم اس علاقے میں کیسے گئے؟''
وہ زور سے ہنسا اور کہنے لگا۔ ''سپ، شیہ، درویش دا دیس کیہڑا۔ اللہ لوکو! ہم درویش لوگ آج یہاں، کل کا کوئی پتہ نہیں ہمارا رزق اللہ نے مٹھی میں لے کر ایسے بکھیر دیا ہے جیسے زمیندار بیج بوتے وقت چھٹا لگاتا ہے۔ بس اب ہم دیس دیس اور گاؤں گاؤں پھر کر اپنا بکھرا ہوا رزق اکٹھا کرتے پھر رہے ہیں''۔
''ماجے پہلوان کے علاقے میں چکر لگائے کتنی دیر ہو گئی ہے؟''
''تقریباً ایک سال ہو گیا ہو گا''۔ اس نے بتایا۔
''ماجا پہلوان دو سال جیل کاٹنے کے بعد واپس آیا تھا''۔
''جیل کاٹ کر؟''
''ہاں اللہ لوکو! ماجے کو دو سال سزا ہو گئی تھی''۔
''کیا اس نے کوئی جرم کیا تھا؟''
''نہیں جی، وہ تو شریف آدمی ہے''۔
''پھر اسے کس جرم میں جیل ہوئی؟''
''وہ جی دراصل اس کی بیوی کا کوئی رشتہ دار لڑکا تھا غالباً اس کی بیوی کے بھائی کا لڑکا تھا۔ اللہ رکھا، اس نے اس گاؤں کی ایک سکھ لڑکی سے زیادتی کی تھی جس کے نتیجے میں وہ لڑکی مر گئی تھی۔ رکھا تو کہیں بھاگ گیا، پولیس نے مجرم کو بھگانے کے جرم میں اسے گرفتار کر لیا تھا اور پھر عدالت نے اسے دو سال قید بامشقت کی سزا دی تھی''۔
میرے سینے میں ایک ہوک سی اٹھی لیکن میں خود پر قابو پا گیا اور تھرتھراتی آواز میں پوچھا کہ رکھے کو تلاش کرنے کی کوشش کی گئی، وہ ملا یا نہیں؟
''اللہ لوکو! پولیس نے اس کے گاؤں کئی چھاپے مارے اس کے والد کو تھانے بلایا ڈرایا، دھمکایا لیکن رکھے کو پتہ نہیں آسمان کھا گیا یا زمین نگل''۔
''ماجے پہلوان کی بیوی تو بہت پریشان ہوئی ہو گی؟''
''ہاں، یہ تو ظاہری بات ہے کیونکہ ماجے اور اس کی بیوی کے پیار و محبت کے قصے تو زبان زدِعام ہیں لوگ کہتے ہیں دونوں میں صرف میاں بیوی کا رشتہ ہی نہیں تھا بلکہ وہ ہیر رانجھے کی طرح ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔ ویسے مَیں نے اُسے دیکھا ہے وہ یا تو کوئی پری ہے جو بھولے سے پرستان سے ادھر آ نکلی ہے یا کوئی حور جنت سے بھٹک کر ماجے کے سنگ ہو گئی ہے''۔
''اچھا ٹھیک ہے''۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکتے ہوئے کہا کہ کہیں وہ میری پھپھو کے بارے میں کوئی غلط بات کہہ دیتا اور میرے ہاتھوں سے اپنے دانت تڑوا بیٹھتا۔
''دیکھ فقیر لوکو! وہ فقیروں کو بھی کچھ دیتا ہے یا نہیں؟''
''ہاں، اب آئے ناں کاروباری معاملات کی طرف''۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''اللہ لوکو! تم جب اس کے دروازے پر جا کر سوال کرو گے تو تمہیں توقع سے

زیادہ وے دے گا کسی وقت ادھر کا چکر لگے تو ماجا پہلوان کو یاد رکھنا"۔

"ٹھیک ہے فقیر لوکو! میں یاد رکھوں گا اور جب بھی اُدھر گیا تو ماجے پہلوان سے ضرور ملوں گا"۔ اس نے کہا اور پوچھا۔ "فقیر لوکو! یہ جس عورت کا تم نے ذکر کیا ہے کہ اسے کسی نے قتل کر دیا تھا اور اس کے مرنے کے بعد اس کا پیٹ چاک کر کے لڑکی کو زندہ نکال لیا گیا تھا اس کا ماجے پہلوان سے کیا تعلق تھا؟"

"اللہ لوکو! وہ ماجے پہلوان کے چچا کی بیٹی تھی"۔ اس نے کہا۔

"وہ جس آدمی کے ساتھ بھاگ آئی تھی وہ کون تھا؟" میں نے پوچھا۔

"اللہ لوکو! یہ سب عشق کے فساد ہیں"۔ اس نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ "بات کوئی اتنی لمبی نہیں وہ آدمی بازیگر تھا ایک دفعہ انہوں نے ماجے کے گاؤں میں بازی ڈالی اپنے انداز میں وہ اونچی چھلانگ لگاتے اور کبوتر کی طرح بازی لگا کر اکھاڑے میں گر جاتے۔ یہ تماشہ گاؤں کے قریب ہی ہوا تھا۔ لہٰذا مکانوں کی چھتوں پر لڑکیاں بھی ان کے کرتب دیکھنے کے لئے جمع ہو گئی تھیں۔ پتہ نہیں اس جوان بازیگر میں کیا کمال تھا کہ جیواں اس پر عاشق ہو گئی اور پھر اگلے دن جیواں کا کوئی پتہ نہ چل سکا"۔

"پھر فقیر لوکو! وہ اتنے بڑے گھرانے کی ہوتے ہوئے ایک بازیگر پر کیسے عاشق ہو گئی؟"

"اللہ لوکو! یہ تو خدا ہی جانتا ہے لیکن تم نے ایک محاورہ تو سنا ہی ہوگا؟" اس نے کہا۔

"کون سا؟"

"بھوک نہ دیکھے جوٹھا بھات، نیند نہ دیکھے ٹوٹی کھاٹ، پیاس نہ دیکھے دھوبی گھاٹ اور عشق نہ دیکھے ذات بذات"۔

"ہاں یہ تو ہے"۔ میں نے کہا۔

"میرے خیال میں بازیگر اور جیواں کو ماجا پہلوان کے لوگوں نے ہی قتل کیا ہے"۔ اس نے کہا۔ "اور وہ لڑکی جو تم نے دیکھی ہے اسی بازیگر کی ہے"۔

"فقیر لوکو! تم نے اس عورت کو دیکھا تھا؟"

"ہاں جی، میں نے اسے اچھی طرح دیکھا تھا۔ ہاتھ لگانے سے میلی ہو جاتی تھی"۔ اس نے کہا۔ "جوانی اور حُسن اپنے پورے جوبن کے ساتھ اس پر چھا چکے تھے۔ رخسار ایسے جیسے دہکتے ہوئے دو انگارے۔ سیاہ زلفوں میں چمکتا ہوا چہرہ کالے بادلوں میں سے جھانکتے ہوئے چاند کی طرح دہر دہر کرتا تھا۔ کمر اتنی پتلی کہ مٹھی میں آ جائے، دراصل ماجے پہلون کا خاندان خوبصورتی میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ تم نے وہ سات آٹھ سال کی بچی تو دیکھی ہی ہے بالکل اپنی ماں پر گئی ہے۔ 'سوالاں جمدیاں دے ای منہ ترکھے ہندے نیں' اللہ لوکو! ہم باتوں میں ہی الجھ گئے، آپ کے بارے میں تو کچھ پوچھا ہی نہیں"۔

"پوچھ کیا پوچھنا چاہتا ہے؟"

"اللہ لوکو! تم کس گدی سے تعلق رکھتے ہو؟" اس نے پوچھا۔ میں اس سوال کے لئے تیار نہیں تھا۔ میں شپٹا گیا لیکن جلد ہی سنبھل کر کہا۔

فقیر لوکو! ابھی منزل پوری نہیں ہوئی۔ پیر و مرشد نے ابھی بھید ظاہر کرنے کی اجازت نہیں دی، بس ابھی سرکار کا حکم ہے کہ لوگوں کے دروازے پر جا کر سوال کیا کرو تا کہ تمہارا اَمن مر جائے۔ باقی بعد میں جو امر ہوگا وہ بجا لاؤں گا"۔

"اللہ لوکو! بُرا نہ منانا میرے خیال میں تم بڑی مشکل سے کامیاب ہوگے"۔

"کیوں فقیر لوکو؟"

"اللہ لوکو! تمہاری صحت اور جسمانی ساخت

فقیروں جیسی کبھی نہیں بن سکے گی"۔ اس نے گہری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے تم کسی چکر میں ہو لیکن ایک بات یاد رکھنا، رنگ پور میں داخل ہوتے ہی گاؤں کی لڑکیوں نے رانجھے کو پہچان لیا تھا کہ یہ کوئی جوگی نہیں صرف جوگیانہ وضع قطع بنا رکھی ہے اور بعض نے تو دبی زبان میں کہہ بھی دیا تھا کہ یہ تو وہی چاک معلوم ہوتا ہے جو ہیر کے والد کی بھینسیں چرایا کرتا تھا۔ عشق اور مشک کبھی چھپ نہیں سکتے۔ دیکھو اگر کوئی ایسی بات ہے تو بے دھڑک بتا دو، تمہاری کچھ نہ کچھ مدد ضرور کر دوں گا"۔

میں نے زور کا قہقہہ لگایا اور پھر دو ٹوک الفاظ میں کہا۔ نہیں، فقیر لوکو! ایسا کوئی معاملہ نہیں۔ اس نے ہنستے ہوئے میرے ساتھ ہاتھ ملایا اور اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔

ٹھگاں دی ریوڑی

اس کے جانے کے بعد ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا اور اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے سوچنے لگا۔ میری سوچ میں کئی باتیں آئیں کبھی تو یہ خیال آتا کہ جس طرح بھی ہو اس لڑکی کا تعلق پھوپھا ماجے سے ضرور بنتا ہے لیکن پھر دوسرا خیال آیا کہ رشتے چوری یاری سے تو نہیں بنتے یہ بازیگر کی لڑکی ہے اور اس سے انتقام لینے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ اس کی لڑکی کو اغوا کر لیا جائے اس کے خاندان کی عزت و ناموس اس طرح برباد کی جائے جس طرح اس نے پھوپھا ماجے کے خاندان کی عزت کا جنازہ نکال دیا تھا اور پھر یہی خیال میرے ذہن میں پختہ ہو گیا۔ اس گاؤں میں بازیگروں کے کافی گھر تھے اور سب منجھے ہوئے بدمعاش اور ڈاکو تھے۔ طاقت کے لحاظ سے بھی فٹ تھے کیونکہ کسرت کیا کرتے تھے اور اُن کے جسم لوہے سے بھی سخت ہو گئے تھے۔ اپنے آبائی

فن بازیگری کے علاوہ ان میں ہر وہ عیب موجود تھا جو بگڑے ہوئے لوگوں میں ہوتا ہے۔ وہ بظاہر شریف لیکن اندر سے شیطان کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ ساری معلومات میں نے مختلف لوگوں سے جو قریبی بستیوں میں رہتے تھے، حاصل کیں۔

دودھ پیتے بچے کو اغوا کرنا اتنا مشکل نہیں تھا لیکن ایک آٹھ سالہ بچی کو آبادی میں سے اٹھانا مشکل کام تھا لیکن جوگی کی خواہش کے ساتھ انتقامی جذبہ بھی میرے ذہن میں کارفرما ہو گیا تھا۔ میں اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے کئی بار بہروپ بدل کے اس گاؤں گیا لیکن کامیابی نہ ہو سکی۔ آخر ہندو جوگی نے چند ریوڑیاں جو گڑ سے تیار کی گئی تھیں جن میں مناسب مقدار میں تخم دھتورہ شامل کیا گیا تھا، وہ مجھے دیں اور مجھے اچھے طریقے سے سمجھا دیا کہ کسی طرح یہ ریوڑیاں اس لڑکی کو کھلا دو۔ یاد رہے کہ وہ ریوڑیاں کھانے کے بعد آدمی بے ہوش ہو جاتا تھا شاید تخم دھتورہ کی تاثیر ہو گی۔ عرف عام میں انہیں "ٹھگاں دی ریوڑی" کہا جاتا تھا۔ چور اپنے شکار کو کسی بہانے وہ ریوڑی کھلا دیتے تھے اور جب وہ بے ہوش ہو جاتا تو اسے لوٹ لیتے تھے چونکہ یہ گڑ سے تیار کی جاتی تھیں اور ان کے اوپر تل بھی لگے ہوتے تھے لہٰذا کوئی پہچان نہیں سکتا تھا کہ اس میں کوئی نشہ آور چیز ملی ہوئی ہے۔ (آج کل بھی جرائم پیشہ افراد اس قسم کی کارروائی کر جاتے ہیں) لیکن نذیر! مشکل یہ تھی کہ اس لڑکی کو کس طرح کھلائی جاتیں۔ آخر میں نے بھیس بدلا اور لڑکی کے دروازے پر پہنچ گیا اور اس دن مجھے کچھ امید بندھی کیونکہ لڑکی اکیلی گھر پر تھی۔ اس کے گھر والے کسی گاؤں میں کرتب دکھانے گئے ہوئے تھے۔

"کاکی! یہ لو درویش کے ہاتھ سے ریوڑیاں کھا لو"۔ میں نے اسے پیار سے پچکارتے ہوئے کہا۔ اس نے معصومانہ انداز میں ذرا سا جھجکنے کے بعد ریوڑیاں لے

بس اور میرے دیکھتے ہی ایک ریوڑی کھا گئی پھر دوسری پھر تیسری۔ پھر وہ جلد ہی ڈانواں ڈول ہونے لگی۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور سخت خطرہ مول لیتے ہوئے اس کو ساتھ لئے ہوئے گاؤں سے باہر نکل آیا۔ ابھی تک وہ اپنے پاؤں پر چل رہی تھی اور خوش قسمتی سے ہمیں کسی نے دیکھا بھی نہیں تھا۔ کچھ دور جا کر اس کی ٹانگیں لڑکھڑا گئیں۔ میں نے جلدی سے اسے اٹھا کر ڈھاک سے لگا لیا۔ میں نے ایسے وقت کا انتخاب کیا تھا کہ سورج بالکل ڈوبنے کے قریب ہو گیا تھا کیونکہ رات کو ایک لڑکی کے ساتھ سفر کرنا دن کی نسبت آسان تھا لیکن میں ابھی پوری طرح مطمئن نہیں تھا۔ ابھی اندھیرا ابھی نہیں ہوا تھا اور یہ ڈر بھی تھا کہ اس کے گھر والے واپس نہ آ گئے ہوں۔

ناگہاں مجھے ایک آدمی تیزی سے اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ میں ذرا سا گھبرایا لیکن پھر میرے اندر کا پہلوان جاگ اٹھا۔ ایک آدمی میرے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ میں اُسے ٹھکانے لگا کر لڑکی کو لے جا سکتا تھا لیکن خیر ہی گزری اس نے مجھے السلام علیکم کہا اور سرسری سی نظر ڈال کر کہنے لگا لڑکی سو گئی ہے؟ ہاں بھئی جی تھک گئی ہے اور اب سو گئی ہے۔ میں نے اسے اٹھا کر ڈھاک سے لگا لیا ہے۔

"کہاں جانا ہے؟" اس نے پوچھا۔ مجھے قریبی گاؤں کا نام آتا تھا کیونکہ میں کئی دفعہ اِدھر آ چکا تھا۔

"بس قریب ہی ہے میرے خیال میں عشاء کے وقت تک تم گاؤں پہنچ جاؤ گے"۔ اس نے کہا اور پھر وہ اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔

دن غروب ہو گیا اور پھر آہستہ آہستہ اندھیرے کی چادر تننی شروع ہو گئی، پَو پھٹنے تک میں جوگی کے پاس اپنے ڈیرے پر پہنچ گیا۔ پوری رات میں نے سفر میں گزار دی تھی۔ جوگی نے جب لڑکی کو دیکھا تو بہت خوش ہوا۔

"بس چند سالوں میں یہ کنیا ایک بہت ہی سندر ناری کا روپ دھار جائے گی"۔ اس نے کہا۔ "یہ کنیا نہیں پاربتی دیوی ہے پاربتی لیکن ہم کو یہاں سے ابھی سدھار جانا چاہئے کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کے والی وارث اس کی تلاش میں یہاں تک پہنچ جائیں"۔

"ٹھیک ہے استاد! اگر کچھ کھانے کو ہے تو جلدی سے دے دے۔ واقعی ہمیں یہاں سے روانہ ہو جانا چاہئے، دور کہیں بہت دور"۔

کئی دنوں کے سفر کے بعد ہم بنارس کے مضافات میں پہنچے اور جوگی نے اپنے ہمراز سیوک کے گھر اس لڑکی کو چھوڑا اور پھر ہم بے فکر ہو کر مختلف شہروں میں گھومتے پھرے۔ اس دوران جوگی نے مجھے کئی ہنر سکھائے جن میں ارتکازِ توجہ بھی شامل تھا۔ بعض جڑی بوٹیوں کے خواص اور پہچان کرائی اور کئی سنیاسی نسخے مجھے بتائے جو کچھ مخصوص امراض کے لئے تیر بہدف ثابت ہوئے۔ پھر اس نے مجھ سے ایک انتہائی مشکل اور خطرناک چلّہ کرایا جس کے لئے دو دودھ پیتے بچے اغوا کر کے انہیں قتل کیا گیا اور ان کے خون سے مختلف عمل کئے۔ پھر اس نے مجھے سانپ حاضر کرنے کا عمل سکھایا جس کے لئے مجھے کئی مُردوں کی قبریں اکھاڑنی پڑیں۔ ہمیں ایک ایسی مردہ عورت کی کھوپڑی چاہئے تھی جو ابھی مکمل طور پر سڑی گلی نہ ہو اور اس میں سے سیاہ رنگ کا مادہ جس میں کیڑے پڑ چکے ہوں، وہ موجود ہو۔ میں نے کئی قبریں اکھاڑیں لیکن کامیابی نہ ہو سکی۔ یا تو میت ابھی صحیح سلامت ہوتی یا پھر گل سڑ کر خشک ہو گئی ہوتی۔ آخر ایک عورت کسی گاؤں میں فوت ہوئی، ہم اس کا جنازہ پڑھنے کے بہانے قبر کو اچھی طرح سے دیکھ آئے اور پھر ایک ماہ بعد اس کی قبر کھولی تو ایک بڑے ناگ نے کام خراب کر دیا۔ جب میں نے اسامی سے اینٹیں ہٹائیں تو سیاہ ناگ پھنکارتا ہوا مجھ پر حملہ آور ہوا۔ میں جلدی سے قبر سے باہر نکلا اور

قریبی درخت سے ایک بڑی شاخ توڑ کر اساں میں اِدھر اُدھر پھیرنے لگا تاکہ سانپ باہر نکل جائے۔ کافی کوشش کے بعد سانپ اساں سے باہر نکلا۔ میں نے ایک بڑی اینٹ اس کے سر پر دے ماری وہ وہیں تڑپنے لگا، کچھ دیر بل کھاتا رہا اور پھر ساکت ہو گیا۔ میں دوبارہ قبر میں اترا اور چاقو سے مردہ عورت کا سر کاٹ کر باہر آ گیا۔ میں نے منہ پر ڈھاٹا باندھا ہوا تھا لیکن اس کے باوجود بُو سے میرا دماغ پھٹا جا رہا تھا۔ میں نے سر کو تھیلے میں ڈالا اور جوگی کے پاس پہنچ گیا۔ مردہ عورت کے سر سے سیاہ رنگ کا سیال بہہ رہا تھا۔ جوگی نے اسے گڑ میں ملایا اور کافی سائز میں گولیاں بنائیں جو مقدار میں چنے کے برابر تھیں۔ پھر اس سر کو پانی میں ابال کر صاف کیا۔ اب صرف ہڈیاں باقی رہ گئی تھیں۔ جبڑے کی ہڈیاں، ناک اور آنکھوں کے سوراخ وہ بدوضع ڈراؤنی شکل اختیار کر گئی تھی۔

میں نے جوگی سے گولیوں کے متعلق پوچھا تو وہ کہنے لگا کہ یہ گولی جس شخص کو کھلا دی جائے وہ نیم پاگل ہو جاتا ہے۔ موسیقی سننے سے جھومنے لگتا ہے، قوالی سنے تو حال کھیلنے لگتا ہے۔ بظاہر ٹھیک نظر آتا ہے لیکن جب بھی کوئی ایسی آواز سنے گا جس میں ترنم یا موسیقیت یا جذباتیت ہو گی تو بے اختیار ہو کر ناچنے لگتا ہے اور یہ چیزیں جتنی شدت سے ہوں گی اتنی ہی اس کی طبیعت میں شدت پیدا ہو جائے گی۔ بہت جلد عقیدت کا اظہار کرنے لگتا ہے۔ کتے کی طرح فرمانبردار اور وفادار بن جاتا ہے۔ پیروں، فقیروں، جوگیوں اور مذہبی لوگوں کا غلو کی حد تک احترام کرتا ہے۔ حتیٰ کہ بیوی بچے، بہن بھائیوں، رشتہ داروں کو چھوڑ کر اپنے روحانی گرو، استاد، پیر کے ساتھ پیوستہ ہو جاتا ہے اور اسی کے در کا ہو کر رہ جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دھوبی کا کتا بن جاتا ہے۔ دین اور دنیا دونوں سے جاتا رہتا ہے۔ اپنے روحانی گرو کا فرمانبردار اور چیلا بن جاتا ہے۔

دیکھو رکھے! جس نے ایسے سیوکوں کی تعداد بڑھانی ہو اسے یہ گولیاں ضرور بنانی چاہئیں۔ پھر اس نے مجھے کچھ منتر وغیرہ یاد کرائے جو میں دودھ پیتے بچوں کو قتل کر کے ان کے خون سے مردہ عورت کی کھوپڑی کو غسل دیتا اور پھر منتر پڑھتا، چالیس دنوں کے صبر آزما اور مشکل ترین عمل کے بعد آخر میں کامیاب ہو گیا اور ایک بہت بڑا اژدھا کھوپڑی کی اوٹ سے نمودار ہوا۔ جوگی نے مجھے پہلے سے بتایا ہوا تھا لہٰذا میں ڈرے بغیر اس کی طرف متوجہ ہوا اور اُسے مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ آئندہ جب میں تمہیں بلاؤں فوراً حاضر ہونا پڑے گا اور آج تک میرا یہ معمول ہے، یہ عمل میں تمہیں بھی سکھا دوں گا۔

"ہاں، رکھے! میں یہ عمل ضرور سیکھوں گا لیکن اس کا فائدہ کیا ہو گا؟"

"کچھ بھی نہیں، بس لوگوں کو متاثر کرنے کے لئے اور اپنی اولیائی جتانے کے سوا اس کا اور کوئی فائدہ نہیں"۔

"لیکن رکھے! میں کسی قبر سے مردہ عورت کی کھوپڑی نہیں لا سکوں گا"۔ میں نے جھرجھری لیتے ہوئے کہا۔

"کوئی بات نہیں اس کا ایک اور طریقہ بھی ہے"۔ رکھے نے کہا۔ "کیا تم ایک دو بچے تو اغوا کر لو گے؟"

"ہاں، یہ شاید کر لوں"۔

"اور اس کے علاوہ تمہیں ایک کام اور کرنا ہو گا؟"

"وہ کیا؟" پھر جب اس نے وہ کام بتایا تو میری روح تک ہل گئی۔

قارئین کرام! یہ پہلا موقع تھا کہ نذیر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دیا اور جب اس نے وہ بات مجھے بتائی تو خوف خدا سے میری چیخ نکل گئی۔ میرے جسم پر رعشہ طاری ہو گیا اور میں پسینے میں نہا گیا۔ میرا جی چاہا اس خبیث آدمی کو ابھی گھر سے نکال دوں لیکن پھر معاً اللہ رب العزت کی غفور اور رحیم ہونے کی صفت کا خیال آ

گیا۔ اس رب کریم کی عفو و درگزر کو یاد کرتے ہوئے میں نے سوچا کہ مجھے کیا حق حاصل ہے کہ اسے راندۂ درگاہ قرار دے دوں جسے خود اسی کے فضل و کرم نے سیدھی راہ کی ہدایت فرما دی ہے۔

ارتکاز توجہ (ہپناٹزم) کا پہلا تجربہ

نذیر نے بات جاری رکھتے ہوئے بتایا کہ رکھے کہ میرے تسلی دلاسہ دینے پر دوبارہ کہانی کا آغاز کیا۔

نذیر ایک دن میں سیر کے لئے نکلا اور ایک گھر سے ایک نوجوان لڑکی تھالی میں آٹا ڈال کر مجھے دینے کے لئے آئی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر توجہ مرکوز کی اور پھر پیچھے ہٹنے لگا۔ وہ بھی میرے ساتھ کھنچی چلی آئی۔ میں نے گمبھیر آواز میں کہا۔ لڑکی سنو تم شام کے بعد حشمت علی کے ڈیرے پر آؤ گی۔ میری بات غور سے سنو میں وہاں تمہارا انتظار کروں گا اور پھر نظریں ہٹائیں تو وہ لڑکھڑائی اور گلی کی دیوار سے ٹکرائی لیکن جلد ہی سنبھل گئی کیونکہ میں نے محض ذرا سی دیر کے لئے توجہ مرکوز کی تھی۔ ہم حشمت علی کے ڈیرے پر ٹھہرے ہوئے تھے۔ شام کے بعد میں ڈیرے کی طرف آنے والے راستے پر کھڑا ہو گیا اور ذرا دیر بعد مجھے محسوس ہوا کہ کوئی ادھر آ رہا ہے۔ جب میرے قریب آئی تو میں نے پہچان لیا کہ وہی لڑکی ہے۔ میں نے اس کا بازو پکڑا اور ذرا دور ایک کھیت میں لے گیا۔ کچھ ہی دیر بعد میں نے کہا۔ تم گھر جا کر سو جاؤ اور صبح تک تم بالکل ٹھیک ہو گی۔ میں نے جوگی سے اس کا ذکر کیا اس نے مجھے کچھ اور رموز سے آگاہ کیا۔

مختصر تبصرہ

توجہ کا ذکر بعض صوفیاء کے حالات سے ملتا ہے مگر ظاہر ہے کہ صحیح صوفیاء تو اس قسم کے ناجائز اور ناپسندیدہ کام نہیں کرتے۔ گو صوفیاء کی توجہ سے بھی بعض علماء کو تحفظات ہیں کہ توجہ کیا ہوتی ہے اور اس سے صوفیاء کیا کام لیتے ہیں لیکن اس وقت میرا یہ موضوع نہیں ہے۔ زیر نظر کہانی میں جوگی، رکھا اور نذیر ارتکاز توجہ کے ماہر تھے۔ جوگی نے رکھے کو یہ فن سکھایا اور رکھے نے نذیر کو لیکن یہ چونکہ جعلی پیر اور عامل تھے لہٰذا ان تینوں نے اس سے صرف شیطانی کام ہی کئے۔ میرے خیال میں یہ چیز موجودہ زمانے کے جدید علم (ہپناٹزم) سے ملتی جلتی کوئی چیز ہے جس کی وضاحت میں پیچھے کر آیا ہوں لیکن اس وقت ایک نئی بات میرے ذہن میں آئی ہے اور وہ ہے ''نظر بد'' چونکہ حدیث پاک سے ثابت ہے کہ نظر لگ جانا حق ہے۔ (بخاری شریف کتاب الطب حدیث نمبر 5740) حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ نظر بد برحق ہے اگر تقدیر سے کوئی چیز سبقت لے جا سکتی ہے تو وہ نظر بد ہے۔ (الخ) (مسلم شریف کتاب اسلام باب الطب والمرض والرقی حدیث نمبر 2188)۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ نظر بد انسانوں پر اثر انداز ہوتی ہے کہ اگر کوئی اونچی جگہ (پہاڑ یا چھت وغیرہ) پر کھڑا ہو تو نظر بد کی وجہ سے نیچے گر سکتا ہے۔ (السلسلۃ الصحیحہ حدیث نمبر 889)

اور بھی بہت سے حوالے ہیں حتیٰ کہ حافظ ابن قیمؒ نے اپنی کتاب زاد المعاد میں ایک دلچسپ واقعہ نقل کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ابو عبداللہ نامی ایک شخص کی اونٹنی کو ایک شخص نے عمداً ضد میں آ کر بری نظر سے دیکھا تو وہ گر کر تڑپنے لگی۔ پورا واقعہ پڑھنا ہو تو حوالہ حاضر ہے۔ (زاد المعاد جلد 3 صفحہ 160 پر دیکھئے)

نظر بد پر میں تفصیلی مضمون پہلے کسی شمارے میں لکھ چکا ہوں۔ عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ نظر میں کوئی تاثیر یا طاقت ضرور موجود ہے جس کی وجہ سے نقصان ہو سکتا ہے اور ایک نہایت ضروری نکتہ یہ ہے کہ اگر ارتکاز توجہ

میں کوئی کمال ہے تو پھر جدید سائنس اسے مان چکی ہے اور اب تو یہ علم با قاعدہ کتابوں میں موجود ہے اور بعض یونیورسٹیوں میں پڑھایا بھی جاتا ہے لہٰذا جو سائنس زدہ لوگ محض اس وجہ سے نظر بد کی حقیقت کا انکار کرتے ہیں کہ اُن کے نزدیک نظر لگنے کی کوئی سائنٹفک یا عقلی توجیہہ ان کی سمجھ میں نہیں آتی تو انہیں اس بارے میں ضرور غور کرنا چاہئے البتہ صحیح مسلمان کے لئے قرآن و حدیث کی باتیں کسی تحقیقات کی محتاج نہیں ہیں۔

ناگ کا حاضر ہونا

ناگ حاضر کرنے کے لئے جوگی نے رکھشے سے جو عملیات کرائے ان کا مختصر تذکرہ میں کر چکا ہوں لیکن میں نے جان بوجھ کر اس کی تفصیل بیان نہیں کی کیونکہ کوئی مہم جو قسم کا لا اُبالی نوجوان غلط راستے پر نہ چل نکلے۔ البتہ اتنا عرض ضرور کروں گا کہ یہ کوئی انہونی بات نہیں۔ مجھے ایک جعلی عامل کے بارے میں کسی نوجوان نے فون کر کے بتلایا ہے کہ ان کے علاقے میں ایک عامل ہے جو سانپ حاضر کرتا ہے اور وہ سانپ با قاعدہ عورت کی آواز میں باتیں کرتا ہے۔ یاد رکھنے کی بات صرف یہ ہے کوئی بھی عامل جو ایسی حرکت کرتا ہو اس کے متعلق فوراً یہ رائے قائم کر لیں کہ وہ جادوگر ہے دوسرے اس کا مطلب یہ نہیں کہ اب وہ عامل حاجت روا یا مشکل کشا بن گیا ہرگز نہیں بلکہ وہ شیطان کے پاس اپنا ایمان گروی رکھ چکا ہے۔ ہمارے لوگوں کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ ایسے لوگوں سے بہت جلد متاثر ہو جاتے ہیں اور ایک شیطان کے دوست کو پہنچا ہوا بزرگ سمجھنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس طرح شیطان اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

عام لوگ اسے بزرگ کی کرامت سمجھنا شروع کر دیتے ہیں جبکہ حقیقت یہ ہوتی ہے کہ یا خبیث جن جس کا اس عامل سے رابطہ ہوتا ہے سانپ کی شکل میں نظر آتا ہے اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہوتا یا پھر کوئی ایسا عامل جادو کے ذریعے ایسا کر دیتا ہے جس کا نا قابل تردید ثبوت قرآن مجید میں ملتا ہے۔

ترجمہ: پھر ان کے جادو کے اثر سے (حضرت موسیٰؑ) کو ایسے معلوم ہوتا تھا کہ اُن کی رسیاں اور لاٹھیاں یک دم دوڑنے لگی ہیں یہ دیکھ کر موسیٰؑ اپنے دل میں ڈر گئے، ہم نے (وحی کے ذریعے) انہیں کہا۔ ڈرو مت، تم ہی غالب رہو گے۔ (سورۂ طٰہٰ آیت 66 تا 68)

یاد رکھیں! یہ دوسرا طریقہ ہے، پہلا تو یہ ہے کہ جن سانپ کی شکل میں ظاہر ہو جائے اور دوسرا جادو کے ذریعے بھی ایسا ہو سکتا ہے۔ حتیٰ کہ سیدنا موسیٰؑ کو جادوگروں کی رسیاں اور لاٹھیاں سانپ نظر آنے لگیں اور اس میدان میں موجود دوسرے تمام لوگوں کو بھی ایسا ہی محسوس ہوا۔ اس بات کو مزید سمجھنے کے لئے قرآن مجید کی سورہ اعراف کی آیات مبارکہ 115 تا 126 ملاحظہ فرمائیں۔ اگر میں چاہتا تو آپ کو محض کہانی سنا دیتا، یہ میرے لئے آسان طریقہ بھی تھا لیکن میں چاہتا ہوں کہ کہانی کے ساتھ ساتھ آپ کے عقائد کی بھی اصلاح ہو اور آپ کو ایسی معلومات مہیا ہوں جو شاید اس سے پہلے آپ کو کہیں نہیں ملی ہوں گی۔ قارئین! کے میسجز اور فون کالز اور خطوط سے یہ بات میرے لئے انتہائی خوشی کی ہے کہ میں اپنے مقصد میں کافی حد تک کامیاب رہا ہوں۔

دوسرا عشق

رکھشے نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا کہ چار سال بعد ہم واپس بنارس آئے اور جوگی کے اس سیوک کے گھر گئے جہاں اغوا شدہ لڑکی کو چھوڑ گئے تھے، اس کی عمر اس وقت بارہ تیرہ سال کی ہو گئی تھی۔ جوگی نے اپنے سیوک سے اس لڑکی کے متعلق چند سوالات کئے اور پھر مطمئن ہو کر اسے کمرے میں بھیجنے کو کہا۔ جب وہ لڑکی کمرے میں

داخل ہوئی اور میری نظر اس پر پڑی تو میں آنکھیں جھپکنا بھول گیا۔ میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا وہ اپنی عمر سے ذرا زیادہ بڑی نظر آ رہی تھی لیکن اس کے چہرے پر سوگواریت اور آنکھوں میں آنسو تھے۔ بیضوی اور آنچ جیسے چہرے پر سیاہ بکھری زلفیں قیامت تھیں، اس کے سیدھے رخسار پر عین اس جگہ جہاں جبڑے کی ہڈی ابھری ہوتی ہے ایک سیاہ تل نمایاں تھا۔ بھیگی بھیگی آنکھوں میں حیا و ندامت سے عرق عرق آنکھیں کیف و مستی کے فوارے تھیں۔ گردن کے نیچے حسن شباب مائل پرواز محسوس ہوتا تھا۔ کمر اتنی پتلی کہ وہ جب چل کر ہمارے پاس آئی تو ایسا لگتا تھا جیسے ہی پتلی کمر درمیان سے ٹوٹ جائے گی۔ شادو کے بعد یہ دوسری لڑکی تھی جو ایک ہی نظر میں مجھے گھائل کر گئی۔ مجھے بنارس، اودھ، لاہور اور ہندوستان کے دوسرے شہروں میں بازار حسن میں بیٹھی رنڈیاں ہیچ نظر آنے لگیں۔

پھر پتہ نہیں رکھے کو کیا خیال آیا اس نے اپنے کانوں میں انگلیاں ڈالیں اور اپنی مترنم اور پُر سوز بھاری آواز میں وارث شاہ کے یہ شعر پڑھنے شروع کر دیئے۔

ہ ٹ سرخ یاقوت جیوں لعل چمکن ٹھوڈی سیب ولایتی سار وچوں
نک الف حسینی دا پیلائے زلف ناگ خزانے دی بار وچوں
دند چنبے دی کلی کہ ہنس موتی نکلے حسن انار وچوں
لکھی چین تصویر کشمیر والی قد سرو بہشت گلزار وچوں
گردن کونج دی انگلیاں روانہہ پھلیاں ہتھ کولڑے برگ چنار وچوں

جوگی میری نظروں کو پہچان گیا۔

"رکھے میں نے تمہیں کہا تھا کہ یہ لڑکی حسن کی دیوی ہوگی"۔ اس نے کہا۔ "پر تو مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ حسن اس پر اس قدر طاری ہو جائے گا کہ تجھ جیسے نوجوان کو مسحور کر دے گا"۔

"ہاں استاد! واقعی یہ لڑکی مجھ پر چھا گئی ہے اور اب میں تم سے ایک ضروری بات کرنے والا ہوں"۔

"ہاں، ہاں کیوں نہیں؟"

"دیکھ استاد! یہ لڑکی میرے حوالے کر دے اور تُو اس سے کوئی توقع نہ رکھ"۔

"دیکھ رکھے! تُو نے ایک مشکل بات کی فرمائش کر دی ہے"۔ جوگی نے کہا۔ "میرے خیال میں یہ بات میرے بس میں نہیں ہے"۔

"ٹھیک ہے پھر تُو اس لڑکی کو صرف طاقت بازو سے حاصل کر سکتا ہے"۔ میں نے جوگی سے کہا۔ ویسے بھی مجھے اب اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔ اس سے جو کچھ میں نے سیکھنا تھا سیکھ لیا۔

"رکھے! میری ایک بات سن"۔ جوگی نے بات بگڑتے دیکھ کر کہا۔ "میں تمہیں اس کا آسان حل بتا دیتا ہوں"۔

"وہ کیا؟"

"لڑکی سے پوچھ لیتے ہیں وہ جس کے ساتھ رہنا چاہے دوسرے کو اعتراض نہیں ہونا چاہیے"۔

"مجھے منظور ہے"۔ میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے"۔ جوگی نے کہا۔

"ابھی اس سے پوچھ لیتے ہیں"۔ لڑکی دوسرے کمرے میں چلی گئی تھی۔ "اگر تم کہو تو میں اسے بلا لاؤں؟"

"نہیں اپنے سیوک کو آواز دو کہ لڑکی کو ادھر بھیج دے"۔

جوگی نے زور سے آواز لگائی سیوک بھاگتا ہوا ہمارے پاس آیا۔ "دیکھو بالک! اس لڑکی کو اِدھر ہمارے پاس بھیج دو"۔ جوگی نے سیوک سے کہا۔

"ٹھیک ہے مہاراج!" سیوک نے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا اور پھر وہ لڑکی کو بلانے کے لئے چلا گیا۔ ذرا دیر بعد واپس آیا اور کہنے لگا۔ مہاراج لڑکی گھر پر نہیں ہے۔ شاید پڑوس میں کسی کے گھر چلی گئی ہو میں

ابھی اسے تلاش کر کے لاتا ہوں۔ پھر اچانک گاؤں میں شور قیامت برپا ہوگیا۔ کسی لڑکی نے کنویں میں چھلانگ لگا دی تھی لوگ اس کنویں کی طرف بھاگے چلے جا رہے تھے۔ جلد ہی گاؤں کے دو غوطہ خور کنویں میں اتر گئے انہوں نے غوطہ لگایا اور پھر کنویں سے آواز دی کہ لڑکی سر کے بل کیچڑ میں دھنسی ہوئی ہے انہوں نے دوبارہ غوطہ لگایا اور لڑکی کو کھینچ کر پانی کی سطح تک لے آئے۔ لڑکی مر چکی تھی اور وہ وہی لڑکی تھی۔ مجھ پر سکتے کا عالم طاری ہو گیا۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنے آپ پر قابو پایا۔ نذیر! وہ لڑکی مجھے آج تک نہیں بھولی۔

اس کے آگے کی کہانی میں تمہیں سنا چکا ہوں کہ پھوپھا ماجے اور پھپھو بہشتاں کی وفات کے بعد اور ملنگ اور اس کی داشتہ کے قتل کے بعد جوگی کا رجوع مذہب کی طرف ہو گیا اور وہ پہاڑوں میں دیگر سادھوؤں کے ساتھ اپنے مذہب کے مطابق عبادت میں مصروف ہوگیا اور پاکستان بننے کے بعد میں اس خانقاہ میں موتیوں والی سرکار کے نام سے تمہارے سامنے بیٹھا ہوں۔

رکھے کا انجام

"قاری صاحب! رکھے نے مجھے ارتکاز توجہ کا عمل سکھایا اور سانپ حاضر کرنے کا عمل کرایا"۔ رکھے کی کہانی سنانے کے بعد نذیر نے کہا۔ "پھر مجھے اور زیادہ مشہور کرنے کے لئے زمین میں گڑھا کھود کر چالیس دن کا چلہ کرایا جو سراسر فراڈ تھا لیکن اس سے یہ فائدہ ہوا کہ میں لوگوں کی نظروں میں رکھے کا جانشین بننے کے قابل ہو گیا۔ ہماری پیری مریدی میں بے پناہ اضافہ ہوا اور ہماری آمدنی بے حد و حساب ہوگئی لیکن رکھے کی شیطانی حرکتوں سے میں بہت تنگ آ گیا تھا وہ ستر سالہ بوڑھا اب مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا تھا اور پھر ایک دن چپکے سے میں نے اس کے کھانے میں سنکھیا ملا دیا۔

کھانا کھانے کے کچھ ہی دیر بعد رکھے کو پتہ چل گیا تھا اس نے بلک بلک کر میرے سامنے ہاتھ جوڑے کہ دواؤں والا تھیلا اسے دوں اور دودھ میں گھی ملا کر اسے پلاؤں۔ اس نے مجھے خدا اور رسولؐ کے واسطے دیئے لیکن مجھے اب اس کی کوئی پروا نہیں تھی پھر اس نے خون آلود الٹی کی اس کے ناک اور مونہہ سے خون بہنے لگا اس کی آنکھیں پتھرا گئیں پھر اس پر تشنج کے دورے پڑنے لگے۔ آخر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر بے جان ہو گیا۔ میں نے اچھی طرح سے اس کے ناک اور منہ سے خون صاف کیا اور آرام سے اپنے حجرے میں آ گیا۔

صبح میں بلند آواز سے رونے لگا۔ اردگرد کے ڈیرے والوں نے رونے کی آواز سنی تو خانقاہ میں جمع ہو گئے۔ رکھے کی موت کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پورے علاقے میں پھیل گئی۔ مریدوں کا جم غفیر جمع ہو گیا۔ رکھے کو غسل دیا گیا اور قریبی گاؤں کے مولوی صاحب کو جنازہ پڑھانے کا کہا وہ خود تو نہ آئے مگر اپنا ایک شاگرد بھیج دیا اور رکھے کو دفن کر دیا گیا۔ پیر بھائی آپس میں گلے مل کر رو رہے تھے اور ایک دوسرے سے تعزیت کر رہے تھے۔ کوئی کہہ رہا تھا اللہ والے مرتے نہیں بس ذرا دنیا سے پردہ کر لیتے ہیں۔ کوئی اپنے دل کو تسلی دینے کے لئے کہہ رہا تھا ان کی نگاہِ کرم اب بھی ہم پر ہمیشہ رہے گی وغیرہ وغیرہ۔ میں گدی نشین منتخب ہوا جلد ہی رکھے کی قبر پر سربفلک گنبد کھڑا کر دیا گیا۔ رکھے کے مریدوں نے پانی کی طرح پیسہ بہایا سنگ مرمر کی قیمتی ٹائلوں سے مزار مزین کیا گیا۔ آخر موتیوں والی سرکار کی درگاہ پاک تھی۔ بالو کنجری تو مر گئی تھی لیکن اس کی لڑکی سہتی ہر سال عرس پر آتی اور راگ رنگ کی محفل جمتی لوگ چڑھاوں کے انبار لگا دیتے اس طرح مرا ہوا ہاتھی سوا لاکھ کا ہو گیا۔

گدی نشینی کے مزے

رکھیے کی زندگی میں ہی کافی لوگ مجھ سے متعارف ہو چکے تھے۔ رکھیے کے مریدوں نے اب مجھے اپنا پیر سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ میں نے جعلی پیری کے سارے گُر رکھیے سے سیکھ لئے تھے اس کے علاوہ میں تعلیم یافتہ پینتیس سالہ خوبصورت نوجوان تھا۔ میرے پاس مریدوں کا وسیع حلقہ حسن، جوانی اور دولت وافر مقدار میں موجود تھی۔ ارتکاز توجہ اور سانپ حاضر کرنے کا فن بھی جانتا تھا۔ کئی سنیاسی نسخے بھی رکھیے سے سیکھ رکھے تھے۔ طبیعت میں عشق و محبت کا جذبہ غالب تھا جس دن سے رابعہ نے میرے اندر سوئے ہوئے حیوانی جذبات کو ہوا دی تھی میں عشق کے رموز و اوقاف سے پوری طرح آشنا ہو گیا۔ یاد رہے کہ ہر متنفس کو لذت عشق عطا کی گئی ہے اور اس در و جگر سے رابعہ مجھے آشنا کر چکی تھی اور میں اب تک اس صحرائے پُر فضا میں بہت کچھ بادیہ پیمائی کر چکا ہوں۔

راجہ اندر اور واجد علی شاہ جیسے بے شمار مریضانِ عشق گزر چکے ہیں لیکن میرا انداز ان سب سے نرالا تھا وہ حکومت اور طاقت کے ذریعے ایسا کرتے تھے، میں فقیری اور درویشی کے لبادے میں۔

”نذیر! چھوڑ ان باتوں کو“۔ میں نے ذرا اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”مجھے یہ بتا کہ تُو کس طرح راہِ راست پر آیا؟“

”قاری صاحب اس کی کئی وجوہات تھیں“۔ نذیر نے کہا۔ ”لیکن سب سے بڑی بات محض میرے مولا کا کرم ہے اور عشق کا حصہ بھی اس میں ضرور ہے“۔

”عشق کا حصہ؟“

”ہاں قاری صاحب! اور آپ کی دعا بھی شاملِ حال تھی“۔ نذیر نے کہا۔ ”آپ حیران ہوں گے کہ میرے دل سے عورتوں کا عشق آخری چند سالوں میں بالکل ختم ہو گیا تھا اور میرا اندازِ فقیری بھی بدل گیا تھا میں نے سنہری دستار و جبہ چھوڑ کر صرف لنگوٹ اپنا لیا تھا۔ حجامت بنوانی بھی چھوڑ دی تھی۔ آپ نے مجھے اس حالت اور شکل میں دیکھا تھا“۔

”ہاں، بھئی جب تم ہمارے گاؤں آئے تھے تو صرف لنگوٹ ہی باندھا ہوا تھا“۔ میں نے نذیر سے کہا۔ ”اور تمہارے بغلوں کے بال اور زیرِ ناف بال بڑھے ہوئے تھے“۔

”ہاں، لیکن اس وقت میں عورتوں سے بالکل بے رغبت ہو گیا تھا۔ آپ کو یاد ہو گا کہ ایک لڑکا جس نے لڑکی کا روپ دھارا ہوا تھا جس کو آپ نے مارا بھی تھا وہ لڑکا خانہ بدوشوں کا تھا اور وہ رکھیے کے مزار پر چڑھاوا چڑھا گئے تھے۔ وہ لڑکا میری خواہش پوری کیا کرتا تھا اور بعد میں وہی رکھیے کے مزار کا گدی نشین بنا تھا۔ اس رات آپ نے میرے بھیجے ہوئے سانپ کو بھگا دیا تھا اور میری جعلی پیری سے پردہ اٹھا دیا تھا۔ اس سے میرے ساتھ میرے مرید مجھ سے بدظن ہو گئے۔ پیران پیر کی زیارت کا ڈھونگ بھی آپ نے افشا کر دیا تھا اور پھر ایک رات ایک ڈراؤنا خواب میں نے دیکھا“۔

جہنم کا گڑھا

نذیر نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”ایک رات سونے سے ذرا پہلے مجھے خیال آیا اور میں نے اپنی موجودہ اور گزری ہوئی زندگی کو یاد کیا۔ شرک، قتل جس میں دو معصوم بچے بھی شامل تھے۔ زنا، حرام خوری، جھوٹ فراڈ، دھوکہ دہی، جادو سیکھنا وغیرہ، اتنے بڑے بڑے گناہ، میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ موت یاد آئی اور پھر روزِ قیامت حساب کتاب کا مرحلہ، ضمیر سے آواز آئی او ظالم انسان تُو نے اپنی جان پر کتنے ظلم کئے اور حاصل کیا کیا؟ دنیا کا زر و مال جو عارضی ہے

اور جس کو تمہارے سامنے رکھتا چھوڑ کر چلا گیا اس سے پہلے کہ خدا کی پکڑ آ جائے توبہ کرے......

انہی خیالوں میں مجھے نیند آ گئی میں نے خواب میں دیکھا کہ دو آدمی مجھے پکڑ کر جہنم کی طرف سے لے جا رہے ہیں۔ وہ ہولناک منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوا اور پھر انہوں نے مجھے جہنم کے عین وسط میں پھینک دیا میں نے جہنم میں خچر کے قد کاٹھ کے بچھو اور بڑے بڑے سانپ دیکھے جو مجھ پر حملہ آور ہو گئے اور آگ نے مجھے جلانا شروع کر دیا۔ میں نے بڑے ہاتھ پاؤں مارے، چیخا چلایا اور پھر مجھے اس وقت ہوش آیا کہ چارپائی سے گر کر زمین پر پڑا تھا میرے حواس کچھ بحال ہوئے میں نے دیکھا کہ میرے جسم پر باقاعدہ رعشہ طاری تھا اور میں پسینہ پسینہ ہو رہا تھا"۔

رابعہ کی غیر متوقع آمد

رابعہ نے جب سے توبہ کی تھی وہ اپنی توبہ پر قائم رہی اور اس کے بعد کبھی مجھے ملنے کے لئے نہیں آئی، اس دوران تقریباً بیس سال کا عرصہ بیت گیا اب میں اس کی طرف سے بالکل مایوس ہو گیا تھا۔ ان بیس سالوں میں رابعہ پر کئی قیامتیں آئیں اور گزر گئیں۔ مجھے اس کے متعلق واقعات کا پتہ چلتا رہتا تھا لیکن میں اپنی گناہ آلود زندگی میں اتنا غرق ہو چکا تھا کہ مجھے کسی کا کوئی احساس باقی نہیں رہا تھا۔ جس رات میں نے خوفناک خواب دیکھا اس سے اگلے دن رابعہ خانقاہ پر آئی جیسے ہی وہ خانقاہ میں داخل ہوئی اتنے سال گزرنے کے باوجود میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ میرے قریب آئی اور میرے پاؤں پکڑ لئے اور پھر اس کی چیخیں نکل گئیں وہ اس قدر دلدوز تھیں کہ میرا دل دہل گیا کہ پتہ نہیں رابعہ کو کیا افتاد آن پڑی ہے۔

"میرے پاؤں چھوڑ دے رابعہ، اپنے پاک ہاتھ میرے گندے وجود کو نہ لگا"۔ میں نے لرزتی آواز سے کہا۔

"نہیں نذیر! تُو پاک ہے، میں گندی اور ناپاک ہوں"۔ رابعہ نے کہا۔ "تجھے اس راستے پر ڈالنے والی میں ہی ہوں"۔

"نہیں، میں خود گمراہ ہوا ہوں رابعہ تیرا اس میں کوئی قصور نہیں"۔ میں نے کہا۔ "مجھے بتا آج تو اتنے عرصے بعد یہاں کیا لینے آئی ہو؟"۔

"نذیر وعدہ کر آج میں جو تجھ سے مانگوں گی تُو مجھے دے دے گا"۔ اس نے مجھ سے سوال کیا۔

میں گہری سوچ میں گم ہو گیا اور پھر فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "رابعہ مانگ کیا مانگتی ہے جو بھی تُو مانگے گی اگر میرے بس میں ہوا تو تجھے ضرور دے دوں گا"۔

اس نے میرے پاؤں چھوڑ کر اپنے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے اور کہنے لگی۔ "نذیر! میں تجھ سے تجھ کو مانگتی ہوں آج میں تجھے لینے آئی ہوں"۔

"کیا مطلب؟" میں نے پوچھا۔

"مطلب یہ کہ واپس آ جا"۔ رابعہ نے کہا۔ "تجھے میرے پرانے پیار کی قسم میرا اب اس دنیا میں کوئی بھی نہیں رہا، میں مسلسل بیس سال تجھے اللہ سے مانگتی رہی ہوں"۔

"قاری صاحب! آپ یقین کریں میں اس قدر تڑپ کر رو دیا کہ میری آنکھیں آنسوؤں کے سیلاب کے سامنے بے بس ہو گئیں مجھے رابعہ پر ٹوٹ کر پیار آیا اتنا کچھ ہونے کے باوجود وہ وفا کی پتلی اپنے عہد پر قائم تھی۔ مجھے آج سے تقریباً پچیس سال پہلے اس کے کہے ہوئے الفاظ یاد آ گئے، اُس نے مجھ سے کہا تھا نذیر میں مر کر مٹی ہو جاؤں تو میری قبر کی مٹی بھی تمہاری امانت ہے۔

"ٹھیک ہے رابعہ!" میں نے گلوگیر آواز میں کہا۔ "تم جس طرح کہو گی میں اسی طرح کروں گا بول تمہاری کیا خواہش ہے؟"

"مجھے اپنا لے نذیر"۔ اس نے التجا کی۔ "میرے ساتھ نکاح کر لے۔ رسولؐ کے بتائے ہوئے طریقے پر۔ غلط کام سے میں نے توبہ کر لی ہے اور بیس سال سے تیری امانت میں ایک رتی خیانت نہیں کی۔ ہم مل کر اللہ کے حضور اپنے گناہوں کی معافی مانگیں گے۔ مجھے یقین ہے وہ غفور الرحیم ہمیں ضرور معاف کر دے گا"۔

قاری صاحب! میرے دل میں تو پہلے ہی انقلاب آ چکا تھا اور رات والے ڈراؤنے خواب نے رہی سہی کسر پوری کر دی تھی۔ میں نے سینے پر ہاتھ رکھ کر رابعہ سے پکا وعدہ کر لیا اور پھر رابعہ واپس چلی گئی۔ میں نے حجام کو بلوایا اور بغلوں اور زیر ناف بال صاف کئے غسل کر کے نیا لباس پہنا اور اسی دن خانقاہ کو چھوڑ کر اپنے سسرال گیا اور سب سے پہلے اپنی بیٹی کو ملا جس کی عمر تقریباً چوبیس سال ہو گئی تھی اس نے جب مجھے دیکھا تو نفرت سے منہ پھیر لیا اور پھر بھاگ کر اندر چلی گئی۔ میں اس کے پیچھے اندر گیا اور اس کے قدموں میں گر پڑا اور گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

"بیٹی مجھے معاف کر دو میں اس وقت حیوان تھا مجھے کوئی ہوش نہیں تھا"۔ (نذیر کا جرم میرا قلم لکھنے سے قاصر ہے) و نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا

رابعہ کے ساتھ کیا بیتی؟

بیس سال پہلے جب رابعہ نے سچی توبہ کی تو پھر وہ مجھ سے کبھی نہیں ملی لیکن ان بیس سالوں میں رابعہ پر قیامت پہ قیامت ٹوٹتی رہی۔ اس کے ایک بھائی کو سزائے موت ہو گئی اور دوسرے کو عمر قید لیکن بارہ سال جیل کاٹنے کے بعد وہ جیل میں ہی بیمار ہوا اور وہیں فوت ہو گیا۔ دو بھائی باقی تھے جن کو جاگیردارنی نے قتل کرا دیا اس دوران چوہدری رمضان رابعہ کا والد اور والدہ بھی فوت ہو گئے۔ اب رابعہ اکیلی بچی تھی یا اس کا بیٹا جو اصل میں میرا بیٹا تھا اور ہمارے ناجائز تعلقات کا نتیجہ تھا۔ اب وہ تقریباً بائیس سال کا ہو گیا تھا قانونی اور شرعی طور پر وہ اپنے باپ کا ہی بیٹا بنتا تھا عام لوگ بھی اُس جاگیردارنی کے مقتول بیٹے کا بیٹا ہی سمجھتے تھے۔ اب وہ قانونی طور پر اپنے باپ کی دس مربع زمین کا واحد وارث تھا ادھر رابعہ بھی اپنے باپ اور بھائیوں کی واحد وارث تھی کیونکہ اس کے بھائیوں کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ رابعہ کو بھی قتل کرنے کی کوشش کی گئی لیکن وہ معجزانہ طور پر بچ گئی اس کا ذکر میں پیچھے کر چکا ہوں۔ رابعہ کے بیٹے کا نام وسیم تھا جبکہ میری ایک ہی بچی تھی جس کا نام غزالہ تھا۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ میں چھوٹا زمیندار تھا میری زمین صرف پانچ ایکڑ تھی رابعہ بڑے باپ کی بیٹی تھی، رابعہ کی تحریک پر میری والدہ نے چوہدری رمضان سے میرے لئے رابعہ کا رشتہ مانگا تو چوہدری رمضان نے میری ماں کی بے عزتی کی تھی۔ کاش یہ اونچ نیچ نہ ہوتی تو شاید اتنی لمبی کہانی جنم نہ لیتی۔ دو گھر مکمل طور پر تباہ نہ ہوتے اور میں راہِ راست سے نہ ہٹتا میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ خدا کو ایسے ہی منظور تھا کیونکہ انسان اپنی غلطیوں کوتاہیوں کا خود ہی ذمہ دار ہے جب آپ کی تدبیر غلط ہو گی تو تقدیر کو مورد الزام نہیں ٹھہرا سکتے اپنے گناہوں کا ذمہ دار بھی خدا پاک کو ہی ٹھہرا دیتے ہیں حالانکہ انسان کو نیکی اور بدی کے دونوں راستے بتا دیئے گئے ہیں اب انسان کی اپنی مرضی پر منحصر ہے کہ کفر کرے یا شکر کرے اور اگر انسان مجبور محض ہے تو پھر عذاب کا حقدار نہیں ہے۔

قاری صاحب! آپ اس بات کو مجھ سے زیادہ جانتے ہیں، مجھے سیدنا علیؓ کی بات یاد آ گئی جب اُن سے کسی نے اسی قسم کا سوال کیا کہ بندہ کس حد تک مختار ہے تو آپ نے سائل سے فرمایا اٹھ کر کھڑے ہو جاؤ، وہ کھڑا ہو گیا۔ آپ نے فرمایا ایک ٹانگ اوپر اٹھاؤ، اس نے ایک ٹانگ اوپر اٹھا دی۔ فرمایا اب دوسری بھی اٹھاؤ، وہ کہنے لگا جناب دوسری نہیں اٹھا سکتا۔ فرمایا اس سے ثابت ہوا کہ

کسی حد تک بندے کا اختیار ہے لیکن ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ بندے کے اختیار سے باہر ہو جاتا ہے۔

قاری صاحب! اب صورت حال یہ ہو گئی کہ چوہدری رمضان کا سارا گھرانہ ختم ہو گیا رابعہ کے سسرال بھی ختم ہو گئے۔ اب رابعہ خود مختار تھی اور پھر اس نے میرا ہی انتخاب کیا۔ ہم دونوں کی عمریں پچاس سال سے اوپر ہو گئی تھیں ہم نے سادگی سے نکاح کیا۔ وسیم کی مرضی بھی اس میں شامل تھی میرے پاس بے شمار دولت تھی اور رابعہ تو ویسے ہی منہ میں سونے کا چمچہ لئے پیدا ہوئی تھی۔ وسیم کی جائداد بھی اب ہماری ہی تھی میں پندرہ مربع زمین کا مالک اور دنیا کی تمام دولت رابعہ کے مقابلے میں کچھ بھی حیثیت نہیں رکھتی تھی وہ بھی میری ملک میں تھی اور سب سے بڑی بات میری زندگی میں انقلاب آ گیا میں نے شیطان سے ناطہ توڑ کر رب کائنات سے ناطہ جوڑ لیا ہے، ہم نے نکاح والے دن اتنی دولت خیرات کی کہ اردگرد کے دیہاتوں کے غریب لوگ بھی نہال ہو گئے۔

دعاؤں کا ثمر

نذیر کی داستان سن کر میں گہری سوچ میں ڈوب گیا ذرا دیر بعد نذیر نے مجھے کہا۔ قاری صاحب کس سوچ میں کھو گئے ہو۔

''نذیر میں یہ سوچ رہا ہوں کہ ایسا کیسے ہو گیا''۔ میں نے کہا۔ ''اتنے گنہگار انسان پر خدا تعالیٰ کی اتنی رحمت کیسے ہو گئی۔ نذیر تم مجھے سوچ کر بتاؤ کہ کبھی تم نے اپنی زندگی میں کوئی نیکی کا ایسا کام کیا ہو جو تمہیں آج تک یاد ہو''۔

''نہیں قاری صاحب میں نے نیکی کا کوئی ایسا کام کام نہیں کیا جو میرے گناہوں کا نعم البدل ہو سکتا''۔ نذیر نے کہا۔ ''ہاں البتہ مجھے پتہ ہے کہ ایسا کیوں ہوا''۔

''کیوں ہوا؟'' میں نے جلدی سے پوچھا۔

''صرف رابعہ کی دعائیں خدا کے ہاں مقبولیت کا درجہ حاصل کر گئیں''۔ نذیر نے کہا۔ ''جب اس نے برائی سے توبہ کی اور مجھ سے بیس سال پہلے جدا ہوئی تو اس نے مجھے کہا تھا کہ نذیر چھوڑ اس گناہ آلود زندگی کو اور میں تیرے لئے خدا سے دعا کرتی رہوں گی کہ اللہ اپنی اتنی مخلوق میں سے ایک نذیر مجھے دے دے، میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ یہ سب رابعہ کی دعاؤں کا ثمر ہے''۔

میرے ذہن نے فوری طور پر اس بات کو تسلیم کر لیا۔

رابعہ سے ملاقات

میرے دل میں رابعہ سے ملنے کی شدید خواہش پیدا ہو گئی۔ میں نے نذیر سے کہا۔ نذیر میں رابعہ سے ملنا چاہتا ہوں۔

''ضرور قاری صاحب! لیکن میری ایک خواہش ہے کہ آپ جب آئیں بھابی کو ساتھ لے کر آئیں''۔ نذیر نے کہا۔ ''ویسے آپ مجھ سے کافی چھوٹے ہیں میری بچی آپ کی ہم عمر ہے اگر آپ برا محسوس نہ کریں تو میں بھابی کے بجائے آپ کی بیگم کو بیٹی کہہ لوں''۔

''جیسی تمہاری مرضی!'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

صبح نذیر واپس جانے لگا تو مجھ سے اپنی امانت مانگی میں نے بیگم سے کہا کہ وہ روپوں والی تھیلی (عام زبان میں اسے ونجلی کہتے تھے) لاؤ، اس میں کافی تعداد میں چاندی کے روپے تھے، وہ تھیلی لے کر آئی اور مجھ سے کہنے لگی کہ مہمان رخصت ہو رہا ہے؟ میں نے کہا ہاں!

''شکر ہے خدا کا''۔ بیگم کہنے لگی۔ ''میں تو تھی کہ بس اب یہ یہیں کا ہی ہو رہے گا، یہ پھر کب آئے گا؟'' میری بیگم نے ازراہ مذاق کہا۔

''بس اب یہ کبھی نہ کبھی آتا ہی رہے گا''۔ میں نے اسے چڑایا۔

''ٹھیک ہے پھر ہمیں یہاں سے جانا ہی پڑے گا''۔ بیگم نے کہا۔
''اسے بھی تمہارے والا مرض تھا''۔ میں نے شرارتاً کہا۔
''مجھے کون سا مرض تھا؟'' میری بیگم نے سوالیہ انداز سے پوچھا۔
''بھئی وہی جو تمہیں تھا، جواب کافی حد تک ٹھیک ہو گیا ہے''۔
''پہیلیاں نہ بجھوائیں صاف بات کریں''۔
''چھپ چھپ کر رونے کا، میری والدہ اور اپنی پھپھو سے تم نے کیا کہا تھا''۔
''چھوڑیں قاری صاحب گڑے مردے نہ اکھاڑیں میرے خیال میں آپ خوش فہمی کا شکار ہو گئے ہیں۔ ایسی بھی کوئی بات نہیں تھی''۔
''امی کو بلاؤں؟''
''رہنے دیں پھپھو بھی آپ کی ہی حمایت کریں گی''۔
''اس کا مطلب ہے اب تم اقرار نہیں کرو گی؟''
''ہاں نہیں کروں گی''۔
''دل سے کہہ رہی ہو؟''
''نہیں زبان سے دل تو باتیں نہیں کرتا بولتی تو زبان ہے''۔
''لیکن دل کی بات ہی زبان پر آتی ہے''۔
''چلیں یوں ہی سمجھ لیں لیکن بعض دفعہ دل میں کچھ ہوتا ہے زبان پر کچھ''۔ پھر وہ کھل کر ہنسی اور اپنا ہاتھ میرے کندھے پر رکھ کر کہنے لگی۔ ''کیا ابھی تک آپ کو یقین نہیں آیا۔
باہر سے نذیر نے آواز دی قاری صاحب! دیر ہو رہی ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے حسین خواب دیکھتے ہوئے جگا دیا ہو۔ میں نے روپوں والی تھیلی پکڑی اور نذیر کے پاس آ گیا۔
''قاری صاحب اگر اجازت ہو تو ذرا بیٹی سے مل لوں؟''
''ہاں، اس میں کیا حرج ہے''۔ میں نے کشادہ دلی سے کہا۔ وہ میرے ساتھ اندر آ گیا میری بیگم نے پردہ کر لیا اس نے پدرانہ شفقت سے میری بیگم کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ پتہ نہیں اس کی آنکھوں میں آنسو کیوں آ گئے پھر بھرائی آواز میں کہنے لگا۔ ''دیکھو بیٹی! تم میری بیٹی سے بھی چھوٹی ہو میں تمہارے باپ کے برابر ہوں دیکھو میرا دل نہ توڑنا یہ تھوڑے سے پیسے رکھ لو''۔ پھر اس نے روپوں کی تھیلی زمین پر رکھ دی اور باہر آ گیا۔ میری بیگم نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا میں ابھی کچھ کہنے ہی والا تھا کہ نذیر نے آگے بڑھ کر میرا بازو پکڑ لیا اور گلی میں آ کر کہنے لگا۔ آپ کوئی فکر نہ کریں ان میں ایک روپیہ بھی حرام کا نہیں ہے۔
رات کو میں نے بیگم کو نذیر کی کہانی سنائی تو اس نے بھی اشتیاق ظاہر کیا کہ وہ بھی رابعہ سے ملنا چاہتی ہے چنانچہ ہم رابعہ کے گاؤں پہنچ گئے۔ میں نے نذیر کو اپنا پروگرام بتا دیا تھا وہ لوگ ہمارے منتظر تھے رابعہ نے میری بیگم کو کافی دیر سینے سے لگائے رکھا اور پھر بڑھ کر میرے سر پر پیار دیا۔ رابعہ گو پچاس کے پیٹے میں تھی لیکن اس عمر میں بھی حسن کی گھٹائیں اس پر چھائی ہوئی تھیں اگر اس کا قد تھوڑا سا اور لمبا ہوتا تو حُسن کا شاہکار نظر آتی وہ میری والدہ کی طرح تھی لہٰذا احتراماً میں اس کے سراپے کے بارے میں نہیں لکھوں گا۔
''قاری بیٹا! آپ مجھے چچی کہیں تو مجھے خوشی ہو گی''۔ وہ مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگی۔ ''نذیر بے شک آپ کا دوست بھی ہے لیکن رشتے اپنی جگہ بہت اہم ہوتے ہیں ویسے بھی مجھے قاری لوگوں سے بڑی عقیدت ہے۔ خدا بخشے میرے استاد بھی قاری تھے انہی کی وجہ سے

میں راہِ راست پر آئی تھی میں نے قرآن حکیم کا مکمل ترجمہ اور تفسیر ان سے پڑھی تھی“۔

مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ چچی رابعہ کی بھرپور فرمائش پر میں نے اُن کے وسیع وعریض مکان کی چھت پر وعظ کیا تھا کیونکہ گرمیوں کا موسم تھا اور لاؤڈ سپیکر اس وقت ابھی دیہات میں شاذ و نادر ہی تھے میں اس وقت بھرپور جوان تھا اور گلے میں سوز بھی تھا لہجے میں روانی اور اندازِ بیان ساحرانہ تو نہیں لیکن الحمدللہ ٹھیک ہی تھا لوگوں نے کافی پسند کیا۔ ہم نے صبح واپس آنے کا کہا لیکن انہوں نے ضد کر کے ایک دن اور رکنے پر مجبور کر دیا۔

جستجو کھوئے ہوؤں کی عمر بھر کرتے رہے

نذیر کبھی نہ کبھی ملنے کے لئے آتا رہتا ایک دفعہ رابعہ کے بیٹے وسیم کو بھی ساتھ لایا۔ وسیم ایک وجیہہ امیرزادہ تھا۔ میرا اچھا دوست بن گیا۔ وہ مجھے قاری بھائی کہا کرتا تھا۔ زندگی کے شب و روز گزرتے رہے وقت کا صیاد شکار کے تعاقب میں ہمیشہ سرگرداں رہتا ہے لیکن یہ بھی خدا تعالیٰ کی حکمت بالغہ ہے کہ آئندہ آنے والے خوفناک حادثات و واقعات سے انسان کو آگاہ نہیں کیا ورنہ دنیا غم و اندوہ کے جہنم میں تبدیل ہو جاتی البتہ یہ حقیقت ہر شخص کو معلوم ہے کہ ایک نہ دن اس دنیا فانی کو چھوڑ کر چلے جانا ہے لیکن موت کا وقت نہیں بتایا تاکہ انسان غفلت و لاعلمی میں زندگی کے اختصار میں سے چند لمحے عارضی خوشی اور سکون کے چھین سکے لیکن اس کے باوجود ایک ہی رات کی دلہن سہاگ رات میں کوئلوں کی گیس سے دم گھٹ کر مر جاتی ہے اور کسی کو ایک رات بھی نصیب نہیں ہوتی سسرال پہنچنے سے پہلے ہی ایکسیڈنٹ کا شکار ہو کر قبر میں بسیرا کر لیتی ہے۔ بے شک دنیا کی ہر خوشی اور ہر غم عارضی ہے لیکن خوشی کا وقت کم اور غم کی رات لمبی ہو جاتی ہے۔ انسان سوچتا کچھ ہے ہوتا کچھ ہے

سید عبدالقادر جیلانیؒ فرماتے ہیں:

ترجمہ: بہت سے لوگوں میں کفن پہننے والے ابھی تک بازاروں کی خرید و فروخت میں لگے ہیں اور موت سے غافل ہیں۔

بہت سے لوگوں کی قبریں کھد کر تیار ہوئیں مگر ان میں دفن ہونے والے خوشیاں مناتے پھرتے ہیں۔

بہت سے لوگ منتظر ہوتے ہیں خوشی کی خبروں کے اچانک ان کے سامنے رنج اور مصیبت کی خبریں آتی ہیں۔

قارئین کرام! زمانہ کی نیرنگی کچھ عجیب قدرت کا تماشہ دکھا رہی ہے ایک ہی شہر میں ایک ہی جگہ،

کہیں گلاب کے پھول، کہیں درخت ببول
کہیں شادی کا ولیمہ کہیں میت کے پھول
کوئی اپنے بہنوئی کے لئے دوشالہ خریدے لئے چلا آتا ہے
کوئی اپنے داماد کے لئے کفن کا کپڑا لئے چلا آتا ہے
کسی کو عطرِ سہاگ لگایا جاتا ہے
کسی کے غسل میت کے لئے پانی میں کافور ملایا جاتا ہے
کوئی مخملی بچھونوں پہ سوتا ہے
کوئی قبر کی خاک پر پڑا ہوتا ہے
کسی کی ایک آواز پر ہزار جواب ملتا ہے
کسی کی ہزار آواز پر بھی کوئی جواب نہیں
کہیں خوشی، کہیں غم
کہیں خانہ آبادی، کہیں خانہ بربادی

شادی کے ایک سال بعد میری بیگم ایک بچی کو جنم دے کر بچی کی وفات کے آٹھ دن بعد خود بھی دنیا فانی کو خیرباد کہہ گئی۔ اس پر زیادہ نہیں لکھوں گا۔

خیال و خواب ہوا برگ و بار کا موسم

بچھڑ گیا تیری صورت، بہار کا موسم
کئی رُتوں سے میرے نیم وا دریچوں میں
ٹھہر گیا ہے تیرے انتظار کا موسم

نذیر اور چچی رابعہ کو پتہ چلا تو وہ ہمارے پاس پہنچ گئے۔ میری بیگم اپنے میکے میں فوت ہوئی تھی۔ ہم دن غروب ہونے سے ذرا پہلے دفن کرنے کی تیاری کر رہے تھے۔ میت کو اسامی میں رکھ دیا گیا تھا کہ کسی نے بلند آواز سے پکارا۔ ٹھہر جاؤ! ایک آدمی اور ایک عورت کپڑا ہلاتے ہوئے آ رہے ہیں، ہم ٹھہر گئے جب وہ قریب آئے تو میں نے پہچان لیا۔ وہ نذیر اور رابعہ تھے۔ چچی رابعہ غم سے نڈھال تھی۔ ایک آدمی نے کفن منہ سے ہٹا کر اسامی میں ہی منہ دکھایا کیونکہ چچی رابعہ نے میت کا منہ دیکھنے کی خواہش کی تھی۔ پھر وہ میری طرف بڑھی اور ماں مہربان کی طرح مجھے کلاوے میں لے کر اس تڑپ سے روئی کہ میری آنکھیں بھی اُبل پڑیں۔ قبر میں مٹی ڈالی جانے لگی۔

نذیر مجھے بازو سے پکڑ کر قریبی نالے کی طرف لے آیا وہ زار و قطار رو رہا تھا۔ پھر اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور کہنے لگا۔ قاری صاحب! مجھے پتہ نہیں اس وقت یہ بات کرنی مناسب ہے یا نہیں لیکن اگر آپ بُرا محسوس نہ کریں تو ایک بات کروں؟

''ہاں کرو''۔ میں نے اجازت دی۔

''دیکھیں، قاری صاحب! آپ کو جو صدمہ ہوا ہے اس کا بدل تو ہو ہی نہیں سکتا''۔ نذیر نے کہا۔ ''لیکن یہ خدا کے کام ہیں، انسان تو مجبور محض ہے۔ میں اپنی لڑکی غزالہ کا رشتہ آپ کو دیتا ہوں، آپ جب جی چاہے نکاح کر سکتے ہیں اور یہ محض تسلی دلاسہ نہیں اس میں رابعہ کا مشورہ بھی شامل ہے''۔

''ٹھیک ہے، نذیر! تمہارا شکریہ''۔ میں نے کہا۔ ''لیکن ابھی میں ہاں یا نہ کی پوزیشن میں نہیں ہوں''۔

لیکن جوڑیاں آسمان پر بنتی ہیں، زمین پر نہیں۔ میں ایک لڑکی کے حُسن کی سادگی سے متاثر ہو گیا اور پھر کوشش بسیار کے بعد اس سے شادی کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

اسی سال رابعہ اور نذیر نے حج بیت اللہ کی سعادت کے لئے درخواستیں دی تھیں لیکن ان کی درخواستیں منظور نہ ہوئیں۔ اس زمانے میں ہوائی سروس ابھی کم ہی تھی، زیادہ تر حجاج بحری جہازوں سے جاتے تھے اور قرعہ اندازی کے ذریعے درخواستیں منظور کی جاتی تھیں۔ البتہ جن کی درخواستیں ایک دفعہ منظور نہ ہوتیں تو اگلے سال انہیں ترجیحی بنیادوں پر قبول کر لیا جاتا تھا۔ چنانچہ اگلے سال رابعہ اور نذیر حج کرنے کے لئے چلے گئے۔ واپسی پر جدہ سے ایک دن کی مسافت طے ہونے کے بعد نذیر کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی۔ اسے اسہال اور اُلٹیاں شروع ہو گئیں۔ جہاز پر میڈیسن کا پورا انتظام تھا لیکن ڈاکٹر اسے بچانے میں ناکام ہو گئے اور وہ دارِ فانی سے کوچ کر گیا۔ بحری جہاز کے قواعد و ضوابط کے مطابق اسے غسل دیا گیا اور باقاعدہ نمازِ جنازہ ادا کی گئی جس میں جہاز پر سوار تمام حاجی شریک ہوئے اور پھر اس کی میت کے ساتھ بھاری پتھر باندھ کر سمندر میں بہا دیا گیا۔

جب مجھے اطلاع ملی کہ وزیر آباد ریلوے سٹیشن پر کراچی سے حاجیوں کی ٹرین آ رہی ہے تو میں ان کا استقبال کرنے کے لئے وزیر آباد پہنچ گیا۔ میں مجمعے میں سے انہیں تلاش کر رہا تھا کہ اچانک چچی رابعہ مجھے نظر آ گئی لیکن نذیر اس کے ساتھ نہیں تھا۔ میں نے بھاگ کر چچی رابعہ کے کندھے پہ ہاتھ رکھ دیا اس نے مجھے دیکھا تو اس کی چیخیں نکل گئیں۔ میں حیران و پریشان ہو گیا اور پوچھا۔ چچی کیا بات ہے تُو رو کیوں رہی ہے، یہ تو خوشی کا موقعہ ہے اور حاجی نذیر کدھر ہے؟

''قاری بیٹا! وہ فوت ہو گیا''۔ چچی رابعہ نے کہا۔

''کیسے..... کہاں؟'' مجھ پر اضطرابی کیفیت طاری ہو

گئی اور پھر چچی رابعہ نے سارا واقعہ مجھے سنایا۔ اتنے میں وسیم اور غزالہ بھی ہم سے آ ملے اور جب انہیں نذیر کی وفات کا پتہ چلا تو غزالہ پر سکتے کی کیفیت طاری ہو گئی، وسیم بھی انتہائی پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ چچی رابعہ نے غزالہ کو سینے سے چمٹا لیا اور اُسے تسلی دلاسہ دینے لگی لیکن اس کی اپنی آنکھیں ساون برسا رہی تھیں۔ وسیم نے بڑھ کر غزالہ کو بازو سے پکڑا غزالہ نے وسیم کی طرف دیکھا اور پھر اپنے بازو پھیلا دیے۔ وہ وسیم کے گلے لگ کر زار و قطار رو رہی تھی۔ وسیم کے آنسو بھی چھلک پڑے پھر وہ غزالہ کے آنسو پونچھنے لگا اور آہستہ سے کہا۔ غزالہ مت رو میں زندگی میں تمہیں کبھی دکھ نہیں آنے دوں گا۔ میری چھٹی حس بیدار ہو گئی میں خطرے کی بُو محسوس کر رہا تھا، ایک ایسا خطرہ جو والدین کی کوتاہیوں سے جنم لیتا ہے۔ خدا اور رسولؐ نے جس کی سنگینی کی اطلاع ہمیں قرآن و حدیث میں دے دی ہے۔

ترجمہ: مت قریب جاؤ زنا کے بے شک وہ بے حیائی ہے اور بُرا راستہ۔

میں نے دل میں دعا کی خدا کرے میرا اندازہ غلط ہو لیکن میری چھٹی حس بہت کم دھوکا کھاتی ہے۔ وسیم اور غزالہ کی نظروں میں مجھے وہ چیز نظر آئی جس نے میرے رونگٹے کھڑے کر دیے۔ اب مجھے جلد از جلد اس کا حل سوچنا تھا ورنہ ان کے گناہ میں مَیں برابر کا شریک ہوتا۔ ہم گھر آ گئے مبارک دینے والے تعزیت کر رہے تھے کوئی کہہ رہا تھا نذیر خوش قسمت ہے کہ گناہوں سے پاک ہو کر خدا کے پاس چلا گیا۔ چچی رابعہ کو تسلی دلاسے دینے والے اپنے اپنے خیال کے مطابق کچھ کہہ رہے تھے لیکن چچی نذیر کی جدائی کو برداشت نہ کر سکی۔ کھانا پینا چھوڑ دیا اسی رات مجھے کہنے لگی۔

''قاری بیٹا! میں نے بیس سال تک اللہ سے دعائیں مانگ مانگ کر نذیر کو لیا تھا۔ کاش! میں دعاؤں میں اس کی درازیٔ عمر کی دعا بھی مانگ لیتی''۔

ٹھیک دو ماہ بعد چچی رابعہ بھی اللہ کو پیاری ہو گئی۔ میں نے بہت کم لوگوں کی میت پر اتنا حسن اور نور دیکھا ہے جتنا چچی رابعہ کے چہرے پر تھا۔

مکافاتِ عمل

میرے دل میں ایک کرب ناک خوف گھر کر گیا تھا جو مجھے چین نہیں لینے دے رہا تھا۔ چچی رابعہ کی وفات کے چند دن بعد ہی میں دوبارہ وسیم کے گاؤں پہنچ گیا۔ تعزیت کرنے والوں کا ابھی تک تانتا بندھا ہوا تھا چھوٹی عمر میں ہی وسیم اپنے علاقے کا ہر دلعزیز نوجوان بن چکا تھا وہ مجھے بڑے تپاک لیکن غمزدہ انداز سے ملا۔ مجھے کچھ بھی سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وسیم سے کیسے اور کس طرح بات کروں کیونکہ ابھی اس کے گھر کا ماتمی ماحول ختم نہیں ہوا تھا۔ عصر کی نماز پڑھ کے میں اپنے طور پر ہی باہر کھیتوں کی طرف نکل گیا ابھی میں تھوڑی دور ہی گیا تھا کہ کسی نے مجھے آواز دی قاری بھائی! میں فوراً پہچان گیا وہ وسیم تھا۔

''بھائی جان! کدھر کا ارادہ ہے؟'' اس نے پوچھا۔ ''بس یار ذرا گھومتے پھرتے اِدھر نکل آیا ہوں''۔ میں نے کہا۔

اس نے اپنے باڈی گارڈز کو اشارے سے کہا کہ وہ یہیں ٹھہریں میں نے قاری صاحب سے ضروری بات کرنی ہے۔ لیکن باڈی گارڈز نے وسیم کو یاد دلایا کہ چوہدری صاحب آپ کی والدہ کی وصیت ہے کہ آپ کو کسی حال میں بھی اکیلے نہیں چھوڑا جائے گا۔

''پیارے ویرو میں کہیں دور نہیں جا رہا''۔ وسیم نے کہا۔ ''تم بالکل کوئی فکر نہ کرو میری والدہ مرحومہ ٹھیک کہہ گئی ہیں اُن کے دو بھائی قتل ہو چکے ہیں اور وہ خود بھی معجزانہ طور پر بچی تھیں بس ان کے دل میں ایک قسم کا خوف بیٹھ گیا تھا۔ میری کسی سے کوئی دشمنی نہیں ویسے بھی میں دشمنوں سے نمٹنا خوب جانتا ہوں''۔ اس نے۔ جوانی

کے جوش میں کہا۔

''ٹھیک ہے دوستو!'' میں نے کہا۔ ''ہم زیادہ دور نہیں جائیں گے اور تمہاری نظروں سے اوجھل بھی نہیں ہوں گے''۔

''ٹھیک ہے جناب!'' انہوں نے سعادت مندی سے کہا۔

ہم اُن سے ذرا دور ہٹ کر کھیت کی ایک منڈیر پر بیٹھ گئے۔

''قاری بھائی آپ سے ایک مشورہ کرنا ہے''۔ وسیم نے کہا۔

''ہاں بھئی کیوں نہیں تم کھل کر بات کر سکتے ہو''۔

''میں نے غزالہ سے شادی کا فیصلہ کر لیا ہے''۔ وسیم نے بات آگے بڑھائی۔

میرے دل پر ایک ضرب سی لگی لیکن میں نے سنبھلتے ہوئے کہا۔ ''تم نے یہ فیصلہ کیوں کیا؟''

''اس لئے کہ وہ جوان ہے خوبصورت ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہم دونوں آپس میں محبت کرتے ہیں۔ انتہائی محبت''۔ وسیم نے کہا۔ ''پھر وہ یتیم ہے مری ماں کی بیٹی ہے اور اب اس کا باپ بھی فوت ہو گیا ہے جس کا وہ منہ بھی نہیں دیکھ سکی''۔

''کیا تمہیں اس پر رحم آتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں یہ بات بھی ہے''۔ وسیم نے صاف گوئی سے کہا۔ ''لیکن اصل بات یہ ہے کہ میں اس کے بغیر رہ بھی نہیں سکتا''۔

میں اندر سے بکھر گیا تھا لیکن ہمت کر کے میں نے پوچھا۔ ''شادی سے پہلے ہی تو سب ارمان پورے نہیں کر لئے؟'' میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا میری بات کا جواب اس کے چہرے پر لکھا ہوا تھا لیکن اس کے باوجود میں نے اسے بولنے دیا۔

''جی قاری بھائی ہم سے کئی دفعہ غلطی ہو چکی

ہے"۔ وسیم نے اعتراف کیا۔ "چچا نذیر اور ای حج پر چلے گئے اس دوران غزالہ ادھر میرے پاس ہی رہی"۔

مکافات عمل! میرے دل سے آواز آئی، خدائی حدیں توڑنے کا خطرناک انجام لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔

"دیکھو وسیم تم غزالہ سے شادی کا ارادہ ترک کر دو"۔ میں نے اس سے کہا۔

"قاری بھائی یہ ناممکن ہے" وسیم نے کہا۔ "اس کے بغیر تو میں ایک پل نہیں رہ سکتا اور یہی حالت غزالہ کی بھی ہے"۔

"لیکن میں تمہیں اس سے شادی نہیں کرنے دوں گا"۔

"قاری بھائی آپ تو میرے بھائی ہیں"۔ اس نے شکوہ کیا۔ "آپ کو میری خوشیاں عزیز نہیں ہیں"۔

صدمے اور کرب نے میرے حواس معطل کر دیئے تھے میں پھٹ پڑا۔ "وسیم کیا تم اپنی سگی بہن سے شادی کر لو گے؟"

"سگی بہن سے؟" اس نے ہونقوں کی طرح مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں، غزالہ تمہاری سگی بہن ہے"۔ میں نے کہا۔ "تم دونوں ایک ہی باپ کے نطفے سے ہو"۔

وہ یک دم سنجیدہ اور پریشان ہو گیا۔ "قاری بھائی کوئی دلیل یا تفصیل؟"

اور پھر میں نے اسے ساری بات تفصیلاً بتا دی جس کی تفصیل آپ پیچھے پڑھ چکے ہیں اس نے دونوں ہاتھ کانوں کو لگائے اور پھر کہنے لگا "یا اللہ رحم" پھر اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور ہچکیوں کے دوران کہنے لگا۔

"قاری بھائی اب کیا ہو گا؟ اس کے ساتھ ہی گاؤں کی مسجد سے شام کی اذان شروع ہو گئی میں نے کہا سن رہے ہو مؤذن کیا کہہ رہا ہے؟ اللہ سب سے بڑا ہے۔ ہاں اس میں کیا شک ہے اس نے آہستہ سے کہا۔

"وہ بڑا بھی ہے اور بڑا رحم کرنے والا مہربان بھی ہے۔ آؤ اس کے حضور اپنے گناہ کی معافی مانگو"۔

"کیا وہ اتنا بڑا جرم معاف کر دے گا؟" اس نے مایوسانہ انداز میں کہا۔

"ہاں وسیم! مجھے یقین ہے کہ اس نے تمہارے گنہگار والد اور والدہ کو معاف کر دیا ہے وہ تمہیں بھی معاف کر دے گا۔ گناہ چونکہ کسی حالت میں بھی انسان کے لئے فائدہ مند نہیں ہے اور اللہ چونکہ اپنے بندوں پر مہربان ہے۔ اس لئے اس نے گناہ سے بچنے کی تلقین کی ہے لیکن اگر بندہ باز نہ آئے تو اسے مکافات عمل سے ضرور گزرنا پڑے گا"۔

"قاری بھائی! میں اب گھر نہیں جاؤں گا"۔ ہم نماز پڑھ کر مسجد سے باہر آئے تو وسیم نے دوٹوک انداز میں کہا۔ "اس نے باڈی گارڈز کو بلایا اور گھوڑیاں تیار کرنے کے لئے کہا اور اسی وقت اپنے قانونی باپ کے گاؤں چلا گیا۔

غزالہ کو پتہ چلا تو وہ بہت پریشان ہوئی بعد میں اس نے اسے کئی پیغام بھیجے لیکن وسیم نے اسے صاف کہہ دیا کہ میں تم سے ناراض نہیں ہوں لیکن میں تم سے شادی ہرگز نہیں کروں گا اور جب تک میں زندہ ہوں مجھے ملنے کی کوشش نہ کرنا اور یہ یاد رکھنا کہ جب بھی تم مجھ سے ملی وہ میری زندگی کا آخری دن ہو گا۔ میں گاؤں والی پانچ مربع زمین تمہارے نام کرا دوں گا اور پانچ ایکڑ زمین تمہارے باپ کی تو پہلے ہی تمہاری ہے اور پھر وسیم اور غزالہ کبھی ایک دوسرے سے نہیں ملے۔

غزالہ کو وسیم کی بے وفائی کا دکھ تو ضرور ہوا ہو گا لیکن وسیم جس کرب سے گزرا غزالہ لاعلمی کی وجہ سے اس کرب عظیم سے بچ گئی۔ شاید کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے "لاعلمی بھی ایک نعمت ہے"۔

ختم شد

میری آپ بیتی آپ کو گندی لگے گی لیکن اس گندگی کو پیدا کرنے والوں کی طرف بھی دیکھیں۔ پاکستان تو اسلامی ملک ہے۔

راوی: گمنام / تحریر: نسیم سکینہ صدف

آپ شہروں کی چاردیواری کی دنیا کی کہانیاں چھاپتے ہیں، آپ کو شاید معلوم نہیں کہ چاردیواری کی دنیا دیہات میں بھی ہے۔ شہروں میں تعلیم اور نئی روشنی ہے مگر دیہات میں پیر، تعویذ اور ٹونے گنڈے سے چلتے ہیں۔ ان سے جو کہانی بنتی ہے اُس کو شہروں کے لوگ اور کالجوں میں پڑھے ہوئے لوگ سچی نہیں مانیں گے۔ ویسے اب تو شہروں میں بھی پیر، عامل، بابے اور شاہ جی پڑھے لکھے لوگوں کو بے وقوف بنا رہے ہیں۔ پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا پر ان کی مشہوری کی جاتی ہے اور کوئی ان کو روکنے والا نہیں۔ یہ ایک دیہاتی علاقے کے پیر کی ڈسی ہوئی لڑکی کی کہانی ہے جو اپنا نام ظاہر نہیں کرنا چاہتی۔

میں اَن پڑھ اور دیہاتی لڑکی ہوں۔ اپنا نام نہیں بتاؤں گی۔ یہ کہانی عبرت کے لئے سنا رہی ہوں۔ میری شادی میرے سگے ماموں کے بیٹے کے ساتھ ہوئی۔ میرا تمام خاندان ناخواندہ ہے۔ میرا خاوند فوج میں ملازم ہے۔ دیکھنے میں صحت مند جوان ہے لیکن اندر سے کھوکھلا نکلا۔ وہ چھٹی آتا اور واپس چلا جاتا تھا۔ اتنے صحت مند جسم میں خدا نے ایسی اندرونی کمزوری ڈال دی تھی کہ خاوند بننے کے قابل نہیں تھا۔

وہ چھٹی کاٹ کر چلا جاتا تو مجھ کو اپنی ساس اور سسرال کے دیگر افراد کے طعنے سننے پڑتے کہ یہ لڑکی اولاد پیدا نہیں کرسکتی۔ میں اپنی زبان نہیں کھولتی تھی۔ ایک بار خاوند چھٹی آیا تو میں نے اُس کو بتایا کہ تمہاری ماں مجھ کو اولاد نہ ہونے کے طعنے دیتی ہے۔ خاوند نے اپنی کمزوری کو چھپانے کے لئے اپنی ماں کی طرفداری کی اور مجھ کو طلاق کی دھمکی دی۔ اَن پڑھ لوگ طلاق کو برداشت نہیں کرتے۔ اگر مجھ کو طلاق مل جاتی تو پھر میں نے

ساری عمر اپنے ماں باپ کے گھر بیٹھی رہنا تھا۔
میرا سسر میری ماں کا بھائی ہے۔ میں نے ماں کو بتایا تو ماں نے اپنے بھائی یعنی میرے ماموں کو بتایا۔ ماموں کے بارے میں بھی کچھ سن لیں۔ اس کی دو بیویاں ہیں۔ بڑی بیوی میری ساس ہے۔ چھوٹی بیوی کا معاملہ یہ ہے کہ پہلے سے طلاق یافتہ ہے۔ طلاق لے کر ایک آدمی کے ساتھ در پردہ دوستی استوار کر لی۔ اس آدمی کی شادی ہونے لگی تو اس عورت نے اس آدمی کو اُسترے سے زخمی کر دیا اور گرفتار ہوئی۔ اس پر جوانی کا عالم تھا۔ میرے ماموں نے اُس کو ضمانت پر رہا کرایا۔ اُس کو سزائے قید ہوئی۔ جب سزا کاٹ کر آئی تو میرے ماموں نے اُس کے ساتھ شادی کر لی اور اُسی کے ساتھ رہنے لگا۔

میری ماں نے اُس کو شکایت کی کہ تمہارا بیٹا اور اُس کی ماں میری بیٹی کو طعنے دیتے ہیں کہ اُس کی گود کبھی ہری نہیں ہوگی۔ تم اپنے بیٹے کو کہو کہ اپنی بیوی کو اپنے ساتھ رکھو۔

ماموں نے کہا کہ میرا بیٹا میرے اختیار میں نہیں۔ وہ صرف اپنی ماں کی سنتا ہے۔ ماں نے اُس پر جادو یا تعویذ کیا ہوا ہے۔ ماموں نے میری ماں کو یہ بھی کہا کہ تم کسی سے حساب نکلواؤ۔ پتہ چل جائے گا کہ جادو تعویذ کیا ہوا ہے تو یہ صاف کرا دینا۔

آپ دیہات کے لوگوں کی حالت پر غور کریں۔ ان کو تعلیم نہیں دی جاتی، ان کی تربیت نہیں ہوتی۔ مولوی صاحبان ان کو مذہب کی روشنی نہیں دکھاتے۔ وہ اپنی عید شب برأت کا دھیان رکھتے ہیں کہ گاؤں والوں سے کھتا مال ملتا ہے۔ وہ گاؤں کے لوگوں کو دوزخ کی آگ سے ڈراتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مسجد اور امام کی خدمت کرو ورنہ دوزخ کی آگ میں جلو گے اور دنیا میں بھی تم کو سزا ملے گی۔ تمہارے مویشی بیمار ہو جائیں گے اور تمہاری نسلوں کو کیڑا لگ جائے گا۔

دیہاتی لوگوں کی طرف لیڈر صاحبان توجہ دیتے ہیں لیکن صرف اُس وقت جب اُن کو ووٹوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ طرح طرح کے نعرے لے کر آتے ہیں اور ووٹیں لے کر چلے جاتے ہیں۔ ان میں روٹی کپڑا دینے والے بھی ہوتے ہیں اور اسلام دینے والے بھی لیکن ہمیں کچھ بھی نہیں ملتا۔ ہمارے نصیب میں صرف نعرے رہ جاتے ہیں۔

آپ کہیں گے کہ ایک اَن پڑھ دیہاتی لڑکی جو پسماندہ اور جانگلی لوگوں کے گھر میں پیدا ہوئی، اس کی ساری عادتیں اور سوچ سمجھ اُن جیسی ہی ہوگی لیکن مجھ پر جو گزری ہے اُس نے میری آنکھیں کھول دی ہیں اور اپنی شرمناک کہانی اسی غرض سے بیان کر رہی ہے کہ دوسروں کی بھی آنکھیں کھلیں۔

ہم دور دراز دیہاتی علاقوں میں رہنے والے لوگ حالات سے مجبور ہو کر تعویذوں کے پیچھے دوڑ پڑتے ہیں تعویذ دینے والے بہت ہیں۔ وہی ہمارے دلوں پر قابض ہوتے ہیں اور وہ ہم پر خوف طاری کر کے رکھتے ہیں۔ میں بھی مجبور تھی اور میری ماں بھی مجبور تھی۔ تعویذ دینے اور شر شرار کو بھگانے والا ایک شاہ قریب ہی موجود تھا۔ ماں مجھے اُس کے پاس لے گئی۔ وہاں ایک بزرگ مائی صاحبہ نے مجھے دیکھا تو میری ماں کو ڈرایا کہ اس لڑکی پر تو بہت بڑے جادو کا اثر ہے جو یہاں سے ٹھیک ہو جائے گا۔

میری ماں کو تعویذ لکھ کر دیئے گئے جن کی قیمت اتنی زیادہ تھی جو ماں نے اُدھار لے کر پوری کی۔ یہ تعویذ مجھے پلائے جاتے تھے۔ عرصہ تین ماہ عجیب سے عمل اور تعویذ چلتے رہے مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔ ساس پہلے کی طرح مجھے طعنے دیتی رہی۔

پھر کسی نے ایک اور بزرگ کا پتہ بتایا۔ میں اس بزرگ کا نام لکھنے کی جرأت نہیں کر سکتی ورنہ مجھ پر تعزیر لگ

جائے گی اور مجھے سنگسار کر دیا جائے گا۔ یہ بتا دیتی ہوں کہ یہ ضلع اٹک کا ایک گدی نشین تھا۔ میری ماں کو کسی نے بتایا کہ یہ بزرگ تو ہتھیلی پر سرسوں اُگا کر دکھا سکتے ہیں۔

میری ماں قسمت کی ماری وہاں چلی گئی۔ وہ بہت دور جگہ تھی۔ واقفیت بھی نہیں تھی اور غربت ایسی کہ پیسے بھی بہت تھوڑے تھے۔ ماں واپس آئی تو بہت خوش تھی کیونکہ اس معمر گدی نشین کا ایک جوان بیٹا میری ماں کے ساتھ آیا تھا۔ مجھے یوں کہنا چاہئے کہ پیر صاحب کے صاحبزادہ صاحب آئے تھے۔

میرا خیال ہے کہ اس نوجوان لڑکے نے میری ماں سے میرے بارے میں پوچھ لیا ہوگا کہ میری عمر کتنی ہے اور میں کیسی ہوں۔ وہ کوئی عمل کرنے آیا تھا جس کو دارا بھرنا کہتے ہیں۔ اُس نے کچھ دن ہمارے گھر رہنا تھا۔ اُس کے منہ پر ہر وقت ایک کپڑا لپٹا رہتا اور وہ کوئی وِرد یا وظیفہ کرتا رہتا تھا۔ وہ نماز نہیں پڑتا تھا۔ وہ ہمارے گھر میں ایک کمرے میں بند رہتا۔ اُس کے کہنے پر ہم نے کمرے میں خوشبو رکھ دی تھی اور میری ماں اگربتیاں لے آئی تھی۔ یہ بھی کمرے میں جلتی رہتی تھیں۔ اُسے کمرے میں کھانا دیا جاتا۔ رات کو وہ دودھ پیا کرتا تھا۔

بعض اوقات وہ گانا شروع کر دیتا اور پھر شعر پڑھتا تھا۔ اُس وقت تو میں خوش ہوتی تھی کہ یہ واقعی اللہ لوک ہیں اور میری مراد پوری ہو جائے گی لیکن بعد میں جو حادثہ ہوا اس سے مجھے پتہ چلا کہ یہ نوجوان نیم پاگل تھا یا اُس کے دماغ پر یہ بھوت سوار تھا کہ ہم دیہات کے پسماندہ لوگ اُس کے زرخرید غلام ہیں اور وہ فرعون کی اولاد ہے۔

تین دن گزر گئے۔ اُس نے مجھے اور میری ماں کو کمرے میں بلایا۔

''آج رات میں نے دارا بھرنا ہے''۔ اُس نے کہا۔ ''تم اپنی بیٹی کے ساتھ اس کمرے میں رہو گی۔ اس کمرے کی صفائی کر دو اور فرش پر دو چٹائیاں بچھا دو۔ ایک گھڑا پانی، دو پیکٹ اگربتیاں، ایک شیشی عطر حنا اور ایک تیز چھری اس کمرے میں رکھ دو۔ تم دونوں کے سوا کمرے میں اور کوئی نہ آئے''۔

میری ماں نے ان تمام اشیاء کا بندوبست کیا اور کمرے میں رکھ دیں۔ مغرب کے بعد کھانا کھا کر پیر کا صاحبزادہ اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ اُس نے مجھے کہا کہ میں چٹائی پر سو جاؤں۔ میں سو گئی۔ میری ماں نے اُس کے ساتھ جاگنا تھا۔

آدھی رات کا وقت ہوگا جب میری آنکھ کھل گئی۔ صاحبزادہ کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ اُس نے دیکھا کہ میں جاگ گئی ہوں تو میری ماں کو کوئی ایسی چیز لانے کو کہا جو ہمارے گھر میں نہیں تھی۔ ماں نے آدھی رات کے وقت دوسروں کے دروازے کھٹکھٹانے تھے۔ جونہی ماں باہر نکلی، پیر کے بیٹے نے ایک دھونی سی میری ناک کے قریب کی اور کہا کہ اسے سونگھو۔ میں نے اُسے سونگھا۔ اس کے ساتھ ہی مجھ پر غشی طاری ہونے لگی پھر میں مکمل طور پر بے ہوش ہو گئی۔

میں نہیں بتا سکتی کہ میں کتنے وقت بعد ہوش میں آئی۔ میری ماں واپس آ گئی تھی۔

''جادو کا زور بڑھ گیا تھا''۔ اس نے میری ماں کو بتایا۔ ''موکل لڑکی کو لے جانے آ گئے تھے۔ میں نے بڑی مشکل سے اُن سے لڑکی کو بچایا ہے۔ یہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ اب خطرہ ٹل گیا ہے۔ مراد پوری ہو جائے گی''۔

میں ہوش میں آتے ہی سمجھ گئی کہ میں لٹ چکی ہوں۔ عورت کے پاس عصمت سے زیادہ عزیز کوئی چیز نہیں ہوتی۔ میں نے گدی نشین کے بیٹے کو نفرت کی نظروں سے دیکھا۔ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ پیر یا اُس کی اولاد پر تہمت لگانا بہت بڑا گناہ سمجھا جاتا ہے۔ میں نے اس طرح بغاوت کی کہ کمرے سے

نکل گئی۔ ماں میرے پیچھے آئی اور کہنے لگی کہ تم صاحبزادہ صاحب کی گستاخی کر رہی ہو۔ میں غصے میں تھی اور میرے آنسو بھی بہہ رہے تھے۔ نہ ماں نے پوچھا کہ میں وہاں سے کیوں آ گئی ہوں نہ میں نے بتایا۔

صبح ہوئی تو پیر کا بیٹا نہ جانے میری ماں سے کتنی رقم وصول کر کے چلا گیا اور میں اپنے سسرال چلی گئی۔ میں نے ماں کے پاس آنا چھوڑ دیا۔ تین مہینے گزر گئے تو میں ماں بننے کے آثار محسوس کرنے لگی۔ اپنی ساس کو یہ علامتیں بتائیں تو اُس نے دائی کو بلایا۔ دائی نے مجھے دیکھ کر میری ساس کو بڑی خوشی سے بتایا کہ مراد پوری ہو گئی ہے اور اللہ نے کرم کر دیا ہے۔

میری ساس کے ماتھے پر لکیریں گہری ہو گئیں۔ اُس نے مجھے گھور کر دیکھا اور آہستہ سے کہا کہ میرا بیٹا سات مہینوں سے چھٹی نہیں آیا تو مراد کس طرح پوری ہو گئی؟

میں چپ رہی، کہتی تو کیا کہتی۔ مجھے اپنا انجام نظر آ گیا تھا، یہ تھا طلاق۔ صرف طلاق ہی نہیں بلکہ میں نے کسی اور کے بچے کو جنم دینا اور اُسے ماں کے گھر بیٹھ کر پالنا تھا لیکن انجام اس سے زیادہ بھیانک ہوا۔

ساس کچھ دن چپ رہی۔ اس نے اپنے بیٹے کو فوراً خط لکھوا دیا۔ ایک روز میں تیل والے چولہے کے پاس بیٹھی ہوئی تھی کہ ڈاکیہ آ گیا۔ وہ میرے نام ایک رجسٹری لفافہ لایا تھا۔ وہ اندر آ گیا۔ اس نے لفافہ مجھے دے کر رسید پر میرا انگوٹھا لگوایا۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ خط پڑھ کر سنا دے۔ میری ساس باہر نکل گئی۔ ڈاکیے نے خط پڑھ کر سنانا شروع کر دیا۔ یہ پیر کے بدکار بیٹے کا خط تھا۔ اُس نے میرے نام شعر لکھے ہوئے تھے اور بیہودہ باتیں لکھی تھیں۔ آخر میں اُس نے لکھا تھا کہ تم میرے بچے کی ماں بن رہی ہو اس لئے جتنی رقم چاہو اپنی ماں کی معرفت مجھ سے منگوا سکتی ہو۔

ڈاکیے نے خط ابھی پورا نہیں پڑھا تھا کہ میری ساس واپس آ گئی۔ اُس کے ساتھ میرا دیور تھا۔ ساس اسی کو بلانے چلی گئی تھی۔ دیور نے آتے ہی کہا کہ یہ خط مجھے دے دو۔ یہ کس کا ہے؟ میں نے ڈاکیے کے ہاتھ سے خط چھین لیا اور دیور کو دینے سے انکار کر دیا۔ وہ مجھ سے زبردستی خط چھیننے لگا۔ ہم گتھم گتھا ہو گئے۔ میں پیٹھ کے بل گر پڑی۔ دیور میرے پیٹ پر بیٹھ گیا۔

میں نے اُس سے آزاد ہونے کے لئے کہا کہ ہٹو، میں خط دیتی ہوں۔ وہ ہٹا اور میں اٹھی۔ میں نے خط تیل کے جلتے چولہے پر رکھ دیا۔ دیور نے لپک کر جلتا ہوا خط اٹھا لیا۔ اُس نے اس کے کچھ الفاظ پڑھ لئے۔ اُس نے سب کو باہر نکال دیا اور مجھ سے پولیس کی طرح تفتیش کرنے لگا۔ وہ کہتا تھا کہ تمہیں پولیس کے حوالے کروں گا۔ میں نے اُسے کہا کہ میں بھی اب پولیس کے پاس ہی جاؤں گی۔ اُس نے مجھے مارنے کے لئے پکڑنے کی کوشش کی۔ میں چارپائی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ پاتھا پائی میں چارپائی جو کمزور سی تھی۔ ایک طرف کو ڈھلک گئی اور میں گر پڑی۔ پاس ہی چولہا جل رہا تھا اور اس کے قریب مٹی کے تیل کا ڈبہ پڑا تھا۔ میں ایسی گری کہ جلتے چولہے پر جا پڑی اور تیل کے ڈبے کو ٹھوکر لگی تو وہ اُلٹ گیا۔ تیل میرے کپڑوں پر پڑا۔ کپڑوں کو پہلے ہی آگ لگ گئی تھی۔ ان پر تیل پڑا تو میں شعلوں کی لپیٹ میں آ گئی۔

میں خود دیہاتن، باقی سب دیہاتی اور میری طرح اَن پڑھ نہ مجھے کچھ پتہ تھا کہ اس حالت میں کیا کرنا چاہئے نہ میرے دیور کو دیور گھبرا کر باہر کو دوڑ گیا اور کمرے کا دروازہ بند کرتا گیا۔ میری چیخیں سن کر کچھ دیر بعد میری ساس اور دو چار آدمی اندر آئے۔ اس کے بعد مجھے معلوم نہیں کیا ہوا۔

میں ہوش میں آئی تو قریبی شہر کے ہسپتال میں پڑی ہوئی تھی۔ اس سے مجھے پتہ چلا کہ میں زندہ ہوں۔

دو تین روز بعد پولیس کے آدمی آئے اور مجھ سے پوچھا کہ مجھے آگ کس طرح لگی تھی۔ میری ماں نے پہلے ہی مجھے کہہ دیا تھا کہ کوئی پوچھے تو کہہ دینا کہ میں چولہے پر روٹی پکا رہی تھی کہ جلتا چولہا پھٹ گیا اور مجھے آگ لگ گئی۔ میں نے پولیس کے آدمیوں کو یہی بیان دیا۔ ہسپتال میں میرے ساتھ صرف میری ماں رہتی تھی۔ سسرال سے کوئی بھی مجھے دیکھنے نہیں آیا۔ مجھے کچھ دنوں بعد پتہ چلا تھا کہ میرے ماموں نے پولیس کو دے دلا کر یہی بیان منظور کرا لیا تھا کہ میرے کپڑوں کو چولہا پھٹنے سے آگ لگی تھی۔

مجھے جلانے والے کا سارا خاندان پھانسی چڑھ جاتا تو کیا ہو جاتا۔ میں تو ہمیشہ کے لئے ناکارہ ہو چکی تھی۔ چہرہ جل گیا، سینہ اور سر جل گیا۔ میری شکل و صورت چڑیلوں جیسی ہو گئی۔ مجھے ایک مہینہ اس ہسپتال میں رکھا گیا۔ میں نے ایک روز ساس کو پیغام بھیجا کہ میرے کپڑے بھیج دے۔ ساس نے کپڑوں کی بجائے ایک لفافہ بھیجا۔ یہ ایک آدمی لایا تھا۔ اُس نے لفافے کی رسید پر میرا انگوٹھا لگوایا اور مجھے بتایا کہ لفافے میں میرا طلاق نامہ ہے جو میرے خاوند نے چیئرمین کی معرفت بھیجا ہے۔

یہ تو ہونا ہی تھا۔ میں کسی اور کے بچے کی ماں بننے والی تھی۔ بے انصافی دیکھو کہ پولیس نے بھی تفتیش نہ کی کہ میں کس طرح جلی ہوں اور چیئرمین نے بھی مجھ سے نہ پوچھا کہ تمہیں خاوند نے طلاق دی ہے، کیا تم اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہتی ہو؟ تمہارے ساتھ بے انصافی تو نہیں ہو رہی؟

ہم غریب اور پسماندہ لوگوں کا کوئی پُرسانِ حال نہیں ہوتا اس لئے ہم لوگ تعویذوں کا سہارا لیتے ہیں۔ پیروں اور عاملوں وغیرہ کی بدکاریاں اسی لئے چلتی ہیں کہ ان سے باز پُرس کرنے والا اور ہماری سننے والا کوئی نہیں۔

طلاق نامے کے بعد میرے جہیز کا کچھ سامان اور کپڑے میرے گھر بھیج دیئے گئے۔ میں ازدواجی زندگی کے آٹھ سال پورے کر کے اجڑ گئی۔ یہ گزشتہ سال کا واقعہ ہے۔ ایک مہینے بعد مجھے راولپنڈی پھر لاہور کے ہسپتالوں میں لے جایا گیا۔ میرے ماں باپ پہلے ہی غریب تھے، اب مقروض ہو گئے اور حاصل کچھ بھی نہ ہوا۔ کھال جل گئی تھی۔ اس کا کوئی علاج نہیں۔

پھر ایک اور اذیت ملی۔ میری ایک بچی پیدا ہوئی اور چوبیس گھنٹے زندہ رہ کر مر گئی۔ یہ بچی خوش نصیب تھی جو زندہ نہ رہی ورنہ مجھ جیسے ہی خاوند کے ہاتھ لگ جاتی اور جل جل کر مرتی۔

اب میں صحت یاب ہو گئی ہوں لیکن چہرہ انتہائی بھیانک ہو گیا ہے۔ سر کی کھال جل گئی ہے۔ میں سب کے لئے تماشا بنی ہوئی ہوں۔ میرا باپ عدالت میں جانا چاہتا تھا کہ میرے ساتھ جو ظلم ہوا ہے اس کا مجھے معاوضہ یا ہرجانہ مل جائے لیکن میری ماں نے میرے باپ کو قانونی چارہ جوئی سے روک دیا کیونکہ میری ماں کو اپنے بھائی کا زیادہ خیال ہے۔ وہ اپنے بھائی کی لاج رکھ رہی ہے۔

میں نے اپنی آپ بیتی اس لئے نہیں لکھوائی کہ میرے ساتھ ہمدردی کی جائے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ ملک میں کوئی ایسا لیڈر یا صدر اور وزیراعظم کبھی ایسا بھی آئے گا جو ہم جیسے پسماندہ لوگوں کی طرف توجہ دے گا؟ میری کہانی شاید آپ کو گندی لگے گی لیکن اس گندگی کو پیدا کرنے والوں کی طرف بھی دیکھیں۔ پاکستان تو اسلامی ملک ہے۔ پسماندہ دیہات میں اس سے بھی زیادہ شرمناک واقعات ہوتے ہیں۔ کیا اسلام اس کی اجازت دیتا ہے؟

◆✻◆

اس بیٹے کی کہانی جو دولت کمانے کی دوڑ میں شریک ہو کر اپنے بوڑھے والدین چھوڑ کر پردیس جا بسا تھا۔

وقار احمد ملک

ہم گھر سے روانہ ہوئے تو ملگجی شام کا دھندلکا ہمیں الوداع کہہ رہا تھا۔ ہر طرف خاموشی اور اداسی کی سی کیفیت تھی۔ پھیکے پھیکے تاروں نے دھیرے دھیرے شب تاریک کو منور کرنا شروع کر دیا تھا۔ آسمان پر دن بھر کے تھکے ہوئے پرندے انجان علاقوں کی لا محدود اڑانیں بھرنے کے بعد نا معلوم ٹھکانوں کی طرف محوِ پرواز تھے۔ کہیں کہیں کچے گھروندوں سے نحیف سا دودھیا دھواں اٹھتا محسوس ہوتا تھا۔ گڈریا دینو ابھی ابھی کمزور اور بیمار بکریوں اور طاقتور اور تندرست بھیڑوں کا ریوڑ لے کر قریبی جنگل سے گاؤں میں داخل ہوا ہے۔ ریوڑ جس گلی سے بھی گزرتا ہے جانوروں کے کھروں سے اڑتی ہوئی مٹی کھلے دروازوں میں سے اور چھوٹی چھوٹی دیواروں پر سے گھروں میں پھینکتا چلا جاتا ہے۔ لیکن آج سہ پہر کے وقت ہونے والی بارش نے گاؤں کی گلیوں کی مٹی کو جما دیا ہے۔

ہمارے چند کمروں پر مشتمل کچے پکے مکان کے کچے صحن اور پکی دیواروں سے مٹی کی سوندھی سوندھی سی خوشبو آ رہی ہے۔ اس گھر میں بابا، ماں جی، میری ایک

سالہ پرانی دلہن اور میں ایک بے کیف زندگی گزار رہے تھے۔ میں قریبی شہر میں منیاری کی دوکان کرتا تھا جس سے گھر کا خرچ چل رہا تھا۔ تھوڑی بہت بچت ہوئی تو قریبی بنک میں جمع کرادی۔ اسی دوران رحیم داد جو میرا بچپن کا دوست تھا کئی سالوں کے بعد ساؤتھ افریقہ سے واپس آیا۔ وہ وہاں ایک سپر سٹور پر سیلز بوائے کا کام کرتا تھا۔ اس کی ملازمت معمولی نوعیت کی تھی لیکن گھر میں دولت کی ریل پیل سے یوں معلوم ہوتا تھا کہ جیسے ساؤتھ افریقہ کی سونے کی کانوں کا رخ سیدھا ہمارے گاؤں کی طرف ہو گیا ہے۔ رحیم داد نے اپنی کوششوں سے میری جگہ بھی بنا دی تھی۔ چنانچہ چند ہفتوں کی بھاگ دوڑ کے بعد میں نے اپنا اور بیگم کا پاس پورٹ بنوا کر ویزا لگوا دیا۔ رحیم داد پچھلے ماہ گاؤں کو مستقل طور پر چھوڑ کر اپنے دو بھائیوں کے ہمراہ اسلام آباد جا بسا تھا اور وہیں سے اس نے ساؤتھ افریقہ جانا تھا جبکہ ہم نے ایک ہفتہ بعد اپنے گاؤں سے روانہ ہونا تھا۔

شدید گرمیوں کی وجہ سے صحن میں حسب معمول چار چارپائیاں بچھی تھیں۔ دو چارپائیاں خالی تھیں جبکہ دو پر بوڑھے والدین اپنے بڑھاپے میں لپٹے چھوٹی موٹی بیماریوں کے ہمراہ لیٹے پڑے تھے۔ بابا کی آنکھیں تو کب کی بے نور ہو چکی تھیں، ماں بھی اب موٹی موٹی عینک کے اوپر جھریوں بھرے ہاتھ کا شیڈ بنا کر کسی دور کی چیز کو دیکھا کرتی۔ ماں جی کب سے دو خالی چارپائیوں کو تکے جا رہی تھی۔ یہ چارپائیاں آج رات سے خالی ہو جانے والی تھیں۔ مریم نے شام پڑتے ہی ان کو صحن میں بچھا تو دیا تھا جانے صبح ان کو کمروں کے اندر کس نے رکھنا تھا۔ بابا نابینا اور ماں جی بہت کمزور۔

چند ماہ سے بابا کے سر کے دائیں طرف ایک چھوٹی سی رسولی سی نمودار ہوئی تھی جو دیکھتے ہی دیکھتے چند دنوں میں پھوڑا بن گئی۔ درد کی شدت کی وجہ سے بابا چند راتوں سے سو بھی نہیں سکتے تھے۔ قریبی شہر کے ڈاکٹر کو چیک کرایا تو اس نے بیس دن بعد آپریشن کا کہا۔ لیکن ہماری فلائٹ آپریشن سے پہلے تھی۔ میرے اکاؤنٹ میں پچاس ہزار روپے اپنی ضروریات سے زائد تھے۔ میں نے پچاس ہزار کا چیک ماں جی کو دے دیا کہ وہ وقت پڑنے پر کیش کرا لیں گی۔ مریم اور میں مطمئن تھے کے والدین کے لیئے مناسب رقم چھوڑ کر جا رہے تھے۔ جب بابا کو میں الوداع کرنے کے لیئے ان کے پاس گیا تو ان کا پھوڑا لال پیلا ہو رہا تھا۔ بابا کے پاس سے مختلف قسم کے تیل، دیسی کریموں اور جڑی بوٹیوں کے ساتھ ساتھ بوسیدگی کی بدبو آ رہی تھی۔ میں جلدی جلدی ان سے جدا ہونا چاہتا تھا لیکن وہ میرا ہاتھ نہیں چھوڑ رہے تھے۔ میرے ہاتھ کو وہ عجیب انداز سے اپنی بے نور آنکھوں، سینے اور آخر میں ہونٹوں سے مسلنے لگے۔ جب بوسہ لینے کی کوشش کی تو لعاب کی ایک کثیر مقدار نے میرے شفاف ہاتھ کو گندہ کر دیا۔ میں نے اس مرتبہ زور لگا کر اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی تو بابا ایک جھٹکے سے چارپائی پر پڑے لوٹے کے اوپر گر گئے۔ پھوڑا براہِ راست لوٹے کی ٹونٹی سے ٹکرایا تھا۔ بابا کے منہ سے ہائے ہائے نکلنے لگی۔ تھوڑی دیر میں ہم جب دروازے سے نکل رہے تھے تو بابا کی نحیف ہائے ہائے کی آوازوں نے گاؤں کی خاموش چادر کو تار تار کر رکھا تھا۔ ماں کے ہاتھ میں کل اثاثہ پچاس ہزار کا چیک لپٹا پڑا تھا۔

جب طویل گلی کا آخری موڑ مڑے تو میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ماں اندھیری گلی میں دروازے کی چک اٹھائے ابھی تک ہمیں جاتا ہوا دیکھ رہی تھی۔ اندھیرے کے باوجود ماں کا وجود روزِ روشن کی طرح میری آنکھوں کے سامنے واضح تھا۔ چارپائیاں وہ اٹھا نہیں سکتی تھیں لیکن گھسیٹ کر آہستہ آہستہ وہ ان کو کمروں میں ڈال سکتی تھیں۔ جب ہم بس میں بیٹھے تو میں چشمِ تصور میں افریقہ

کی سونے کی نقرئی کانوں کی سیر کرنے لگا۔ کچھ عرصے بعد جب ہم لوٹیں گے تو میں اپنے ساتھ ڈھیروں مال و دولت لے کر آؤں گا جس سے نہ صرف میں، میرے بال بچے بلکہ میرے بوڑھے والدین بھی بقایا زندگی سکون اور عزت سے گزار لیں گے۔ میں چشمِ تصور سے اب ماں جی کو کھانا کھاتے اور بابا جی کو کھانا کھلواتے دیکھ رہا تھا۔ ارے وہ پانی کے گھڑے کا کیا بنے گا جو میں مسجد کے کنویں سے بھر کر لاتا تھا جو دن بھر ہم تمام کے پینے کے کام آتا تھا۔ یہ سوچ کر دل کو تسلی دی کہ ماں تھوڑا بہت تو چل ہی لیتی ہیں۔ گھڑا نہ اٹھا سکیں تو کٹوروں یا جگ میں ہی مسجد سے پانی لے آیا کریں گی۔

دو دنوں بعد ہم ساؤتھ افریقہ کے شہر پورٹ الزبتھ میں تھے۔ رحیم داد نے میری اور مریم کی ملازمت کا پہلے ہی بندوبست کر رکھا تھا۔ ہم دونوں کو ابتدائی طور پر ایک مقامی کروڑ پتی حبشی کے گھر میں ملازمت ملی تھی۔ مریم ان کے کمروں کی صفائی کرتی تھی۔ ان کے بھاری بھرکم پلنگ بیچاری کو صبح شام اندر باہر گھسیٹنے پڑتے تھے۔ کھانا پکانا پڑتا اور دوسرے چھوٹے موٹے کام بھی کرنے پڑتے۔ میرے ذمہ گھر کے باہر کے کام تھے۔ وہاں پینے کا صاف پانی گھر گھر دستیاب نہ تھا۔ محلے کے چوراہے کے ساتھ پانی کی ایک ٹینکی نصب تھی جہاں سے پینے کا پانی لایا جاتا۔ ایک روز میں حسبِ معمول ایک بڑا سا گیلن بھر کر لا رہا تھا جب تھکاوٹ کے شدید احساس کے ساتھ ماں جی کی یادیں جاگ اٹھیں۔ پتہ نہیں ماں جی اور بابا کے لئے مسجد کے کنویں سے پانی کون لاتا ہوگا۔ جانے ان کی لکڑی اور بان سے بنی چارپائیاں کون اندر باہر رکھتا ہوگا۔ گھر کی صفائی، کھانا پکانا، برتن کی صفائی جیسے کام کیسے ہوتے ہوں گے۔

میں نے چوہدری فتح خان کے گھر فون کرنے کی کوشش کی لیکن جواب ملا کہ فون عدم ادائیگی بل کی وجہ سے عارضی طور پر بند ہے۔ چوہدری جی کا فون ہی والدین سے رابطہ کا واحد ذریعہ تھا جو اب موجود نہیں رہا تھا۔ پتہ نہیں بابا کا آپریشن ہوا یا نہیں...... اب ان کی حالت کیا ہوگی...... کیا چیک کیش کرانے کے بعد ماں جی باقی رقم کو سنبھال سکی ہوں گی...... ایسا نہ ہو کہ انہوں نے فضول خرچی میں پیسے اڑا دیے ہوں اور پھر خستہ حال ہو گئے ہوں۔ میں کتنے ہی دن فون ملاتا رہا لیکن چوہدری جی نے نہ بل جمع کرایا اور نہ فون کا کنکشن بحال ہوا۔

دو اڑھائی سال گزرنے میں دیر نہ لگی۔ ہم نے ایک ماہ کی چھٹی لی اور اپنے دیس کی طرف روانہ ہو گئے۔ جب گاؤں پہنچے تو سردیوں کا موسم عروج پر تھا۔ ابھی شام بھی نہیں ہوئی تھی اور شدید ٹھنڈ سے ہمارے اوپر ایک کپکپی سی طاری ہو گئی تھی۔ والدین کی خیریت کی دعائیں ہمارے لبوں پر تھیں۔ تانگہ شہر کے اڈے سے گاؤں کی طرف کچی سڑک پر لشتم پشتم چلا جا رہا تھا۔ سڑک کے دونوں طرف میلوں تک سرسوں کے پھول لہلہا رہے تھے۔ گلابی جاڑے کا موسم اپنے عروج پر تھا۔ ہم نے سالم تانگہ کرائے پر لیا تھا تاکہ جلد گھر پہنچ سکیں۔ راستہ طویل تھا اور سڑک خراب۔ راستے میں کئی مسافروں نے تانگے کو روکنے کی کوشش کی لیکن ہم نے کسی مسافر کو سوار ہونے کی اجازت نہ دی۔ ایک جگہ تو مریم نے سیاہ چیتھڑوں میں ملبوس ایک بزرگ عورت کے تانگہ روکنے کی کوشش پر تانگہ روکنے کو کہا لیکن میں نے انکار کر دیا۔ وہ بیچاری ہاتھ کے اشاروں سے دیر تک منت کرتی رہی۔ اس کی ایک ٹانگ میں لنگڑاہٹ شاید اس کے چلنے میں رکاوٹ بن رہی تھی۔

تانگہ جب گاؤں کے قریب پہنچا تو میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ جانے میرے گھر، اور ماں باپ کی حالت کیا ہوگی۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ سرد مستانی ہوائیں چل رہی تھیں۔ دو تین جان پہچان کے آدمیوں نے مجھے

حیرت سے دیکھا بھی سہی لیکن ساتھ عورت ہونے کی وجہ سے کسی نے نہ سلام دعا کی اور نہ کسی نے خیر خیریت پوچھی۔ جب ہم اپنی گلی سے ہوتے ہوئے اپنے گھر کے سامنے پہنچے تو باہر کنڈی چڑھی تھی۔ اس لمحے ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو گئی تھی۔ سردی کی شدت میں بے پناہ اضافہ ہو گیا تھا۔ شمال کی طرف سے کالے کالے بادلوں کی فوج چڑھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ ہم نے تالے کے بغیر بند کنڈی کھولی اور اندر داخل ہو گئے۔ صحن اور کمروں کی ویرانی کو دیکھ کر یہ عمارت گھر کم اور ایک فرسودہ مکان بلکہ کھنڈر زیادہ لگ رہی تھی۔ باورچی خانے کو دیکھ یوں محسوس ہوا کہ یہاں مہینوں آگ نہیں جلائی گئی۔ گھر کی اکثر چارپائیاں ٹوٹ چکی تھیں۔ ایک قدرے محفوظ چارپائی پر ہم نے اپنے بیگ رکھے، گرم کوٹ نکالے اور اپنے جسموں کو سردی سے بچانے کی کوشش میں لگ گئے۔ بارش کی کن من میں اضافہ ہو چکا تھا۔ ماں جی اور بابا کہاں چلے گئے اور کس گھر میں رہائش اختیار کر لی اس کا کچھ پتہ نہ تھا۔ ہمارے ہمسائے چاچا کریم نواز کو ہماری موجودگی کا پتہ چل چکا تھا۔ چاچا خود تھوڑی دیر میں گرم گرم چائے پکوڑوں کے ساتھ لے آیا۔ تسلی سے چائے پکوڑوں سے اپنے تھکے ہوئے اور سرد جسموں کو گرمانے کے بعد ہم نے چاچا سے اپنی ماں اور باپ کی بابت سوال کیا۔

چاچا حیران رہ گیا کہ ہم اپنے والدین سے متعلق بالکل انجان تھے۔ چاچے نے جو داستان سنائی وہ ناقابلِ یقین تھی۔ ان کے مطابق بابا ہمارے جانے کے ایک ماہ بعد انتقال کر گئے تھے۔ ان کا سر کی رسولی کا آپریشن نہ ہو سکا تھا اور رسولی دو ہفتوں کے بعد کھوپڑی کے اندر کی طرف سے پھٹ گئی تھی۔ ہم جب گھر سے روانہ ہوئے تھے تو پچاس ہزار کا چیک جو میں نے ماں جی کو لکھ کر دیا تھا ماں کے رات بھر رونے کی وجہ سے گیلا ہو

''حکایت'' کے دیرینہ قاری کا منفرد اعزاز

نیشنل کونسل فار طب وزارت صحت حکومت پاکستان کے نوٹیفکیشن کے مطابق امتحانات 2014ء کے نتائج کا اعلان کر دیا گیا ہے۔ اس کے مطابق **حکیم محمود الشریف** ولد **محمد شریف** رول نمبر 10207 ملک بھر کے تمام طبیہ کالجز میں سے پہلی پوزیشن حاصل کر کے گولڈ میڈل کے لئے منتخب قرار پائے۔

یاد رہے کہ انہوں نے اپنی کامیابی غوثیہ طبیہ کالج اوکاڑہ کے اساتذہ کرام بالخصوص پرنسپل کالج ہذا کی بھرپور رہنمائی اور والدین و احباب کی دعاؤں کا نتیجہ قرار دیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنی بہترین ذہنی، جسمانی اور فکری تربیت میں ''حکایت'' کے کردار کو سراہا جو ان کے گھر میں نسل در نسل پڑھا جاتا ہے۔

ادارہ ''حکایت'' اس شاندار کامیابی پر ان کو زبردست مبارکباد پیش کرتا ہے اور مزید کامرانیوں کا متمنی ہے۔

(ادارہ)

کرنا قابلِ استعمال ہوگیا تھا۔ ماں جی کو جب بنک منیجر نے چیک یہ کہہ کر واپس کر دیا تھا کہ یہ پانی کی وجہ سے ہم نہیں لے سکتے تو سادگی کی تجسیم ماں جی نے دو دن کے لیئے اس چیک کو دھوپ میں رکھے رکھا بالکل ویسے جیسے وہ گرمیوں کے موسم میں کریلے کاٹ کر اس کا ہار بنا کر دھوپ میں سکھا کر محفوظ کیا کرتیں۔ پھر بھی چیک کیش نہ ہوسکا۔ بابا کے آپریشن کی فیس کے لئے اہلِ محلہ نے چندہ کیا لیکن وہ ناکافی تھا چنانچہ آپریشن تعطل کا شکار ہوتا رہا۔ اسی تعطل کے دوران پھوڑا پھٹ گیا اور بابا کی موت کا باعث بن گیا۔

کریم نواز نے بتایا کہ بابا نے آخری دن انتہائی درد وکرب میں گزارے۔ شب و روز ہائے ہائے کرتے رہتے، نہ خود سوتے نہ تمہاری ماں اور نہ ہمیں سونے دیتے۔ ہر وقت اور ہر کسی سے کہتے رہتے "میرے علاج کے پیسے اکٹھے ہو گئے؟...... تم سارے لوگ جاؤ بنک افسر کے پاس کہ میرے علاج کے پیسے دے دے...... تھانے میں رپٹ لکھوا دو کہ بنک افسر میرے بیٹے کے پیسے نہیں دے رہا۔

میرے بیٹے کو چٹھی لکھو کہ جلد آ جائے مجھے بہت تکلیف ہے سر میں"۔ وہ ہر وقت ہاتھ پر دم کر کے ہاتھ سر کے پھوڑے پر پھیرتے رہتے۔ سوجن پھیلتے پھیلتے گردن کے اوپری حصے تک آن پہنچی تھی۔ درد کی شدت سے اکثر بابا کی بے نور آنکھوں میں پانی جاری رہتا۔ ماں جی نے دوا دارو کی مقدور بھر کوشش کی لیکن شاید اب بات ان کے ہاتھ سے نکل چکی تھی۔ بابا اور ماں جی دو دنوں تک ڈاکٹر کے کلینک پر پڑے منتیں ترلے کرتے رہے لیکن کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ آخر کار سوجے ہوئے سر والے نابینا بڈھے کی چارپائی کو گھر لے جایا گیا جہاں اس نے اگلے دن جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔

چاچے کریم نواز سے یہ رقت آمیز کہانی ہم دونوں نے انتہائی مایوسی کے ساتھ سنی۔ باہر بارش کی رفتار اور بڑھ گئی تھی۔ درختوں کے شور سے تیز طوفانِ باد و باراں کا گماں ہوتا تھا۔ ہم تینوں کے جسم سردی سے کپکپا رہے تھے۔ جب چاچا جانے لگا تو مجھے ماں جی کا خیال آیا۔ چاچا نے کہا کہ تاجو لوہار کا بیٹا عامر بنک میں ملازم ہوا ہے۔ اس نے ماں کو کہا تھا کہ تم بنک میں آنا میں تمہارا مسئلہ کرانے کی کوشش کروں گا۔ آج تمہاری ماں شہر گئی ہوئی تھی۔ میں تھوڑا متفکر ہوا کہ رات ہو چکی ہے اب تو ماں کو آ جانا چاہیے تھا۔ تھکاوٹ نے تھوڑی دیر میں ہمارے اوپر نیند طاری کر دی اور صبح تک ہم بے خبر سوئے رہے۔

صبح سویرے چاچا کریم نواز کی اونچی آوازوں نے ہم کو بیدار کر دیا۔ چاچے نے روتے ہوئے بتایا کہ تمہاری ماں شہر اور گاؤں کی درمیانی سڑک پر رات کو مردہ پائی گئی ہے۔ چوہدری صاحب رات کو ساتھ والے گاؤں سے آ رہے تھے کہ راستے میں ان کو سیاہ کپڑوں میں ملبوس کوئی عورت لیٹی دکھائی دی۔ جب قریب سے معائنہ کیا تو وہ تمہاری ماں تھی جو شاید کرایہ ختم ہو جانے کے باعث واپسی پر پیدل ہی آ رہی تھی۔ راستے کی سردی اور بارش شاید اس کمزور عورت کی موت کا باعث بن گئے۔

تھوڑی دیر میں چوہدری صاحب کی گاڑی ہمارے دروازے پر تھی۔ ماں جی کو بارش کے باعث کمرے کے اندر رکھا گیا تھا۔ کپڑے ٹھنڈے کیچڑ سے لت پت تھے۔ جب غسل سے پہلے کپڑے اتارے گئے تو دوپٹے کے کونے کے ساتھ کچھ بندھا ہوا تھا۔ جب اس ننھی سی گانٹھ کو کھولا گیا تو ایک بوسیدہ سا کاغذ بارش کی نمی کے باعث چھوٹی سی گیند کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ گیند کو کھولا گیا تو وہ ایک پرانے چیک کی شکل اختیار کر گئی۔

O

☆---------- مرتب: ڈاکٹر ندیم شفیق ملک / تبصرہ نگار: پروفیسر غازی علم الدین

علامہ اقبالؒ کے چند نادر و نایاب خطوط

علامہ اقبالؒ کی ہمہ جہت شخصیت کے بارے میں تحقیق و انکشاف کا سلسلہ ہنوز ختم نہیں ہوا۔ کوئی دن ایسا نہیں جاتا جب پرستارانِ اقبال ان کے بارے میں نئے نئے گوشے سامنے نہیں لاتے۔ ہماری ملی اور فکری تاریخ میں اقبال کے بلند مقام کے پیشِ نظر یہ ضروری ہے کہ ان کے قلم اور زبان سے نکلے ہوئے لفظ کو محفوظ کیا جائے۔ اس سے ان کا فکری ارتقاء، زندگی کے ہر دور کی دل چسپیوں اور ذوق کا علم ہوتا ہے۔ اسی احساس کے پیشِ نظر بہت سی کتابیں منظرِ عام پر آچکی ہیں جن میں علامہ کی غیر مطبوعہ منظومات، متفرق اشعار، مطبوعہ کلام کی ابتدائی صورتیں، خطوط، بیانات، تقاریظ اور فرمودات یک جا کیے گئے ہیں۔ ان مجموعوں کے باوجود رسائل و جرائد کی ورق گردانی کرتے ہوئے علامہ کی زبان و قلم سے نکلے ہوئے ایسے جواہر پارے مل جاتے ہیں۔ وطنِ عزیز کے معروف محقق اور ماہرِ اقبالیات ڈاکٹر ندیم شفیق ملک نے علامہ اقبالؒ کے چند نادر اور نایاب خطوط کو حواشی اور تشریحات کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب اس گراں قدر کتاب کی غرض و غایت بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"علامہ اقبال کو ہماری ملی تاریخ میں ایک نہایت اہم مقام حاصل ہے۔ دنیا کی بہت سی زبانوں میں ان کی کتب کے تراجم ہو چکے ہیں۔ خود حیاتِ اقبال پر بہت سی کتابیں لکھی جا چکی ہیں، مگر اب بھی ان کی زندگی کے بہت سے پہلو مخفی ہیں۔ یہ کتاب اس کمی کو پورا کرنے کی ایک حقیر کاوش ہے۔" (ص 7)

اقبالیات میں تحقیق کرنا فن ہے، ذوق بھی اور

روشن باتیں

☆ زمین کے اوپر عاجزی سے رہنا سیکھ لو۔ زمین کے نیچے سکون سے رہو گے۔
☆ لفظوں کے دانت نہیں ہوتے لیکن یہ کاٹ لیتے ہیں اور پھر ان کے زخم کبھی نہیں بھرتے۔
☆ مایوس وہ ہوتا ہے جو اللہ پر یقین نہیں رکھتا اور محروم وہ ہوتا ہے جو اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کا شکر ادا نہیں کرتا۔

لیاقت بھی۔ یہ عمل بڑی ژرف نگاہی اور محنت شاقہ کا طالب ہے۔ اس وادیٔ پُر خار کی مشکلات کو وہی سمجھتے ہیں جنھوں نے کبھی اس میں قدم رکھا ہے۔ ڈاکٹر ندیم شفیق ملک کی مرتب کردہ یہ کتاب اقبالیات کی کھتونی کا اہم باب ہی نہیں، مرتب کی بالغ نظری اور ناقدانہ بصیرت نے اس کے اندر فکر و معانی اور نقد و نظر کا ایک جہان سمو دیا ہے۔

اس کتاب میں علامہ اقبال کے نادر، غیر مدوّن، غیر مطبوعہ، نایاب اور ناقص (نامکمل) مکاتیب کے حوالے سے ستائیس مضامین ہیں جو نام ور اہلِ قلم کی تحقیق کا حاصل ہیں۔ دہلی میں قیام کے دوران نظام الدین اولیاء کے مزار اور غالب کے مرقد پر حاضری کی تفصیل ملتی ہے۔ روانگی سے قبل بمبئی میں قیام اور مختلف لوگوں سے ملاقاتیں، شہر کی سیر، وہاں کی معاشرت، ترقی اور علمی سطح کے حوالے سے معلوماتی مشاہدات ملتے ہیں۔

باقی تین خطوط سید فصیح اللہ کاظمی کے نام ہیں جن میں اسرارِ خودی (طبع ۱۹۱۵ء) کے سلسلہ میں جو مخالفت کا طوفان برپا ہوا تھا، اس کے متعلق مفید اشارے پائے جاتے ہیں۔ اسرارِ خودی کے متعلق یہ بحث ۱۹۱۵ء سے ۱۹۱۸ء تک چلتی رہی۔

یہ کتاب 'ریفرنس بک' کا درجہ رکھتی ہے جس میں مرتب کی تحقیقی مہارت اور بصیرت عیاں ہے۔ یہ کتاب اعلیٰ سطحی جامعاتی تحقیق کے لئے راہ نما کی حیثیت رکھتی ہے۔

نوادراتِ علامہ اقبالؒ

علمی دنیا میں اقبالیات کے موضوعات تابندۂ جاوداں اور لازوال موضوعات کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ علامہ اقبال کی زندگی ہی میں ان کے فکر و فن، حیات اور فلسفے پر کتابیں شائع ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ تاہم ماضی کی کثیف دھند کے سبب اقبال کی شخصیت اور شاعری کے کئی پہلو ہنوز تشنۂ تحقیق ہیں۔ معروف محقق ڈاکٹر ندیم شفیق ملک نے "نوادراتِ علامہ اقبالؒ" مرتب کر کے اقبال کی شخصیت اور شاعری کے کئی مخفی گوشے تلاش کر کے محفوظ کر دیے ہیں۔ یہ کتاب دراصل حقائق کی بازیافت ہے۔

ڈاکٹر صاحب بارہ (۱۲) سے زاید تحقیقی کتب کے مصنف ہیں۔ ان کے ستر (۷۰) سے زاید تحقیقی مقالات انٹرنیشنل ریسرچ جرنلز میں شائع ہو چکے ہیں۔

اس کتاب میں اٹھارہ قابلِ قدر مضامین شامل ہیں جو نام ور اہلِ علم و تحقیق کے قلم کا نتیجہ ہیں۔

"نوادراتِ علامہ اقبال" اقبالیاتی ادب کے حوالے سے معلومات میں بیش بہا اضافے کا سبب بنی ہے۔ لاریب یہ کتاب کسی دائرۃ المعارف سے کم نہیں ہے۔ اس پیش کش کو لائقِ تحسین بنانے میں جناب مرتب کی کھلی لگن، فرض شناسی اور دل سوزی کا بڑا ہاتھ ہے جس کے لئے وہ بجا طور پر مبارک باد کے مستحق ہیں۔ یہ کتاب اعلیٰ سطحی جامعاتی تحقیق کے لئے راہ نما کی حیثیت رکھتی ہے۔ حواشی بڑی محنت سے تحقیقی اسلوب کے مطابق لکھے گئے ہیں۔ فاضل مرتب اور پبلشر فکشن ہاؤس لاہور بجا طور پر مبارک باد کے مستحق ہیں۔

***

اُمید

کوئی قوم بحیثیت مجموعی بُری یا اچھی نہیں ہوتی یہ اوصاف قوم کے افراد میں پائے جاتے ہیں۔ البتہ جو قوم ذاتی مفاد کو قومی مفادات پر ترجیح دینے لگ جائے وہ صفحۂ ہستی سے مٹ جاتی ہے۔

☆ .... عارف محمود

امید اور ناامیدی، فکرِ انسانی کے دو مختلف انداز ہیں۔

امید حیات آور اور ناامیدی یا مایوسی حیات کش ہوتی ہے کیونکہ امید انسان کو حوصلہ عطا کر کے اس کی کارکردگی کو چار چاند لگا دیتی ہے جبکہ مایوسی انسان کو کسی کام کا نہیں رہنے دیتی۔ زیرِ نظر کہانی ان نتائج کو اجاگر کرتی ہے۔

مغرب کے دانشور البرٹ کامیو کا مقولہ ہے کہ

"If there is no hope left, then invent one hope your self."

یعنی اگر کوئی امید باقی نہ رہے تو ایک امید اپنی طرف سے ایجاد کرلو۔

کہانی پیش کرنے سے پہلے اس مقولے پر تبصرہ بے حد ضروری ہے۔

اگر اسے البرٹ کامیو کی ذہنی کاوش تسلیم کرلیا جائے تو یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ البرٹ کامیو پرلے درجے کا فکری قزاق تھا کیونکہ مایوسی سے گریز تو اسلامی تعلیمات کا خلاصہ ہے۔ قرآن حکیم کی سورہ نمبر 39 الزمر کی آیت نمبر 53 کا ترجمہ ملاحظہ ہو۔

”اے میرے بندو! جو اپنی جانوں پر زیادتی کر بیٹھے ہو، اللہ کی رحمت سے ناامید مت ہو جانا“۔

مایوسی کا شکار انسان چونکہ آیت قرآنی کا انکار کرتا ہے لہٰذا گناہِ کبیرہ کا مرتکب ہوتا ہے۔ قرآن حکیم کے ہوتے ہوئے ہم اسے کسی دانشور کی ذہنی کاوش کیسے قرار دے سکتے ہیں۔ اب اصل کہانی پیش کی جاتی ہے۔

1939ء میں دوسری عالمی جنگ کا آغاز ہو چکا تھا۔ محوری طاقتوں کا سربراہ جرمنی کا ہٹلر تھا جس کے مقابلے میں اتحادی فوج برطانیہ، روس، فرانس وغیرہ پر مشتمل تھی۔ یہ سچ ہے کہ شروع میں امریکہ کا جنگی کردار کوئی زیادہ فعال نہیں تھا البتہ اس کی ہمدردیاں اتحادیوں کے ساتھ ضرور تھیں۔

دسمبر 1941ء کو جرمنی کے طاقتور حلیف جاپان نے جزیرہ ہوائی کی مشہور بندرگاہ پرل ہاربر پر حملہ کر کے ناقابلِ تلافی غلطی کا ارتکاب کیا۔ اس حملے کے نتیجے میں امریکہ اپنی پوری قوت کے ساتھ محوری افواج پر حملہ آور ہوا اور اس طرح اتحادیوں کا پلڑہ بھاری ہوگیا۔ دوسری غلطی ہٹلر نے کی کہ روس جیسے وسیع و عریض ملک پر دھاوا بول دیا۔ یاد رہے کہ روس کا مؤثر ترین ہتھیار وہاں کا سرد موسم تسلیم کیا جاتا ہے۔ ماہرین حرب کے بقول ہٹلر اس کا اندازہ نہ لگا سکا۔ خیر جرمنی کی تباہی کی ایک اور وجہ بھی تھی جو ذرا دیر بعد منظرِ عام پر آئی۔ ہٹلر نسلی برتری کا قائل تو تھا ہی مگر وہ اپنے اس فرسودہ فلسفے کو اقوام عالم پر بھی تھوپنا چاہتا تھا۔ اسی فلسفے کی رُو سے اس نے جرمن باشندوں کو بہترین لڑاکا مشین بنا ڈالا اور یہود کو دنیا کی بدترین قوم قرار دیا۔

اس پر بحث کرنا کہانی سے ناانصافی ہوگی۔ بہرحال جرمنی اور اس کے زیرِ اثر علاقوں میں یہودیوں پر عرصہ حیات تنگ ہوگیا تو وہ راہِ فرار اختیار کر کے دیگر ممالک کی طرف ہجرت کرنے لگے۔ جرمنی میں یہودیوں کو قیدی بنا کر رکھنے کے لئے جگہ جگہ بندی خانے قائم کئے گئے جن کو جرمن زبان میں آش وٹز (Aush Wts) کہا جاتا ہے۔ چنانچہ پہلا بندی خانہ پولینڈ (Poland) میں قائم ہوا۔ واضح رہے کہ پولینڈ کو جرمن فوج نے نہایت مختصر سے عرصے میں روند ڈالا تھا، یہی نسلی برتری والے فلسفے کا آغاز تھا۔ علاوہ ازیں ہٹلر کے دست راست گوئبلز نے اتنی شدت سے اس فلسفے کا پرچار کیا کہ اقوام عالم کی بڑی تعداد اسے سچ تسلیم کرنے لگی۔ بندی خانوں کی سربراہی ہٹلر کے پسندیدہ افراد کو سونپی گئی جو سمجھ میں آنے والی بات ہے۔

ایک بندی خانے میں دو ڈھائی ہزار مرد و زن پر مشتمل قیدی تھے جہاں کا انچارج بڑا ہی ظالم انسان تھا،

اس نے کیمپ کا چارج سنبھالتے ہی تمام قیدیوں کو جمع کیا اور کیمپ پر خود ساختہ قوانین لاگو کرنے کا اعلان کر دیا۔

"تم لوگ دنیا کی بدترین قوم کے افراد ہو"۔ اس نے کہا۔ "تم سب مزاجاً دغاباز، فریبی اور مکار لوگ ہو۔ تمہارے اکابرین نے ہمارے جنگی راز چرا کر ذلیل اتحادیوں کے حوالے کر دیئے اور اپنی غداری ثابت کر دی۔ یاد رکھو! تم لوگوں کو بنیادی سہولتوں سے محروم کیا جاتا ہے۔ تم کسی قسم کے رویے کے خلاف احتجاج نہیں کرو گے"۔

پھر کمانڈر نے اپنے ماتحت سپاہیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ لوگ اس وقت دنیا کی بہترین قوم کے افراد ہیں اور تم سب زمین کا بوجھ ہو۔ ان لوگوں کو کیمپ کی حفاظت سونپی گئی ہے۔ اگر کسی نے ان کے احکام کی خلاف ورزی کی تو اسے فوراً سزائے موت دے دی جائے گی۔ اگر کوئی محافظ کسی قیدی عورت سے جنسی تسکین کا ارادہ کرتا ہے تو اس دوشیزہ کا فرض ہے کہ وہ دلی رغبت سے اپنے آپ کو اس جوان کے حوالے کر دے یا موت کو گلے لگا لے۔ اگر کسی محافظ کا کتا کسی قیدی پر حملہ کرتا ہے تو وہ قیدی کتے کو گزند نہیں پہنچائے گا۔ اگر ایسا کرے گا تو اسے زندہ گاڑ دیا جائے گا۔ تم کو جو کچھ دیا جائے تم کو اسے خوشی سے قبول کرنا ہوگا، جو احتجاج کرے گا وہ زندگی سے محروم کر دیا جائے گا اور یہ موت المناک بھی ہو سکتی ہے"۔

تمام قیدی بت بنے اپنی تقدیر کا فیصلہ سن رہے تھے۔

"آخری بار تمہیں سوال کرنے کی اجازت دی جاتی ہے"۔ آخر میں کمانڈر نے زہریلی مسکراہٹ سے کہا۔ "سوالی اپنا ہاتھ کھڑا کر سکتا ہے"۔

ایک قیدی نے ہاتھ کھڑا کرنے کے ساتھ سوال بھی داغ دیا۔

"جناب عالی! اگر ہمارا جرم بھی تو بتایا جائے"۔ کمانڈر یہ سنتے ہی گرجنے برسنے لگا۔

"اور کون اپنا جرم جاننا چاہتا ہے؟" کمانڈر نے پوچھا۔

چار مزید قیدیوں نے ہاتھ کھڑے کیے مگر قیدی بھول گئے تھے کہ کمانڈر نے ان کو بنیادی سہولتوں سے محروم کر دیا تھا اور یہ سوالات سہولت کے زُمرے میں آتے تھے۔

ان پانچ افراد کو ہجوم سے الگ کر دیا گیا پھر ان کو سب کے سامنے دو زانو بیٹھنے کا حکم ہوا۔ محافظوں میں سے پانچ افراد ان دو زانو بیٹھے افراد کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ ان کے ہاتھوں میں بیس بال (Base Ball) کھیلنے والے مخروطی ڈنڈے تھے جن کی ضرب عام ڈنڈوں سے کئی گنا شدید ہوتی ہے۔ عجب کسمپرسی کا عالم تھا ان قیدیوں کو بے حس و حرکت رہنے کا حکم ہوا۔

چند پل بعد کیمپ کمانڈر نے اپنے الفاظ کو عملی جامہ پہنا دیا، اس کے اشارے پر ہٹے کٹے محافظوں نے پوری قوت سے دو زانو قیدیوں کے سروں پر ڈنڈے برسائے اور قیدیوں کی کھوپڑیاں چٹخ گئیں۔ وہ پانچوں قیدی فرش پر گر کر تڑپنے لگے۔ آخری منظر بھی کچھ کم نہ تھا۔

قیدیوں کی موت کا انتظار کیے بغیر ان کو گھسیٹ کر وسیع و عریض گڑھے میں پھینک دیا گیا اور ان نیم مردہ افراد پر مٹی ڈال دی گئی کہ موت واقع ہوتی رہے گی۔

اس عملی سبق نے تمام قیدیوں کا دم خشک کر دیا۔ کسی میں داد فریاد کی ہمت ہی نہ رہی۔ انسانی فطرت ہے کہ آدمی چند سانسوں کی خاطر ذلت کو گلے لگا ہی لیتا ہے۔

اس عملی مظاہرے کے بعد قیدیوں کو کال کوٹھریوں میں جانے کا حکم ہوا۔

یہ کمرے صرف نام کے کمرے تھے کسی قیدی کو پاؤں پھیلا کر لیٹنے کی سہولت میسر نہ تھی۔ ہر کال کوٹھری میں قیدی یوں بند ہوتے تھے جیسے گتے کے ڈبے میں بوٹ رکھے جاتے ہیں۔

آخر پاؤں پھیلا کر لیٹنا بھی تو انسان کا بنیادی حق ہے۔ انسانوں کے اپنے ہم جنسوں سے اس رویے سے چند یوم کے بعد ہی قیدیوں کو ناامیدی کی دلدل میں دھکیل دیا۔ یہودی لڑکیاں ڈبل روٹی کے ایک ٹکڑے کی خاطر اپنا نسوانی اثاثہ محافظوں کو پیش کرنے لگیں۔ ناامیدی کی یہ ایسی سیاہ اور طویل رات تھی جس کی سحر کا نام و نشان دکھائی نہیں دیتا تھا۔ کم و بیش تمام قیدی اسی کیفیت میں مبتلا ہو چکے تھے۔

ان میں جیکب نامی قیدی اپنے عہد آزادی میں بون یونیورسٹی میں بین الاقوامی تاریخ کا پروفیسر رہ چکا تھا۔ اس کے شاگرد اگرچہ جرمن فوج میں اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے تاہم اس عہد سیاہ بختی میں تمام کے تمام کنارہ کشی اختیار کر چکے تھے۔ پروفیسر جیکب دن رات اپنی قوم کی زبوں حالی اور فکری طور پر قلاش ہونے پر کڑھتا رہتا۔ اس کی دلی تمنا تھی کہ اس کی قوم مایوسی کی دلدل سے نکل آئے ورنہ تباہ و برباد ہو جائے گی۔ آخر کافی سوچ بچار کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ وہ خود یہ بھاری پتھر اٹھائے گا خواہ اسے اپنی جان قربان کرنی پڑ جائے۔ یہ سوچ کر اس نے ایک بے عیب منصوبہ تیار کیا۔

ان نامساعد حالات میں بھی تمام قیدی اس کا احترام کرتے تھے کہ وہ واقعی قابل احترام تھا۔ اور اسی احترام نے اسے اس مشکل کام پر مجبور کیا تھا۔ منصوبے کو عملی جامہ پہناتے وقت سخت احتیاط کی ضرورت تھی۔ معمولی سا جھول سارے کئے کرائے پر پانی پھیر سکتا تھا۔ جیکب نے سوچ بچار کے بعد مسٹر ڈیوڈ کا انتخاب کیا کیونکہ کسی بھی بات کی تشہیر کے لئے وہ مناسب ترین آدمی تھا۔ ایک تو معمولی سی بات بھی اسے ہضم نہیں ہوتی تھی بلکہ وہ اپنی اہمیت جتانے کی خاطر ہر خبر کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کا عادی تھا۔ دوسرے پروفیسر اسے اپنی بات کا مکمل یقین کرا سکتا تھا جو کامیابی کی کلید تھی۔

ایک شام جب قیدی بیگار سے واپس آ رہے تھے پروفیسر نے سرگوشیانہ لہجے میں ڈیوڈ سے کہا۔ ''پیارے بھائی! میرے پاس ایک بہت بڑی خوشخبری ہے اور میں چاہتا ہوں کہ سب سے پہلے وہ تمہیں سناؤں''۔ پروفیسر نے عمداً اپنا لہجہ رازدارانہ بناتے ہوئے کہا۔

''محترم پروفیسر صاحب! ہمارے لئے خوشی کی خبر تو صرف موت کی اطلاع ہی ہو سکتی ہے''۔ ڈیوڈ نے مایوسی کے لہجے میں کہا۔ ''تاکہ تمام مصائب سے چھٹکارا مل جائے''۔

''تم جیسے نفیس مزاج آدمی کے منہ سے مایوسی کی بات اچھی نہیں لگتی۔ عنقریب ہماری مصیبتوں کا خاتمہ ہونے والا ہے''۔ پروفیسر نے دھماکہ کرتے ہوئے کہا۔

''وہ کیسے؟'' ڈیوڈ نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

''وہ یوں کہ جرمن فوج کو تمام محاذوں پر پے در پے شکست ہو رہی ہے''۔ جیکب نے اسے بتایا۔ ''ہر محاذ سے کمک طلب کی جا رہی ہے۔ بس یوں سمجھو کہ اتحادی آنے ہی والے ہیں اور جب اتحادی آ جائیں گے تو ظاہر ہے کہ ہم قیدی نہیں رہیں گے''۔

''یہ بات تو درست ہے کہ اتحادی ہمیں فوراً آزادی دلائیں گے''۔ ڈیوڈ نے کہا۔ ''مگر پروفیسر صاحب! اتنی اہم خبریں آپ کو کس نے دی ہیں؟''

ڈیوڈ نے متوقع سوال کیا جس پر جیکب کافی غور کر چکا تھا۔ اس نے ذرا قریب آ کر کہا۔ ''ڈیوڈ بھائی! میں اپنی جان تمہارے حوالے کرنے لگا ہوں، اس بات کی بھنک بھی غیروں کو لگ گئی تو رب موسیٰ کی قسم، جرمن محافظ میرے ٹکڑے اڑا دیں گے''۔

''پروفیسر صاحب! آپ مجھ پر اعتماد کر سکتے ہیں کیونکہ میں تو آپ کا سچا پرستار ہوں لہٰذا آپ کو تکلیف کیسے پہنچا سکتا ہوں''۔ ڈیوڈ نے پختہ لہجے میں اسے یقین دلایا۔

"اصل بات یہ ہے کہ دنیا کے حالات سے باخبر رہنا میرا پیشہ رہا ہے"۔ جیکب نے اسے بتایا۔ "اور اس کے لئے ایک چھوٹا مگر بڑا حساس ریڈیو ہر وقت میرے پاس ہوا کرتا تھا اور جب ان جاہلوں نے مجھے گرفتار کیا تو وہ ریڈیو میرے پاس تھا جسے میں اپنے ساتھ اس جہنمی قید خانے میں لے آیا۔ مجھے اعتراف ہے کہ اس معاملے میں رب موسیٰ نے میری مدد فرمائی اور اسے چھپانے میں ایک جگہ تک بھی میری رہنمائی فرمادی۔ اب اگر ہٹلر کے یہ چیلے اپنے آپ کو عام انسانوں سے برتر سمجھتے ہیں تو وہ ریڈیو تلاش کر کے دکھائیں"۔ پروفیسر نے پوری وضاحت کرتے ہوئے بات آگے بڑھائی۔

"جب یہ جنگ شروع ہوئی تھی تو میں ہر اس محاذ سے واقف ہو چکا تھا جو ہٹلر نے اتحادیوں کے خلاف کھول رکھا تھا۔ یہ تو آپ جانتے ہیں کہ ساری دنیا کا نقشہ اور تاریخ انسانی کے بڑے بڑے واقعات میرے ذہن میں محفوظ ہیں اس طرح استدلال سے میں آنے والے حالات سے بھی آشنا ہو چکا تھا۔ اس قید خانے میں آتے ہی میں چھپ کر اور مناسب وقت نکال کر اس ریڈیو سے خبریں سنتا رہتا ہوں اور صورتِ حال کی خبر ہوتی رہتی ہے"۔

پروفیسر نے محسوس کیا کہ ڈیوڈ اس کی باتوں پر یقین تو کر چکا تھا مگر اہم ترین سوال کے لئے بے تاب بھی ہو رہا تھا۔ آخر اس نے اپنے سامع کو سوالوں کا موقع فراہم کر ہی دیا۔

"مگر پروفیسر صاحب! وہ ریڈیو آپ نے کہاں چھپا رکھا ہے؟ مناسب ہو تو مجھے بھی اپنے ساتھ ریڈیو سنوا دیں"۔ ڈیوڈ نے ایک ایک لفظ احتیاط سے ادا کرتے ہوئے کہا۔

مگر پروفیسر نے اپنے ہونٹوں پر انگشت شہادت کو رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

"نہ میرے بھائی اس راز کا انکشاف تو میں کر ہی نہیں سکتا اور آپ سے بھی میری درخواست ہے کہ اس معاملے میں آپ کی کم علمی ہی ہم سب کے لئے سودمند ہے۔ یہ درندے انسانیت سے گر چکے ہیں اور عین ممکن ہے کہ غیر انسانی حربے استعمال کر کے آپ سے حقیقت اگلوالیں۔ دوسری اہم بات یہ کہ اسی راز پر ہماری ملت کی سلامتی کا انحصار ہے لہٰذا اس راز کو میں نے اپنے سینے کی قبر میں دفن کر دیا ہے اور یہ راز اب میرے ساتھ قبر میں جائے گا"۔

ڈیوڈ کے چہرے سے ظاہر ہوا کہ اسے پروفیسر کی ہر بات سے اتفاق تھا لہٰذا اس نے بھی جیکب کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔

"آپ درست فرماتے ہیں، یہ راز آپ ہی تک رہنا چاہئے مگر وہ خوش خبری کیا ہے؟" ڈیوڈ نے پوچھا۔ "ریڈیو کا وجود تو کوئی خوش خبری نہیں"۔

"ڈیوڈ بھائی! آپ درست کہتے ہیں"۔ جیکب نے اسے بتاتے ہوئے کہا۔ "گزشتہ دس روز سے ریڈیو پر ہاہاکار مچی ہوئی ہے۔ جرمن فوج پسپا ہو رہی ہے اور اتحادی غالب آ رہے ہیں۔ ہر محاذ سے جرمن کمانڈر کمک کا مطالبہ کر رہے ہیں اور آپ جانتے ہیں کہ کمک صرف اس وقت مانگی جاتی ہے جب مقامی فوج بے بس ہو جائے۔ ادھر اتحادیوں کے محاذوں پر فتح کے نعرے گونج رہے ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ عنقریب اتحادی فوج اس سرزمین پر قابض ہو جائے گی"۔ پروفیسر نے مسکرا کر اظہارِ مسرت کرتے ہوئے بات ختم کی۔

"پروفیسر صاحب! یہ تو واقعی بہت ہی بڑی خوشخبری ہے گویا ہم سب لوگ آفتابِ آزادی اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں گے"۔ ڈیوڈ نے کہا۔

"یقیناً اور وہ بھی عنقریب"۔ پروفیسر نے جواب

دیا۔

''مگر جناب عالی!'' ڈیوڈ نے ملتجی لہجے میں مزید کہا۔ ''اس ریڈیو کا خاص خیال رکھیں کہ یہ بڑا مستند ذریعہ ہے حالات حاضرہ سے باخبر رہنے کا''۔

ڈیوڈ کی بات سن کر پروفیسر جیکب کو دلی مسرت ہوئی کیونکہ اس کے منصوبے کا پہلا مرحلہ کامیابی سے طے ہو گیا تھا۔

اب یہ خبر سارے کیمپ میں پھیل جانی تھی۔ پروفیسر کو یقین تھا کہ ڈیوڈ اس خبر کو بڑھا چڑھا کر دوسروں تک پہنچائے گا اور ہوا بھی بالکل ایسا ہی، یہ خبر کہ اتحادی آ رہے ہیں جنگل کی آگ کی طرح پھیلی اور اس کا نتیجہ بھی فوراً ہی برآمد ہونے لگا۔

قیدیوں کو جب امید کی روشن کرن دکھائی دی تو ان کی ذہنی کیفیت ہی بدل گئی۔ بیشتر حضرات تو مستقبل کی منصوبہ بندی کرنے لگے۔ ان کی حالت اس ڈوبنے والے شخص کی ہو گئی جسے اچانک سمندر میں کوئی جزیرہ نظر آ جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ منظر اس کی خفیہ صلاحیتوں کو بیدار کر دیتا ہے۔ دو تین روز بعد قیدیوں کے رویے میں واضح تبدیلی دکھائی دینے لگی۔

***

ازابیلا کو کیمپ گارڈز لاتعداد بار پامال کر چکے تھے جس کے عوض اسے اچھی خوراک میسر آ جاتی اس طرح عام قیدی خواتین سے اس کی صحت بہتر تھی اور رنگ روپ بھی ماند نہیں پڑا تھا۔ اس روز وہ بیگار کیمپ میں سخت مشقت کی وجہ سے تھک کر چور ہو چکی تھی اور ایک پتھر پر بیٹھ کر سستا رہی تھی۔ قیدی خواتین کو گارڈز اپنی ملکیت قرار دیتے تھے۔ اسی زعم میں ایک محافظ نے موقع پا کر ازابیلا کو اپنی ہوس کا نشانہ بنانا چاہا اور انعام کے طور پر پوری ڈبل روٹی کے ساتھ مکھن کی ٹکیہ بھی پیش کر دی۔

''ارے رنگین تتلی! اگر کہو تو تمہاری ساری تھکن چوس کر تمہیں تر و تازہ کر دوں۔ دیکھو، تمہارے لئے آج میں کیا لایا ہوں''۔ گارڈ نے اس کی زلفوں سے کھیلتے ہوئے کہا۔ اسے توقع تھی کہ قیدی عورت شاخ گل کی طرح جھوم کر اس کی بانہوں میں آ جائے گی مگر ہوا یہ کہ ازابیلا نے نہ صرف اس کا دست ہوس جھٹک دیا بلکہ قہر آلود نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم غلیظ خارش زدہ کتے! اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہو؟ میں نے سنا ہے کہ جرمن قوم کا آغاز غیر فطری طریقے سے ہوا تھا۔ ایک فاحشہ عورت نے ایک گیدڑ سے جنسی تعلقات استوار کئے جس کے نتیجے میں تمہاری قوم معرض وجود میں آئی مگر تمہارا یہ چوہا فیوہرر نسلی برتری کا ڈھنڈورا پیٹ رہا ہے۔ تاہم تمہاری ذلت کا آغاز بس ہونے ہی والا ہے۔ اتحادی عنقریب تمہارے ملک کو روند ڈالیں گے اور ساری دنیا تماشا دیکھے گی''۔ ازابیلا نے قہر آلود لہجے میں کہا۔

''تمہارے ظلم کی انتہا ہو چکی ہے، اب زوال ہی زوال ہے۔ ذرا دیکھنا اتحادی آ کر تم لوگوں کا کیا حشر کرتے ہیں''۔ ازابیلا غلیظ گالیوں سے گارڈ کی تواضع کر رہی تھی اور گارڈ ورطۂ حیرت میں ڈوب ڈوب کر ابھر رہا تھا۔ یہ احتجاج نہیں کیمپ قوانین کی کھلی خلاف ورزی تھی۔

جب گارڈ نے حیرت سے نجات پائی تو برق رفتاری سے اپنا پستول نکالا اور ازابیلا کے جسم پر پستول کی ساری گولیاں چلا دیں۔

یہ دھماکہ سن کر چند دوسرے قیدی جائے واردات پر جمع ہو گئے تو گارڈ نے خطرے کی سیٹی بجا کر اپنے ساتھیوں کو متوجہ کیا اور قیدیوں کی شامت آ گئی مگر حیرت انگیز بات یہ ہوئی کہ دیگر قیدیوں نے بھی اتحادیوں کی آمد والا نعرہ بلند کیا۔ یہ بھس میں چنگاری پھینکنے والی بات تھی۔ اگر سارے بندی خانوں کے قیدی باغی ہو جاتے تو ان کو قابو کرنے کے لئے جرمن سپاہی محاذوں سے طلب کرنے

پڑتے۔ ادھر جرمن فوج پہلے ہی قلت کا شکار ہو رہی تھی کیونکہ ہٹلر نے ساری دنیا سے ٹکر لے رکھی تھی۔

اس دھماکے کی گونج کمانڈر تک پہنچی تو اس نے فوراً ہنگامی اجلاس طلب کیا تو مزید انکشاف ہوا کہ چند روز سے قیدیوں کے رویے میں تبدیلی آ چکی تھی۔ وہ احکامات کی کھلی خلاف ورزی تو نہیں کرتے تھے تاہم زیر لب مسکرا کر اور عجیب نگاہوں سے دیکھ کر تمسخر ضرور اڑاتے تھے۔

یہ سنتے ہی کیمپ کمانڈر آگ بگولا ہو گیا اور اس نے فوراً گستاپو سے چند تجربہ کار جاسوس طلب کیے تاکہ معاملے کی تہہ تک رسائی ہو سکے۔ محافظوں کو اس نے خوب لتاڑا اور ان کو خردماغ قرار دیا بلکہ تا حکم ثانی محتاط رہنے کی تلقین بھی کر دی اس طرح عارضی طور پر ہی ان منہ زور سانڈوں کو نکیل ڈال دی گئی۔

ادھر پروفیسر جیکب نے ہدایت کر رکھی تھی کہ جسمانی تشدد برداشت کرنے کے بجائے رازداری کی صرف اداکاری کی جائے اور ساری داستان محتاط الفاظ میں بیان کر دی جائے۔ یہ بات عام قیدیوں کی سمجھ میں تو نہ آ سکی مگر ذہین افراد جیکب کا مفہوم پا گئے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ 24 گھنٹوں میں کے اندر اندر کمانڈر کو حالات سے باخبر کر دیا گیا اور یہ بھی بتا دیا گیا کہ اس افواہ یا حقیقت کا منبع و ماخذ پروفیسر جیکب ہے اور یہ کہ تمام قیدیوں کو یقین ہے کہ پروفیسر نے حساس ریڈیو کہیں چھپا رکھا ہے اور وہ خبریں بھی سنتا رہتا ہے۔

دوسرے روز بندی خانے میں گویا طوفان آ گیا۔ کیمپ کا کونہ کونہ چھان مارا گیا، قیدیوں کو برہنہ کر کے تلاشی لی گئی مگر ریڈیو کا نام و نشان نہ مل سکا۔ تب گستاپو افراد کے سامنے پروفیسر جیکب کو طلب کیا گیا اور کمانڈر نے دو ٹوک الفاظ میں کہا۔

”پروفیسر جیکب! ریڈیو کی نشاندہی کر دو یا موت کو گلے لگا لو مگر یاد رہے موت المناک بھی ہو سکتی ہے“۔

خلاف توقع پروفیسر نے سینہ تان کر جواب دیا۔

”اگر تم لوگ واقعی ایک برتر نسل سے تعلق رکھتے ہو تو اپنی برتری کا ثبوت پیش کر کے وہ ریڈیو تلاش کر لو اور یہ کہ ہاں، میں نے ہی اتحادیوں کی آمد سے تمام قیدیوں کو باخبر کیا ہے بلکہ عنقریب یہ تماشا تم خود دیکھ لو گے“۔

اس پر گستاپو کے ایک فرد نے کمانڈر سے سرگوشی کی اور تفتیش والا معاملہ اپنے ہاتھ میں لے کر مطالبے کو ذرا نرم کرتے ہوئے کہا۔

”محترم پروفیسر صاحب! آپ ریڈیو کو بھول جائیں اور تمام قیدیوں کے سامنے اعتراف کر لیں کہ آپ نے عمداً جھوٹ بولا ہے اور یہ کہ اتحادیوں کی آمد والی بات سراسر افواہ ہے۔ ہم آپ کو معاف کر دیں گے بلکہ آپ کو انعام سے بھی نوازا جائے گا“۔

”تو گویا آپ مجھے خریدنا چاہتے ہیں“۔ پروفیسر نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

”ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ آپ موقع سے فائدہ اٹھائیں“۔ کمانڈر نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

”آپ مجھے سوچنے کا وقت دیں، صبح سب کے سامنے میں جواب دوں گا“۔ جیکب نے کہا۔

کیمپ کمانڈر نے سکھ کا سانس لیتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے، آپ رات بھر سوچ سکتے ہیں“۔ کمانڈر کو امید تھی کہ جیکب اپنے جرم کا اعتراف کرتے ہوئے اتحادیوں کی آمد کو افواہ قرار دے کر ذاتی سہولتیں حاصل کرنے کا فیصلہ کرے گا کہ یہی عام انسان کی فطرت ہوتی ہے۔

دوسرے روز تمام قیدیوں کو اکٹھا کیا گیا اور کمانڈر اپنے عملے کے ساتھ خونخوار کتے بھی لے آیا۔ گویا انعام و اکرام کے ساتھ المناک سزا کا اہتمام بھی کیا گیا تھا۔ جیکب نے ساتھی قیدیوں کو مخاطب کرتے ہوئے پہلے حالات کی وضاحت کی کہ اسے پرکشش انعام و اکرام

کی کوشش اتحادیوں کی آمد کو افواہ قرار دینے کی پیشکش کی جا رہی ہے۔ بصورت دیگر مجھے پھانسی دے دی جائے گی۔ مگر اے میرے بدنصیب ساتھیو! غور سے سنو، میرے لئے جان بچانا بہت آسان ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ مجھے بیش قیمت انعام سے بھی نوازا جائے۔ ایک طرف زندگی کی راحتیں ہیں اور دوسری طرف موت کی تلخیاں مگر میں......

یہاں پہنچ کر جیکب خاموش ہو گیا۔ اپنے پرائے تمام سامعین بھی دم بخود کھڑے تھے۔ عام خیال یہی تھا کہ جیکب موت کو رد کر کے زندگی کو گلے لگا لے گا کہ آخر وہ یہودی نژاد قیدی تھے اور یہودی خسارے کا سودا نہیں کیا کرتے۔ جیکب نے سامعین پر طائرانہ نگاہ ڈالی اور پھر کیمپ کمانڈر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"محترم کمانڈر! تمہاری پیشکش کو میں اپنے جوتے کی نوک پر بھی نہیں رکھتا۔ میں لعنت بھیجتا ہوں ایسی زندگی پر جو مجھے خودغرض بنا دے۔ رب موسیٰ و ہارون کی قسم میرا کہا ہوا ایک ایک لفظ سچ ہے۔ اتحادی بس آنے ہی والے ہیں، جرمن قوم کا سفینہ غرق ہونے ہی کو ہے"۔ یہ کہہ کر پروفیسر مضبوط قدموں سے چلتا ہوا ایک کونے میں نصب سولی کے قریب جا کھڑا ہوا۔

سولی کا پھندا پروفیسر کے ہاتھ میں تھا اور وہ الفاظ کی گولیوں سے کیمپ کمانڈر کے علاوہ جرمن قوم کے سینے چھلنی کر رہا تھا۔ اس نے مزید کہا۔

"اے میرے ساتھیو! کوئی شخص جھوٹ کی خاطر جان قربان نہیں کرتا مگر سچائی پر قربان ہونے والے ہر دور میں پیدا ہوتے رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ میں جھوٹ بول کر اپنی جان بچا کر خوشگوار سہولتیں بھی حاصل کر سکتا ہوں مگر میں نے سچائی پر قربان ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ میرا بیان کردہ ایک ایک نقطہ مبنی بر حقیقت ہے۔ اتحادی بس آنے ہی والے ہیں جرمنی کا چراغ سنبھالا لے کر گل ہونے کو ہے"۔

پروفیسر کی تقریر اب ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھی۔ لہٰذا کمانڈر کے حکم پر اسے سولی پر لٹکا دیا گیا۔

اس وقت تمام قیدی پروفیسر جیکب کی باتوں کا یقین کر چکے تھے کہ اس نے ناقابل تردید ثبوت پیش کیا تھا۔ یہ الگ بات کہ حاضرین میں بغاوت کی جرأت نہیں تھی۔

دنیا میں قتیل اس سا منافق نہیں کوئی
جو ظلم تو سہتا ہے بغاوت نہیں کرتا

***

اس تناظر میں دیکھا جائے تو اس بندی خانے کے تمام قیدی سوائے پروفیسر جیکب کے منافق تھے اور اسی کی سزا بھگت رہے تھے۔ جیکب کو سزائے موت دے دی گئی مگر اس کی داستان اختتام پذیر نہیں ہوئی۔ اس کے آخری الفاظ نوشتہ دیوار کا درجہ رکھتے ہیں۔

"یاد رکھو! جرمن قوم کی بربادی میں اہم ترین کردار ان قیدیوں کی قوم کا فرد ادا کرے گا"۔

ان الفاظ کے ساتھ ہی اس کی زبان ہمیشہ کے لئے بند کر دی گئی مگر حیرت انگیز بات یہ ہوئی کہ اس کی لاش کو گڑھے میں پھینکنے کے بجائے باقاعدہ اسی جگہ دفن کیا گیا جہاں اسے پھانسی دی گئی تھی اور نہ صرف یہ بلکہ تدفین کا کام کیمپ کے محافظوں یعنی جرمن افراد نے انجام دیا۔ اس کی وجہ بعد میں منظر عام پر آئی جب اس کی قبر پر عجیب قسم کا کتبہ لگایا گیا اس پر لکھا تھا۔

"Jakob The Liar."

یعنی "جیکب جھوٹا"۔ جرمن باشندوں کی یہ آخری کوشش بھی اس وقت ناکام ہو گئی جب اسی رات قیدیوں نے اس کتبے کی عبارت بدل دی۔ کسی نے خون سے وہاں لکھ دیا۔

"Jakob the light house of the truth."

یعنی جیکب سچائی کا مینارِ نور۔

اس طرح قیدیوں نے ثابت کر دیا کہ وہ پروفیسر کی ہر بات پر ایمان لا چکے تھے۔ اس داستان کا انجام واقعی حیرت انگیز ہوا۔ جرمن اور جاپان کی حماقتوں کے نتیجے میں اور ہر کمالے را زوالے کے مصداق جرمنی کا زوال برق رفتاری سے ہوا۔ اسٹالن گراڈ پر حملے کی ناکامی کے علاوہ امریکہ نے ہٹلر کے بڑے حلیف جاپان کا گویا کچومر نکال کے رکھ دیا۔

یہ اگست 1945ء سے پہلے کا واقعہ ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ جاپان کا شہنشاہ ہیرو ہیٹو آبرومندانہ طریقے سے ہتھیار ڈالنے کو تیار تھا اور جاپان پر ایٹم بم گرانے کی قطعاً ضرورت نہ تھی۔ اس کا اعتراف امریکی دانشوروں نے بھی کیا ہے۔ مگر یہ

کی میرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

والی بات کے مترادف ہے۔

ادھر جنرل رومیل "صحرائی لومڑی" کی تدابیر کو اتحادیوں نے جنگی ساز و سامان اور افرادی قوت کی بہتات سے غیر موثر کر دیا تو ہٹلر کو اپنا انجام نظر آ گیا تھا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ڈی ڈے (D-Day) اتحادیوں کے یوم فتح سے پہلے ہی جرمنی کے مرد آہن یعنی ہٹلر نے ہیمبرگ میں قلعہ نما تہہ خانہ بنوایا تھا جو بم پروف تھا۔ اس تہہ خانے کی دیواریں 14 فٹ موٹی تھیں اور ہٹلر اپنی داشتہ ایوا براؤن کے ساتھ اس تہہ خانے میں پناہ لے چکا تھا۔

برسبیل تذکرہ آج یعنی 2013ء میں ہٹلر کی اس پناہ گاہ کو یورپ کے سب سے بڑے شمسی پاور پلانٹ میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ آج یہ عمارت 9 منزلوں پر مشتمل ہے جہاں سولر پینلز، وڈ چپس اور بایو میتھین سے توانائی پیدا کی جا رہی ہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق اس توانائی سے 30 ہزار مکانوں کو بجلی فراہم کی جا سکے گی اور وہ بھی ماحول کو آلودہ کیے۔ بغیر ہٹلر نے یہ بنکر اتحادیوں کی بمباری سے محفوظ رہنے کے لئے بنوایا تھا۔ جس کا مطلب صاف ہے کہ اسے اپنی شکست کا یقین ہو گیا تھا۔ جب ہی تو وہ چوہے کی طرح محفوظ تہہ خانے میں جا چھپا تھا اور اس حقیقت سے تو سب واقف ہیں کہ اس پناہ گاہ میں اس نے اپنی داشتہ کے ساتھ خودکشی کی تھی۔ اب اس داستان کے دیگر حقائق بیان کیے جاتے ہیں جن سے ساری دنیا باخبر ہے یا ہونی چاہئے۔

***

جب جرمن سرزمین پر یہودیوں کا عرصہ حیات تنگ ہو گیا تو وہ ہر حیلے وسیلے سے وہاں سے ہجرت کر کے دیگر ممالک میں جا بسے۔ ان مہاجروں میں بلند مرتبت سائنس دان بھی تھے۔ اتفاق کی بات کہ اس دور کا سب سے بڑا سائنس دان البرٹ آئن سٹائن اپنے رفقاء کار کے ساتھ امریکہ میں پناہ لینے میں کامیاب ہو گیا۔ یہی ایٹمی ٹیکنالوجی کا موجد تسلیم کیا جاتا ہے اور اب یہ امریکی شہری تھا اور دنیا جانتی ہے کہ آئن سٹائن یہودی تھا۔

یہ بھی تاریخی حقیقت ہے کہ جرمن سائنس دان ایٹمی میدان میں بہت آگے نکل چکے تھے۔ تکنیکی الفاظ میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ آئسوٹوپ (Isotop) کی دریافت کے بعد بھاری پانی (Heavywater) بنا چکے تھے۔ یہی وہ شئے ہے جس نے آئن سٹائن کو بے چین کر رکھا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگلا قدم ایٹم بم ہوگا اور اگر یہ دیو ہٹلر کے ہاتھ لگ گیا تو دنیا برباد ہو جائے گی۔ کہا یہی جاتا ہے کہ سائنس دانوں کا دین دھرم صرف انسانیت ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جان پر کھیل کر اس ٹیکنالوجی پر ایک ملک کی اجارہ داری برداشت نہیں کرتے تا کہ طاقت کا توازن برقرار رہے۔ یہ فرینکلین ڈی لانو روز ویلٹ کا عہد صدارت تھا اور حقیقت یہی ہے کہ آئن سٹائن نے

صدر امریکہ کو قائل کر لیا کہ جرمنوں سے پہلے امریکہ کو ایٹم بم بنا لینا چاہئے۔ واضح رہے کہ روز ویلٹ کا عہد صدارت 1945ء تک رہا مگر سائنس دان کے ایما پر روز ویلٹ نے جنگی جنون سے یہ پراجیکٹ شروع کرا دیا۔ اس کا نام مین ہٹن پراجیکٹ رکھا گیا۔

پراجیکٹ مین ہٹن کا انچارج جنرل گرووز (Grooves) تھا جو بعد میں جنرل ایٹم بم کے نام سے مشہور ہوا۔ امریکہ کے کونے کونے میں 35 ہزار فیکٹریاں قائم کی گئیں جہاں تقریباً 40 ہزار کارکنان دن رات لیزلی گرووز کے حکم تلے کام کرنے لگے، اسی انداز کار کو جنونی کیفیت قرار دیا گیا ہے۔ بہر حال امریکہ نے آغاز تو دیر سے کیا مگر کارکنان کی محنت سے میدان مار لیا۔ اس پراجیکٹ میں تیار ہونے والے بم کا نام ''کم سن چھوکرا'' (Little Boy) تھا۔

اب 1945ء میں عالمی جنگ کی صورت حال یہ تھی کہ ہٹلر ذہنی طور پر شکست کھا چکا تھا۔ یہ بھی سچ ہے کہ اس دور تک کسی ایک ملک نے اتنی بڑی فوج تیار نہیں کی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ ہٹلر کی فوج 100 ڈویژن پر مشتمل تھی۔ اب اگر ایک ڈویژن میں اوسطاً 25 ہزار افراد ہوں تو حساب لگالیں کہ اس فوج میں سپاہیوں کی تعداد کتنی ہو گی۔ تاہم اب اس فوج کا کچومر نکل چکا تھا۔

مغربی فلمسازوں نے ہٹلر کو پاگل ثابت کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تاہم اس میں کامل سچائی نہیں ہمیں یہی دکھایا جاتا ہے کہ ہٹلر پاگلوں کی طرح چیخ چیخ کر احکامات صادر کرتا رہتا تھا کہ اتنی ڈویژن فوج فلاں محاذ پر لگا دو اور اتنے ڈویژن وہاں بھیج دو وغیرہ وغیرہ۔ تاہم ہٹلر کی ذہنی کیفیت کا اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اس کا سب کچھ برباد ہو چکا تھا لہٰذا دھچکا بھی اتنی ہی شدت کا تھا۔ پھر یوں ہوا کہ اس مردِ آہن کو اپنی داشتہ کے ساتھ اسی خفیہ تہہ خانے میں خودکشی کرنی پڑی۔ ڈی ڈے کے بعد اتحادی افواج جرمنی میں داخل ہو گئیں۔

برلن کے جنوب مغرب میں 35×40 کلومیٹر کے فاصلے پر پوٹس ڈیم (Potsdam) بندرگاہ پر ایک بحری جہاز پر اس دور کے تین بڑے یعنی سٹالن، چرچل اور ہیری ٹرومین بندر بانٹ کرنے والے اجلاس میں بیٹھے تھے۔

روز ویلٹ کا عہدِ صدارت 1945ء میں اختتام پذیر ہو چکا تھا اور اس کی جگہ ٹرومین صدر تھا۔ اسے صدر بنے چند ماہ کا عرصہ ہی گزرا تھا کہ اسے تاریخ انسانی کا سب سے بڑا فیصلہ کرنا پڑا یعنی جاپان پر ایٹم بم گرانا۔ ٹرومین زمانہ طالب علمی میں ناتواں سا لڑکا تھا۔ جس کی عینک کے شیشے بوتل کے پیندے جیسے تھے اور اکثر طلباء اسے عینکوں کہا کرتے تھے۔ صدارت کے بعد اس نے اعتراف کیا کہ اسے عوام کی دعاؤں کی ضرورت تھی جن کے بغیر وہ صدارت کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا تھا۔

اسی جہاز پر دورانِ اجلاس ٹرومین کو مطلع کیا گیا کہ ایٹم بم کا تجربہ اندازے سے کہیں زیادہ کامیاب ہوا ہے۔ تار برقی کے الفاظ تھے۔ ''کمسن چھوکرا اندازے سے زیادہ طاقتور ثابت ہوا''۔

یہ تجربہ نیو میکسیکو کے مقام الکورو پر کیا گیا۔ بس اس پل سے امریکی صدارتی اتحادیوں کا سربراہ بن گیا اور برطانیہ، روس کی حیثیت ثانوی بن گئی۔ ٹرومین نے اجازت دے دی کہ اگست کے پہلے ہفتے جس روز موسم مناسب ہو ہیروشیما پر ایٹم بم گرا دیا جائے۔ اس طرح صرف ایک جہاز بی-29 پر ایٹم بم رکھ دیا گیا۔ ادھر جاپانی فوج نے یہ واحد جہاز دیکھ لیا تھا مگر انہوں نے ایک جہاز کو کوئی اہمیت ہی نہ دی اور وہ کچھ ہو گیا جس نے تاریخ انسانی کا رخ موڑ کے رکھ دیا۔

اب ذہن میں پیدا ہونے والے اہم سوال کا جواب بلاحظہ ہو یعنی پروفیسر جیکب کی قبر کہاں ہے؟ اس کا

جواب غیر متوقع سا ہے کہ آج اس قبر کا رُوئے زمین پر وجود ہی نہیں کیونکہ اس قبر کا نشان خود یہودیوں نے مٹا ڈالا مگر اس کی وجہ بڑی فکر انگیز ہے۔ ہوا یہ کہ جب اس بندی خانے سے یہودی قیدیوں کو نجات دلائی گئی تو ہر قیدی تلخ یادوں کے ساتھ ایک بیش قیمت شئے بھی اپنے ساتھ لے گیا۔ یعنی پروفیسر جیکب کی قبر کی مٹھی بھر مٹی۔ اس طرح اس قبر کا نشان بظاہر تو مٹ گیا مگر ہزاروں انسانوں کے ذہن پر نقش ہو کر رہ گیا۔ ان قیدیوں کی نسلوں نے اس مٹی کو متبرک قرار دے کہ اس کی حفاظت کی۔ اہم بات یہ کہ بہت سے لوگوں کو وہ مٹی دیکھنے کا موقع ملا۔ دیکھنے میں یہ عام سی مٹی تھی مگر کیا اسے عام مٹی کہنا مناسب ہے؟ یہ فیصلہ قارئین خود کریں۔

یہ داستان اس وقت منظر عام پر آئی جب نورمبرگ (جرمنی) میں جرمن جرنیلوں پر جنگی جرائم کے سلسلے میں مقدمات چلائے گئے۔ دنیا شاہد ہے کہ اک مین (Eichman) کو یہودیوں نے ڈھونڈ ہی نکالا اور سزائے موت دلوا کر دم لیا۔

1960ء کے عشرے میں راقم کو ایک یہودی تاجر مسٹر کیٹز (Katz) نے نہ صرف اس داستان کی تصدیق کی بلکہ مٹی بھی دکھا دی۔ بقول مسٹر کیٹز اس کا ایک بزرگ اس بندی خانے میں قیدی تھا اور خود وہ متبرک مٹی لے کر آیا تھا اور اب اس کے خاندان میں قیمتی سرمائے کی حیثیت سے موجود ہے اور نسل در نسل رہے گی۔

کوئی قوم بحیثیت مجموعی بُری یا اچھی نہیں ہوتی یہ اوصاف قوم کے افراد میں پائے جاتے ہیں۔ البتہ جو قوم ذاتی مفاد کو قومی مفادات پر ترجیح دینے لگ جائے وہ صفحہ ہستی سے مٹ جاتی ہے۔ آج اپنے گرد و پیش نگاہ دوڑائیں تو بات آپ کی سمجھ میں ضرور آ جائے گی۔ ہم اگر زندہ ہیں تو گداگری کے طفیل۔

***

کچھ یادیں کچھ باتیں

ایم اسلم نقاشِ فطرت

اردو ادب کے ایک کلاسیک ادیب کی بھولی بسری یادیں

ربانی عبدالجبار-امریکہ

میاں ایم اسلم کہتے تھے کہ حکیم سعید صاحب نے دوستی کا حق ادا کر دیا ہے۔ یقیناً ایسا ہوا ہوگا۔ دنیا ابھی اچھے دوستوں سے خالی نہیں ہوئی۔ ناراضی کی وجہ سے جناب حاجی اشرف صبوحی نے اپنے ایک خط میں میاں صاحب کو لکھا تھا کہ آپ کے سامنے معقول عذر بیان کرنا گویا لقمان حکیم کے آگے حکمت بیان کرنے کے مترادف ہے۔ اُن دونوں دوستوں کے درمیان کچھ عرصہ عارضی ناراضی رہی لیکن مولانا محمد اسماعیل پانی پتی (جنہیں پیار سے 'سیناپتی' بھی کہتے تھے) کی مداخلت سے دونوں دوست پھر ایک ہو گئے۔

طالب علمی کے زمانے میں ایم اسلم نے مولانا محمد حسین آزاد کو سرِ راہ روک کر دریافت کیا۔ ''حضرت استعمال نہ ہونے والے برتنوں پر سبز رنگ کی کائی جم جاتی ہے جسے پنجابی زبان میں ''اُتی'' کہتے ہیں۔ اسے اردو زبان میں کیا کہتے ہیں؟''

''پھپھوندی''۔ مولانا آزاد نے جواب دیا۔

منشی پریم چند ایم اسلم صاحب سے ملاقات کی غرض سے آئے اور انہوں نے سوال کیا کہ میاں صاحب آپ لکھنے سے پہلے کس قسم کا ماحول پسند کرتے ہیں؟ میاں صاحب نے چند گراموفون ریکارڈ بجا کر منشی صاحب کو سنائے اور جواب دیا کہ میں لکھنے سے پہلے اچھی غزلیں اور عمدہ گانے سنتا ہوں۔ منشی پریم چند نے بے اختیار واہ واہ کی اور میاں صاحب کی تعریف کرتے ہوئے رخصت ہوئے۔

قیامِ پاکستان سے پہلے لیلا پارک لاہور میں مشاعرہ منعقد ہوا۔ جوش ملیح آبادی شریکِ مشاعرہ تھے۔ اسلم صاحب نے جوش صاحب کو کھانے کی دعوت دی۔ جوش صاحب نے دریافت کیا کہ کھانے میں شراب کا بھی اہتمام ہوگا یا نہیں؟

ایم اسلم نے اپنی پوری حیات میں سگریٹ پیا:

پانی کا ذائقہ بھی چکھا تھا۔ میاں صاحب کو طیش تو بہت آیا لیکن انتہائی شائستگی سے جواب دیا کہ شراب اُن کے یہاں دعوت میں تو کبھی بھی نہیں دی گئی۔ جوش صاحب نے کہا کہ وہ شیر ہیں اور میاں صاحب کے یہاں گھاس کھانے ہرگز نہیں جائیں گے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ سے بھی ان کی اکثر خط و کتابت ہوتی تھی۔ میاں صاحب کہتے تھے کہ مرزا صاحب ایسا صاحب طرز ادیب شاید اب کبھی پیدا نہ ہو گا۔ آغا حشر کاشمیری، سوتر منڈی لاہور میں حکیم فقیر محمد کے یہاں آ کر ٹھہرا کرتے تھے۔ حکیم احمد شجاع پاشا اکثر اُن کے یہاں آ کر اپنے لکھے ہوئے ڈراموں کی بہت تعریف کیا کرتے تھے۔ ایسی ہی ایک نشست میں پاشا صاحب جب اپنے ڈراموں کی خوب تعریف کر چکے تو حشر نے شجاع پاشا سے کہا کہ جیسے سیب ایسے بیر کی ''گٹ'' کا علم نہیں کہاں ہوتی ہے ایسے ہی تم اردو ڈرامہ کے متعلق کچھ نہیں جانتے۔

حضرت علامہ اقبال اور مولانا گرامی کے ہمراہ ایم اسلم بھی کسی دوست کی شادی میں مدعو تھے۔ بارات گاؤں میں گئی۔ اُس وقت کے رسم و رواج کے مطابق بارات کو رات گاؤں میں ٹھہرایا گیا۔ گرمیوں کا موسم تھا۔ میاں صاحب کی شامتِ اعمال کہ ان کی چارپائی مولانا گرامی کی چارپائی کے برابر بچھا دی گئی۔ اچانک آدھی رات مولانا گرامی نے اللہ ہو...... اللہ ہو کا بلند آواز سے ورد شروع کر دیا۔ یہ دوبارہ نہ سو سکے تو علامہ اقبال کے خادم علی بخش نے کہا میاں صاحب! ان کا تو معمول یہی ہے۔ ہم تو اب ان کی اس عادت کے عادی ہو چکے ہیں۔ مولانا نے وضو کیا اور نہ ہی نمازِ فجر ادا کی۔ سورج نکلنے تک چارپائی پر بیٹھے بیٹھے بس اللہ ہو...... اللہ ہو کرتے رہے۔

میاں نظام دین ایم اسلم کے والد گرامی نے ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر کی بچپن ہی سے اپنے گھر میں پرورش کی۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان بھیجا۔ سالک اور تاثیر کی بڑی دوستی تھی۔ یہ دونوں حضرات علامہ اقبال کے خلاف اپنے نام بدل بدل کر لکھنؤ سے نکلنے والے اخبارات اور رسائل میں مضامین لکھا کرتے تھے۔ اعتراضات اس قسم کے ہوتے تھے کہ ''سیدھا کرے کوئی''۔ کا کیا مطلب ہے۔ بھلا یہ بھی کوئی شعری مضمون ہے۔ ایک دفعہ یہ تینوں یعنی تاثیر، سالک اور ایم اسلم علامہ اقبال کی میکلوڈ روڈ والی کوٹھی سے حضرت علامہ سے مل کر باہر نکلے ہی تھے کہ اچانک تاثیر اور سالک کی زبان سے نکل گیا کہ یہ فیل چشم عجب آدمی ہے۔ علامہ اقبال کی آنکھیں قدرے چھوٹی اور دھنسی ہوئی ہونے کی وجہ سے یہ نام ان دونوں نے رکھا ہوا تھا۔ ایم اسلم کا یہ سننا تھا کہ وہ انتہائی طیش میں آ گئے اور ان دونوں سے کہا تم اب اپنی خیر مانگو۔ میں اسی وقت واپس جا کر علامہ سے تمہاری شکایت کرتا ہوں۔ تاثیر اور سالک فوراً ان سے لپٹ گئے اور میاں صاحب سے انتہائی عاجزی سے معافی مانگی۔ اسلم صاحب نے ان سے وعدہ لیا۔ سالک اور تاثیر نے وعدہ کیا۔ تب کہیں ان کا غصہ فرو ہوا۔

میاں ایم اسلم کو شہرت بھی خوب ملی۔ مرزا ادیب، شبلی (بی کام بعد میں ایم کام) اور مرزا احسان سے انہوں نے دریافت کیا کہ ''سچ کہیے گا آپ حضرات کی طبیعت میرے یہاں آ کر کچی کچی سی کیوں رہتی ہے؟''

''یہ سچ ہے!'' مرزا احسان نے جواب دیا۔ ''جب تک آپ لکھتے رہیں گے ہم آگے نہیں بڑھ سکتے''۔

''یہ تو بہت آسان کام ہے''۔ ایم اسلم نے ان کو مسکراتے ہوئے مشورہ دیا۔ ''بھئی! آپ سب دوست مزار حضرت داتا صاحب کے سامنے سے گزر کر میرے یہاں آتے ہیں، وہاں ذرا دیر رُک کر میرے جلد مرنے کی دُعا کیا کریں، آپ سب کی مراد جلد بر آئے گی''۔

لاہور میں پارک کا میلہ ہر برس مقبرہ جہانگیر میں منعقد

ہوتا تھا۔ یہ اتفاق کی بات تھی کہ اس میلہ میں عبدالرحمان چغتائی، غلام عباس اور ایم اسلم کی جیبوں سے برآمد ہونے والی رقم صرف ایک چونی تھی۔ ایم اسلم بہت اچھے شکاری ہونے کی وجہ سے ان کا نشانہ رائفل بھی بہت غضب کا تھا۔ اس میلے میں نشانہ بازی کے مقابلے میں انہوں نے تین روپے کی رقم جیتی جو اس وقت ایک اچھی اور معقول رقم ہوتی تھی۔ ان سب نے جی بھر کے لیمونڈ سوڈا پیا اور مٹھائی کھائی۔ عبدالرحمان چغتائی صاحب کے متعلق میاں صاحب کہتے تھے کہ وہ ایک "Gifted" آرٹسٹ ہیں لیکن میرے نامہرباں دوست بھی ہیں۔ ایک دفعہ اپنے بھانجے میاں سلی (صلاح الدین۔ داماد حضرت علامہ اقبال) کو ڈانٹ پلا رہے تھے کہ تم ہمیشہ مجھ سے میاں صاحب...... میاں صاحب! کہہ کر کے مخاطب ہوتے ہو۔ میں تمہارا ماموں بھی ہوں۔

پنڈت رام چڈھا (خوشتر گرامی) مدیر "بیسوی صدی" جب تک زندہ رہے یہ ماہ نامہ اعزازی تمام عمر اُن کو ملتا رہا۔ کہتے تھے کہ احمد ندیم قاسمی صاحب سے صرف ایک بار پنڈت آنند نرائن مُلّا کی موجودگی میں لاہور ہوٹل میکلوڈ روڈ میں ملاقات ہوئی تھی اس کے بعد آج تک اُن کی تحریروں میں ہی اُن سے ملاقات ہو رہی ہے۔

کراچی کی ایک ضیافت میں فیض احمد فیض صاحب نے میاں صاحب کے سامنے شراب پینے سے انکار کر دیا اور صاحب خانہ سے کہا کہ اس وقت دعوت میں ایم اسلم کی موجودگی میں مجھے ان کے سامنے شراب پیتے ہوئے شرم آتی ہے۔ میاں صاحب میرے بزرگ ہیں"۔

ماہنامہ "نور و نار" کی مدیرہ محترمہ کلثوم رحمان کی تعریف کرتے تو کہتے۔ تم اُن کو دیکھو تو بس دیکھتے ہی رہ جاؤ۔ واہ، کیسی طرحدار خاتون ہیں۔

میاں صاحب بتاتے تھے کہ ان کے والد گرامی

مسافر

نگر نگر میں پھیرا اپنا
کہیں نہیں ہے ڈیرا اپنا
گلی گلی میں آنا جانا
دو قدموں کا تانا بانا
چلتے جائیں بُنتے جائیں
پھول اور پتھر چُنتے جائیں
بجلی ہے رفتار ہماری
منزل ہے اُس پار ہماری
کوئی نہیں ہے دشمن اپنا
صحرا اپنا گلشن اپنا
خاک زمانہ چھان چکے ہیں
دُنیا کو پہچان چکے ہیں
ہر کوچے میں صدا لگائیں
گزریں اور گزرتے جائیں
اپنا ہو یا غیر ہو بابا!
دِل والوں کی خیر ہو بابا!

(عاصمہ جمیل۔ لاہور)

میاں نظام دین نے اپنی زرعی زمین فروخت کر کے جناح صاحب کی مسلم لیگ کے لئے چندہ دے دیا لیکن خود سیاست میں کبھی حصہ نہیں لیا۔ (منزل انہیں ملی جو شریک سفر نہ تھے)

میاں ایم اسلم صاحب کے ایک ادھیڑ عمر ملازم کا نام امام دین تھا۔ اس کا ایک بھانجا تھا جو درزیوں کا کام کرتا تھا، میاں صاحب نے اسے بھی از راہِ ہمدردی اپنی حویلی میں رہائش کے لئے جگہ دے رکھی تھی۔ پنجابی کے شاعر اسلم فیضی اکثر امام دین کو دیکھتے ہی راجہ مہدی علی خان کے ایک شعر کی پیروڈی کرتے:

اللہ رکھا اور نظام دین اصل میں دونوں ایک ہیں

موت سے پہلے آدمی ان سے نجات پائے کیوں
میاں صاحب یہ سن کے بے اختیار ہنس پڑتے۔
میاں صاحب کے وسیع و عریض کمرے کی بالکونی بھی بڑی لمبی اور وسیع تھی۔ میاں صاحب کہتے تھے کہ استاد محترم حضرت علامہ اقبال صاحب کے پسر جناب جاوید اقبال صاحب اکثر ان کے ہاں آتے رہتے تھے۔ انہوں نے ایک بار میاں صاحب کو بتایا کہ ایک عورت انہیں اس بالکنی سے "جاں" کرتی ہے اور پھر غائب ہو جاتی ہے۔ یعنی وہ ان کو جھانک کر بتاتی ہے کہ میں یہاں ہوں۔

جاوید اقبال صاحب کہتے تھے کہ میاں صاحب اس بالکنی میں یقینی طور پر پُر اسرار ارداح کا بسیرا ہے۔

مدیر "ساقی" جناب شاہد احمد دہلوی ہمیشہ ان کے مداح رہے۔ قیام پاکستان سے قبل شاہد احمد صاحب دہلی سے اور عصمت چغتائی صاحبہ نے بمبئی سے اپنے شوہر فلم ڈائریکٹر شاہد لطیف کے ہمراہ لاہور آ کر میاں صاحب کی حویلی میں قیام کیا۔ واقعہ یہ تھا کہ ان دنوں لاہور کی ایک عدالت میں سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی اور شاہد احمد دہلوی پر عریاں افسانے لکھنے اور اُن کی اشاعت کے سبب ان پر مقدمہ زیر سماعت تھا۔ میاں صاحب نے سعادت حسن منٹو کی ضمانت دی اور عصمت چغتائی صاحبہ کے حق میں صفائی کی شہادت دینے سے انکار کر دیا۔ ان کے اس طرز عمل سے عصمت صاحبہ ناراض ہو کر اپنی ایک سہیلی سلطانہ صاحبہ ریڈیو اناؤنسر کے یہاں منتقل ہو گئیں۔ البتہ ان کے شوہر شاہد لطیف صاحب میاں صاحب کی حویلی میں ہی رہے۔ تقسیم وطن کے بعد فسادات کے پیش نظر میاں ایم اسلم نے "رقصِ ابلیس" کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ عصمت چغتائی صاحبہ نے اس کتاب پر خوب و ناخوب تنقید کی میاں صاحب نے بھی اس کا ویسا ہی کڑا جواب لکھا۔ اس بحث کا نتیجہ یہ نکلا کہ بھارتی حکومت نے میاں صاحب کا ہندوستان میں داخلہ بند کر دیا۔

مزنگ لاہور میں ایک ادبی انجمن بنی۔ احسان دانش میاں صاحب کو وہاں افسانہ پڑھنے کے لئے لے گئے۔ شوکت تھانوی صاحب نے صدارت کی۔ دانش صاحب نے غزل پڑھی۔ انہوں نے اپنا افسانہ پڑھ کر ابھی ختم بھی نہیں کیا تھا کہ سامعین نے بے ہنگم تنقید کی بوچھاڑ کر دی۔ یہ اٹھ کر چلے آئے۔ اس واقعہ کے کچھ روز گزرنے کے بعد انجمن کے سیکرٹری کا انہیں رجسٹرڈ لفافہ ملا۔ تحریر تھا کہ آپ سے زیادتی ہوئی ہے۔ ہم معذرت خواہ ہیں۔ دراصل شوکت تھانوی صاحب کی شدید خواہش تھی کہ آپ اُن کی صدارت میں افسانہ پڑھیں اور اُس پر کڑی تنقید بھی ہو۔ یہ خط جوں کا توں میاں صاحب نے جناب دانش صاحب کو دے دیا۔ دانش صاحب نے ان کے یہاں آنا موقوف کر دیا۔ ان کی وسیع حویلی کے صحن میں کبھی ادبی محفلیں ہوتیں اور کبھی کبھار چند شعراء پر مشتمل مشاعرہ کا اہتمام بھی ہوتا تھا۔ ایسی ہی ایک محفل میں منور سلطانہ لکھنوی، مولانا اسماعیل پانی پتی، پنجابی شاعر اسلم فیضی اور جناب بے خود دہلوی کے نواسے (نام اِس وقت یاد نہیں) نماز مغرب ادا کرنے کے لئے اُٹھے تو میاں صاحب نے کہا کہ انہوں نے طوائف کے موضوع پر چار ناول لکھے ہیں۔

آپ نے حق ہمسائیگی ادا کر دیا۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔ حضرت آپ کی حویلی طوائف خانہ کے نزدیک ہی تو ہے۔

ایم اسلم کا لباس بھی انتہائی عجیب قسم کا ہوتا تھا۔ سر پر سرخ ترکی ٹوپی، خوبصورت سلک کی اطالوی ٹائی، ڈبل بریسٹ کا ولایتی کوٹ اور پینٹ کی جگہ ہمیشہ سفید لٹھے کی شلوار پہنتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ پینٹ اور ہیٹ سے ہمیشہ نفرت تھی۔ تمام عمر عزیز ایسے ہی آدھا تیتر اور آدھا بٹیر کے حلئے شریف میں گزار دی۔ عظیم الشان، مستند اور

جغادری نقاد بھی میاں صاحب کی زودنویسی کے سامنے عاجز ہو گئے بلکہ سب کو سانپ سونگھ گیا لیکن ایم اسلم نے کبھی بھی کسی کی رائے سنی نہ ہی اپنی روش میں تبدیلی کی۔ اپنی تحریر پر تنقید سننا ان کی برداشت سے باہر تھا۔ میرے لئے بھی ایک شعر گھڑا ہوا تھا۔ مجھے سناتے اور دیر تک بے اختیار کہتے۔

''کوئی ثانی نہیں ربانی کا
خانہ خالی ہے عقل و دانش کا''

تقریباً سو برس کی عمر پائی۔ چار بیگمات یکے بعد دیگرے اپنی طبعی عمر میں اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ بدقسمتی سے اولاد کسی سے بھی نہ ہوئی۔ حد یہ کہ میاں صاحب نے اپنی بھانجی، اصغری کو گود میں لیا تو وہ بھی تین برس کی عمر میں فوت ہوگئی۔ اصغری کے لئے حفیظ جالندھری صاحب کا لکھا ہوا نوحہ اور سربریدہ گائے کا کھلونا تمام عمر اپنے کمرہ میں سجا کر رکھا۔ اصغری کو یاد کر کے آبدیدہ ہو جاتے تھے۔

لکھنے کی ابتدا شاعری سے کی تھی اور چوہدری خوشی محمد ناظر جو کہ حکومت برطانیہ کی طرف سے کشمیر کے وزیراعظم کے عہدے پر فائز تھے، سے اصلاح لیتے۔

سکول کے بعد گورنمنٹ کالج میں داخلہ لیا تو حضرت علامہ اقبال کی شاگردی میں آ گئے۔ علامہ صاحب نے ایم اسلم کو مشورہ دیا کہ شاعری کو چھوڑ کر نثر لکھو۔ میاں صاحب نے تمام عمر اس بات پر فخر کیا کہ انہوں نے اپنے استاد محترم کا مشورہ مان کر بے پناہ شہرت و عزت پائی۔ حضرت علامہ کی زبان میں اللہ نے ایسی تاثیر دی تھی۔ شاعری کرتے تو یہ مرتبہ ان کو تمام عمر نصیب نہ ہوتا۔

میں نے اس مضمون میں غیر ضروری واقعات کا ذکر نہیں کیا لیکن آخر میں مَیں صرف اتنا ہی لکھ کر ختم کر رہا ہوں کہ مجھے خبر نہیں کہ جس ادیب نے اسی برس سے بھی زیادہ اُردو ادب کی خدمت کی ہے اور لاتعداد کتابوں کا مصنف ہے حیرت ہوتی ہے کہ اُس کا ذکر اردو کی کسی درسی کتاب میں موجود کیوں نہیں ہے؟

ایک کالم نویس جو کراچی سے نیویارک تشریف لائے تھے اور یونائیٹڈ نیشن کی بلڈنگ کو دیکھ کر ''ونڈرفل ونڈرفل'' کہتے ہوئے واپس تشریف لے گئے، ان کا مضمون بی اے کی درسی کتابوں میں شامل ہے۔ اس کی وجہ پاکستان میں اُردو کا نصاب ترتیب دینے والوں کو معلوم تو ہوگی۔

چلتے چلتے اطلاعاً عرض ہے کہ راقم الحروف 1947ء میں پانچویں کلاس کا طالب علم تھا۔ اس سے پہلے یعنی قیام پاکستان سے پہلے میاں ایم اسلم کی ایک بچوں کے لئے لکھی ہوئی کہانی ''شیشے کا ٹکڑا'' درجہ دوم اردو کے نصاب میں شامل تھی۔ یاد رہے کہ غیر منقسم پنجاب میں فیروزپور، امرتسر، لدھیانہ، گورداسپور، ہوشیارپور اور جالندھر کے ملحق علاقہ جات شامل تھے۔

حضرت علامہ اقبال صاحب ایم اسلم صاحب کے والد گرامی میاں نظام دین صاحب کو ملنے کے لئے اکثر آیا کرتے تھے۔ ایک دن نظام دین صاحب نے علامہ صاحب کو شکایت کی کہ یہ اسلم ہر وقت لکھتا رہتا ہے۔ اس کو سمجھائیں۔ علامہ صاحب نے کہا کہ اگر یہ بامقصد لکھتا ہے تو اس میں کوئی ہرج نہیں، اسے لکھنے دیں۔ اس دن کے بعد سے میاں صاحب کو کھل کر لکھنے کی اجازت مل گئی اور والد صاحب نے کہا کہ اس کے لکھنے میں مداخلت نہ کی جائے۔

حکیم یوسف حسن مدیر ''نیرنگ خیال'' راولپنڈی اور مصورِ غم علامہ راشدالخیری کے صاحب زادے منظم الخیری مدیر ''جام نو'' کراچی نے خاص طور پر ''میاں ایم اسلم'' نمبر شائع کیا۔ حکیم یوسف میاں صاحب کے حقیقی ماموں زاد بھائی تھے۔

(غیر مطبوعہ)

آٹھویں قسط

موم سے پتھر بن جانے والے ایک شریف النفس قبائلی نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت۔

☆---------0345-1563185/E-mail.shahidkohler@gmail.com رزاق شاہد کوہلر

صمد خان کے دائیں ہاتھ کی شہادت والی انگلی ٹریگر پر تھی اور اُس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے قہر برس رہا تھا۔ گل کے ہاتھ یاری خان کے ہاتھوں میں تھے اور صمد خان کے دل پر آرے سے چل رہے تھے۔ ایک آتش فشاں تھا جو اُس کے دل کے اندر جل رہا تھا۔ اُسے یوں محسوس ہونے لگا کہ نفرت کا یہ آتش فشاں اُسے بھک سے اُڑا دے گا اور اُس کا جسم ننھے ننھے ذروں میں بٹ جائے گا۔ اُس کے اندر کی ساری نفرت اُس کی اُس انگلی میں سما گئی جو اُس نے پستول کے ٹریگر پر رکھی ہوئی تھی۔ یاری خان اور گل اُس سے بے خبر ایک دوسرے میں کھوئے ہوئے تھے۔ سر پر منڈلانے والی موت سے وہ قطعی لاعلم تھے۔

ٹریگر پر اُس کی انگلی کا دباؤ بڑھنے لگا اور ہونٹ سختی سے بھنچ گئے۔ وہ بس گولی چلانے والا ہی تھا کہ معاً اُسے ایک گرج دار آواز سنائی دی۔ ”رُک جاؤ ورنہ کھوپڑی کھول کر رکھ دوں گا“۔

غیر ارادی طور پر اُس نے اُس جانب دیکھا جدھر سے آواز آئی تھی۔ اُس سے چند قدموں کے فاصلے پر ہاسپٹل کا سکیورٹی گارڈ ہاتھ میں گن پکڑے اُسے غضب ناک نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

”یہ کیا کر رہے ہو؟“ گارڈ نے اُس کے قریب پہنچ کر کرخت لہجے میں سوال کیا۔

”کک ...... کچھ ...... نہیں ...... بس ایسے ہی ...... اپنے ...... بھ ...... بھائی کو ڈرا رہا تھا“۔ اُس نے بوکھلا کر جواب دیا۔

”ڈرا رہا تھا کہ قتل کر رہا تھا؟“ گارڈ نے مشکوک انداز میں سوال کیا۔

”مم ...... میں بھلا ...... اپنے بھائی کو کیوں قتل کرنے لگا؟“ وہ بدستور بوکھلایا ہوا تھا۔

گارڈ بولا۔ ”ڈرانے والے یوں کھڑکیوں سے چھپ کر بھائیوں کو نشانے پر نہیں رکھتے ...... اور پھر تمہارے ہاتھ میں پستول بھی اصلی ہے۔ میں ابھی پولیس کو فون کرتا ہوں وہ خود ہی تم سے نمٹ لیں گے“۔

”نہیں ...... تم ...... ایسا نہیں کر سکتے“۔ گارڈ کو جیب سے موبائل فون نکالتے دیکھ کر وہ گڑگڑایا۔ ”مجھے خواہ مخواہ پولیس کے حوالے کر کے تجھے کیا فائدہ ہوگا؟“

”اور تجھے چھوڑ کر بھلا مجھے کیا فائدہ ہوگا؟“ گارڈ طنزیہ انداز میں مسکرایا۔

”تم اگر چاہو تو اچھا خاصا فائدہ ہو سکتا ہے“۔ اُس نے پستول چھپاتے ہوئے جیب سے والٹ نکال لیا۔

”اوہ ...... تو تم مجھے رشوت دینا چاہتے ہو؟“

”آج کل لوگ اسے نذرانہ اور چائے پانی بولتے ہیں تم ......“

”میں لعنت بھیجتا ہوں تیرے نذرانے پر، اب تو تجھے پولیس کے حوالے کرنا ہی پڑے گا“۔ گارڈ نے فیصلہ کن انداز میں جواب دیا۔

”تم میری مجبوری کا ناجائز فائدہ اُٹھا رہے ہو ...... تمہیں شرم آنی چاہیے ایک معزز شہری سے رشوت مانگتے ہوئے“۔ یاری خان اور گل کو کھڑکی کے قریب پہنچتے دیکھ کر وہ چلّایا۔ ”تم ...... تم کیسے انسان ہو ...... کچھ شرم حیا ہے کہ نہیں؟“

لمحہ بھر کے لیے تو گارڈ اُس کی دیدہ دلیری پہ حیران رہ گیا۔ اُس نے گرگٹ کے رنگ بدلنے والا محاورہ سنا تھا، مگر کسی انسان کو گرگٹ کے مانند رنگ بدلتے پہلی مرتبہ دیکھ رہا تھا۔ جو شخص چند لمحے قبل اُس کے سامنے گڑگڑا رہا تھا، وہی اب چلا چلا کر بول رہا تھا۔

”یہ ...... یہ تم کیا بکواس کر رہے ہو؟“ گارڈ اپنے دفاع میں بولا۔ ”میں ایک ایمان دار ریٹائرڈ فوجی ہوں اور تم اپنا جرم چھپانے کے لیے مجھ پر رشوت لینے کا گھناؤنا الزام لگا رہے ہو ...... میں نے زندگی میں تم جیسا بے

غیرت انسان کبھی نہیں دیکھا"۔

"اب دیکھ لیا ہے ناں؟" وہ اُسے آنکھ مارتے ہوئے دھیمی آواز میں بولا۔ "جاؤ ورنہ نوکری سے ہاتھ دھو بیٹھو گے"۔

"یہ تم نے کیا ہنگامہ مچا رکھا ہے صمد خان؟" یاری خان نے کھڑکی پر جھکتے ہوئے سوال کیا۔

"لالہ! ہنگامہ میں نے نہیں بلکہ اس رشوت خور گارڈ نے مچا رکھا ہے۔ یہ...... یہ مجھ سے یونہی رشوت مانگ رہا ہے"۔ اُس نے سفید جھوٹ بولتے ہوئے جواب دیا۔

"یہ جھوٹ بول رہا ہے"۔ گارڈ بولا۔ "اس کے پاس پستول ہے اور یہ یہاں کھڑکی سے غالباً آپ کو گولی مارنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اسے رنگے ہاتھوں پکڑا ہے"۔

"میں اور اپنے لالہ کو گولی ماروں گا...... پاگل کے بچے! تمہارا دماغ تو درست ہے؟" صمد خان نے چلا کر جواب دیا۔

"تمہارے پاس پستول ہے؟" یاری خان نے مداخلت کی۔

"ہاں...... ہے لیکن...... ہم...... میں تو وہ......"

"تم یہاں ہسپتال میں پستول لے کر کیوں آئے؟" یاری خان نے اُسے ٹوکتے ہوئے سوال کیا۔ "جب کہ ہماری کسی کے ساتھ دشمنی بھی نہیں ہے"۔

"آپ بھول رہے ہیں لالہ!" وہ وقتی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے بولا۔ "ہمارے یہاں دوست اور دشمن کا پتا نہیں چلتا، جیسے یہ گارڈ بالکل غیر متوقع طور پر میرا دشمن بن گیا ہے اور مجھ پر اتنا سنگین الزام لگا رہا ہے کہ دل چاہتا ہے اسے گولی مار دوں"۔

"بکواس مت کرو"۔ یاری خان نے اُسے ڈانٹا اور پھر گارڈ سے معذرت کرتے ہوئے بولا۔ "دوست! اس کی جگہ میں آپ سے معافی چاہتا ہوں، دراصل اس کا ذہنی توازن ٹھیک نہیں ہے کبھی کبھار یہ ایسی اُلٹی سیدھی حرکتیں کرتا رہتا ہے"۔

گارڈ بولا۔ "کوئی بات نہیں صاب! بس آپ ذرا اس سے محتاط رہیں ورنہ کسی دن نقصان اُٹھا بیٹھیں گے، پاگل کا کوئی بھروسا نہیں ہوتا"۔

"مجھے...... مجھے پاگل کہتا ہے...... تیری تو میں......"

"صمد خان گارڈ کو ایک گندی گالی دیتے ہوئے آگے بڑھا مگر یاری خان نے اُسے پکڑ لیا۔

"یہ کیا بے وقوفی ہے؟" یاری خان چلایا۔ "تمہیں یہاں تماشا لگانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، چلو خالہ کے پاس چلتے ہیں"۔

"آپ اور گل جاؤ، مجھے ایک کام ہے"۔ اُس نے ناگوار انداز میں جواب دیا اور ہسپتال کے بیرونی گیٹ کی طرف چل پڑا۔

☆☆☆

بالکل غیر متوقع طور پر کمرے میں ایک بلند قامت، وجیہہ و شکیل نوجوان داخل ہوا اور داؤد خان اپنی سرگزشت سناتے سناتے اچانک خاموش ہو گیا۔ میں جو اُس کی کہانی کے سحر میں کھویا ہوا تھا معاً ٹرانس کی کیفیت سے باہر نکل آیا۔ اب میری نگاہیں نووارد کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ مجھے دیکھ کر وہ دیدہ زیب انداز میں مسکرایا، آگے بڑھا اور مجھ سے گرم جوشی کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے بولا۔

"شیر دل خان! میں تم سے ملنے کا بہت متمنی تھا۔ میرا نام عدنان حیدر چودھری ہے اور تعلق گجرات سے ہے"۔

"لیکن جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے قطعی اجنبی ہیں"۔ میں نے اُلجھن آمیز انداز میں جواب دیا۔

"بالکل"۔ اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "اس

سے مجھے انکار نہیں ہے مگر جب تم میری داستانِ حیات سنو گے تو میں تجھے قطعی اجنبی نہیں لگوں گا...... دراصل میرا، داؤد خان کا اور تمہارا دشمن ایک ہی شخص ہے"۔

"میں سمجھا نہیں...... تم کہنا کیا چاہتے ہو؟" میں مزید اُلجھ گیا۔

"شیر دل! یہ ٹھیک کہتا ہے"۔ داؤد خان نے مداخلت کی۔ "تم اس کی کہانی سن لو، میرا دل کہتا ہے کہ تم اس کی کہانی سن کر ایک بہت بڑی اُلجھن سے آزاد ہو جاؤ گے"۔

"مگر میں تو کسی ایسی اُلجھن میں گرفتار نہیں ہوں"۔ میں نے بلا سوچے سمجھے جواب دیا۔

"کیا تم اُس لڑکی کو بھول گئے ہو؟" وہ بولا۔ "جس کی تصویر تم نے اخبار میں لگوائی تھی؟"

"اُسے میں کیسے بھول سکتا ہوں"۔ میں نے کہا۔

"وہ تو مجھے ہر رات خواب میں دکھائی دیتی ہے"۔

"تو پھر عدنان حیدر کی کہانی سن لو تمہاری اُلجھن دور ہو جائے گی"۔

"ٹھیک ہے"۔ میں نے بادلِ نخواستہ اثبات میں سر ہلایا تو عدنان حیدر ممنون انداز میں میری طرف دیکھنے لگا۔

"عدنان حیدر! شروع ہو جاؤ"۔ میں نے کہا۔ "مگر پلیز اپنی کہانی جلد سمیٹنے کی کوشش کرنا کیونکہ ابھی داؤد خان کی داستانِ حیات بھی باقی ہے"۔

"او کے"۔ اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "میری کہانی کوئی اتنی زیادہ طویل نہیں ہے"۔ اتنا کہہ کر وہ چند لمحوں کے لیے کھو سا گیا اور پھر عدنان حیدر نے جو واقعات سنائے تھے، مجھے یقین ہے کہ قارئین سن کر بے حد محظوظ ہوں گے۔ عدنان حیدر کی کہانی میں دلچسپی کے تمام لوازمات موجود ہیں اور سب سے اہم بات یہ ہے اُس کی کہانی نے میرے خوابوں کا عقدہ کچھ اس طرح کھولا کہ آج برسوں بیت جانے کے باوجود مجھے اُس کی کہانی نہیں بھولتی۔ یہ آپ کو عدنان حیدر کی داستان پڑھ کر معلوم ہوگا۔

☆☆☆

"انسان احساسات و جذبات کا مجموعہ ہے۔ ان میں سے ایک طاقتور ترین جذبہ بھوک ہے جسے پیٹ کی آگ بھی کہتے ہیں"۔ کلاس روم میں پروفیسر ارشد زمان کی آواز گونج رہی تھی۔ پوری کلاس ہمہ تن گوش تھی۔ طلباء وطالبات کی نگاہیں پروفیسر کے چہرے پر مرتکز تھیں۔ پروفیسر ارشد زمان پوری یونیورسٹی میں اپنے پُر مغز، مدلل اور دلچسپ لیکچرز کی وجہ سے مشہور تھا۔ وہ کسی بھی موضوع پر بلا تکان بولتا تھا اور اُس کے بولنے کا انداز مسحور کن تھا۔ سٹوڈنٹس پوری دلجمعی اور شوق کے ساتھ لیکچر سنا کرتے تھے۔ بلاشبہ وہ پوری یونیورسٹی میں سٹوڈنٹس کا پسندیدہ پروفیسر تھا۔ چنانچہ اس پسندیدگی نے اُسے کسی حد تک مغرور بنا دیا تھا۔

"دنیا میں ایسے لاتعداد واقعات رونما ہو چکے ہیں"۔ پروفیسر لیکچر جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "جب کسی انسان نے اپنی بقا کے لیے اپنے ہی جیسے انسان کا گوشت کھانے سے بھی دریغ نہیں کیا۔ ایک بھوکے انسان کے سوچنے سمجھنے کی سب صلاحیتیں سلب ہو جاتی ہیں۔ بھوک ہر انسانی جذبے پر غالب آ جاتی ہے۔ معروف شاعر ساحر لدھیانوی کا ایک مصرع ہے۔ 'بھوک آداب کے سانچے میں نہیں ڈھل سکتی' اپنی بھوک مٹانے کے لیے انسان نے......"

"بھوک سے بھی طاقتور ترین انسانی ایک جذبہ ہے جو عشق کہلاتا ہے۔" معاً درمیانی نشستوں سے ایک لڑکے کی آواز آئی اور پروفیسر کی بات ادھوری رہ گئی۔

"اوہ...... عدنان حیدر صاحب! یہی نام ہے نا تمہارا؟" پروفیسر کا انداز سوالیہ مگر لہجے میں طنز تھا۔

''یس سر''۔ عدنان نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''آپ کو اچھا لگتا ہے تو آپ رکھ لیں، میں کوئی اور اچھا سا نام ڈھونڈ لوں گا''۔

کلاس روم میں ہنسی کی آواز گونجنے لگی، جسے پروفیسر نے نظرانداز کر دیا۔ وہ چند لمحے عدنان حیدر کو گھورتا رہا پھر طنزاً بولا۔

''میں نے سنا ہے کہ تمہارا باپ ایک ارب پتی ہے اگر یہ بات سچ ہے تو پھر تمہیں بھوک کا تجربہ ہو ہی نہیں سکتا۔ تاہم عشق ومحبت کے تجربے کے بارے میں کچھ بھی کہنا مشکل ہے۔ شاید یہ تجربہ تمہیں ہو چکا ہو یا پھر ابھی ابتدائی مراحل میں ہو...... بہرکیف میں اتنا جانتا ہوں کہ خالی پیٹ انسان محبت تو کیا خود کو بھی بھول جاتا ہے..... محبت کی اوقات ہی کیا ہے بھوک کے سامنے''۔

''اوقات ہے سر!'' وہ لفظ اوقات پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ''ہاں، آپ کی نگاہوں میں نہ ہو تو یہ اور بات ہے''۔

''لگتا ہے برخوردار کو نئی نئی محبت ہوئی ہے''۔ پروفیسر نے برجستہ کہا اور تمام کلاس بے ساختہ ہنسنے لگی۔

''نہیں سر! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ جذبہ تو قسمت والوں کو عطا کیا جاتا ہے۔ وہ جن کے پاس ظرف ہوتا ہے، کم ظرف کبھی محبت کی قدر نہیں کرتے''۔ اُس نے جھٹ سے جواب دیا۔

پروفیسر کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ عدنان کا جواب اُس کے لیے کسی طمانچے سے کم نہیں تھا۔ لمحہ بھر کے لیے اُس کے چہرے پر ذلت کا احساس اُبھرا مگر دوسرے ہی لمحے معدوم ہو گیا۔ گرمیوں کا موسم ہونے کی وجہ سے اُس نے ہاف آستین کی شرٹ پہن رکھی تھی۔ اُس کی دونوں کہنیوں کی ہڈیاں جوڑ سے قدرے اُبھری ہوئی تھیں۔ غور سے دیکھنے پر صاف معلوم ہوتا تھا جیسے کہنیوں کی ہڈیاں ٹوٹنے کے بعد دوبارہ جوڑی گئی ہوں۔

پروفیسر نے سر جھکا کر کہنیوں کی طرف دیکھا اور پھر سر اُٹھا کر بولا۔ ''ہم بات طاقتور ترین انسانی جذبے کی کر رہے تھے۔ نہ کہ ظرف اور کم ظرفی کی..... اب بات صرف موضوع پر ہو گی''۔

''میں کہاں موضوع سے ہٹا ہوں سر؟'' عدنان نے احتجاج کیا۔ ''آپ نے خود ہی موضوع کو پس پشت ڈال دیا ہے''۔

''او کے، میں تم سے متفق ہوں''۔ پروفیسر نے سر ہلایا۔ ''چلو، اب ثابت کرو کہ محبت بھوک سے کس طرح طاقتور ہے؟''

''سر! اسے ثابت کرنے کی کیا ضرورت ہے؟'' وہ بولا۔ ''یہ تو ثابت شدہ حقیقت ہے۔ کیا آپ نیوز پیپر نہیں پڑھتے، ٹی وی نہیں دیکھتے؟ روزانہ کتنے ہی لوگ محبت میں ناکام ہونے کے بعد خودکشی کر لیتے ہیں جب کہ کوئی بھوکا کبھی کبھار ہی ایسا قدم اُٹھاتا ہے''۔

''کیا تم محبت میں ناکام ہونے کے بعد خودکشی کرنے کی ہمت کر سکتے ہو؟'' پروفیسر نے مذاق کے انداز میں پوچھا۔

''ہو سکتا ہے..... لیکن فی الحال میں کسی سے محبت نہیں کرتا''۔

''کیا تم ماں باپ اور بہن بھائیوں سے محبت نہیں کرتے؟'' پروفیسر نے چڑانے والے انداز میں سوال کیا۔

''آپ پھر موضوع سے ہٹ رہے ہیں سر!'' وہ احتجاجاً بولا۔ ''محبت محبت میں فرق ہوتا ہے۔ ماں باپ اور بہن بھائیوں سے انسان اور طرح کی محبت کرتا ہے جب کہ محبوب سے اور طرح کی''۔

''اوہ.....!'' پروفیسر نے مسکرا کر سر ہلایا۔ ''چلو یہ بتا دو کہ محبوب سے انسان کس طرح کی محبت کرتا ہے؟''

''سر! مجھے امید ہے کہ آپ مجھ سے یہ بات جانتے

ہوں گے"۔ اُس نے سنجیدہ انداز میں جواب دیا اور کلاس روم میں ایک بار پھر ہنسی کی آواز گونج اُٹھی۔

ایک ثانیے کے لیے عدنان نے اپنے کلاس فیلوز کی طرف دیکھا تو کچھ اُسے مسکراتی ہوئی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے جبکہ بعض کی نظروں میں اُس کے لیے ناپسندیدگی تھی۔ اُس سے چند نشستیں دور بیٹھی ایک لڑکی اُسے قدرے غصیلے انداز میں گھور رہی تھی۔ اُس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں لڑکی سے استفسار کیا تو لڑکی نے اُسے چپ رہنے کا اشارہ کر دیا۔ مگر اس دوران پروفیسر اُسے مخاطب کر چکا تھا۔

"کیوں بھئی! میں بھلا تم سے بہتر کس طرح جان سکتا ہوں...... کیا میں نے عشق کی دُکان کھول رکھی ہے؟"

"سر! میری چھٹی حس کہتی ہے کہ آپ نے نوجوانی میں ضرور کسی نہ کسی سے محبت کی ہوگی...... ورنہ آپ محبت سے نفرت کیوں کرتے؟"

پروفیسر کی رنگت ایک مرتبہ پھر سے پھیکی پڑ گئی۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی نے اُس کی دُکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔ خیالات کی ایک یلغار تھی جو اُسے گھیر چکی تھی اور ماضی کی ایک فلم سی اُس کے دماغ میں چل پڑی تھی۔ وہ اب اُس وقت کو کوس رہا تھا جب اُس نے عدنان حیدر جیسے منہ پھٹ لڑکے سے بحث چھیڑی تھی۔ عدنان انجانے میں اُسے چرکے پر چرکا لگائے جا رہا تھا لیکن وہ بے بس تھا۔ عدنان کو کچھ بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔ پروفیسر کو عشق و محبت سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ اُس کی نگاہوں میں محبت ایک بے کارترین مشغلہ تھا جو فارغ لوگوں کو ہی راس آتا تھا۔

"عدنان حیدر!" وہ دوبارہ موضوع پر آتے ہوئے بولا۔ "تمہیں معلوم ہے کہ بھوکا انسان خدا کو بھی بھول جاتا ہے۔ محبت کی تو کوئی حیثیت نہیں ہے بھوک کے سامنے"۔

"نہیں سر!" اُس نے نفی میں سر ہلایا۔ "اس حقیقت سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ خدا کو ہمیشہ پیٹ بھرے ہی بھولتے ہیں، بھوکے تو پل پل اُسے یاد کرتے ہیں"۔

وقتی طور پر اُس نے پروفیسر کو لاجواب کر دیا تھا۔ اُس کے کلاس فیلوز اب اُسے ستائشی انداز میں دیکھ رہے تھے۔ مگر محبت اور بھوک کی اس بحث میں پروفیسر کو محبت کی جیت کسی صورت میں بھی منظور نہیں تھی۔ وہ بولا۔

"بھوک نے دنیا میں کئی بار انقلاب برپا کیے ہیں لیکن محبت نے آج تک کچھ بھی نہیں کیا، سوائے رونے دھونے اور خودکشیاں کرنے کے۔ تم ایسی ایک بھی مثال پیش نہیں کر سکتے جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ محبت بھوک کے مقابلے میں طاقتور ہوتی ہے"۔

"میں ثابت کر سکتا ہوں"۔ وہ پُرجوش ہو گیا۔ "آج سے چودہ صدیاں قبل ایک انقلاب برپا ہوا تھا۔ جس نے اُس وقت کی دنیا کا نقشہ بدل ڈالا تھا اور ہم سب جانتے ہیں کہ وہ انقلاب بھوک کا مرہونِ منت نہیں تھا۔ اگر غیر جانبداری سے دیکھا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اُس عظیم انقلاب کو برپا کرنے میں محبت نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ رسول ﷺ کی خدا سے محبت اور آپ ﷺ کے پیروکاروں کی آپ ﷺ سے محبت ہی اُس عظیم انقلاب کی سب سے بڑی وجہ تھی لیکن شاید آپ بھی اُن لبرل مائنڈڈ لوگوں کی طرح یہ بات تسلیم نہیں کریں گے جو اس عظیم انقلاب کا سبب عربوں کی بھوک اور ہوسِ ملک گیری بتاتے ہیں"۔

"یہ لبرل لوگ کچھ غلط تو نہیں کہتے میاں!" پروفیسر نے جواب دیا۔ "اب تمہاری طرح ہر کوئی حقیقت سے انکار تو نہیں کر سکتا"۔

"سر! میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ بھوک جان لیتی ہے جبکہ محبت جان دیتی ہے اور یہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے کہ جان لینا آسان ہوتا ہے مگر جان دینا دنیا کا مشکل

ترین کام ہے۔ جان وہی لوگ دیتے ہیں جن کے دِل میں عشق کی شمع روشن ہوتی ہے اور جان لینے والے کبھی بھوک تو کبھی نفرتوں کے مارے لوگ ہوتے ہیں۔ محبت تاج محل تعمیر کرتی ہے تو نفرت بابری مسجد شہید کرتی ہے۔ محبت عظیم ہوتی ہے سر! اور عظیم ایسی کہ کبھی نہ مٹنے والی جبکہ بھوک پیٹ بھرتے ہی مٹ جاتی ہے۔ سیر ہونے کے بعد بھوک کا احساس تک باقی نہیں رہتا۔ بھوک کی عشق کے سامنے کوئی حیثیت ہی نہیں ہے''۔ اُس نے جذباتی لہجے میں جواب دیا تو پوری کلاس نے باقاعدہ تالیاں بجا کر اُسے داد دی۔

پروفیسر ارشد زمان ایک بار پھر لاجواب ہو کر رہ گیا۔ مگر وہ شکست ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ بیس برس قبل ہی وہ محبت پر لعنت بھیج چکا تھا۔ چنانچہ تالیوں کا شور تھمتے ہی پروفیسر نے کہا۔

''محبت بھی تو بھوک ہی کی ایک قسم ہے۔ بدن کے حصول کے بعد اکثر محبتیں ہوا میں تحلیل ہو جاتی ہیں''۔

''محبت اگر بدن کے حصول تک محدود ہوتی تو تاج محل کبھی تعمیر نہ ہوا ہوتا سر! اور ایک ماں اپنے بچے سے محبت بدن کے حصول کے لیے تو نہیں کرتی...... مان لیں سر! کہ محبت سے بڑا کوئی جذبہ نہیں ہے۔ بھوک آپے سے باہر ہو کر خونی انقلاب لاتی ہے جبکہ محبت دِلوں کو تسخیر کرتی ہے اور دائمی انقلاب کا باعث بنتی ہے۔ کائنات کی ساری رنگینیاں محبت ہی کے دم سے ہیں۔ بقول شاعر...... رونق بزمِ جہاں ہے تو اسی کے دم سے -- اور کچھ بھی نہیں دنیا میں محبت کے سوا''۔

''تم کچھ بھی کہو مگر میں تم سے متفق نہیں ہوں'' پروفیسر بولا۔ ''میں اب بھی یہی کہوں گا کہ بھوک طاقتور ترین احساس ہے۔ محبت میں ہارا ہوا انسان زندہ رہ سکتا ہے لیکن بھوک کا مارا ہوا...... ناممکن...... کبھی بھی زندہ نہیں رہ سکتا''۔

اسی دوران پیریڈ اختتام پذیر ہو گیا اور یہ بحث ادھوری رہ گئی۔ پروفیسر نے چبھتی ہوئی نگاہوں سے عدنان کی طرف دیکھا اور پھر کلاس روم سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

''آج تم نے اچھا نہیں کیا۔'' عاتکہ نے گھور کر اُسے دیکھا اور پھر شکایتی انداز میں بولی۔ ''میں نے تمہیں منع بھی کیا تھا لیکن تم نے پھر بھی پاپا کی انسلٹ کر دی۔ کیوں کرتے ہو تم ایسا، آخر پاپا سے تمہاری کیا دشمنی ہے؟''

''میں نے کچھ غلط نہیں کیا عاتکہ!'' اُس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''یہ تو صرف ایک بحث تھی جو بغیر کسی نتیجے کے ختم ہو گئی۔ ورنہ تم جانتی ہو کہ میں تمہارے پاپا کی بہت عزت کرتا ہوں''۔

''میں جانتی ہوں عدی! تمہیں شاید نہیں معلوم کہ پاپا کو محبت کے نام سے سخت چڑ ہے بلکہ اُنہیں تو محبت کا نام سننا بھی گوارا نہیں ہے''۔ عاتکہ کی بات سن کر عدنان کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

اُس وقت وہ دونوں ایک معروف ریسٹورنٹ میں بیٹھے کولڈ ڈرنکس سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ اُن کی دوستی کو تقریباً ایک سال کا عرصہ ہونے والا تھا مگر بات ابھی تک صرف دوستی تک ہی محدود تھی۔ پسندیدگی کے مراحل تک نہیں پہنچی تھی۔ یا اگر پہنچ بھی چکی تھی تو اس کا اظہار ابھی تک کسی جانب سے بھی نہیں ہوا تھا۔ البتہ اُن کی دوستی واقعی بے مثال تھی۔ دونوں ایک دوسرے کا دل سے احترام کرتے تھے۔ جس کا اظہار وہ ایک دوسرے سے گاہے بگاہے کرتے رہتے تھے۔

عاتکہ زمان پروفیسر ارشد زمان کی اکلوتی بیٹی تھی جبکہ عدنان حیدر کا تعلق گجرات کی ایک جاگیردار فیملی سے تھا۔ اُس کا باپ فرمان حیدر چوہدری ایک وسیع و عریض جاگیر کا مالک تھا اور روایتی جاگیرداروں کی طرح ملکی

سیاست میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا رہتا تھا۔ گو کہ اُس نے خود کبھی بھی عملی طور پر سیاست میں حصہ نہیں لیا تھا۔ تاہم اپنے چھوٹے بھائی قربان حیدر چودھری کو وہ کئی بار صوبائی اسمبلی کی نشست پر بطور اُمیدوار کھڑا کر چکا تھا۔ مگر جیت ایک بار بھی قربان حیدر کے حصے میں نہیں آئی تھی۔

''یہ پروفیسر بھی ناں! بس عجیب چیز ہیں۔ کبھی انہیں چودھریوں سے کے نام سے چڑ ہو جاتی ہے تو کبھی محبت کے نام سے۔ پتا نہیں ان کی پرابلم کیا ہے؟''

''تم نے پاپا کو چیز کہا''۔ عاتکہ نے آنکھیں نکالیں۔ ''وہ تمہیں چیز نظر آتے ہیں...... کچھ شرم وحیا ہے کہ نہیں؟''

''شکر کرو صرف چیز کہا ہے۔ عجیب نہیں کہا''۔ اُس نے ہنسی ضبط کرتے ہوئے جواب دیا۔

''جس دن پاپا کو پتا چل گیا ناں کہ تم بھی چودھری ہی ہو تو اُس دن تمہیں معلوم ہوگا کہ وہ کیا چیز ہیں؟''

''نہیں بھئی! یہ بات اُنہیں پتا نہیں چلنا چاہیے۔ میں آئندہ اُنہیں چیز نہیں کہوں گا۔ آئی ایم رئیلی سوری''۔ اُس نے باقاعدہ کانوں کو چھوتے ہوئے پراسں کیا تو عاتکہ کھل اُٹھی۔

''عدی!'' وہ کولڈ ڈرنک کا سپ لیتے ہوئے ایک دم سنجیدہ ہوگئی۔ ''یہ یونیورسٹی میں ہم دونوں کا فائنل ایئر ہے ناں؟''

''یس''۔ اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''کوئی پریشانی ہے کیا؟''

''مطلب......'' اُس نے افسردہ لہجے میں کہا۔ ''ہم دونوں چند ماہ کے بعد ہمیشہ کے لیے جُدا ہو جائیں گے؟''

''عاتکہ! ہم یہاں انجوائے کرنے کے لیے آئے ہیں۔ کامیاب انسان وہی ہوتا ہے جو ہر قسم کے حالات میں خوش رہنا سیکھ لیتا ہے۔ جو آج سے لطف اندوز ہوتا جانتا ہے اُسے آنے والے کل کی فکر کبھی پریشان نہیں کرتی...... یہ تمہیں بیٹھے بٹھائے کیا ہوگیا ہے؟''

''یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے عدی!''۔ وہ مصر ہوئی۔ ''تم بات کو ٹالنے کی کوشش کررہے ہو''۔

''تو کیا کہوں تم بتاؤ ناں؟'' اُس نے اُلٹا سوال کر دیا۔

''محبت کی فیور میں اس قدر بڑھ چڑھ کر بولنے والا انسان اتنا انجان ہوسکتا ہے؟''

''اوہ، آئی سی...... مطلب تم سنجیدہ ہو!'' وہ حیران رہ گیا۔

''ہاں......'' عاتکہ نے اقرار میں سر ہلایا۔

''میں...... میں تم سے......''

''پلیز عاتکہ!'' اُس نے جھنجلا کر قطع کلامی کی۔ ''میں اس موضوع پر کوئی بات نہیں سننا چاہتا''۔

''لیکن کیوں؟'' وہ مستفسر ہوئی۔

''بس ہم صرف اچھے دوست ہیں اور ہمیشہ دوست رہیں گے''۔

''مگر جب تم چند ماہ کے بعد ہمیشہ کے لیے چلے جاؤ گے تو کیا یہ دوستی قائم رہ سکے گی؟''

''میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ یہیں کراچی ہی میں رہوں گا''۔

''یہ بات تو تم مجھے خوش کرنے کے لیے کہہ رہے ہو ورنہ میں جانتی ہوں کہ تمہارے دل میں میرے لیے......''

''ڈونٹ بی سلی عاتکہ!'' اُس نے تیز لہجے میں بات کاٹی۔ ''میں تمہاری بہت قدر کرتا ہوں۔ میرے دل میں تمہارا ایک خاص مقام ہے اور وہ خاص مقام شاید میں کسی کو بھی نہ دے سکوں لیکن......'' وہ کچھ کہتے کہتے چپ ہوگیا۔

''لیکن کیا؟'' وہ مضطرب ہوگئی۔

"ابھی میں نے ازدواجی زندگی کے بارے میں کچھ بھی نہیں سوچا" عدنان نے بے نیازی سے جواب دیا۔ "اور پھر یہ ضروری بھی تو نہیں کہ انسان جس سے پیار کرے شادی بھی اُسی سے کر لے۔ کیا محبت کرنے کے لیے شادی کرنا لازمی شرط ہے؟"

عاتکہ کے دل پر ایک چوٹ سی لگی۔ لمحہ بھر کے لیے اُس کا چہرہ متغیر ہو گیا مگر اُسے چہرے کے تاثرات چھپانے میں ملکہ حاصل تھا۔

"ارے گھونچو! میں تو مذاق کر رہی تھی، تم تو سیریس ہی ہو گئے"۔ وہ ایک دم کھلکھلا کر بولی۔ "میں جانتی ہوں کہ پاپا مجھے زہر دینا پسند کر لیں گے مگر کسی چودھری کے ساتھ مجھے دلہن بنا کر رخصت کرنے کے لیے راضی نہیں ہوں گے"۔

"ہاں یہ بات تو ہے"۔ وہ قدرے پھیکا پڑ گیا۔ "تمہارے پاپا کی چودھریوں سے نفرت سمجھ میں نہیں آتی"۔

"تمہیں کیا دُکھ ہے اس بات کا؟" اُس نے انجانی سی خوشی محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں تو"۔ وہ بے تاثر آواز میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "یہ تمہارے پاپا کا ذاتی معاملہ ہے۔ مجھے بھلا اس میں کیا دلچسپی ہو سکتی ہے اور دکھ ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اُن کی مرضی جس سے نفرت کریں، جس سے پیار کریں..... میرا کیا لینا دینا؟"

اُس کی وقتی خوشی کافور بن کر اُڑ گئی۔ دل مرجھا سا گیا تھا مگر لبوں پر بدستور ہنسی رقصاں تھی۔ عدنان حیدر بہت گہرا آدمی تھا۔ کسی اُلجھی ہوئی پہیلی کی طرح سمجھ میں نہ آنے والا۔ ایسے ہی وقت عاتکہ کو ایک شعر شدت کے ساتھ یاد آنے لگا مگر وہ اُسے زبان پر لانے کی ہمت نہ کر سکی بس دل ہی دل میں دوہرا کر رہ گئی۔

ہاتھ اُلجھے ہوئے ریشم میں پھنسا بیٹھے ہیں

بہترین دوا

حکیم لقمان نے کسی کے پوچھنے پر بتایا۔ "میں نے زندگی میں مختلف دواؤں سے لوگوں کا علاج کیا مگر اس طویل تجربے کے بعد میں نے سیکھا کہ انسان کے لئے سب سے بہترین دوا محبت اور عزت ہے"۔

اب بتا، کون سے دھاگے کو جدا کس سے کریں؟

"اے کہاں کھو گئی ہو؟" عدنان نے اُس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرایا۔

"پاپا کے متعلق سوچ رہی تھی"۔ اُس نے سفید جھوٹ بولا مگر چہرے کے تاثرات سے اس جھوٹ کا بھرم قائم رکھا۔

"پاپا سے کبھی پوچھو ناں! کہ وہ چودھریوں سے نفرت کیوں کرتے ہیں؟"

عاتکہ نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا اور سوچا کیا یہ وہی شخص ہے جو لمحے بھر پہلے اس بات کو پاپا کا ذاتی معاملہ کہہ رہا تھا۔ تاہم اپنی اس سوچ کو وہ لفظوں کا جامہ پہنانے سے قاصر رہی اور ٹالنے والے انداز میں بولی۔

"کئی بار کوشش کر چکی ہوں مگر پاپا ہمیشہ میرے اس سوال پر چپ سادھ لیتے ہیں، کچھ بتاتے ہی نہیں"۔

"اور محبت کے نام سے کیوں چڑتے ہیں؟" عدنان نے ہنس کر پوچھا۔

"عدی! تم پاگل تو نہیں ہو" وہ بولی۔ "بھلا کوئی بیٹی اپنے باپ سے اس قسم کا سوال پوچھ سکتی ہے؟"

"کیوں..... کیا ایسا سوال پوچھنا جرم ہے، یا پھر تم اُن سے ڈرتی ہو؟"

"نہیں"۔ اُس نے منفی انداز میں سر ہلایا۔ "بس میں اُن سے پوچھنا ہی نہیں چاہتی۔ کوئی بھی مشرقی لڑکی

اپنے باپ سے ایسا سوال پوچھنے کی جسارت نہیں کر سکتی"۔

"او کے، تو پھر میں ہی پوچھ لوں گا، بس موقعہ ملنے کی دیر ہے"۔

"وہ تمہیں کچھ بھی نہیں بتائیں گے بلکہ اُلٹا تمہاری بے عزتی کر دیں گے"۔

"نہ بتائیں مگر میں اُن سے پوچھوں گا ضرور، بے عزتی ہوتی ہے تو ہونے دو"۔ عدنان حیدر نے اٹل انداز میں جواب دیا۔

"او کے، یہ حسرت بھی پوری کر لینا مگر یہ یاد رکھنا کہ آئندہ تم نے پاپا سے کسی بھی موضوع پر بحث نہیں کرنی ورنہ ہماری دوستی میں دراڑ پڑ جائے گی"۔ اُس نے اُٹھتے ہوئے جواب دیا۔

"مجھے دھمکی دے رہی ہو؟" عدنان نے جیب سے والٹ نکالتے ہوئے پوچھا۔

"حقیقت بتا رہی ہوں۔ بس پاپا سے تم بحث مت کیا کرو مجھے اچھا نہیں لگتا"۔

"میری جیت بُری لگتی ہے؟" اُس نے ناراض انداز میں سوال کیا۔

"نہیں، پاپا کو ہارتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی"۔

عدنان نے والٹ سے ایک نوٹ نکال کر بل چکایا اور پلٹ کر بولا۔ "میں اگر بحث میں تمہارے پاپا سے ہار جایا کروں تو کیا تمہیں اچھا لگے گا؟"

"پتا نہیں"۔ وہ کشمکش کا شکار ہو گئی۔ "اس بارے میں شاید میں کچھ بھی نہ کہہ سکوں"۔ اس دوران وہ ریسٹورنٹ سے نکل کر گاڑی کے قریب پہنچ چکے تھے۔

"جب دو شخص آپس میں کسی موضوع پر بحث کرتے ہیں تو اُن میں سے کسی ایک کو ہارنا پڑتا ہے"۔ عدنان نے کہا اور سوالیہ انداز میں پوچھا۔ "سچ بتاؤ، تمہیں کس کی جیت اچھی لگتی ہے، میری یا پھر اپنے پاپا کی؟"

"کسی کی بھی نہیں"۔

"یہ تو کوئی جواب نہ ہوا"۔ وہ مصر ہوا۔

"عدی! سانڈوں کی لڑائی میں پودے کچلے جاتے ہیں"۔ عاتکہ نے چڑ کر کہا اور وضاحت کرنے لگی۔ "تیری اور پاپا کی بحث سے تکلیف مجھے پہنچتی ہے۔ میں ایک کی ہار اور دوسرے کی جیت کی خوشی ایک ہی وقت میں کیسے منا سکتی ہوں؟ میرے سینے میں ایک ہی دل ہے جو تمہاری اور پاپا کی یکساں قدر کرتا ہے۔ پلیز! یا تو پاپا سے بحث کرنا چھوڑ دو یا پھر مجھ سے اس قسم کے سوال مت پوچھا کرو"۔ اُس نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

"چلو بیٹھو"۔ وہ گاڑی کی کھڑکی کھولتے ہوئے بولا۔ "آئندہ میں خیال رکھوں گا"۔

وہ چپ چاپ گاڑی میں بیٹھ گئی۔ عدنان نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے ریورس گیئر لگایا، گاڑی کا رخ تبدیل کیا اور پھر دوبارہ گیئر لگاتے ہوئے گاڑی آگے بڑھا دی۔

☆☆☆

پروفیسر ارشد زمان سخت جھنجلایا ہوا تھا۔ اُسے عدنان حیدر پر بے حد غصہ آ رہا تھا۔ زندگی میں پہلی بار کسی سٹوڈنٹ نے اُسے یوں چیلنج کیا تھا۔ اس سے قبل کبھی کسی نے لیکچر کے دوران اُس سے بحث نہیں کی تھی۔ پروفیسر کو اپنی فصاحت و بلاغت پر بڑا مان تھا مگر آج یہ مان ٹوٹ گیا تھا اور یہ مان توڑنے والا کوئی دانشور نہیں بلکہ ایک عام سا سٹوڈنٹ تھا۔ وہ اگر کوئی پروفیسر، دانشور یا تجزیہ نگار ہوتا تو شاید پروفیسر زمان کو اس قدر دُکھ نہ ہوا ہوتا۔ وہ خود کو لفظوں کا کھلاڑی سمجھتا تھا مگر ایک اناڑی نظر آنے والے نوجوان نے اُسے کلین بولڈ کر دیا تھا۔ اپنے پاس معلومات کا خزانہ رکھنے کے باوجود وہ اپنے ایک شاگرد سے بُری طرح ہار گیا تھا۔

ذلت کا احساس کسی زہریلے بچھو کی طرح اُسے ڈنک مار رہا تھا۔ اُس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ ابھی جا کر عدنان حیدر کو شوٹ کر دے مگر کسی دشمن سے بدلہ چکانے کے لیے جو ہمت درکار ہوتی ہے وہ اُس کے پاس نہیں تھی۔ وہ فطرتاً انتہائی بزدل انسان تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں سے ڈر جانے والا، منٹوں میں مدِمقابل سے دب کر ہتھیار پھینک دینے والا۔ اپنی اس بزدلی کے ہاتھوں اُس نے زندگی میں کئی بار ناقابلِ تلافی نقصانات اُٹھائے تھے لیکن ان نقصانات کا الزام وہ ہمیشہ مخالف فریق پر لگا دیتا تھا۔ بچپن سے آج تک اُس نے کبھی اپنی غلطی تسلیم نہیں کی تھی۔ وہ ہمیشہ خود کو ہی حق بجانب سمجھا کرتا تھا۔ اسی ہٹ دھرمی کے سبب وہ کئی رشتوں اور مخلص دوستوں سے ہاتھ دھو چکا تھا اور پھر ایک دن ایسا ہوا کہ اپنی ہر بات کو حرفِ آخر سمجھنے والا پروفیسر ارشد زمان بھری دنیا میں تنہا رہ گیا سوائے اپنی اکلوتی بیٹی عاتکہ زمان کے، اُس کے پاس کوئی رشتا رہا اور نہ ہی دوست۔ بس اب عاتکہ ہی اُس کی زندگی کا مقصد و محور تھی۔ وہ بچپن ہی سے پروفیسر کا ہر حکم بلا چوں و چراں مانتی چلی آ رہی تھی۔ پروفیسر اُس کے لیے آئیڈیل باپ تھا۔ اُس نے کبھی بھی کسی معاملے میں باپ سے بحث نہیں کی تھی۔

عاتکہ کی ماں عائشہ بیگم تو پروفیسر جیسے شخص کے ساتھ بمشکل دس برس ہی گزار سکی تھی اور یہ دس برس بھی اُس بچاری نے روتے اور کڑھتے ہوئے گزارے تھے۔ پروفیسر نے ازدواجی زندگی کے دوران اُسے سکھ کم اور دکھ زیادہ دیئے تھے۔ پروفیسر کے مقابلے میں وہ کم پڑھی لکھی تھی اس لیے ہمیشہ بحث میں ہار جایا کرتی تھی۔ پروفیسر اپنی ہر غلطی اُس کے سر تھوپ دیا کرتا تھا اور جب وہ اپنے دفاع میں کچھ بولنے کی کوشش کرتی تو پروفیسر اپنی دانشورانہ گفتگو سے اُسے چپ کرا دیا کرتا تھا۔ وہ پروفیسر کے منطقی دلائل کے جوابات ہی نہیں دے پاتی تھی۔

عاتکہ اُس وقت تین برس کی تھی جب عائشہ بیگم دماغی نس پھٹنے کی وجہ سے اللہ کو پیاری ہوئی۔ اُس کے مرنے کے بعد پروفیسر نے اپنی تمام تر توجہ ننھی عاتکہ پر مرکوز کر دی اُس نے بیٹی کی ہر ضرورت کا خیال رکھا اور اُسے اس قدر توجہ اور پیار دیا کہ وہ ماں کی کمی محسوس ہی نہ کر سکی۔ پروفیسر ہمیشہ بیٹی کی ہر خواہش کو مقدم سمجھتا تھا۔ حتیٰ کہ بڑی ہو کر جب عاتکہ نے عدنان حیدر سے دوستی کی تو تب بھی پروفیسر نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ عدنان ایک اچھا لڑکا تھا اور پروفیسر اُسے پسند کرتا تھا لیکن آج عدنان کے ساتھ ہونے والی بحث کے بعد پروفیسر کے خیالات تبدیل ہو چکے تھے کہ اُسے بیٹی کی خوشی سے زیادہ اپنی انا عزیز تھی۔ اب عدنان اُسے دنیا کا بدترین لڑکا لگ رہا تھا اور ایسے بدترین لڑکے سے اپنی بیٹی کی دوستی اُسے سخت تکلیف پہنچا رہی تھی۔

پروفیسر ایک اچھے خاصے شاندار گھر میں رہتا تھا اور یہ گھر اُس نے اپنی حلال کی کمائی سے تعمیر کیا تھا۔ گھر کے کام کاج کے لیے اُس نے ایک ادھیڑ عمر نوکرانی رکھی ہوئی تھی۔ فاطمہ نامی اُس عورت کو پروفیسر کے ہاں کام کرتے ہوئے طویل عرصہ ہو چکا تھا اور اب اُس کی حیثیت گھر کے ایک فرد کی سی ہو گئی تھی۔ فاطمہ کا چونکہ آگے پیچھے کوئی نہیں تھا اس لیے وہ بھی پروفیسر کے گھر کو اپنا ہی گھر سمجھتی تھی۔ مگر اتنی طویل رفاقت کے باوجود پروفیسر نے ہمیشہ اُسے ایک نوکرانی ہی سمجھا تھا۔ البتہ عاتکہ کی فاطمہ سے خوب بنتی تھی۔ عاتکہ اُسے بچپن ہی سے بُوا کہتی چلی آ رہی تھی اور فاطمہ نے بھی کبھی اُسے یہ احساس دلانے کی کوشش نہیں کی تھی کہ وہ محض ایک نوکرانی ہے۔ وہ عاتکہ کو سگی بیٹی کی طرح چاہتی تھی اور اُس کے پیار میں کسی قسم کی بناوٹ یا تصنع نہیں تھا۔ عاتکہ کے بچپن ہی سے وہ اُس کا بے حد خیال رکھتی چلی آ رہی تھی۔ وہی اُسے نہلاتی دھلاتی تھی اور کسی ماں کی طرح اُس کی ہر ضرورت کا خیال رکھتا

کرتی تھی۔

پروفیسر نے کبھی اُن دونوں کے اس رشتے پر اعتراض نہیں کیا تھا۔ عاتکہ اُس کی موجودگی میں بھی فاطمہ کو بُوا کہتی تھی۔ مگر پروفیسر کے لیے فاطمہ ہمیشہ ایک غیر عورت ہی رہی تھی۔ پروفیسر اب بھی اُسے باقاعدگی سے تنخواہ دیتا تھا۔ گو کہ اب تنخواہ لینے کو فاطمہ کا دل نہیں چاہتا تھا لیکن وہ پروفیسر کو اچھی طرح جانتی تھی اس لیے انکار کر کے وہ یہ محفوظ ٹھکانا کھونا نہیں چاہتی تھی۔ بہت عرصہ پہلے ایک بار اُس نے تنخواہ لینے سے انکار کیا تھا تب پروفیسر نے اُسے دوٹوک الفاظ میں کہا تھا۔

''فاطمہ! میں کسی کا احسان لینے کا قائل نہیں ہوں۔ میں نے تمہیں گھر میں کام کاج کے لیے رکھا ہوا ہے اگر تم تنخواہ نہیں لوگی تو پھر میں تمہیں اس گھر میں نہیں رکھ سکوں گا۔ میں کوئی اور کام والی ڈھونڈ لوں گا''۔

فاطمہ کو پروفیسر کے کہے گئے الفاظ آج بھی یاد تھے۔ اُس وقت تو اُسے پروفیسر پر بے حد غصہ آیا تھا اور شاید وہ وہاں سے چلی بھی جاتی مگر عاتکہ کی محبت نے اُسے یہ انتہائی قدم اُٹھانے سے روک دیا تھا۔ وہ بن ماں کی ایک معصوم بچی کو یوں چھوڑ کر جانے کی ہمت نہ کر سکی۔ ان گزرے برسوں کے دوران وہ پروفیسر کو اچھی طرح جان گئی تھی کہ وہ بحث کرنے والے ہر شخص کو سخت ناپسند کرتا ہے، بس اپنی کہتا ہے دوسرے کی سننا اُسے ناگوار گزرتا ہے۔

اُس دن پروفیسر جب یونیورسٹی سے گھر پہنچا تو لنچ کا ٹائم نکلنے والا تھا لیکن اُس کی بھوک اُڑ چکی تھی۔ ڈائننگ روم کا رخ کرنے کی بجائے وہ اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔ اُس کا دماغ مسلسل عدنان حیدر کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اُس کی سماعتوں میں اب بھی عدنان حیدر کے کہے گئے الفاظ گونج رہے تھے۔ ''محبت عظیم ہوتی ہے سر! عظیم...... کبھی نہ مٹنے والی جبکہ بھوک پیٹ بھرتے ہی مٹ جاتی ہے...... سیر ہونے کے بعد بھوک کا احساس تک باقی نہیں رہتا...... محبت تاج محل تعمیر کرتی ہے''۔

''ہونہہ محبت''۔ پروفیسر منہ بناتے ہوئے اُٹھ بیٹھا۔ ''تاج محل محبت نے نہیں بلکہ ایک شہنشاہ کی دولت نے تعمیر کیا تھا، اُن مزدوروں اور راج مستریوں نے تعمیر کیا تھا جن کے نام تک تاریخ یاد نہ رکھ سکی''۔

پروفیسر یوں بُرے بُرے منہ بنا رہا تھا جیسے اُس نے کونین کی گولی چبا ڈالی ہو۔ پھر یونہی کسی خیال کے تحت اُس نے عاتکہ کو پکارنا شروع کر دیا۔ چند لمحوں کے بعد عاتکہ کی بجائے فاطمہ اندر داخل ہوئی اور سلام کرنے کے بعد بولی۔

''صاحب! عاتکہ بی بی تو ابھی تک یونیورسٹی سے واپس نہیں لوٹی''۔

''کیوں؟'' پروفیسر نے چلا کر پوچھا۔ ''کیا اُس نے تمہیں لیٹ آنے کے متعلق بتایا تھا؟''

''نہیں صاحب! اُس نے ایسا کچھ نہیں بتایا تھا''۔

''میں جانتا ہوں وہ اُسی بدتمیز کے ساتھ گھوم رہی ہوگی۔ بس بہت ہو گیا، آج کے بعد اُس کے ساتھ عاتکہ کا ملنا جلنا بند''۔

''کیوں صاحب! کیا عدنان صاحب نے کچھ......''

''صاحب مت کہو، اُسے''۔ پروفیسر نے چلا کر قطع کلامی کی۔ ''ایک نمبر کا بدتمیز اور بے شرم ہے وہ...... اُسے بڑوں سے بات کرنے کی تمیز تک نہیں ہے''۔

''صاحب! کھانا لگا دوں؟'' فاطمہ نے موضوع بدل کر پوچھا۔

''کوئی ضرورت نہیں ہے''۔

''کیا مجھ سے کوئی خطا ہو گئی ہے صاحب؟'' فاطمہ نے سہم کر پوچھا۔

''بس تم جاؤ''۔ پروفیسر چلایا اور فاطمہ حیرانی اور پریشانی کی ملی جلی کیفیت میں کمرے سے باہر نکل گئی۔

پروفیسر دوبارہ بستر پر لیٹ گیا۔ اُس کا دماغ مسلسل عدنان حیدر کے متعلق سوچ رہا تھا۔ عدنان کے الفاظ کسی ہتھوڑے کی مانند اُس کے دماغ پر برس رہے تھے۔ بظاہر جسمانی طور پر وہ مکمل صحت مند انسان تھا۔ بس کبھی کبھی اُسے ہائی بلڈ پریشر کی شکایت ہو جاتی تھی۔ اُس روز عدنان حیدر سے بحث کرنے کی وجہ سے اُس کا بی پی قدرے بلند تھا رہی سہی کسر گھر میں بیٹی کی عدم موجودگی نے پوری کر دی تھی۔ وہ جوں جوں عدنان حیدر کے بارے میں سوچتا گیا۔ اُس کا غصہ بھی بڑھتا گیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اُس پر وہی کیفیت طاری ہوگئی جو بلند فشارِ خون کے مریضوں کی خاصیت ہوتی ہے۔ پہلے اُسے کنپٹیوں پر دباؤ محسوس ہوا اور دل کی دھڑکن رفتار پکڑنے لگی۔ اس کے بعد اُس کے ہاتھ کانپنے لگے۔ اُس نے چلا کر فاطمہ کو پانی لانے کا حکم دیا اور پھر ٹیبل کی دراز کھول کر بی پی کنٹرول کرنے والی ٹیبلٹس تلاش کرنے لگا۔ دراز میں ٹیبلٹس موجود نہیں تھیں۔ اُس کا غصہ شدید تر ہو گیا۔ اب اُس کا پورا بدن کانپ رہا تھا اور وہ بلند فشارِ خون کی وجہ سے پسینہ پسینہ ہونے لگا۔

''کہاں مر گئی ہو فاطمہ؟'' وہ حلق کے بل چلایا اور پھر لرزتا کانپتا بستر پر گر گیا۔ اب اُس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا تھا۔ بے ہوش ہونے سے قبل اُس نے کسی کے دوڑتے ہوئے قدموں کی چاپ سنی تھی۔ اس کے بعد اُس کا ذہن اندھیروں میں ڈوبتا چلا گیا۔

(یہ لہورنگ داستان ابھی جاری ہے بقیہ واقعات آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیے)

◆✻◆

معاشرت

اگر آج تم نے کسی کی دل آزاری کی ہے، کل تمہاری اولادیں بھی تم سے یہی برتاؤ کریں گی۔ اس وقت تمہیں پتہ چلے گا کہ کسی کا لخت جگر اگر جدا ہوتا ہے تو کتنا قلبی دکھ ہوتا ہے

ہوا جوان بیٹا، بہو نے چھین لیا

نازیہ لیاقت

زمانہ قدیم میں لڑکیوں کو پیدائش کے بعد زندہ دفن کر دینے کا رواج تھا۔ آج کے جدید دور میں الٹرا ساؤنڈ کی سہولت کی وجہ سے لڑکی کو پیدا ہی نہیں ہونے دیا جاتا اور کچھ شقی القلب لوگوں کی کوشش ہوتی ہے کہ لڑکی کی پیدائش نہ ہو۔ ہمارے معاشرے میں لڑکے کی پیدائش کے بعد والدین، نانا نانی، دادا دادی، ماموں ممانی، چاچا چاچی ہر فرد اپنے طور پر خوشیاں مناتے ہیں۔ لڑکے کی پیدائش کو خاندان کی وراثت آگے بڑھانے والی نشانی تسلیم کر لیتے ہیں۔ نام رکھنے کی رسم سے پہلی سالگرہ تک بڑی دھوم دھام سے منائی جاتی ہے۔

جونیئر سکول کے لئے والدین اچھے سے اچھے نرسری سکول میں داخلے کی کوشش کرتے ہیں۔ جونیئر سینئر سکول کے بعد ہزاروں روپے خرچ کر کے انگلش میڈیم سکول میں فرسٹ میں داخل کرواتے ہیں۔ بچے نے انگلش میڈیم سکول میں داخلہ لے لیا ہے تو ٹیوشن کلاس اشد ضروری ہے۔ ماں اپنے مزید بچوں کی پرورش کے ساتھ ساتھ اپنے بڑے بچے کو تیار کر کے اس کا سکول کا بیگ اٹھا کر سکول بس میں چھوڑنے کے لئے چوک تک جاتی ہے اور اپنا سارا گھریلو سامان چھوڑ کر بچے کی سکول سے واپسی کے وقت سے پہلے سڑک پر انتظار کرتی رہتی ہے۔ آج کے اس مہنگائی بھرے دور میں والدین اپنی خواہشات کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت اور ان کی پرورش کے لئے دن رات ایک کر دیتے ہیں۔

ایف ایس سی کے امتحان سے قبل والدین ہر لمحے اپنے صاحب زادے کے لئے فکر مند رہتے ہیں۔ اپنی نیندیں، چین، سکون کو بھول کر ہر وقت یہی سوچتے رہتے

ہیں کہ ہمارا لاڈلا ایف ایس سی امتحان میں امتیازی نمبروں سے کامیاب ہو جائے۔ غرض کہ وہ ہونہار ایف ایس سی امتحان میں کامیاب ہو جاتا ہے تو اس کو اعلیٰ تعلیم کے لئے دس کالجوں سے فارم لاتے ہیں۔ سفارشی خطوط، عاجزی اور قرض لے کر کالج میں داخل کرا دیتے ہیں اور ان کی آخری حد تک کوشش ہوتی ہے کہ ان کا فرزند اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے اپنے پیروں پر کھڑا ہو جائے اور ہمارے بڑھاپے کا سہارا بنے اور خوش حال زندگی گزارے۔

اب بچہ اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے برسر روزگار ہو گیا ہے۔ جوان لڑکا شادی کی عمر کو پہنچ چکا ہوتا ہے۔ رشتے آنا شروع ہو جاتے ہیں۔ والدین یہ کہہ کر ٹال دیتے ہیں کہ ہم بعد میں جواب دیں گے۔ ہر والدین کی یہ دلی تمنا ہوتی ہے کہ وہ اپنے بیٹے کا نکاح اپنی زندگی میں کر دیں۔ لہٰذا والدین بھی بہو کی تلاش شروع کر دیتے ہیں۔ بہو کے لئے زیورات کی خریداری، شادی کا جوڑا وغیرہ وغیرہ۔ غرض شادی کی تیاری شروع ہو جاتی ہے۔ رشتے داروں اور احباب کو بتا دیا جاتا ہے کہ میرا بیٹا لاکھوں میں ایک ہے، ہمیں بہو بھی لاکھوں میں ایک چاہئے۔ اب بہو تلاش کرنے اور فوٹو دیکھنے کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

کبھی کبھی گھر میں رشتہ آتا ہے تو یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ لڑکی کا رنگ صاف نہیں ہے یا لڑکی کے نین نقش ہماری سمجھ میں نہیں آئے، ہمیں تو خوبصورت اور صحت مند، بادامی آنکھوں، شہابی رنگ والی لڑکی کا رشتہ کرنا ہے۔ کبھی کبھی والدین لڑکی کو دیکھنے اس کے گھر جاتے ہیں تو خوب سج سنور کر، زیورات کی نمائش کرتے ہیں تاکہ سامنے والے کو ایسا لگے کہ اچھی حیثیت والے ہیں۔ غرض کہ خوبصورت اور صاف رنگ کی بہو تلاش کرنے کے لئے والدین خوب سیرت، ملنسار، خوش اخلاق بہو میں کچھ نہ کچھ عیب تلاش کرتے ہیں۔ آخر دو خاندان کا مزاج ملتا ہے اور رشتہ طے ہو جاتا ہے۔ لڑکی کے والدین جہیز کی لمبی فہرست پر دستخط لینے کے بعد لڑکے کے گھر میں جہیز شادی سے دو تین روز قبل ہی دے دیتے ہیں۔

دو خاندانوں کے بیچ نئی رشتے داری کی شروعات ہوتی ہے اور شادی بڑی دھوم دھام سے انجام پاتی ہے۔ شادی کے بعد والدین کی محبت تقسیم ہو جاتی ہے۔ نئی نویلی خوبصورت دلہن کی محبت اور دلفریب ادائیں والدین کی محبت پر حاوی ہو جاتی ہیں۔ اکثر والدین اپنی بچیوں کو یہ تعریت دے کر شادی کرتے ہیں کہ پہلے دن ہی شوہر کو اپنی مٹھی میں رکھنے کی کوشش کرنا۔ لڑکے کے والدین بھی سوچتے ہیں کہ دلہن ابھی نئے ماحول سے ہمارے گھر آئی ہے چند مہینوں میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔ لڑکے کے والدین چاہتے ہیں کہ ہماری بہو ہمیں اپنے والدین کی طرح سمجھے مگر چھوٹے چھوٹے اختلافات، غلط فہمیوں اور لفظی جھڑپ کے بعد وہ بہو چند ہی مہینوں میں اپنے والدین کو میٹنگ کے لئے بلا لیتی ہے۔

گھر کی ناز و نخرے سے پرورش پائی بہو کا کہنا ہوتا ہے کہ مجھے اس گھر میں بہت تکلیف ہے۔ میری صبح اٹھنے کی عادت نہیں ہے مگر یہاں مجھے چھ بجے اٹھا دیا جاتا ہے۔ ناشتہ بنانے کا حکم دیا جاتا ہے۔ نند صبح تیار ہو کر کالج چلی جاتی ہے۔ ناشتے کے بعد شوہر کے لئے دوپہر کا ٹفن بنانا ہوتا ہے۔ دس بجے کے بعد دوپہر کے کھانے کی اشیاء لانے کے لئے ساس کے ساتھ بازار جانا ہوتا ہے۔ گیارہ بجے بازار سے آنے کے بعد سالن بنانا، روٹی بنانا، چاول وغیرہ۔ ظہر کی نماز تک پکانا پڑتا ہے۔ اس کے بعد دوپہر میں برتن دھونا، گھر کی صفائی، کپڑے استری وغیرہ سے شام ہونے تک میں تھک جاتی ہوں۔

میں متعدد بار گھر میں کام کرنے والی نوکرانی رکھنے کی بات بھی کر چکی ہوں مگر میری بات کو گھر کا ہر فرد

نظر انداز کر دیتا ہے۔ میں دن بھر گھریلو کام میں مصروف رہتی ہوں۔ میری شادی نہیں ہوئی ہے بلکہ میں یہاں گھریلو نوکرانی بن کر آئی ہوں۔

واضح ہوا کہ لڑکی کے والدین کی غلط تربیت اور آج کی لڑکیوں کی گھریلو امور خانہ داری سے عدم دلچسپی ان کو بداخلاق بنا دیتی ہے۔ دونوں خاندانوں کی میٹنگ ہونے کے بعد ایک دوسرے کو سمجھا بجھا کر معاملے کو رفع دفع کرنے کی کوشش کی جاتی ہے مگر کچھ دنوں بعد گھر میں سرد جنگ شروع ہو جاتی ہے۔ لڑکا جب ڈیوٹی انجام دے کر گھر پہنچتا ہے تو والدین کی شکایت، بیوی کے آنسوؤں کے ساتھ دن بھر ہوئے ظلم کی داستان سن کر افسردہ ہو جاتا ہے۔ اگر والدین سے کچھ کہتا ہے تو والدین ناراض، بیوی کو کچھ کہتا ہے تو وہ رنجیدہ ہو جاتی ہے۔ غرض کہ شادی کے بعد ایک خوش حال خاندان میں ایک دوسرے کے لئے نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔ لڑکی گھر میں ساس سسر سے ہاں، نہیں میں جواب دینا شروع کر دیتی ہے۔ نند سے لفظی جھڑپ عام بات ہو چکی ہوتی ہے۔ آخر میں لڑکی یہ فیصلہ کر لیتی ہے کہ میں اپنے میکے چلی جاؤں گی۔ اب مجھے ساس سسر اور نند کے ساتھ نہیں رہنا ہے۔ آخر میں پڑھی لکھی ہوں، میری بھی تو اپنی زندگی ہے۔ کیا کمی ہے مجھ میں؟

یہاں وضاحت کرنا ضروری ہے کہ ایسے واقعات انہی گھروں میں ہوتے ہیں جو خوبصورت (گورے رنگ والی) بہو، خوب زیورات، نقد رقم اور جہیز میں دیئے جانے والے اسباب کی طویل فہرست دیکھ کر شادی کراتے ہیں۔ ایسے والدین اگر خوب سیرت، اچھے اخلاق والی، ملنسار، امور خانہ داری میں ماہر بہو لائیں گے تو انہیں رات دن ایسے جھگڑوں کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔

(ان شاء اللہ!)

خیر گھر کی حسین بہو کی یہی ضد ہوتی ہے کہ میں الگ رہوں۔ بیچارا لڑکا بغیر قصور کی سزا پاتا ہے وہ لاکھ والدین سے کہتا ہے کہ میں آپ لوگوں کا بھی خیال رکھوں گا مگر والدین رنج و غم اور خون کے آنسو پی کر خاموش رہتے ہیں۔ لڑکا نہ چاہتے ہوئے بھی مضافات میں کرائے کے گھر میں رہنے چلا جاتا ہے یا پھر گھر جوائی رہنے لگتا ہے۔ والدین جن کی فطرت میں شامل ہوتا ہے کہ وہ اپنے لخت جگر کی خوشیوں کے لئے سب کچھ کرنے کو تیار رہتے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ والدین کا دوسرا نام ایثار و قربانی ہوتا ہے۔ ہم بھی عجیب لوگ ہیں، ہمارے والدین اپنے بچوں کو پوری زندگی پالتے رہتے ہیں۔ والدین بچوں کو عمر بھر خوشیوں کا دودھ پلاتے رہتے ہیں لیکن جب والدین بوڑھے ہو جاتے ہیں تو بچے ایک باپ یا ایک ماں کو نہیں پال سکتے۔ ہماری مائیں، ہمارے والد ہمیں بچپن میں کبھی گرم ہوا نہیں لگنے دیتے لیکن جب وہ بوڑھے ہو جاتے ہیں تو ہم انہیں بڑھاپے کی ٹھنڈی راتوں اور گرم دوپہروں میں سڑک پر پھینک کر چلے جاتے ہیں۔ ہم کیسے لوگ ہیں؟

وہ خواتین جو اپنے ذاتی مفاد، کام چوری وغیرہ کے سبب اپنے خاوند کو والدین سے جدا کرنے کو اپنی جیت سمجھتی ہیں، یہ ان کی بھول ہے۔ اس دنیا میں کسی کے دل سے نکلی آہ رائیگاں نہیں جاتی ہے۔ ایسی مفاد پرست خواتین یہ سمجھ لیں کہ ان کے گھر میں بھی لڑکا ہوگا۔ اگر آج تم نے کسی کی دل آزاری کی ہے، کل تمہاری اولادیں بھی تم سے یہی برتاؤ کریں گی۔ اس وقت تمہیں پتہ چلے گا کہ کسی کا لخت جگر اگر جدا ہوتا ہے تو کتنا قلبی دکھ ہوتا ہے جسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا ہے۔

لہو کے رنگ کو مہندی کی بُو نے سونگھ لیا
ہوا جوان جو بیٹا بہو نے چھین لیا
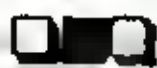
ایک لاوارث لڑکی کا دلگداز قصہ۔ وہ عشق کی راہ خارزار پر آبلہ پا چل پڑی تھی۔ عشق حقیقی ہو یا مجازی، دونوں صورتوں میں مقصود ہے، جلتے رہنا۔ اس کی ترجیح عشق حقیقی تھی کیونکہ یہی منازل عشق میں عظیم ترین ہے۔

ڈاکٹر مبشر حسن ملک ---------- 0345-6875404 ---------- ☆

ہائی سکول پہنچا تو وہ ہمارے گھر وارد ہوگئی۔ یتیمی کا داغ دامن میں سمیٹے۔ اس کی آمد میں بھلا کیا قباحت ہو سکتی تھی؟ اگر وہ بطور مہمان آتی مگر وہ تو ہمارے کنبے کا حصہ بننے چلی آئی تھی۔ گھروندے میں والدین کے ساتھ یکجا ہوئی تو مجھے شیرازہ بندی غیر فطری دکھنے لگی، گھرانے کے ساتھ آگے چلی تو مجھے وہ بیرونی عنصر نظر آئی، اس کا وجود مجھے کمخواب میں ٹاٹ کا پیوند بھائی دیتا تھا۔ وہ اطوار میں بھی نرالی دکھائی دیتی تھی، غالباً کسی پسماندہ گاؤں سے آئی تھی، اس پر طرہ یہ کہ بے چاری بھی کہلانے لگی۔

میرے والدین اس کے گاؤں جایا کرتے تھے مگر میرے لئے وہ علاقہ شجر ممنوعہ تھا۔ میں نہ تو کسی گاؤں سے واقف تھا اور نہ ہی اس لڑکی کے وجود سے جو ہمارے ساتھ شیر و شکر ہونا چاہتی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ مجھے قطعاً اچھی نہیں لگتی تھی بلکہ میں اسے حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ پہلی نظر میں وہ مجھے سٹرابری کی طرح دکھائی دی تھی، اس دم مجھے اس پر ہنسی آ گئی تھی۔ اس کا چہرہ بیضوی تھا، کمزور اور لمبوترا، روتی تو آنکھوں سمیت سرخ ہو جاتی تھی۔ اخلاقاً مجھے اس پر رحم آنا چاہئے تھا کیونکہ وہ لڑکی ستم رسیدہ تھی، اس کے روتے رہنے کی تمام وجوہ موجود تھیں۔ کبھی والدین کو یاد کر کے روتی تو کبھی اپنے گھر کو، وہ سیلاب کے کارن اجڑے دیار سے آئی تھی۔ مکان تو خیر تعمیراتی مرکب تھا، وہ اس میں رچا بسا پیار بھی کھو آئی تھی۔ اس کا مکان مکینوں سمیت دریا بُرد ہو چکا تھا۔ منہ زور پانی نے اس کی آرزوئیں بھی ملیامیٹ کر دی تھیں۔

اس سانحے کے بعد سٹرابری ہمارا آنگن مہکانے لگی تھی مگر اس کی خوشبو مجھے راس نہ آئی، مجھے اس کی طرف ذرا بھی رغبت نہیں تھی۔ گو وہ مجھے ٹکر ٹکر دیکھا کرتی تھی جیسے نہ وا ہوتے دروں کے پیچھے اجنبی۔ کبھی وہ مجھے اپنی طرف مائل بھی کرتی مگر میں نے اپنے گرد شخصی حصاروں میں قفل لگا دیئے تھے۔

اپنا ہر وہ دریچہ بند کر دیا تھا جہاں وہ دستک دے سکتی تھی۔ حسد کا زہر شاید میرے رویوں میں سرایت کر گیا تھا اس لئے احباب اور والدین ہر دم اس کی دلجوئی میں لگے رہتے تھے اور وہ اپنے ساتھ انہیں بھی رُلا دیتی تھی۔ یہ معاملہ دیکھ کر مجھے گھر کے آنگن میں لگا سٹرابری کا باغیچہ اپنی یاد دلانے لگتا جسے باغبان پانی سے سیراب کرنے کے علاوہ گھنٹوں اپنی سیوا سے بھی آراستہ کرتا رہتا تھا مگر وہ پھر بھی لہلہاتا ہوا دکھائی نہ دیتا تھا۔ بالآخر مالی اس کے حق میں دعائیں کرتا ہوا باقی عملِ نگہداشت اگلے یوم پر ملتوی کر دیتا تھا۔

لڑکی کا نام رانی تھا مگر میں اسے سٹرابری کہا کرتا تھا کیونکہ رانی کا تصور میرے ذہن میں شہزادیوں سے جڑا رہتا تھا اور وہ مجھے فقط شریف زادی نظر آتی تھی۔ میں نے اس کے خلاف گھر میں محاذ بنا لیا تھا۔ مجھے لگا کہ اس نے میرے حقوق پر ڈاکہ ڈال دیا تھا، میں اسے اپنے گھر سے نکال دینا چاہتا تھا۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ والدین بھی میرے بارے میں تشویش کا شکار ہونے لگے۔

''لڑکے نے چپ سادھ لی ہے، بجھ سا گیا ہے، اس میں پہلے والی بات نہیں رہی، جوش نہیں رہا، اس کی زندہ دلی کہاں گئی؟ اس کی سرگرمیاں ماند پڑ گئی ہیں''۔

غرضیکہ کئی قسم کے تبصرے مجھ پر چپنے لگے۔ پھر ذہن پر انجانے بوجھ کی وجہ سے میری صحت پر بھی اثر پڑا جو منفی تھا۔ یہ پہلو میرے والدین کو خصوصاً کھٹکنے لگا اور وہ تشویش کا شکار ہو گئے۔ وہ جان گئے کہ میں گھرانے میں رانی کے وجود سے نباہ نہیں کر سکا اور نہ ہی وہ میرے دل میں جگہ بنا سکی ہے۔ اب میں بھی انہیں صحن میں اُگے سٹرابری کے پودوں کی طرح دکھائی دینے لگا تھا۔

''لڑکی کو یتیم خانے بھیج دیا جائے''۔ ایک روز انہوں نے متفقہ فیصلہ کر لیا جو مجھے حتمی نظر آیا۔ پھر انہوں

نے رانی کو یہ سمجھا بھی دیا کہ "ہم وہاں تمہارا خیال رکھیں گے"۔ "جی جیسا آپ چاہیں"۔ رانی نے مختصر جواب دیا مگر اس کی آواز میں افسردگی تھی، پھر اس نے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں شکست و یاس کے بادل لہرا رہے تھے۔ یکلخت اس کے گالوں پر اشک لرزنے لگے اور وہ خاموشی سے اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

میرا ارادہ نہیں تھا، شاید کسی کام سے اوپری منزل پر گیا۔ پیش منظر دیکھ کر مجھے دھچکا سا لگا۔ رانی اپنا سامان باندھ رہی تھی، اس کی کل کایا کپڑوں کے دو جوڑے تھے جو اس نے سلیقے سے اپنی چادر میں لپیٹ لئے تھے۔ میں یہ دیکھ کر پریشان ہو گیا، مجھے پہلی بار اس پر ترس آنے لگا۔ "کمزور لڑکی میرے مقابل کیسے آ سکتی تھی؟" دل نے مجھے سمجھایا، کئی غلط فہمیاں یکسر میرے ذہن سے رفع ہو گئیں۔ "کیا میں اتنا ظالم ہو سکتا ہوں؟" یہ خیال میرے ذہن میں ابھرا اور مجھے پریشان کرنے لگا۔

"امی! سٹرابری جا رہی ہے"۔ میں نے کچن میں آ کر ماں سے کہا۔

"ہاں"۔ ماں نے میری طرف سرسری نظر دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"امی! اسے روک لیں"۔ میں نے مضبوط لہجہ میں درخواست کر دی۔ ماں نے یکدم گھوم کر میری طرف دیکھا مگر اس بار اس کی نگاہیں بہت معنی خیز تھیں۔ جاری کام کاج پر سے اس کا دھیان ہٹ گیا پھر آنکھوں میں استفہامیہ چمک ابھر آئی۔ "ہاں، امی! وہ نہیں جائے گی، آپ اسے کہیں کہ وہ اسی گھر میں رہے"۔ میں نے دو ٹوک الفاظ میں مدعا دہرا دیا۔

"شکریہ!" گہری شام جب رانی اتفاقاً میرے قریب سے گزری تو دھیمے لہجے میں تشکر زبان پر لے آئی۔ میں نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا تو اس کا چہرہ ہر قسم کے تاثر سے عاری تھا۔ اگلے روز اسے چوتھی جماعت میں سکول داخل کرا دیا گیا۔

مجھے یاد ہے وہ بارشوں کا موسم تھا، مالی اس روز مجھے کچھ زیادہ خوش نظر آیا، وہ محنت کا پھل پا رہا تھا۔ سٹرابری کے پودوں میں چند نئی کونپلیں نکل آئی تھیں، وہ چاہت سے ماں کو بتا رہا تھا۔ میں نے دیکھا وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔

رانی ہمارے گھرانے میں رہنے لگی مگر اس کی طرف میرے رویوں میں متلون مزاجی کا امتزاج رہا۔ کبھی میں اس پر مہربان ہو جاتا لیکن اکثر اس سے کھنچا رہتا یا اسے دھتکار دیتا، میرا رویہ اس کی طرف ہتک آمیز بھی ہو جاتا۔ گو میں حدوں سے کبھی نہ گزرتا۔ اگر اس سے کوئی خطا سرزد ہو جاتی تو میں ردعمل کا اظہار ضرور کرتا مگر معاملہ والدین تک پہنچانے سے اجتناب کرتا۔ وہ ہمیشہ میری طرف مائل بہ کرم رہتی تھی۔ ہر دم میری ذہنی کیفیت پہچاننے کی کوشش کرتی رہتی۔ میری توجہ اسے ملتی تو وہ خوش ہو جاتی مگر ملنے والی حقارت پر کوئی گلہ نہ کرتی۔ ٹھنڈی آہ بھر کر خاموش ہو جاتی اور اسے نصیب کا حصہ سمجھ کر پی جاتی۔ گھر میں اس کا عمومی رویہ بھی بڑا متوازن تھا۔ وہ کسی بھی چیز کے لئے ضد نہیں کرتی تھی، نہ تو کھیلنے کے لئے گڑیا مانگتی اور نہ ہی پہننے کے لئے نئے کپڑے۔ قدرت نے اسے چھوٹی سی عمر میں بڑا قانع بنا دیا تھا۔ بدلے ہوئے حالات میں اس نے محرومیوں کو گلے لگا لیا تھا۔ وہ زیادہ تر ماں کے ساتھ رہتی اور گھریلو کام کاج میں اس کی مدد کرتی، کبھی اپنی بساط سے بڑھ کر مشقت کر لیتی۔ ماں اس کا خیال رکھتی تھی۔ اس کی تربیت پر بھی توجہ دیتی تھی۔ اس کی تعلیمی سرگرمیوں پر نظر رکھتی، ہر نماز میں اسے اپنے ساتھ کھڑا کر لیا کرتی۔ اس طرف رانی خاصی ذہین تھی، اس کا رجحان مذہب کی طرف خصوصاً گہرا تھا۔ اس پہلو مجھے بھی رشک دلایا جاتا تھا۔

میرے مشاغل رانی سے قطعی مختلف تھے، میں اپنے ڈھب سے جی رہا تھا۔ اکلوتا تھا اس لئے میری ناز

برداریاں بھی برداشت کی جاتی تھیں۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ میں اپنی زندگی شاہانہ انداز میں بسر کر رہا تھا۔ رانی کے رہن سہن پر نگاہ ڈالتا تو مجھے احساس ہوتا کہ سادہ جیون جینا کس قدر مشکل ہوتا ہوگا۔ مجھے اس سے ہمدردی ہونے لگتی جو مجھے پریشان بھی کرتی۔ ایسے کئی خیال میں اپنے ذہن سے جھٹک دیا کرتا تھا جن کے باعث مجھے یہ تاثر ملتا کہ میں گزرتے وقت کے ساتھ رانی کی حیثیت برداشت کرنے لگا تھا مگر حقیقت یہ تھی کہ میں اپنے آپ کو قائل نہیں کر پا رہا تھا کہ میں نے گھر میں نہ صرف اس کا وجود تسلیم کر لیا تھا بلکہ اس کی کشش کی زد میں اپنے رویوں کے زمرے میں بھی شکست وریخت کا شکار ہو چکا تھا۔ اسی الجھاؤ میں بھی اس کے خلاف زیادہ سخت گیر بھی ہو جاتا۔ اس کے برعکس رانی ہمارے گھر میں اپنی جگہ بنا چکی تھی، وہ اپنے برتاؤ کے سلسلوں میں ذہنی طور پر زیادہ واضح تھی۔ کبھی شریر بھی ہو جاتی لیکن پھر بھی اپنی عمر کے لحاظ سے زیادہ بالغ نظر دکھائی دیتی تھی۔ کبھی لگتا کہ وہ اپنی بھرپور توجہ سے میرا دل جیتنے کی کوشش کر رہی تھی، چند روز بعد مجھے اس کا ثبوت بھی مل گیا۔

قدرت کا نظام اپنے تانے بانے بُنتا رہتا ہے جس کے تحت روزمرہ میں نت نئے واقعات جنم لیتے ہیں۔ اسی ناطے انسانی ہیولے اپنی پہچان کرا دیتے ہیں۔ مجھے ان دنوں شدید بخار ہوا، ساعتوں میں حالت غیر ہو گئی، والدین کو میری جان کے لالے پڑ گئے۔ مجھے ہسپتال داخل کروا دیا گیا جہاں مجھ پر بے ہوشی کے دورے بھی پڑے، رانی میرے ساتھ ہسپتال میں مقیم رہی۔ اس کا انسانی پہلو اور جذبہ مجھے حیران کر گیا۔ وہ فرائض کی بجا آوری میں مجھے لاثانی دکھی۔ میں جب بھی نظریں اٹھاتا اسے اپنے قریب پاتا اور وہ مجھے پوری طرح مستعد نظر آتی۔ نہ جانے اس نے اپنی نیند کو کس طرح شکست دے دی تھی؟ احساس ابھرتا کہ دکھی، چھوٹی سی لڑکی اپنا الم بھول کر اس فرد پر ہمدردی نچھاور کر رہی تھی جو اکثر اسے ستانے پر آمادہ رہتا تھا اور بسا اوقات اسے دھتکار بھی دیتا تھا۔

ایک دوسرا واقعہ میں ذہن سے کبھی بھی فراموش نہ کر سکا۔ میرے گھر میں کیرم بورڈ کی محفل جما کرتی تھی جس میں میرے دوست آیا کرتے تھے اس روز گھر میں خوب رونق ہوا کرتی تھی۔ رانی فقط ہمیں دور سے دیکھا کرتی تھی، وہ عموماً میرے مشاغل سے دور رہا کرتی تھی۔ وہ اس قیامت سے ڈرتی تھی جو میرے انتقامی طیش و غیظ کی وجہ سے گھر میں برپا ہو جایا کرتی تھی۔ ایک روز میں کیرم بورڈ میز پر آویزاں چھوڑ کر باہر نکل گیا، دوستوں کو خدا حافظ کہا، کچھ خوش گپیاں کیں، لوٹا تو رانی میری کرسی پر براجمان تھی اور گردونواح سے بے خبر اپنے دھیان میں کیرم بورڈ پر طبع آزمائی کر رہی تھی، گو وہ کھیل سے تکنیکی طور پر آگاہ نہیں تھی پھر بھی اپنے انداز میں لطف اٹھا رہی تھی مجھے اس کی حرکات مزہ دینے لگیں۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا، شمع رخ۔ مجھے اس پر ترس آیا، ساتھ ہی شرارتاً حسب معمول سرابری کا گماں بھی ہوا جو وہ میری آنکھوں سے سمجھ گئی۔ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر رک گئی۔ میں نے اسے خوش خلقی سے دیکھا، پھر مقابل بٹھا لیا اور کھیل کے قانون سمجھانے لگا۔

انہی دنوں ماں کو اچانک دوسرے شہر جانا پڑا، چند ایام پہلے گھر کا نوکر بھی چھٹی پر چلا گیا تھا۔ مجھے ماں کے بغیر رہنے کی عادت نہیں تھی۔ میرے سارے کام وہی کیا کرتی تھی۔ میں مغموم ہوا اور پریشان بھی، سوچا کہ چند روز بغیر ناشتہ کے سکول جانا پڑے گا، کھانے پینے کا بھی بحران رہے گا۔ اپنے کام خود ہی کرنا پڑیں گے۔ صبح اٹھا تو حیران رہ گیا جب دیکھا کہ سلیقے سے آراستہ تیار یونیفارم الماری میں لٹکی ہوئی تھی اور جوتوں کی پالش بھی کر دی گئی تھی۔

”نواب صاحب! ناشتہ میز پر موجود ہے“۔ مجھے رانی کی آواز سنائی دی۔

زندگی میں پہلی بار وہ میرے ساتھ پُراعتماد لہجہ

میں بات کر رہی تھی۔ مجھے قطعاً بُرا نہ لگا۔ میز پر عمدہ ناشتہ واقعی موجود تھا۔ پالک بھرا پراٹھا اور گرم دودھ کا کپ۔ پراٹھا بڑا لذیذ تھا، میں نے مزے سے سارا کھا لیا۔ پریشان ہوا کہ رانی خود ناشتہ نہیں کر رہی تھی، میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''نماز فجر کے بعد میں نے رات کا بچا ہوا نان کھا لیا تھا''۔ وہ بولی اور برتن دھو کر مجھ سے پہلے اپنے سکول کے لئے نکل گئی۔

وہ دن تھے جب ہم نے ایک دوسرے کو بلا واسطہ برداشت کیا اور براہِ راست ڈھیر ساری باتیں کیں۔ مجھے احساس ہوا کہ حقیقت میں وہ ایک پُر مغز اور شگفتہ مزاج لڑکی تھی۔

سکولوں میں چھٹیوں کا دور آ گیا تھا۔ رانی اپنی خالہ کے ہاں جا رہی تھی، میں اس پر خوش بھی ہوا کہ میرا اکلوتا پن لوٹ رہا تھا، کچھ روز والدین کی ساری توجہ مجھے ملنا تھی جس کا لطف میں اچھی طرح جانتا تھا۔ بچوں کی اپنی ہی سوچیں ہوتی ہیں۔ پھر ایک روز رانی واقعی چلی گئی، میں سو کر اٹھا تو وہ جا چکی تھی۔

مالی پیچی کے ساتھ جتا ہوا تھا۔ ''عجیب پودا ہے''۔ وہ گلہ کر رہا تھا۔ ''بمشکل آب و ہوا اسے راس آنے لگی ہے۔ کل چلو بھر پانی کیا بڑھا، آج اس کی کونپلیں فوراً مرجھا گئیں۔ میں تو سیاپے پر توبہ کر اٹھا ہوں، جی چاہتا ہے کہ کلہاڑا پکڑوں اور اسے جڑوں سمیت کاٹ دوں''۔ اس نے تلخ اور یاس بھرے لہجے میں کہا۔

''یوں نہ کہو، مالی!'' ماں بول پڑی۔ ''کبھی نبات سے بھی ناطے گہرے ہو جاتے ہیں، پودوں کی خوبیاں دلوں کو بھانے لگتی ہیں۔ پھر اگر وہ اپنی جگہ پر دکھائی نہ دیں تو دل مندا ہو جاتا ہے''۔ اس نے رائے دی۔

میں نے ناشتہ شروع کیا تو دل مسوس کر رہ گیا، میرے سامنے والی کرسی خالی تھی، مجھے رانی کی شدید کمی محسوس ہوئی۔ اس روز میں نے اسے کئی بار یاد کیا، اس کی ہر ادا میرے ذہن میں منڈلاتی رہی۔ مجھ پر اداسی کی کیفیت طاری ہو گئی اور دن بوجھ بن کر گزرنے لگے۔ میں اسی طرح پریشان دکھا جیسے ماں کے جانے پر ہوا کرتا تھا۔ ماں نے میری کیفیت کا اندازہ کیا تو بولی۔

''میں بھی رانی سے اداس ہو چکی ہوں، وہ میرا بہت ساتھ دیتی تھی''۔ پھر کہا۔ ''لڑکیوں کی الفت شبنم کی طرح ہوتی ہے، برستی ہے تو اس کی تاثیر روح تک اتر جاتی ہے۔ کٹھن حالات میں خود چاہے بے بسی کی مورت بن جائیں مگر اپنا پیار، ہمدردی کے رچاؤ سے معمور رکھتی ہیں۔ ایسی ناطے دلوں میں چپکے سے یوں پناہ بنا لیتی ہیں کہ احساس تک نہیں ہوتا''۔ اس نے مجھے سمجھایا میں خاموش رہا۔ ''نسوانی پیار بڑا لطیف جذبہ ہے جو ان کے پہاڑوں میں بھی سرایت کر سکتا ہے''۔ وہ مزید بولی۔ عمر کے اس حصے میں بھی مجھے ماں کی بات سمجھنے میں دقت پیش نہ آئی۔ رانی نے واپس لوٹنے میں آٹھ ماہ لگا دیے۔

اُس روز موسم ابر آلود تھا، ساون رُت کا خمار اپنے جوبن پر تھا، میں گھر لوٹا تو ہلکی برکھا برس رہی تھی، سامنے برآمدے میں رانی کھڑی تھی۔ مجھے دیکھ کر مسکان اس کے لبوں پر کھل اٹھی۔ اس نے پلیٹ میں سے پکی ہوئی سٹرابری اٹھائی اور اپنے لبوں میں داب لی۔ میں چونک سا گیا۔ فیصلہ نہ کر پایا کہ سٹرابری نے رنگ اس کے لبوں میں بکھرا دیا تھا یا پھر اس کے ہونٹوں نے پھل کو احمریں بنا دیا تھا۔ اس دم سرخ پیرہن اس کے بدن پر جچ گیا تھا، وہ مجھے کچھ بڑی بڑی دکھائی دی۔ میری نگاہوں نے اسے ٹٹولا تو شرما گئی۔ نامکمل سی ہنسی، جو اس کے لبوں پر سنور گئی اور تابانی کی صورت اس کے گالوں پر جھلکنے لگی، پھر اس کے جسم کا تمام لہو اس کے چہرے میں سمٹ آیا۔ جی چاہا کہ اسے بار بار دیکھوں مگر وہ امی کی اوٹ میں کھڑی مجھے ترسا رہی تھی، اس دم وہ مجھے اور بھی دلفریب لگی۔ آ نے

والے دنوں میں مجھے اس کا نیا روپ نظر آیا جس نے اس کے عمومی رویوں کو یکسر بدل دیا۔ نوجوانی نے اسے ملکوتی حُسن کا احساس دلا دیا تھا اور اس میں اعتماد بڑھا دیا تھا۔ مجھے بھی معلوم ہو گیا کہ لڑکیوں کے دَم سے گھر چاند نگر بن جاتے ہیں۔ لڑکپن کے ادوار میں وقت عموماً سرعت سے گزرتا ہے، کبھی اس کے گزرنے کا احساس بھی ہوتا، گزرتی ہوئی بارش کی طرح۔

ایک شب برکھا اپنے زوروں پر تھی کہ رانی کے کمرے سے مدبھری صدائیں ابھرنے لگیں، وہ گرتے پانی کے جلترنگ میں ڈوب کر گا رہی تھی، میں نے کتاب بند کر کے شیلف میں رکھ دی اور کلام کی ندرت میں کھو گیا۔ اس کا شوقِ نغمگی غالباً سکول والوں نے ابھارا تھا۔ وہ کچھ اس طرح نغمہ سرا تھی:

مینڈا عشق وی توں، مینڈا یار وی توں
مینڈا دین وی توں، انعام وی توں
مینڈا جسم وی توں، مینڈا روح وی توں
مینڈا قلب بھی توں، جند جان وی توں
مینڈا دھرم وی توں، مینڈا بھرم وی توں
مینڈا شرم وی توں، مینڈا شان وی توں
مینڈا عشق وی توں، مینڈا یار وی توں

میں اس کلام کے ہر ایک لفظ سے لطف اندوز ہوا۔ پہلے بھی احساس تھا کہ رانی بنیادی طور پر شاعرانہ مزاج کی حامل تھی اور جذبوں میں ندرت رکھتی تھی۔ اس کی گفتگو میں شعرانہ نکھار احباب کو بھلا لگتا تھا۔

''کیا ہو رہا تھا؟'' مَیں نے صبح دَم اس سے پوچھا تو وہ مسکرا دی پھر اس نے ایک شعر پڑھا۔

سنتے ہیں ہاتھ میں تقدیر ہوا کرتی ہے
کل یونہی ہاتھ پر ایک نام لکھا دیر تلک

لفظوں میں جذبوں کے رچاؤ اور انوکھے اظہار نے میرے دِل کو چھو لیا، میں دم بخود رہ گیا۔ اس کے لبوں پر کھلتی ہوئی مسکان نینوں میں بھی مچلنے لگی۔ مجھے سوچ میں غرق کر کے وہ میرے قریب سے گزر گئی۔

خاندان میں شادی کی تقریب تھی، ماں نے رانی کو میک اَپ کرنے کی اجازت دے دی۔ یہ اس کی زندگی میں یادگار دن تھا۔ پہلا موقع تھا کہ اس کی ہستی کو انفرادی حیثیت میں تسلیم کیا جا رہا تھا۔ صنف نازک کے خصائص میں سجاوٹ کی حِس بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ اس روز مجھے مستقبل کی رانی نظر آئی، اس کے نکھار نے تقریب میں ہر کسی کو چونکا دیا اور وہ مرکزِ نگاہ بنی رہی۔ اس دوران اسے جب بھی موقع ملا وہ میرے قریب چلی آئی اور یہ تاثر دیا کہ بے باک حُسن کو ذوق کی ستائش مل چکی تھی۔ میرے خیال و نظر میں کھلبلی سی مچ گئی، میں نے اس کی آنکھوں میں وہ چمک بھانپ لی جو میرے تصورات کا حصہ نہیں تھی۔

''میرا رانی سے ناطہ کیا تھا؟'' سوال میرے ذہن میں کلبلانے لگا۔ ''بہن یا منگیتر؟'' میں نے اپنے دل سے پوچھا۔

''معلوم نہیں''۔ مجھے جواب ملا۔

''موجودہ صورتِ حال میں مَیں اس کا شہزادہ نہیں ہو سکتا تھا''۔ ذہن نے رہنمائی کی۔

ایک پہلو البتہ عیاں اور واضح تھا کہ رانی مجھے اچھی لگتی تھی، اپنے تمام رویوں کے ساتھ۔ وہ میری عمومی زندگی میں کسی نہ کسی طور شامل بھی تھی۔

گزرتے شب و روز میں جنم لیتے ہوئے واقعات نے مجھے قائل کر لیا کہ میں اس سے تبادلۂ خیال کروں اور اس پر اپنی تمنائیں آشکار کر دوں، جن کا تعلق میری انفرادی ترقی اور خود کفالت کے مراحل سے تھا جو برسوں پر محیط ہو سکتے تھے۔

مجھے یاد ہے، اس روز آسمان کالے بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا اور ابر فضاؤں میں تیر رہے تھے، کبھی گھن گرج میں بھڑکتی رعد کے شعلے مچلنے لگتے مگر دھرتی برکھا کے کرم

سے محروم رہی تھی۔ میں حسب معمول شام کے وقت سبزہ زار میں بیٹھا ہوا تھا کہ رانی وہاں پہنچ گئی۔ باتیں شروع ہوئیں تو ذکر چاہئے سے چاہت تک جا پہنچا۔ رانی کی آنکھوں میں کاجل دہکنے لگا پھر وہ جذبوں کی بھول بھلیوں میں کھوتی گئی۔ اس دم وہ گمان کے گردابوں میں الجھی ہوئی تھی جبکہ میں اس اضطراب سے کوسوں دور تھا۔

''تمام انسانی رشتے جذبوں سے مرصع ہوتے ہیں، جذبے قلوب کی کھیتیوں میں جنم پاتے ہیں، احساسات جذبوں کو منزل شناس کراتے ہیں پھر ہر حقیقی محبت کے رنگ پروان چڑھاتی ہے، یوں ہر رنگ اپنی کایا میں مہکنے لگتا ہے''۔ میری بات پر رانی چونک اٹھی۔

''آپ کھل کر بات کریں'' ۔اس نے کہا۔ ''کبھی احساس بھی جذبے جگا دیتا ہے''۔

''میرے دل میں بھی تمہارے لئے پھول کھلتے ہیں، کچھ اس رنگ کے جو ماموں زاد بھائی کی حیثیت سے بہن کی نذر کئے جا سکتے ہیں۔تم مجھے الفت کی راہوں میں کتنا کامران پاتی ہو؟'' میں نے پوچھا تو رانی کے چہرے پر تابانی ماند پڑ گئی۔

''یہ آپ نے کیوں پوچھا؟'' اس نے بے چین ہو کر سوال کیا۔آسمان پر برپا طوفان اس کی اکائی میں مچلنے لگے، جن کا عکس اس کے چہرے پر ابھرنے لگا۔

''دل کی الجھنیں بڑھتی رہیں گی
اگر کچھ مشورے باہم نہ ہوں گے''

میں نے معاملہ سلجھانے کے لئے شاعر کا سہارا لیا۔ رانی سر جھکائے بیٹھی رہی، اپنی گھنیری زلفوں کی لٹوں سے کھیلتی رہی۔لمحوں کی یہ طوالت میرے سوالوں کا جواب آشکار کرنے لگی، پھر اس نے وہی کہا جو خاموش نگاہوں سے کہا کرتی تھی۔

''دل کی دھڑکن کا ترے قرب کے لمحوں پہ مدار
جس طرح ہم نے تمہیں چاہا، ہم جانتے ہیں''

محنت کی عظمت

دنیا میں ہر چیز کا متبادل موجود ہے لیکن محنت کا کوئی شارٹ کٹ نہیں۔ دنیا کا کوئی کیمیائی عمل لوہے کو سونا نہیں بنا سکتا لیکن انسانی ہاتھ وہ طاقت ہیں جو دنیا کی ہر دھات کو سونے میں بدل سکتے ہیں (دستگیر شہزاد)

یوں برملا اس نے میرے شعری حوالے پر اپنا خواب سجایا تو خود شمع رخ ہو گئی۔

''تمہارے جذبوں میں یہ احساس کیسے جنم پایا؟'' لگا کہ میں نے سوال برائے سوال کیا تھا مگر وہ اپنے اظہار میں بے باکی کا فیصلہ کر چکی تھی۔

''جوانی کی ہر اک لغزش قابل احترام ہوتی ہے''۔ اس نے شوخی سے کہا۔ بادلوں سے جھانکتے ہوئے شمس کی تابانی اس کے چہرے پر دمکنے لگی۔

''میری سوچوں کے زاویے تمہارے نقطۂ نظر سے مختلف رہے ہیں''۔ مجھے کہنا پڑا۔

''میں مصنوعی رشتوں پر یقین نہیں رکھتی۔'' اس نے برملا اظہار کا وطیرہ برقرار رکھا اور کہا۔ ''میں نے سدا آپ کو کزن کے روپ میں دیکھا ہے،بس۔آپ کو زندگی میں کبھی بھائی جان نہیں کہا حالانکہ اس میں بھی ''جان'' کا استعارہ موجود تھا۔ سات برس پہلے جب میں آپ کے گھرانے میں شامل ہوئی تو نو سالہ سٹرابری تھی۔ بس یہی ناطہ میں نے تسلیم کر لیا۔ اب حالات کے تقاضے شاید ہمیں نظر ثانیوں پر مجبور کر رہے ہیں''۔

''سچ تو یہ ہے کہ میں نے تمہیں اس روپ میں کبھی نہیں دیکھا؟'' میں نے پسپائی اختیار کرتے ہوئے کہا۔

''یا پھر آپ مجھے اس قابل نہیں سمجھتے''۔ اس نے جذباتی وار کیا۔

''لوگ کیا کہیں گے؟'' میں نے خدشوں کا اظہار کیا۔

''ہم نہ ہوں گے تو کسی اور کے چرچے ہوں گے
خلقتِ شہر تو کہنے کو فسانے مانگے''
اس کے پاس جواب تیار تھا۔
''نہ مل سکا تو؟''
''اک تیرا غم یا زمانے بھر کے غم
یہ غم ہو گا تو کتنے غم نہ ہوں گے''
رانی بہت سنجیدہ تھی۔

وہ مجھے الزام دے رہی تھی کہ میری شخصیت نے اسے چاہت کی راہوں پر لاکھڑا کیا تھا جبکہ میرا خیال تھا کہ گھرانے میں رشتوں کے ابہام نے یہ صورتِ حال پیدا کی تھی۔

''کچی کلیاں توڑ کر رکھ دیں پانی میں کھل اٹھنے کو
یوں تو تمناؤں سے کھیلے، کھیل کے ہم پچھتائے بہت''
مجھے اعتراف کرنا پڑا۔ رانی موضوع پر بدستور بلاتردد بول رہی تھی۔

''میں لاشعوری طور پر خواہشوں کا شکار ہوتی رہی، حتیٰ کہ یہ جذبے میرا شعور بنتے گئے۔ آج میں اس مقام پر کھڑی ہوں جہاں سے واپسی کا سفر ممکن نہیں''۔ اس نے مجھے وضاحت سے بتا دیا، اس کے پاس راہیں بھی مسدود تھیں۔

رانی سے کھل کر اظہارِ خیال کرنے کے بعد میں شش و پنج میں پڑ گیا تھا۔ میں اسے کوئی عہد نامہ نہیں دے سکتا تھا کیونکہ میڈیکل کی تعلیم کسی بکھیڑے سے کم نہیں ہوتی اور اس میں سالہا سال صرف ہو جاتے ہیں۔

ہمارے گھرانے میں غیر یقینی صورتِ حال بھی پیدا ہو چکی تھی۔ ہمیں تارکینِ وطن کا درجہ ملنے والا تھا۔ اس نئی کہانی میں افسوس ناک پہلو بھی موجود تھا۔ رانی کا معاملہ پیچیدگی کا شکار ہو گیا تھا۔ وہ میرے والدین کی حقیقی دختر نہ تھی اس لئے ہمراہ نہیں جا سکتی تھی۔ اب اس پہلو قانونی تقاضوں پر کام ہو رہا تھا۔ وقتی طور پر اسے اپنی خالہ کے گھر منتقل ہونا تھا۔

ایک روز ماں اس کا ذکر کرتے ہوئے رو پڑی۔
''مجھے یہ لڑکی بہت پسند ہے''۔ اس نے کہا۔
''امی! آپ فکرمند نہ ہوں، یہ آخر ہمیں آن ملے گی، یہ اور بات کہ اس دم اس کے بالوں میں سفیدی جھلک پڑی ہو گی''۔ میں نے جواب دیا۔ ''ہم سب اس کا انتظار کریں گے''۔ میں نے ماں کو یقین دلایا۔

رات بھیگ چکی تھی، ستاروں کی شمعیں جھلملا رہی تھیں، آسمان پر ستاروں کا جھرمٹ ظاہر ہو چکا تھا، اماوس کی رات تھی، سبزہ زار میں ہوا کے جھونکے مچل رہے تھے، اوس کے موتی نبات پر برس رہے تھے، اَن گنت جگنو شب تار میں ٹمٹما رہے تھے، کبھی دائروں میں محوِسفر نظر آتے اور گلابوں میں شمعیں جلانے لگتے، ذہنوں میں تفکرات اور خدشوں کا دور دورہ تھا۔ رانی رات کی رانی والے کنج میں کھڑی تھی، سبزہ زار کی اونچی مدھم بتی کے پہلو میں اس کی آنکھوں میں اشکوں کا سیل رواں اتر آیا تھا۔

''اپنی آرزوؤں کو خدا حافظ کہنے آئی ہوں''۔ اس نے سسکیوں میں اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔
''تمہاری کیفیت نے سب کو آزردہ کر دیا ہے''۔
''آج میں دوسری بار گھر بدر ہو رہی ہوں''۔
''والدین تو تمہارا گھر بسانا چاہتے تھے، تم ہی قائل نہ ہوئیں''۔
''جس کے دِل میں صنم بسا ہو، اسے مکانوں سے کیا لینا؟''
''تم اپنی عمر سے بڑی باتیں کرتی ہو''۔
''جذبوں کی شدت اور حالات انسانوں پر اثرانداز ہوتے ہیں''۔
''خالہ تمہارا خیال رکھیں گی''۔
''دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے''۔
رانی ایک بار پھر پلو سے آنسو پونچھنے لگی۔ ''اپنی تعلیم نہ

چھوڑنا، عزم بلند رکھنا اور حوصلہ بھی''۔

''سہارے مضبوط ہوں تو راہرو اُفق پر بھی پہنچ جاتے ہیں''۔ میں نے رانی کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا مگر اس کے کسی سوال کا جواب نہ دے سکا، نہ ہی اس کے آنسو پونچھ سکا۔ وہ مسلسل رو رہی تھی اور یوں سسکیاں بھر رہی تھی جیسے پہروں روتی رہی تھی۔ اس کا چہرہ سرخ ہو چکا تھا۔

''فکر و نظر کا ایک دریچہ میری جانب کھلا رکھنا''۔ اس نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔

میں نے آنکھوں کے اشارے سے اسے تسلی دی۔

رانی کے لئے گاڑی آ چکی تھی، وہ اپنا سامان یکجا کر رہی تھی، اس کی روانگی کی گھڑی آن پہنچی تھی۔ اس رات مجھے احساس ہوا کہ انسانی جذبے گردش کرتے ہوئے لہو کا دوسرا نام ہیں۔ ویران ہوتے کمرے سے رانی کے گنگنانے کی آواز سکوت میں سنائی دے رہی تھی۔ اس کا لہجہ انتہائی اداس تھا۔ لفظوں کی ادائیگی میں کبھی سسکیاں بھی بھرنے لگتی۔ وہ اپنے دھیان گا رہی تھی مگر اس کا دل رو رہا تھا۔ اس کی جذباتی کیفیت نے میرا دل بھی زخم زخم کر دیا تھا۔

''مینڈا دھرم وی توں، مینڈا بھرم وی توں
مینڈا شرم وی توں مینڈا شان وی توں''

مجھے اس کی صدا سنائی دیتی رہی۔

میرے والدین گھر چھوڑنے سے پہلے خاندانی ملازمین کو آخری ہدایات دے رہے تھے۔ ان ہدایات میں ان کی بکھری یادیں بھی شامل ہو گئی تھیں۔ میں نے محسوس کیا کہ اس دم گھرانے کی ذہنی حالت دلہن جیسی تھی جو گھر اور اپنوں سے بچھڑ رہی تھی مگر مستقبل کی تمنائیں اس کے جیون میں روشن ہو گئی تھیں۔

ننھی گھاؤ اور داغ لئے ہم تارکینِ وطن ہو رہے تھے۔

ائرپورٹ چھوڑنے سے پہلے میں نے اپنا سیل فون بند کیا۔ اس وقت بھی سکرین پر رانی کا پیغام موجود تھا، جس میں اس کی شخصیت کا شاعرانہ انگ جھلک رہا تھا۔

جب کوئی پیار سے بلائے گا
تم کو ایک شخص یاد آئے گا

اس نے لکھا تھا۔

O

نئے وطن پہنچ کر اندازہ ہوا کہ وہاں قدم جمانا کس قدر کٹھن ہو سکتا تھا۔ بدلی ہوئی معاشرتی اقدار میں تارکین کی شخصیات بھی نیا جنم پاتی ہیں۔ شخصی اور معاشرتی مسائل کا بوجھ ذہنی انتشار کا باعث بنتا ہے، جو بسا اوقات شدت اختیار کر لیتا ہے اور اس سے نجات ناممکن دکھائی دینے لگتی ہے۔ ایسی صورت حال کئی گھرانوں کی ہیئت بگاڑ دیتی ہے۔ ہمارا گھرانہ بھی ان تمام آزمائشوں سے گزرا۔

بڑے طبی ادارے میں میرا آغازِ سفر کسی معجزے سے کم نہیں تھا۔ یہ کامرانی میرے لئے بھی ناقابلِ یقین تھی اور میں اسے قدرت کا عطیہ سمجھا کرتا تھا۔

والدین نے کوشش کر کے رانی کے ساتھ رابطہ قائم رکھا۔ وہ اس کی حوصلہ افزائی بھی کرتے تھے کیونکہ وہ اپنی خالہ کے گھر خوش نہیں تھی بلکہ وہاں ایک مشکل زندگی بسر کر رہی تھی اور مسلسل اذیت میں مبتلا تھی۔ والدین اس کے بارے میں تشویش بھی رکھتے تھے۔

میں نے ایف اے کا امتحان پاس کرنے پر اسے تہنیتی کارڈ بھیجا تھا جس کا جواب بھی مجھے ملا تھا۔ ایک ورق کے وسط میں اس نے اپنی پسند کا شعر درج کیا تھا جو اس کی ذہنی حالت کی عکاسی کرتا تھا۔

اگر تو اتفاقاً مل بھی جائے
تیری فرقت کے صدمے کم نہ ہوں گے

رانی بھی اب تارکِ وطن ہو سکتی تھی کیونکہ اس کے سلسلے میں تمام قانونی ابہام دور کئے جا چکے تھے مگر وہ انتہائی بدنصیب واقع ہوئی تھی۔ اس کی زورقِ حیات بحر تلاطم خیز میں ڈگمگاتی رہی تھی۔ ساحل کی طرف بڑھتی تو نیا طوفان جنم لیتا اور بلاخیز لہریں اسے دوبارہ منجدھار میں دھکیل دیتیں اور وہ ایک بار پھر بپھری ہوئی موجوں سے سر ٹکرانے لگتی۔

معلوم ہوا کہ اس کا خالہ زاد، اظہر جیل سے رہا ہو چکا تھا، جہاں وہ اقدامِ قتل کے جرم میں سزا بھگت رہا تھا اور اب وہ انتہائی خطرناک مجرم بن گیا تھا، پھر معلوم ہوا کہ اس نے رانی سے زبردستی نکاح کر لیا تھا۔ اس معاملے میں اس کی ماں بھی بے بس رہی تھی۔ اب وہ رانی کے ہمرکاب بیرون ملک آنا چاہتا تھا۔ والدین آبائی وطن پہنچے تو معاملہ اور بھی بگڑ چکا تھا۔ رانی گھر سے لاپتہ ہو چکی تھی۔ کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ کہاں چلی گئی تھی۔ متعلقہ تھانے کو بھی اس بارے میں کوئی اطلاع نہیں تھی بلکہ اس کی گمشدگی پر وہاں رپورٹ تک درج نہیں کرائی گئی تھی۔ والدین نے کوشش کی کہ اسے ڈھونڈ نکالیں، مگر ان کی کاوش تنگیٔ وقت کے باعث محدود رہی۔ اس دوران انہیں اپنی جان کے لالے بھی پڑ گئے کیونکہ طاقتور جرائم پیشہ افراد انہیں خطرناک دھمکیاں دے رہے تھے۔ والدین کے دباؤ پر معاملات کچھ آگے بڑھے۔ لگا کہ پولیس کسی حد تک معاملہ جان چکی تھی مگر بے بس دکھائی دیتی تھی۔ انہی دنوں رانی کا خالہ زاد بھی پولیس مقابلے میں ہلاک ہو گیا۔ معلوم ہوا کہ وہ کسی بااثر شخص کی پناہ میں جرائم کر رہا تھا۔

میرے والدین نے رانی کے سلسلے میں تلاش اور دیگر متعلقہ امور کی ذمہ داری ایک مشہور لاء فرم کے سپرد کر دی جس نے اپنے طریقۂ کار کے مطابق کچھ کام بھی کیا۔ میرا اندازہ تھا کہ لاء فرم نے بعد ازاں والدین کو رانی کے بارے میں معلومات بھی بہم پہنچائی تھیں جو مجھ سے پوشیدہ

رہیں۔ میرے والدین شاید نہیں چاہتے تھے کہ میرا ذہن ایسے جذبات سے مغلوب ہو جائے جو میری تعلیمی سرگرمیوں پر منفی اثر ڈال دیں یا پھر مجھے ایسا دھچکا لگے جو میری شخصیت میں انتشار برپا کردے۔

تعلیمِ طب میری زندگی کا پوری طرح احاطہ کر چکی تھی۔ اسی ناطے میری دیگر سرگرمیاں بھی محدود ہو گئی تھیں۔ وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔ دن تیزی سے مہینوں اور ماہ سالوں میں ڈھل گئے۔ خود مجھے اپنی شخصیت میں پختگی نظر آنے لگی مگر رانی میرے دماغ اور دل سے کبھی نہ نکل سکی، باوجودیکہ اس کا تذکرہ گھر میں معدوم ہو چکا تھا۔

مغرب کی چکا چوند مجھ پر بھی اثر انداز ہوئی تھی مگر محدود۔ میں نے اپنی شخصی کمزوریاں حصولِ تعلیم میں محنت سے پوری کر لی تھیں۔ اسی ناطے کئی لڑکیاں میری زندگی میں آئیں اور مجھ سے متاثر بھی ہوئیں مگر میں کسی کا طلسم نہ اپنا سکا۔ میرا ذہن مخصوص ازدواجی نظریات کا حامل تھا، جن میں مشرقی فکر و نظر نمایاں نظر آتا تھا اور پختہ بنیادوں پر استوار تھا۔ خیالات کا یہ ڈھب میرے اپنے گھرانے کی بدولت تھا۔ طبی تعلیم کی ڈگری مکمل ہونے پر والدین میرا جیون ساتھی تلاش کر رہے تھے مگر وہ کسی بھی انتخاب پر مجھے قائل نہیں کر پائے تھے۔

میں جب تارکِ وطن ہوا تو نوعمر تھا اور اب دوسرے وطن میں بارہ برس بسر کر چکا تھا۔ والدین اس بیچ فقط دو بار اصل وطن کی طرف گئے تھے، وہ بھی مجبوراً۔ دوسری بار انہیں خاندانی ملازم کے انتقال پر وہاں جانا پڑا تھا۔ وہ اپنے آبائی گھر کا انتظام مرحوم ملازم کے بیٹے کو سونپ کر واپس آ گئے تھے۔ رانی کے بارے میں ان کی معلومات بڑی مبہم تھیں۔

مجھے آبائی وطن جانے کا شوق چرایا تو میرے والدین حیران رہ گئے۔ میں وہاں کیوں جانا چاہتا تھا؟ یہ

میں تو جانتا تھا مگر والدین ادراک نہیں رکھتے تھے کہ رانی ہمیشہ میرے لاشعور کا حصہ رہی تھی جو کبھی میرے شعور پر بھی دستک دینے لگتی تھی اور مجھے کسی قدر پریشان کر دیتی تھی۔ اس کا خیال ذہن سے جھٹک دینا میرے لئے آسان نہیں ہوتا تھا، بسا اوقات ناممکن بھی دکھتا۔ میرے والدین البتہ یہ جانتے تھے کہ میری بالغ نظری اب دنیا کے رنگ و روپ پہچاننے لگی تھی اور یہ نئی راہیں بھی میرے سامنے کھل رہی تھیں جن پر مجھے چلنا تھا۔ اس بناء پر انہوں نے مجھے آبائی وطن جانے کی اجازت دے دی۔ شاید وہ بھی یہ چاہتے تھے کہ میری زندگی کوئی ڈھب اختیار کرلے۔

میں اپنے وطن لوٹا تو ان دنوں خزاں کا موسم تھا۔ لمبا سفر طے کر کے میں آخر اس علاقے میں پہنچ گیا جہاں میرے لڑکپن کی یادیں بکھری پڑی تھیں۔ ایک بڑا دور گزر جانے کے اثرات جگہ جگہ موجود تھے۔ پختہ سڑکوں کے گرد خالی جگہیں آبادیوں میں تبدیل ہو چکی تھیں۔ قدرتی دلفریبیوں کی جگہ مصنوعی خوبصورتیوں نے سنبھال لی تھی۔ ماحولیات کثافتیں بڑھ چکی تھیں اور افراد کے بیچ تنہائیاں بھی۔ چند چہرے شناسا نظر آئے مگر ان کی حتمی پہچان غیر یقینی کا شکار ہو گئی تھی۔ اکثر چہروں پر ماہ و سال کے گہرے تغیر ابھر آئے تھے۔

اپنے آبائی گھر کے دروازے پر پہنچا تو غریب الوطنی کا گزشتہ دور یک دم معدوم ہو گیا اور مجھے یوں لگا جیسے میں شام ڈھلے گھر لوٹ آیا ہوں۔ کیاریوں میں مہکتے ہوئے خزاں کے پھولوں نے میرا خیر مقدم کیا۔ سٹرابری کی کیاریاں گئی فصل کی کہانی سنا رہی تھیں جبکہ لیچی کا پیڑ ہرا بھرا تھا۔ ماں باپ کے کمرے میں شفقت کی خوشبو بدستور موجود تھی۔ اپنے کمرے میں پہنچا تو واقعاتِ ماضی کی فلم ذہن میں گھوم گئی۔ میں چند لمحوں کے لئے پلنگ پر ڈھیر ہو گیا۔ الماری میں میرے لباس ابھی تک محفوظ تھے۔ میری کتابیں شیلفوں میں سجی ہوئی تھیں۔ کمرے میں میری تصویریں لٹک رہی تھیں۔ ماضی کے تسلسل میں مَیں بھی اسی دنیا کا حصہ بن گیا۔

رانی کے کمرے میں گیا تو دل ڈوب گیا۔ ماحول اس کے شخصی نکھار کا پرتو دکھائی دیا۔ وہاں سادگی میں قرینے کا امتزاج تھا۔ دیواروں پر آویزاں سجاوٹیں اس کے ذوقِ نظر کی عکاسی کرتی تھیں۔ در و دیوار پر رنگوں کی آمیزش خوبصورت دکھتی تھی۔ سامنے کی دیوار پر ایک نقرئی فریم لٹک رہا تھا جس میں کسی مصور نے شاعرانہ تخیل اپنے انگ میں ابھار دیا تھا۔ شعر یوں کندہ تھا۔

یوں تو پتھر کی بھی تقدیر بدل سکتی ہے
مگر شرط یہ ہے کہ اسے سلیقے سے تراشا جائے

نگارش پڑھ کر میرے دل کو دھچکا سا لگا۔ الم کی اس کسک نے مجھے ماضی سے چھڑا لیا۔ مجھے ہر صورت میں گم شدہ ساتھی تلاش کرنا تھا، یہ عزم میرے دل و ذہن میں پختہ تھا۔ اس ارادے نے درد پر قابو پا لیا۔

رانی کو ڈھونڈ نکالنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا کیونکہ ایسا کوئی اشارہ موجود نہیں تھا جو میری رہنمائی کر سکتا۔ میں نے اپنے طور پر خاک چھاننا شروع کر دی۔ اس ضمن میں علاقے کے بااثر افراد سے رابطہ قائم کیا، پرنٹ میڈیا سے کام لیا، نیز قانونی مدد بھی حاصل کی مگر جدوجہد بارآور ہوتی نظر نہ آئی۔ لگا کہ اس کے نقوشِ پا بھی دوراں کی گرد نے مٹا دیئے تھے۔ رانی کی خالہ کے احباب کو تلاش کیا اور انہیں مدد کرنے پر قائل کیا مگر اس کا بھی خاطر خواہ فائدہ نہ ہوا۔ ایک رشتہ دار نے البتہ چند انکشاف کئے۔ بتایا کہ رانی کا نکاح اس کے خالہ زاد سے ہوا تھا مگر یہ بندھن رخصتی سے پہلے ہی ختم ہو گیا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ رانی کو اس کے خاوند ہی نے غائب کرایا تھا جو بعد میں کوئی جرم کرتے ہوئے مارا گیا۔ میں علاقے کے بوڑھے گورکن سے بھی ملا مگر وہ بھی کچھ نہ بتا سکا۔ چھ

ماہ اسی طرح گزر گئے۔ مجھے اپنی نصف برس کی جدوجہد بے ثمر ہوتی دکھائی دینے لگی۔

میں ویران کاشانے کے کنج تنہائی میں شام گزارا کرتا تھا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں رانی نے مجھے خدا حافظ کہا تھا۔ گلوں کی مہک وہاں مجھے خوبصورت ماضی کا احساس دلاتی رہی تھی۔ کبھی رات گئے تک میں وہیں بیٹھا رہتا اور چندا کی ہم سفری میں بیتے ہوئے ادوار کو یاد کرتا رہتا۔

"مجھے اپنے دھیان میں رکھنا،
کوئی دریچہ میری طرف وا رکھنا"

آخری ملاقات میں رانی نے مجھے تاکید کی تھی۔ ایسا ہی کوئی واسطہ دلوں کے بیچ موجود رہتا تھا جس کے طفیل میں یہاں تک آن پہنچا تھا۔

"کیا میں واقعی رانی سے محبت کرتا تھا؟" تنہائی میں یہ سوال میرے ذہن میں ابھرتا تھا۔ جواباً میرے دل میں شکست کا جذبہ جنم لیتا تھا، جسے میں نے تسلیم کر لیا تھا۔ رانی اپنے جذبوں میں شدت رکھتی تھی، اتنی بھرپور کہ اس کی تندی وجود سنگ میں بھی گھر کر سکتی تھی۔ مجھے وقت اور تنہائی نے یہ سمجھا تھا۔

ایک شام گھریلو ملازم نے چائے میرے سپرد کی تو نزدیک ہی بیٹھ گیا۔ ہمدردی کا جذبہ اسے میرے قریب لے آیا تھا۔ جلد ہی گفتگو کے پہلو نکلنے لگے۔

"کاش! میرے والد زندہ ہوتے تو آپ کو رانی بی بی کی کٹھن تلاش نہ کرنا پڑتی"۔ اس نے اپنی رائے دی، پھر تھوڑی دیر سوچتا رہا۔ "جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، بی بی آپ کی عدم موجودگی میں یہاں آئی تھی اور اس گھر میں قیام پذیر بھی رہی۔ والد صاحب نے مجھے بتایا تھا۔ وہ سٹرابری اسی امید پر کاشت کیا کرتے تھے کہ کسی روز اچانک بی بی یہاں آ جائے گی اور پھل، پھول دیکھ کر محظوظ ہو گی"۔ ملازم نے بتایا۔ یہ بات سن کر مجھے اچنبھا ہوا۔ دل کچھ بڑھ کر دھڑکنے لگا۔

"کب آئی تھی وہ یہاں؟" میں نے فوراً سوال کر دیا مگر ملازم مزید کچھ نہ جانتا تھا۔ ایک رائے اس نے البتہ مجھے دے دی۔

"قریبی پہاڑوں میں شاہ صاحب کا عرس شروع ہو چکا ہے"۔ اس نے کہا۔ "آپ وہاں چلے جائیں اور کوئی منت مان لیں، ہو سکتا ہے کہ آپ کی مراد بر آ جائے اور بی بی کا اتہ پتہ معلوم ہو جائے"۔

ملازم کے اس اظہار نے میری یادوں کے دریچے وا کر دیے۔ شاہ صاحب کا دربار میرے ذہن میں معلق ہو گیا۔ میں اپنے والدین کے ہمراہ حاضری دینے وہاں جایا کرتا تھا۔ گدی نشین چھوٹے شاہ صاحب ہمارے گھرانے کے ہر رکن کو فرداً فرداً جانتے تھے۔ میں اپنی تنہائی کے سلسلے میں ان کی مدد حاصل کر سکتا تھا۔ وہ بارسوخ شخص تھے، پھر اپنے علاقے میں یہی واحد ایسا مقام بچا تھا جہاں میں نے قسمت آزمائی نہیں کی تھی۔

دربار پہاڑوں کے درمیان بلندی پر واقع تھا مگر ہمیشہ رونق سے معمور رہتا تھا۔ وہاں انسانی ہجوم برقرار رہنے کی وجوہات موجود تھیں۔ دربار خدمت خلق کا منبع خیال کیا جاتا تھا۔ ایک لائبریری اور دو تعلیمی ادارے اس دربار سے منسلک تھے اور ایک شفاخانہ بھی وہاں موجود تھا۔ غریبوں کے لیے لنگر ہمہ وقت جاری رہتا تھا۔ شاہ صاحب نے وہاں بچوں اور مجبور خواتین کا ہوسٹل بھی قائم کر رکھا تھا۔ ان کا حلقۂ ارادت بڑا وسیع تھا اسی لحاظ سے ان کے معاشی حالات بھی اچھے تھے، انہیں اشغال خیر کے لیے امداد مل جایا کرتی تھی۔

پہاڑی راستے اور پگڈنڈیاں کوشاں زندگی کی غمازی کرتے ہیں۔ میں خودرو جھاڑیوں میں راہیں تراشتا ہوا دربار پہنچا تو لہو کی گردش جسمانی تھکاوٹ کا احساس دلانے لگی۔ پہاڑی چوٹیوں کے بیچ سورج حرارت برسا رہا تھا۔ ابھی دوپہر میں وقت باقی تھا، دربار میں عرس کی

سرگرمیاں عروج پر تھیں۔ میں پہلے محفل قرأت میں بیٹھا رہا، پھر حمد و ثناء کی بزم میں شرکت کی۔ اس روز مدت بعد روحانی فیض کا گمان ہوا۔ خاصا وقت وہاں صرف کیا پھر قصد کیا کہ گھر لوٹا جائے۔ ہجوم زیادہ تھا سوچا کہ راہ بدل لوں اور دربار کے پچھواڑے سے باہر نکل جاؤں۔ چند ہی قدم اٹھائے ہوں گے کہ مدھ بھری نسوانی آواز سماعتوں سے ٹکرانے لگی۔ درختوں کے سایہ دار جھنڈ میں اس نوا نے میرے پاؤں تھام لئے۔ ہوا کی لطافت میں رچی بسی صدا کی مٹھاس تن بدن میں مچلی تو دل پر وارد ہونے لگی پھر سُر اور لفظوں کا امتزاج بازگشت کی صورت ذہنی نہاں خانوں میں الجھنے لگا۔ میں دم بخود رہ گیا۔

میڈا عشق وی توں، میڈا یار وی توں
میڈا دین وی توں، انعام وی توں
میڈا جسم وی توں، میڈا روح وی توں
میڈا قلب وی توں، جند جان وی توں

مجھے لگا جیسے در و دیوار اور کوہ و دمن اس صوت کے ناطے گونج اٹھے ہوں اور کائنات میں ہر سُو حسن نوا کی ادائیگی اک طلسم چھا رہا ہو۔ میں بے اختیار ہو کر ایک کمرے کی طرف بڑھا اور ایک ہی دھکے میں اس کے بند دروازے وا کر دیئے۔ کمرے میں چند خواتین محو کار تھیں۔ رانی ان کے درمیان بیٹھی ہوئی تھی۔ بھڑکتی ہوئی آگ کے کنارے وہ گا رہی تھی اور ساتھ ہی بھڑکتے ہوئے تنور میں چپاتیاں پکا رہی تھی۔ روٹیوں کا ڈھیر اس کے قریب جمع ہو چکا تھا۔ حدت آتش نے اس کا چہرہ دہکا دیا تھا اور پسینے کے قطرے اس کے رخساروں پر مچل رہے تھے۔ لگا جیسے اس کی نغمہ سرائی نے شعلوں کو بھڑکا دیا تھا۔ وہ اپنا روپ گنوا چکی تھی۔ لمحہ بھر کے لئے ہماری آنکھیں چار ہوئیں تو وہ بدحواس ہو گئی۔ میں بھی لرز کر رہ گیا۔ دل شدت جذبات سے دھڑکا، پھر بیٹھ گیا۔ ابھرتی ہوئی سریلی آواز یک دم ماند پڑ گئی۔

''تم نے خواتین کو بے پردہ کر دیا''۔ ان گنت آوازیں ابھریں، جن میں چند غصیلی بھی تھیں، پھر بھانت بھانت کی بولیاں میرے دماغ میں گھسنے لگیں۔ ایک خاتون نے بڑھ کر کمرے کا دروازہ بند کر لیا۔ اس دم میں دیوار کے سہارے بمشکل کھڑا تھا اور میرا وجود مسلسل لرز رہا تھا۔ مجھے سنبھلنے میں خاصی دیر لگی۔ تب کمرے میں سکوت کا راج دکھائی دیتا تھا، باہر ہلچل البتہ بڑھ گئی تھی۔ دربار کے رضا کار عرس کے زائرین میں کھانا تقسیم کر رہے تھے۔

رانی کو یوں اس حال میں دیکھنا بڑا اندوہناک تجربہ تھا۔ مجھے لگا جیسے وہ دوراں کی بھول بھلیوں میں راستہ کھو گئی تھی اور اجڑے ہوئے جزیروں کو اپنا چکی تھی بہاروں کے سرابوں نے اسے راہوں میں تھکا دیا تھا اور وہ شکست کھا چکی تھی۔ اپنی تمنائیں کسی مدفن میں چھپا دی تھیں یا انہیں چتا کی آگ میں جلا آئی تھی۔ افسردہ خیالی نے مجھے گھیر لیا۔ شام جب باغیچے میں نکلا تو آنکھوں سے اشک گرنے لگے۔ مجھے دُکھ بھرا احساس ہوا کہ رانی کی بربادی میں میرے گھرانے کا بھی کردار تھا۔

شام گہری ہو چکی تھی، میں نے نمازِ عشاء دربار کی مسجد میں ادا کی۔ عرس کی تقریبات ختم ہو چکی تھیں۔ میں لان میں بیٹھ کر چھوٹے شاہ صاحب کا انتظار کرنے لگا۔ کیاریوں میں مہکتے ہوئے گلاب دیکھ کر احساس ہوا کہ موسم بہار آ چکا تھا۔ جب میں اس شہر میں آیا تو اس دم خزاں کا دور دورہ تھا۔ ''زندگی بھی تو بہار و خزاں کا مجموعہ ہے''۔ خیال میرے دماغ میں مچلنے لگا۔ ''انسان گر تہیہ کر لیتا تو اس کے جیون سے بہاروں کے رنگ کبھی گریزاں نہ ہوتے''۔ سوچیں میرے ذہن میں الجھنے لگیں۔ میں گرد و پیش سے بے نیاز دیر تک ماضی پر سوچتا رہا۔ جب اس تانے بانے سے نکلا تو وقت خاصا گزر چکا تھا۔ دھرتی کے ہمرکاب چندا کا سفر شروع ہو چکا تھا، چاندنی ہر سُو بکھر گئی تھی، پانی کے جھرنوں سے نقرئی موتی ہوا کے سنگ مچل

رہے تھے، ہواؤں میں خنکی تھی، دور پہاڑی جنگلوں میں کوئل کی صدا ابھرنے لگی، میٹھا سا درد فضاؤں میں پھیل گیا تھا۔

''السلام علیکم!'' مہین سی آواز مجھے عقب سے سنائی دی۔

میں چونک کر اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ مڑ کر دیکھا تو مقابل رانی کھڑی تھی۔ میں نے اس کے سلام کا جواب دیا۔ نہ سمجھ پایا کہ اسے کس ڈھب سے ملوں۔ کئی تمنائیں یکے بعد دیگرے دل میں ابھریں مگر میں فقط اپنے دل کی دھڑکن پر قابو پا تا رہ گیا۔

''شکر ہے کہ آخر تم مل گئیں۔'' میں نے اس کا خیر مقدم کیا۔ رانی خاموش کھڑی رہی۔ اپنی چادر کے پلو سے کھیلتی رہی، پھر آزردہ آواز میں بولی۔

''کچھ نہیں بچا میرے پاس ڈاکٹر صاحب! لفظ بھی نہیں بچے جو آپ کی اپنائیت کا جواب دے سکوں۔ میں تہی دست ہوں۔'' اس نے کہا۔

''تم سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے اس کی یاس پر بظاہر توجہ نہ دیتے ہوئے خواہش کی۔

اس نے میری طرف دیکھا پھر دھیرے سے مسکرائی۔ اس کی پھیکی مسکان نے میرے من میں گہرا درد جگا دیا۔ میں کچھ کہنا چاہتا تھا مگر الفاظ کہیں گم ہو گئے۔ وہ بھی مزید کچھ نہ بولی اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی اپنے ہوسٹل کی طرف چلی گئی۔

شاہ صاحب پہنچ چکے تھے، تپاک سے ملے۔ انہوں نے کھانے کا اہتمام کر رکھا تھا۔ باتیں رات گئے تک جاری رہیں۔ گفتگو آخر رانی پر آ گئی۔

''میں اسی کے لئے یہاں آیا ہوں''۔ مجھے یہ کہنے میں عار نہ ہوا۔

''کاش! یہ آپ کے ہمرکاب ہی بیرون ملک چلی جاتی''۔

مسکراہٹ کا جادو

خدا نے انسان کو مسکراہٹ کی شکل میں ایک ایسی صلاحیت دے رکھی ہے جس سے وہ پوری دنیا فتح کر سکتا ہے لیکن ہم میں سے بے شمار لوگ اس صلاحیت کے کمال سے آگاہ نہیں ہوتے۔ اگر لوگف اس طاقت سے آگاہ ہو جائیں تو یقین کریں یہ دنیا ان کے قدموں میں آ گرے۔ (دستگیر شہزاد)

''میرے والدین یہی چاہتے تھے''۔

''وہ یہ جانتی ہے اور اس سمت میں مجبوریاں بھی''۔

''میں ماضی کی تلافی کرنا چاہتا ہوں''۔

''وہ بہت ٹوٹ چکی ہے''۔

''میں اس کی کہانی نہیں جانتا۔ یقینی طور پر المناک ہو گی۔ غالباً وہ شادی اور طلاق کے مراحل سے بھی گزر چکی ہے''۔

''دو بار''۔

''میرے خدا!''

''مرد ذات پر سے اس کا اعتماد اٹھ چکا ہے''۔

''میں اسے خوشیاں لوٹا سکتا ہوں''۔

''بات کر کے دیکھ لیں، آپ اسے کب ملے ہیں؟''

''میں نے اسے دیکھا تھا۔ وہ تنور پر چپاتیاں بنا رہی تھی۔'' میری بات سن کر شاہ صاحب بے ساختہ ہنس پڑے، بولے۔ ''صفات کی حامل لڑکی ہے۔ اس نے ہمارے پرائمری سکول کا انتظام سنبھال رکھا ہے۔ اس کی کارکردگی قابل ستائش رہی ہے۔ رہا معاملہ روٹیاں بنانے کا تو اس نے یہ ذمہ داری رضا کارانہ طور پر انجام دی تھی، عرس کی تقریبات کی وجہ سے''۔

''میں اسے شادی کی پیشکش کرنا چاہتا ہوں۔ کیا یہ مناسب ہے؟ آپ اپنی رائے سے نوازیں''۔

''آپ کا ارادہ شرعی لحاظ سے درست ہے۔ میں اس کی حمایت کروں گا۔ آپ رانی سے ملیں، جان لیں کہ وہ باری تعالیٰ سے لو لگا چکی ہے اور عرفان کے نردبان پر چند قدم بھی بڑھا چکی ہے''۔ شاہ صاحب نے کہا، پھر بولے۔ ''زندگی بے حد پیچیدہ ہے، ہر فرد سکھ کا متلاشی ہے۔ جو مذہب میں سکون تلاش کرنا سیکھ جائے وہی کامران ٹھہرتا ہے''۔ انہوں نے بات ختم کی۔

میں تمام رات رانی کی زندگی اور اس کے مستقبل پر سوچتا رہا۔ اگلے روز اس سے تفصیلی ملاقات کا قصد کرلیا۔ شام کا طلسم گہرا ہوا چکا تھا۔ میں دربار کے احاطے میں پہنچا تو وہاں رونق موجود تھی۔ خواتین کے ہوسٹل میں دو لڑکیاں کھڑی تھیں۔ میں نے ان سے رانی کے بارے میں دریافت کیا تو وہ ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکنے لگیں۔ حیرانی ان کے چہروں پر پھیل گئی۔ چند لمحے اسی طرح خاموشی میں گزر گئے۔ آخر ایک لڑکی میری جانب متوجہ ہوئی۔

''آپ کا تعارف؟'' اس نے پوچھا۔

میں نے اپنا نام بتا دیا، پھر اصرار کیا کہ میری رانی سے ملاقات ضروری ہے۔ اسی اثناء میں دوسری لڑکی بھی میرے قریب آ چکی تھی۔ اس نے پہاڑی چوٹی کی طرف اشارہ کیا۔ وہاں دور آگ کا الاؤ جل رہا تھا۔ پہاڑ پر اس مقام کو ہم کٹیا کہتے ہیں۔ دربار کے افراد وہاں آتے جاتے رہتے ہیں۔ کوئی تنہائی میں عبادت کرنا چاہے تو وہاں بھی جا سکتا ہے۔

رانی کو وہ جگہ بہت پسند ہے۔ وہ بابا جی کے ہمراہ وہاں جاتی رہتی ہے۔ کبھی تنہا بھی چلی جاتی ہے۔ اگر آج ملاقات مقصود ہو تو وہ آپ کو وہیں ملے گی۔ کل البتہ ہوسٹل میں موجود رہے گی۔ آپ اپنی سہولت کے مطابق فیصلہ کر لیں۔'' مجھے رہنمائی مل گئی۔

رانی سے ملاقات میں اپنے ذہن میں ٹھان چکا تھا۔ آغازِ شب تھا، کائنات چاندنی میں نہائی ہوئی تھی، میں نے پہاڑی چوٹی سر کرنے کا مصمم ارادہ کرلیا، دربار سے کٹیا تک کا فاصلہ گھنٹے بھر کا تھا۔ مجھے بھول بھلیوں سے اجتناب کرتے ہوئے جنگل کے کنارے سیدھا اوپر جانا تھا۔ سبک خرام ہوا میں یہ مرحلہ کٹھن نہیں تھا۔ جلد ہی مجھے خود رو نباتات کی خوشبو نے مسحور کر دیا اور قدرتی ماحول کی ندرت اچھوتا لطف دینے لگی۔ کبھی جنگلی حیات بھی اپنی موجودگی کا احساس دلاتی، چرند پرند درختوں کی اوٹ سے سواگت کرتے، ان کی نوائیں دیگر انواع کو بھی ابھار دیتیں مگر اس دم مجھے کوئل کی صدا بڑی دلگداز لگی۔ اس نوا کے بنا جنگلی فضا مکمل نہیں ہوتی۔ ایک چکوری بھی چاند کی سمت پرواز کناں تھی۔ ''فتنۂ حُسن و عشق کائنات کا سب سے بڑا موضوع ہے''۔ خیال میرے ذہن میں کلبلانے لگا۔ رانی آگ کے الاؤ سے زیادہ دور نہیں تھی۔ شعلوں کا رقص اس کے رخساروں میں مچل رہا تھا۔ مجھے پا کر قلب میں بکھرے ہوئے شعلے بھی اس کے گالوں میں ٹمٹمانے لگے۔ وہ بے اختیار ہو کر اٹھی اور میرے قریب چلی آئی۔ دل دھڑکنوں پر مچلنے لگے کبھی وہ میرے دل کے در کھولا کرتی تھی، آج میں نے اس کے من پر دستک دی تھی۔ اس دم مجھے لگا کہ وہ ہر پہلو جیت چکی تھی۔

''خوش آمدید'' مانوس مگر اجنبی آواز سکوت میں ابھری، اس دم مجھے اور بھی اوپری سی سنائی دی۔

''رانی! تم یہاں کیوں اور کیسے؟'' میں اس کے علاوہ کچھ نہ کہہ سکا۔ تھوڑی دیر وہاں کھڑا رہا، پھر اس کے نزدیک بیٹھ گیا۔ وہ خاموشی کی زبان سے میری طرف تکتی رہی۔ کچھ لمحے میں اس کی نگاہوں کے پیام پڑھتا رہا۔

''جذبوں کی صداقت پر قائل ہونا پڑتا ہے''۔ وہ رواں لمحوں میں قصداً تاخیر کے بعد بولی۔ ''مجھے یقین تھا کہ آپ یہاں ضرور آئیں گے''۔ اس نے کہا۔

''میں اپنے سوال کا جواب چاہتا ہوں؟''

''جو گزر گیا، اس پر بات کیسی؟''

رانی ایک بار پھر چپ ہو گئی، ذرا دیر بعد بولی۔

''نہ جہاں میں کہیں اماں ملی، جو اماں ملی تو کہاں ملی
میرے جرم خانہ خراب کو تیرے عفو بندہ نواز میں''

اس نے اپنے انداز میں جواب دے دیا۔

''مشکل گزری ہو گی؟'' میں نے قصداً پوچھا تو وہ پھیکی ہنسی ہنس پڑی۔

''غم سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں''

''میں نے کبھی نہیں چاہا تھا کہ تمہیں رنج ملے''۔ بے اختیار میری زبان پر آ گیا۔

''میں ہی سیاہ نصیب واقع ہوئی تھی''۔ وہ بولی۔

''رانی! میرے گھرانے نے تمہیں محفوظ مقام پر الوداع کہا تھا اور وہ بھی محدود مدت کے لئے''۔ میں نے توجیہہ پیش کی۔

''ہاں، مگر آپ نے مچھلیوں کے تالاب میں مگر مچھ نہیں دیکھے تھے، نہ ہی ان کا اندازہ میں کر پائی تھی''۔ اس نے افسردہ لہجے میں جواب دیا۔

''ہم نے تمہاری خالہ پر بھروسہ کیا تھا''۔ میرا ارویہ معذرت خواہانہ تھا۔

''بدنصیبی سے اس کا بیٹا اظہر جیل سے رہا ہو گیا''۔ وہ آہ بھر کر بولی۔ لبوں پر خاموشی کا طلسم پھر چھا گیا۔ ہم دونوں کو جذبوں کی ہلچل سے سکون پانے کا سفر دشوار گزار لگا۔ اس نے سنبھل کر میری نجی زندگی پر چند سوال کئے، گھرانے کی تارک الوطنی اور متعلقہ جہتوں پر بات کی، پھر اس تصور اوطان میں سود و زیاں کا معاملہ بھی زیر بحث آیا۔ رفیقہ کے بارے میں، میرے خیالات پر بھی بات ہوئی۔ میں نے اس کے احوال ماضی جاننا چاہے تو وہ دوبارہ غمزدہ ہو گئی۔ کہنے لگی۔

''میری زیست طوفانوں کا تسلسل رہی۔ اس میں سکون کے جزیرے خال خال تھے''۔ یکدم گہرا کرب اس کے چہرے پر نقش ہو گیا اور وہ رونے لگی۔ میرا اصرار بڑھا تو اس نے ماضی پر سے پردہ اٹھایا۔ پتا کا آغاز اس روز سے کیا جب اظہر اس کی زندگی میں آیا تھا۔ کہانی نے فضا کو اور بھی سوگوار کر دیا، سرگزشت کچھ اس طرح تھی۔

وہ ایک طوفانی رات تھی مجھے یاد ہے کہ بادل دھرتی پر ٹوٹ پڑے تھے۔ حیات پناہ گاہوں میں مقید ہو کر رہ گئی تھی۔ ایسے میں ہمارے گھر کا دروازہ مسلسل بجنے لگا۔

''خدا خیر کرے''۔ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ خالہ کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی مگر دروازہ تھا کہ مسلسل بج رہا تھا۔ مجبوراً مجھے اٹھ کر جانا پڑا۔ صحن عبور کرتے ہوئے طوفانِ باراں میں بھیگ گئی۔ بیرونی دروازہ کھولا تو سامنے اظہر کھڑا تھا۔ پانی اس کے لباس سے زینوں پر بکھر رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھیں ریچھ کی طرح چمک اٹھیں۔ میں نے یہ ریچھ زندگی میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اجنبی کے طور پر اسے وہاں پایا تو میں خوف کے مارے کانپنے لگی۔ اس کی نگاہیں میرے وجود میں کھب گئی تھیں۔

''کمال ہے، ماں نے تاروں کی مخلوق پال رکھی ہے''۔ اس نے زبان لبوں پر پھیرتے ہوئے کہا، پھر مجھے چھوتا ہوا گھر میں داخل ہو گیا۔

''ماں! یہ حور پری کہاں سے لے آئی ہو؟'' اس نے چھوٹتے ہی خالہ سے میرے بارے میں دریافت کیا پھر بے حیائی سے میری طرف دیکھنے لگا۔ اس کی تیز نگاہوں نے مجھے پسینے میں شرابور کر دیا۔

''یہ رانی ہے''۔ خالہ نے اسے بتایا۔

''رانی''۔ اس نے معنی خیز لہجے میں میرا نام دہرایا پھر اس کی باچھیں کانوں تک کھل اٹھیں اور مسکراہٹ میں میلے کچیلے دانت جھانکنے لگے۔

''یہ اظہر ہے میرا بیٹا''۔ خالہ نے مجھے بتایا۔

وہ چھ سال قید بامشقت کاٹ کر آیا تھا۔ میں جانتی

تھی کہ وہ لڑکپن ہی میں آوارہ ہو گیا تھا اور ماں کا ساتھ چھوڑ چکا تھا۔ اس کا یوں گھر لوٹ آنا خالہ کے لئے بھی ناخوشگوار تجربہ تھا۔

''ماں! بدن پر پھوڑا نکل آئے تو عضو کاٹ نہیں دیتے بلکہ ناسور کا علاج کرتے ہیں۔ تم ہو کہ مجھے اپنے گھرانے سے علیحدہ کرنا چاہتی ہو۔ کیا یہ ممکن ہو سکے گا؟ کیا تم نہیں چاہتیں کہ میں اپنا گھر بساؤں اور تمہاری خدمت کروں؟'' ایک روز وہ ماں سے جھگڑ پڑا۔

''کون سی ماں یہ نہیں چاہے گی؟'' خالہ نے جواب دیا۔

''تو پھر میری شادی رانی سے کر دو۔ وہ بیرون ملک جانے والی ہے۔ اس کے ساتھ میری قسمت بھی جاگ اٹھے گی''۔ اظہر نے رائے دی۔

میرے پاؤں تلے سے زمین کھسک گئی۔ خالہ نے فوراً معاملہ ٹال دیا مگر میرا دل اندیشوں کی آماجگاہ بنتا گیا۔ اظہر ایک نکھٹو شخص تھا۔ وہ دن بھر گھر میں پڑا رہتا تھا۔ مجھے اس کے ارادے خطرناک دکھائی دیتے تھے۔ کسی بھی وقت وہ کوئی ایسی حرکت کر سکتا تھا، جس کے باعث میں ابدی کرب میں مبتلا ہو جاتی۔ میں ہر دم خالہ کے ساتھ چپکی رہتی تھی۔ حالات تیزی سے خرابی کی طرف جا رہے تھے۔ ایک روز ماں بیٹے کے بیچ شدید لڑائی ہوئی۔ میں گھر میں داخل ہوئی تو ٹھٹک کر رہ گئی۔ اظہر گلا پھاڑ پھاڑ کر بول رہا تھا۔

''میں ہر قیمت پر رانی کا ہاتھ چاہتا ہوں''۔ اس نے کہا۔

''تم اس شریف زادی پر ظلم نہیں ڈھاؤ گے''۔ خالہ نے اسے جواب دیا۔

''ظلم کیسا؟ لاوارث کو اس سے بہتر گھرانہ کہاں مل پائے گا؟'' وہ بولا۔ اس کے چہرے پر ڈھٹائی تھی۔ اس دوران اس کی نظر مجھ بے کس پر پڑ چکی تھی۔ اگلے ہی لمحے

ترقی

چیونٹی کے پاؤں لے کر پیدا ہوتی ہے لیکن جوان ہونے تک اس کے پاؤں ہاتھی جتنے بڑے ہو جاتے ہیں۔ (دستگیر شہزاد)

اس نے میرا گریبان دبوچ لیا۔

''نکاح نامے پر دستخط کرو، ورنہ میں تمہاری جان لے لوں گا''۔ اس نے خنجر کی نوک میری گردن پر عقبی سمت ٹکا دی، پھر جھٹکے سے میرے بال گرفت میں تھام لئے۔ درد کے مارے میرے حلق سے چیخ نکل گئی مگر میں نے ہمت کر کے اسے تکمیل تمنا میں ناکام بنا دیا۔ میرے شعور میں نہ جانے کیا مغالطہ تھا جو اس دم میں آپ کو پکار رہی تھی۔ چیخ چیخ کر آپ کو بلا رہی تھی۔ اس روز تو جان بچ گئی مگر اظہر مسلسل اپنی چالبازیوں میں مشغول رہا۔

ایک شب کے پچھلے پہر میں ہڑبڑا کر نیند سے جاگی تو وہ منحوس خالی فارم پر میرا انگوٹھا ثبت کر چکا تھا۔ اس دم اس کا رویہ اتنا دھمکی آمیز ہو گیا تھا کہ خالہ بھی اس کے مقابل بے بس ہو گئی۔ کوئی تسلیم کرتا نہ کرتا، میری شادی اظہر سے ہو چکی تھی۔ کم از کم وہ یہی سمجھتا تھا کیونکہ اس کی تحویل میں مکمل نکاح نامہ موجود تھا۔ شادی کے گواہ بھی پیدا ہو چکے تھے۔ وہ شادی کے مراحل میں آگے بڑھنا چاہتا تھا۔ میں نہیں جانتی تھی کہ اگلے روز کیا ہو گا؟

انہی دنوں خالہ دل کی بیماری میں مبتلا ہو گئی۔ خالہ تو مرتے مرتے بچ گئی مگر میں جیتے جی مر گئی۔ اس روز بھی طوفان اپنے عروج پر تھا جو میرے نصیب پر چھا گیا۔ ہسپتال سے خالہ کے لئے دوا لینے نکلی تھی کہ خود سانحے کا شکار ہو گئی۔ دن دیہاڑے جرائم پیشہ افراد نے مجھ پر غلبہ پایا اور زبردستی اپنی گاڑی میں ڈال لیا۔ پھر مجھ پر بندوقیں تان لی گئیں۔ سنبھلی تو زندان میں قید تھی۔ اندازہ ہوا کہ چند گھنٹوں سے بے ہوش تھی۔ جی متلا رہا تھا اور سر بھاری

تھا۔ اتنا گھبرائی کہ جینے کا حوصلہ جاتا رہا۔ مجھے آنکھوں کے سامنے اپنی لاش نظر آنے لگی جسے گیدڑ اور گدھ نوچ رہے تھے۔ جی چاہا کہ مر جاؤں مگر کیسے؟ کبھی زندگی بھی سزا بن جاتی ہے، جو کاٹنا پڑتی ہے۔

زندان میں اندھیرا تھا۔ مدھم روشنی اکلوتے روشن دان سے اندر آرہی تھی۔ شاید شام پڑ رہی تھی۔ باہر چند لوگ گفتگو کر رہے تھے۔

''چوہدری جابر نئی داشتہ لے آیا ہے؟'' کوئی کہہ رہا تھا۔

''شریف لڑکی دکھتی ہے، لا وارث ہے کیا؟'' دوسرے نے سوال کیا۔

''وارث نے خود بیچی ہے۔'' ایک تیسرا شخص بولا۔

یہ بات سن کر میری تو جیسے جان نکل گئی۔

''چوہدری نے کل دوستوں کو بلا رکھا ہے، شراب اور شباب کی محفل سجے گی'' پہلے فرد کی آواز تھی۔

''یہ لاڈو کہاں رہے گی؟'' کسی اور نے پوچھا۔ اس کی آواز میں لچر پن تھا۔

''چک داسو والے ڈیرے پر''۔ پہلے فرد نے جواب دیا۔

''چک داسو والے ڈیرے پر میرے ساتھ جو سلوک ہوا اسے زبان پر لانا اور لفظوں کا پیرہن پہنانا بہت مشکل ہے۔ اس شب تعارف ہوا کہ انسانیت سوزی کیا ہوتی ہے۔ انسان بھیڑیوں کا روپ بھی دھا لیتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب! آپ کی سٹرابری اس رات روح تک زخم زخم ہوگئی تھی۔ کسی نے اس کی چیخوں کی آواز بھی نہ سنی۔ وہ نیم بے ہوشی میں بھی آپ کو بلاتی رہی، مدد کے لئے پکارتی رہی، مگر لگا کبھی بے کس کے دکھ پر چرخ بھی نہیں روتا۔

میں پانچ برس چوہدری کی قید میں رہی، اس کے مظالم جھیلتی رہی۔ وہ رویوں میں انتہا پسند تھا مگر دوستوں کا بہت شیدا تھا۔ رحم کرنا بزدلی جانتا تھا۔ اپنی جاگیر میں فرعون کہلاتا تھا اور اس کی جاگیر اس قدر وسعت رکھتی تھی کہ اس میں تین ریلوے سٹیشن قائم تھے۔ اس نے پانچ نجی ڈاک بنگلے بھی بنا رکھے تھے، جن میں داشتائیں موجود رہتی تھیں۔ میرے خلاف گہری سازش ہوئی تھی۔ میرے عوض اس نے اظہر کو شہر میں پلاٹ دیا تھا۔

کچھ عرصہ ساتھ چلی تو چوہدری مجھے پسند کرنے لگا۔ میری شخصیت نے شاید اسے متاثر کر دیا تھا۔ میرے پاس تنہا آنے لگا، باتیں بھی کر لیتا۔ انکشاف ہوا کہ اظہر اس کا کارندہ تھا اور چوہدری نے مجھے پہلی بار خالہ کے ہمراہ ہسپتال میں دیکھا تھا۔ وہیں میری قیمت لگ گئی تھی۔ میں چوہدری سے صرف ایک بات منوا سکی تھی۔ میری خواہش پر اس نے مجھ سے نکاح کر لیا تھا۔ دراصل میں گناہ آلود زندگی نہیں چاہتی تھی۔ یہی واحد تمنا تھی جو وہاں میرے اوپر احسان کا بار بنی۔ چوہدری خاندان میں جائیداد کے جھگڑے موجود تھے، جو بالآخر چوہدری جابر کے قتل کا باعث بنے۔ اس قتل کے بعد چوہدری کے لواحقین نے مجھے آزاد کر دیا۔

میں آزادی پا کر اور بھی لاوارث ہوگئی۔ پہلے خالہ کے گھر گئی۔ معلوم ہوا کہ خالہ انتقال کر چکی تھی۔ اظہر پولیس مقابلے میں ہلاک ہو چکا تھا جبکہ گھر پر خالہ کا کزن قابض ہو چکا تھا۔ اس نے میرے ساتھ بہتر سلوک کیا۔ میں چند ایام اس خاندان کے ساتھ رہی مگر ان سے اپنے حقائق چھپاتی رہی۔

وہاں سے میں اُس گھر چلی آئی جو کبھی آپ کا اور میرا آستاں ہوا کرتا تھا۔ میں بے یار و مددگار تھی اور دوسری بار ان دروازوں میں داخل ہو رہی تھی۔ اس بار نہ تو میں سٹرابری تھی اور نہ آپ وہاں موجود تھے۔ میرے دل میں ہول اٹھنے لگے۔ وہاں میری زندگی کی بہترین یادیں بکھری پڑی تھیں مگر ان سے وابستہ افراد بچھڑ چکے تھے۔

میں نے تین چار جگہوں پر بیٹھنے کی کوشش کی مگر بے چین ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ گھر نے مجھے اتنی تشفی دے دی کہ میں وہاں زار و قطار رونے لگیں روتا تو آدمی بہت بار ہے مگر ماں کے دامن میں چہرہ چھپا کر رونا دل کے غبار نکال دیتا ہے۔ میں وہاں اتنا روئی کہ زندگی کے اس مقام پر واپس چلی آئی جہاں سے بھٹک کر دنیا کے جنگل میں کھو گئی تھی۔ ملازم بابا مجھ روتا دیکھتا رہا، پھر اس نے میرے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس دم مجھے محسوس ہوا کہ میں کائنات کے محفوظ ترین مقام پر پہنچ گئی ہوں اور یہی آماجگاہ میری پناہ گاہ ہے۔ مجھے قرار آ گیا۔

پتہ چلا کہ گھر کے باغیچے میں مالی سٹرابری کی فصل صرف اس لئے کاشت کرتا تھا کہ وہ پھل مجھے بہت پسند تھا۔ زندگی میں پہلی بار احساس ہوا کہ اپنائیت نوعِ انسانی کی واحد خوبی ہے، جو رشتے جنم دیتی ہے۔ ملازم بابا یہ چاہتا تھا کہ میری واپسی کے بارے میں خبر آپ لوگوں کو پہنچا دی جائے مگر میں نے اسے منع کر دیا۔ ماضی کے تاریک دور نے میرا اعتماد متزلزل کر دیا تھا اور میں سمجھتی تھی کہ میرا وجود معزز خاندانوں میں ناسور سمجھا جائے گا جس کے بعد مجھے ٹھکرا دیا جائے گا، آخر حقارت ہی میرا مقدر رہے گی۔

شاہ صاحب کے پاس مجھے ملازم بابا لے کر گیا تھا۔ انہوں نے مجھ پر مہربانی کی کہ اپنے اداروں میں پناہ دے دی۔ جب تک ملازم بابا زندہ رہا میں اس کے پاس چلی جایا کرتی تھی۔ بیٹے نے اس کی جگہ لی تو میں نے وہاں جانا ترک کر دیا۔ اس بیچ میری زندگی نئی ڈگر پر چل نکلی تھی۔ دربار کے ماحول نے میری منزل کا تعین کر دیا تھا۔

رانی کی کہانی کا ہر انگ افسردگی میں لتھڑا ہوا تھا۔ اس کے جملے تیروں کی صورت میرے دل میں کھب گئے تھے۔ مجھے احساس ہوا کہ اس کے پرسکون وجود میں الم سمندروں کی مانند گہرے تھے۔ وہ اس کرب سے تنہا کیسے گزری ہو گی؟ اس خیال نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ زندگی سے بھرپور لڑکی چند سالوں میں چلتی پھرتی لاش دکھنے لگی تھی اور وہ ان امور پر شرمندہ تھی جو کبھی اس کے بس میں نہیں تھے۔

''میں ہواؤں کے دوش پر پتوں کی طرح اڑتی رہی''۔ اس نے آنسو بہاتے ہوئے کہا۔ اس کے اشکوں نے مجھے اور بھی دکھی کر دیا۔ میں نے آہستگی سے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

جذبوں کے گرداب سے نکلا تو گرد و پیش پر نظر دوڑائی۔ دل میں الم ہو تو مناظر بھی اداس دکھائی دیتے ہیں۔ رات بھیگ چکی تھی۔ چاند آفاق کے سفر میں تھک چکا تھا۔ اس کی پھیکی کرنیں پہاڑی چوٹیوں پر اٹھلا رہی تھیں۔ فضا شبنم سے معمور تھی، فلک بھی رو پڑا تھا۔ شوریدہ ہواؤں میں کبھی جنگلی حیات کی صدائیں ابھرنے لگتیں۔ کوئل کی نوائیں ماند پڑ گئی تھیں۔ رانی البتہ جذبوں کی کسی اور منزل پر تھی۔

''وجدان میں مجھے یہاں مصور کا تخیل جھائی دیتی ہے، ہر رنگ میں''۔ اس نے کہا۔ ''ہر خوبصورتی خالق کائنات کا حصہ ہے، ہمہ اوست''۔ وہ بولی۔ اس دم مجھے لگا کہ وہ شکر و صبر کے رموز پا چکی تھی۔

آگ کا الاؤ شدت سے بھڑک رہا تھا۔ ناآسودہ جذبوں کی طرح پہروں جلنے والی لکڑیاں مہک سے مالا مال تھیں، پیار بھری خوشبو کی طرح۔ رانی قدرے آزردہ تھی۔ اس نے عہد ماضی کی طرف تلخ سفر طے کیا تھا، جس کے اثرات اس کے غمگین چہرے پر عیاں تھے۔

''رانی! پیچھے مڑ کر دیکھوں تو میں کہہ سکتا ہوں کہ تمہاری محبت یکطرفہ نہیں تھی''۔ میں نے اعتراف کیا۔ موضوع بدل دیا۔

''اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا''

رانی کا اشارہ میرے ذاتی مقاصد کی طرف تھا۔
"جدائی پر تمہاری قربت کا بہت احساس ہوا"۔
میں نے دوسرا اعتراف کیا۔
"اب کیا ہو سکتا ہے؟" اس نے مایوسی میں آہ بھری، میری طرف دیکھا۔
"ہم محبت کے سہارے آگے بڑھ سکتے ہیں"۔
میں نے برملا کہہ دیا، وہ چونک اٹھی۔
"گل کھلا ہوا ہو تو محبت یہ تقاضا نہیں کرتی کہ اسے زیب گلو کر لیا جائے"۔
"اسے جیون کے گلدان میں سجا لینا بھی تو معیوب نہیں"۔
"مجھے معاشرے نے ڈس لیا ہے۔ مناسب نہیں کہ میں بھی آپ کو ڈس لوں"۔
"تمہیں حاصل کر لینا میری خوش بختی ہوگی"۔
"نہ تو جذبے اس طرح جواں رہے ہیں اور نہ وہ روپ عیاں"۔
"خوبصورتی بھانپنے والوں کی آنکھوں میں ہوتی ہے"۔
"کہاں کی آنکھیں کہ اب تو چہروں پہ آبلے ہیں اور ان آبلوں سے بھلا کوئی کیسے خواب دیکھے، سچ تو یہ ہے کہ میں آپ کے قابل نہیں رہی"۔
"یہ فیصلہ کرنا میرا استحقاق ہے"۔
"شاید میں میلا دیکھ کر واپس لوٹ چکی ہوں"۔
"رانی! مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ میری طرف آ جاؤ اور میری دنیا سنوار دو"۔
"بہت سوچنا پڑے گا"۔
میں نے رانی کو فیصلے تک پہنچنے کے لئے مہلت دے دی۔ جب میں واپسی کا سفر طے کر رہا تھا تو مجھے اس کی خوبصورت نوا سنائی دینے لگی۔
"مینڈا عشق وی توں، مینڈا یار وی توں
مینڈا دین وی توں، انعام وی توں
مینڈا جسم وی توں، مینڈا روح وی توں
مینڈا قلب وی توں، جند جان وی توں"
میری واپسی کا ابتدائی سفر اس کی نغمہ سرائی میں طے ہوا، باقی مسافت میں اس کی سوچیں ہمرکاب رہیں۔ دونوں صورتوں میں اس کا خیال میرے ذہن پر غالب رہا اور وہ پوری طرح میرے ساتھ ساتھ رہی۔ گھر پہنچا تو دلی کیفیت کچھ اس طرح تھی۔
پتے بکھر رہے تھے، تیز تھی ہوا
لیکن تیرے خیال کا جلتا رہا دیا
دو روز بعد میں دربار گیا تو رانی وہاں موجود تھی۔ شاہ صاحب سے بھی ملاقات ہوئی۔ کہنے لگے کہ میں نے لڑکی سے کہا ہے کہ شادی کے بارے میں آپ کی پیشکش قبول کر لے۔ اب حتمی فیصلہ اسی کو کرنا ہے۔
چھٹی کا دن تھا اور صبح کے دس بجے ہوں گے۔ شمس کی چمکیلی کرنیں وادی کو سیراب کر رہی تھیں، موسم معتدل تھا، میں اور رانی آہستہ آہستہ چلتے ہوئے قریبی جنگل میں جا پہنچے۔ خودرو جھاڑیوں کے بیچ پتھروں پر بیٹھ جانا اچھا لگا۔ پرندوں کے جھرمٹ گرد و پیش میں چہچہا رہے تھے۔ جنگلی حیات کے کئی شاہکار بھی نظر آئے، جلد ہی یہ انگ آب و تاب سے سجنے لگا اور کوئل کی صدا کہیں دور سے ابھرنے لگی۔ الم کی فضا جنگل میں پھیل گئی میں نے پانی کے جھرنوں میں مچلتا ہوا پھول منتخب کیا اور رانی کے بالوں میں سجا دیا۔
"الم زندگی کا حصہ ہے، لہو کی طرح جسموں میں موجزن رہتا ہے"۔ رانی بولی۔
"ہاں"۔ میں اس کی طرف متوجہ ہوا، دھیان آبی قطروں میں منڈلاتی تتلیوں کی طرف بھی تھا۔
"مجھے کبھی خواہشیں بھی الم دکھنے لگتی ہیں"۔
"تمہاری اکثر تمنائیں ادھوری رہ گئیں"۔
"ہاں، میں نے انہیں کچل دیا"۔

''کیا یہ ممکن ہے؟ بغیر خواہشوں کے جینا؟''

''دنیا نے میرے لئے جیون کا یہ پہلو ممکن بنا دیا ہے۔ آپ نے سنا ہوگا، کسی شاعر نے کہا تھا۔

دنیا نے ہمیں چھوڑا جذبی ہم چھوڑ نہ دیں کیوں دنیا کو
دنیا کو سمجھ کر بیٹھے ہیں، اب دنیا دنیا کون کرے
سچ تو یہ ہے کہ دنیا متاع قلیل ہے اور ملعون بھی۔

سونے کی بھی بن جائے تو بھی بے قیمت ہے۔ یہ ایمان کو اس طرح کھا جاتی ہے جیسے لکڑیوں کو آگ اور معرفت کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے''۔

''تو کیا تم تارک الدنیا ہو چکی ہو؟''

''نہیں، بس محبوب حقیقی سے لو لگا لی ہے۔ اس جانب چلنے میں بڑا سکون ملا ہے۔ میں نے عبادات میں تشفی پالی ہے''۔

''تو گویا اب تم شادی نہیں کرو گی؟''

''ڈاکٹر صاحب! آپ نے یورپی خواتین دیکھیں، وہ آپ کو متاثر نہ کر سکیں۔ اس لئے کہ وہ عیش پرستی میں حدیں عبور کر چکی تھیں، آپ کا گھرانہ نہ سنبھال پاتیں۔ میں ان کی مخالف سمت چل پڑی ہوں اور آگے بھی بڑھ چکی ہوں، راہِ حیات میں آپ کو مایوس کر دوں گی، آپ کی ضروریات پوری نہیں کر سکوں گی، آپ کی زندگی اجیرن ہو جائے گی۔ بارہا گہرے رشتے تلخ حقائق کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں''۔

''اور اگر تمہیں میرا ساتھ حاصل رہے تو؟''

''گر عشق حقیقی است و گر عشق مجاز است
مقصود ازیں ہر دو سرا سوز گداز است

عشق حقیقی ہو یا مجازی، دونوں میں مقصود ہے، جلتے رہنا۔ میری ترجیح اب عشق حقیقی ہے کیونکہ یہی منازلِ عشق میں عظیم ترین ہے۔ عشق ایک طرف قربان ہو جانے کا دوسرا نام ہے''۔

رانی کی باتوں نے میری سوچوں کا دھارا موڑ دیا۔ مجھے یقین آ گیا کہ وہ شادی کے بندھن سے کترا رہی تھی اور اس سلسلے میں اس کی اپنی وجوہات موجود تھیں، جو اس کے کڑے ماضی کی وجہ سے جنم پا چکی تھیں۔ وہ دل پر پتھر رکھ چکی تھی۔

''ٹھیک ہے رانی، زندگی تمہاری ہے، تم اسے جس طرح گزارنا چاہو، گزار سکتی ہو، مگر ایک وعدہ کرو کہ تم میرے ساتھ روابط استوار رکھو گی''۔

''آپ کا میری طرف رجحان میرے لئے بڑی سعادت ہوگی''۔

''رانی گھر واپس آ جاؤ، اپنا گھر سنبھال لو۔ وہاں ملازم موجود ہیں جنہیں ہم مدتوں سے جانتے ہیں۔ تم اپنی زندگی کے معمولات وہاں قیام کر کے بھی انجام دے سکتی ہو''۔

اگلے روز رانی میرے ساتھ گھر میں منتقل ہو گئی۔ ہم دونوں چند گھنٹے اکٹھے رہے۔ اسی رات مجھے لندن کے لئے پرواز لینا تھی۔ شب دیر تک ہم باغیچے میں بیٹھے رہے۔ میں نے رانی سے کہا۔

''تمہیں اپنی منتخب راہیں مبارک، مگر ایک دریچہ میری جانب کھلا رکھنا، پیار اور توجہ کا۔ ایسے بے لوث رشتے کا جس پر ہم دونوں فخر محسوس کر سکیں اور اس ناطے زندگی میں بار بار مل سکیں''۔ ہم دونوں کی آنکھوں میں اشک اتر آئے۔

''میں بھی آپ سے یہی درخواست کروں گی، زندگی میں غالباً دوسری بار''۔ رانی نے کہا پھر وہ میرا ہاتھ تھام کر زار و قطار رونے لگی۔ دوراں نے ہم دونوں کی راہیں متعین کر دی تھیں۔ ایک بار پھر جدائی کا وقت آن پہنچا تھا۔

اپنی یادوں کو سمیٹیں گے بچھڑنے والے
کسے معلوم ہے پھر کون کدھر جائے گا

***

بات ہے رسوائی کی

حسد کی آگ میں جلنے والے ایک بدفطرت شخص کا احوال جس نے اپنی آگ میں ایک بے گناہ کو جلا دیا۔

حسد کی آگ

دستگیر شہزاد ----------------0300-9667909

قتل کی اطلاع ملتے ہی انچارج انسپکٹر ہاؤسنگ کالونی عثمان سیال موقعۂ واردات پر پہنچ گئے۔ ان کے ساتھ اے ایس آئی رضوان احمد اور دیگر عملہ بھی تھا۔ مرنے والا وقار احمد تھا جو علاقے میں وقار جٹ کے طور پر مشہور تھا۔ اُس کی پہچان سول ورکرز اور سیاست دان کے طور پر تھی۔ عثمان سیال نے لاش کا معائنہ کیا۔ مقتول کو تین گولیاں لگی تھیں۔ ایک گولی چھاتی پر، دوسری پیٹ پر اور تیسری گولی کنپٹی پر۔ حالانکہ پہلی دو گولیاں بھی جان لیوا تھیں مگر کنپٹی میں لگی تیسری گولی نے وقار کا بھیجا اڑا دیا تھا جس کے نتیجے میں اُس کی فوری موت ہوگئی تھی۔ موقع پر وقار کا بھائی شاہد جٹ اور اُس کا ایک دوست حمزہ موجود تھے۔

عثمان سیال نے جب تحقیقات کیں تو پتہ چلا کہ قتل کونسلر بندوقا نے کیا تھا۔ یہ نام عثمان سیال کے لئے نیا نہیں تھا۔ وہ نیشنل عوامی پارٹی کا ممبر عاطف خاں عرف بندوقا تھا۔ پھول پور کے کسی نہ کسی تھانے میں صبح و شام اس کی بیٹھک ہوتی تھی۔ علاقے میں مشہور تھا کہ جس کا کوئی کام تھانے میں پھنسا ہو اُسے کروانے کے لئے بندوقا سے ملو۔ وہ خود بھی کھاتا ہے اور پولیس کو بھی کھلاتا ہے۔ بہرحال پولیس کے ٹاؤٹ کے طور پر وہ جانا جاتا تھا۔

پھول پور کے محلّہ سلامت پورہ میں لیلاں خاں

رہتے تھے۔ وہ فٹ ویئر کے تھوک و پرچون کاروباری تھے۔ لیلا خاں کے کنبے میں بیوی کے علاوہ صابر خاں، عاطف خاں عرف بندوقا، ناصر خاں نامی تین بیٹے اور تین ہی بیٹیاں شبانہ، شبنم اور تبسم تھیں۔ عاطف خاں عرف بندوقا ہر فن مولا قسم کا نوجوان تھا۔ سلامت پورہ میں جہاں جوتے چپل کی اس کی دُکان تھی اس کی ساتھ والی ایک دوسری دُکان میں اُس نے پی سی او کھول رکھا تھا۔ اُس پی سی او کو چلانے کے لئے اُس نے محلّے کی ہی عروبہ نامی ایک لڑکی کو رکھا ہوا تھا۔

غور طلب ہے کہ یہی عروبہ بندوقا کی گولی سے مارے گئے وقار جٹ اور حادثے کے چشم دید گواہ شاہد جٹ کی منہ بولی پھوپھی تھی۔ یہ منہ بولا رشتہ جوڑا تھا وقار کے باپ فرحان احمد جٹ نے۔ فرحان احمد جٹ محلّہ گلاب آباد میں رہتے تھے۔ ان کے کنبے میں بیوی کے علاوہ تین بیٹے شاہد، اظہر اور وقار تھے۔ ان کا مکان ضرورت سے زیادہ بڑا تھا۔ اس لئے اس کے کچھ کمرے وہ کرائے پر اٹھا دیتے تھے۔ تقریباً پندرہ سال پہلے ایک بیوہ عورت اپنی تین لڑکیوں کے ساتھ اس کے مکان میں رہنے آئی۔ ایک تو وہ بیوہ دوسرے جوان ہو رہی تین بیٹیوں کے ساتھ۔ فرحان احمد جٹ نے بہت کم کرائے پر انہیں اپنے گھر کا ایک حصہ دے دیا۔ اس کے علاوہ وہ اپنے معیار پر ان چاروں کے سکھ دکھ کا خیال رکھنے لگے۔ کچھ ماہ بعد بسنت کا تہوار آیا تو تینوں بہنوں نے فرحان احمد جٹ کو اپنا منہ بولا بھائی بنا لیا۔ فرحان جٹ نے یہ رشتہ خوب نبھایا۔ بہنوں کے تئیں بھائیوں کا جو فرض ہوتا ہے اُسے نبھانے میں وہ کبھی نہیں ہچکچائے۔ مکان کا کرایہ لینا ہی بند کر دیا۔ رشتہ اپنی جگہ تھا اور زندگی کے مسئلے اپنی جگہ۔ اسی سبب ان چاروں نے کچھ عرصہ بعد پڑوسی محلہ سلامت پورہ میں اوسط درجے کا ایک مکان کرائے پر لے لیا اور اس میں رہنے چلی گئیں۔

مکان بدلنے سے دل نہیں بدلے۔ یہ رشتہ پہلے کی طرح برقرار رہا۔ تینوں بہنوں میں سب سے بڑی عروبہ تھی، پڑھائی پوری کرنے کے بعد اس نے کام کی تلاش شروع کر دی۔ ڈھنگ کا کوئی کام نہیں ملا تو عاطف خاں عرف بندوقا کے پی سی او میں نوکری کر لی۔ پارٹی کے کاموں کے لئے بھی بندوقا کو وقت نکالنا پڑتا تھا۔ پارٹی کے کام سے جب وہ باہر جاتا تو عروبہ کو جوتے چپل کی اپنی دُکان کی زائد ذمے داری بھی سونپ جاتا تھا۔ عروبہ نے کبھی بندوقا کو شکایت کا موقع نہیں دیا تھا۔

عروبہ وغیرہ کی خیر خبر لینے فرحان جٹ اور ان کے بیٹے سلامت پورہ میں آتے جاتے رہتے تھے۔ چونکہ فرحان نے عروبہ کو بہن مان رکھا تھا۔ اس لئے اُس کے تینوں بیٹے حمزہ، اظہر اور شاہد جٹ اُسے بوا جی کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ بندوقا کے پاس پیسہ تھا، رتبہ تھا، ہاتھی کی طاقت اُس کے ساتھ جڑی ہوئی تھی۔ علاقائی شہری ہی نہیں پولیس والے اور دوسرے محکموں کے ملازم اُسے سلام کرتے تھے۔

کوئی بھی لڑکی ہو کنوارے پن کے دنوں میں ایسے ہی دولت مند و بااثر شوہر کے خواب دیکھا کرتی ہے۔ عروبہ کی آنکھوں میں بھی ایسے ہی خواب تھے۔ اپنے ہونے والے شوہر میں جن خوبیوں کا اُس نے تصور کیا تھا وہ سب عاطف خاں عرف بندوقا میں موجود تھیں۔ بس دونوں کے درمیان دیوار تھی تو برادری کی۔ عروبہ اس دیوار کی پروا نہ کرتے ہوئے بندوقا کی جانب راغب ہونے لگی۔ بندوقا پہلے ہی عروبہ پر فدا تھا۔ دونوں کی یہ کشش جلد ہی پیار میں بدل گئی۔ اس کے بعد الگ الگ رہ پانا ان کے لئے ممکن نہیں رہ گیا تو دونوں نے کورٹ میرج کر لی۔

پولیس کو یہ بھی معلوم تھا کہ وقار اور بندوقا کی دوستی بہت تھی۔ پھر کیا وجہ تھی کہ وقار کے قتل کا الزام بندوقا کے

سر رکھا جا رہا تھا۔ شاہد اور وقار کے دوست حمزہ کا کہنا تھا کہ بندوقا نے اپنے لائسنسی ریوالور سے اندھا دھند فائرنگ کر کے وقار کی جان لے لی۔ بندوقا کا نمائندہ ارسلان احمد اور دوست راجو چوہدری بھی اس کے ساتھ تھے۔ واردات کے بعد وہ تینوں فرار ہو گئے تھے۔

اختصار میں سنی گئی بات میں پولیس کے لئے سراغ ڈھونڈنا مشکل ہوتا ہے۔ اس لئے ایس ایچ او عثمان سیال نے شاہد اور حمزہ سے تمام واقعے کو بیان کرنے کے لئے کہا۔

شاہد کی آنکھیں خلا میں ٹک گئیں اور چھوٹی سے چھوٹی بات یاد کر کے اُس نے پولیس کو بتانا شروع کر دیا۔ فرحان جٹ اور اُن کے بیٹے اپنے پشتینی چاٹ پکوڑی کے پیشے کے کاروبار میں لگے ہوئے تھے۔ بعد میں بندوقا کے کہنے پر وقار اپنی قسمت کا ستارہ چمکانے کے لئے جائیداد کی خرید و فروخت میں لگ گیا۔ پراپرٹی کی ایسی ہی ایک ڈیلنگ میں پچاس ہزار روپے بندوقا پر بقایا تھے۔ چونکہ بندوقا وقار کا پھوپھا تھا۔ اس لئے اس نے لحاظ کے سبب اس سے تقاضا بھی نہیں کیا۔ مہینوں بیت جانے کے باوجود بندوقا نے حساب بے باق نہیں کیا اور وقار کو اچانک پیسے کی ضرورت پیش آ گئی۔ تو 15 فروری 2014ء کو اس نے بندوقا کو فون کیا۔

''پھوپھا جی! کہتے ہوئے اچھا نہیں لگ رہا لیکن مجبوری ہے اس لئے بُرا مت مانئے گا''۔ وہ ایک لحہ رُک کر پھر بولا۔ ''پھوپھا! میرے پچاس ہزار روپے آپ پر بقایا ہیں۔ اگر آپ دے دیں تو مہربانی ہوگی۔ مجھے اس وقت پیسے کی سخت ضرورت ہے''۔

''اوہ...... ایک دو دن میں تمہارا پیسہ مل جائے گا''۔ بندوقا ہنس کر بولا۔

اس کے بعد دونوں طرف سے رقم کے لین دین کی کوئی بات نہیں ہوئی۔ 17 فروری کی بات ہے۔ رات

ایک بار آسمان پر دو ستاروں نے اپنے سینگ پھنسا لئے، وہ ساری رات لڑتے رہے اور اپنے تیز دندانوں سے ایک دوسرے کو اچھا خاصا گھائل کر دیا۔ مجبوراً آسمان کے سردار کو انہیں زمین پر بھیجنا پڑا۔ اُن میں سے ایک نے آتے ہی اعلان کیا۔ ''میں مقدر کا ستارہ ہوں''۔ تمام طالع آزماؤں نے اُس کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ دوسرا جو زیادہ تابناک تھا، رشکِ غم بنا اور ایک دکھیا کی آنکھ میں جھلملانے لگا۔ (دستگیر شہزاد)

تقریباً آٹھ بجے تھے، وقار اپنے بھائی شاہد کی مدینہ ٹاؤن میں واقع دُکان پر بیٹھا ہوا تھا تبھی بندوقا کا فون آ گیا۔

''کہاں ہو تم؟''

وقار نے اپنی لوکیشن بتا دی۔

''میں سلامت پورہ والے اپنے گھر میں ہوں''۔ بندوقا بولا۔ ''آ کر پیسہ لے لو''۔

''شکریہ پھوپھا جی! میں تھوڑی دیر میں آپ کے پاس پہنچ جاؤں گا''۔ کہہ کر وقار نے فون رکھ دیا۔ وقار اور شاہد پیسے لینے کے لئے بندوقا کے پاس جانا چاہتے تھے لیکن دُکان بھی نہیں چھوڑنا چاہتے تھے۔ انہیں انتظار تھا باپ فرحان جٹ کا۔ وہ آئے تو بندوقا کے پاس پیسہ لینے جائیں۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد وقار کے فون پر پھر بندوقا کا فون آ گیا۔ تم میرے گھر آنے کے لئے نکلے ہو یا نہیں؟

''پاپا آ جائیں تو اُن کے آتے ہی میں اور شاہد آپ کے پاس آ جائیں گے''۔

''ایسا کرو اب میرے سلامت پورہ والے گھر نہ آنا اور بی ایس کمپلیکس پہنچو''۔ بندوقا نے کہا۔ ''ایک ضروری کام سے میں بھی وہاں پہنچ رہا ہوں۔ یہ جگہ شاہد کی دُکان کے قریب ہے۔ تم لوگوں کو پہنچنے میں آسانی رہے گی اور میرا کام ہو جائے گا''۔

مداری

بیشتر لیڈر مداری ہوتے ہیں جو بھوک اور بدحالی ختم کرنے اور خوش حالی لانے کی ڈگڈگی بجا کر دلکش وعدوں کے ذریعے بدحال عوام کی ہمدردیاں حاصل کر لیتے ہیں۔ مگر ساتھ ہی وہ سوچتے ہیں کہ اگر ان کی بھوک مٹادی گئی تو پھر انہیں کون پوچھے گا۔ (دستگیر شہزاد)

اتفاق سے تبھی فرحان جٹ آ گیا۔ شاہد نے دُکان اس کے سپرد کی اور وقار کی کار میں سوار ہو کر دونوں چل پڑے۔ دونوں سیدھے پہلے بی ایس کمپلیکس نہ گئے بلکہ وقار پہلے اپنے گھر پہنچا۔ کار میں رکھا ہوا کچھ گھریلو سامان بیوی کو سونپا اور اُس کے بعد دوبارہ کار میں آ بیٹھا۔ تبھی حمزہ آ گیا۔ وہ وقار کا دوست تھا اور اُس سے ملنے آ گیا۔ چونکہ حمزہ سے بات کرنے کے لئے وقار کے پاس وقت نہیں تھا اور اس لئے اُسے بھی کار میں بٹھالیا۔ اس کے بعد گپ شپ کرتے ہوئے وہ تینوں بی ایس کمپلیکس پہنچ گئے۔ بی ایس کمپلیکس کے بیسمنٹ میں جہاں سے سیڑھیاں جاتی تھیں وہیں بندوقا کھڑا تھا۔ ارسلان اور راجو اس کے دائیں بائیں کھڑے تھے۔ بندوقا کو دیکھتے ہی وقار نے کار روک دی۔ اس کے بعد تینوں کار سے اتر گئے۔ کار سے اترتے ہی شاہد اور حمزہ کی نظر بیسمنٹ میں سیڑھیوں کے عین سامنے واقع احمد میڈیکل سٹور پر پڑی۔ شاہد کو یاد آ گیا کہ اس نے اپنی ماں کے لئے دوا لینی ہے۔ شاہد نے فوراً آگے بڑھ کر بندوقا کو محبت بھرا سلام کیا، اس کے بعد میڈیکل سٹور جانے کے لئے زینہ اتر گیا اور ماں کے لئے دوا خریدنے لگا۔ حمزہ بھی شاہد کے پیچھے ہو لیا تھا۔ اُس وقت وقار بندوقا کے پاس ہی کھڑا رہا۔

شاہد اور حمزہ میڈیکل سٹور سے دوا خرید ہی رہے تھے کہ اچانک فائرنگ کے دھماکوں کے ساتھ انہوں نے وقار کی چیخیں بھی سنیں۔ وہ دونوں تیزی سے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آئے تو انہوں نے وقار کو زمین پر تڑپتے دیکھا۔ سامنے ہی موت بن کر بندوقا کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں لائسنسی ریوالور تھا اور نشانہ تھا وقار۔ حمزہ اور شاہد یہ نظارہ دیکھ کر سناٹے میں رہ گئے۔ بندوقا ریوالور لہراتا ہوا اپنے ساتھیوں کے ہمراہ وہاں سے فرار ہو گیا۔ بندوقا وغیرہ کے جانے کے بعد حمزہ اور شاہد ہوش میں آئے۔ انہوں نے وقار کی خبر لی تو معلوم ہوا کہ وہ مر چکا ہے۔ مرنے اور مارنے والے سے علاقے والے واقف تھے اس لئے انہونی کے اندیشے سے دکانداروں نے دنادن دکانوں کے شٹر گرانے شروع کر دیئے۔

واقعے کی خبر پا کر پولیس موقعہ پر پہنچ چکی تھی۔ بازار بند ہو چکا تھا۔ البتہ جائے واردات پر بندوقا کے حمایتیوں اور وقار سے ہمدردی رکھنے والوں کی بھیڑ مسلسل بڑھتی جا رہی تھی۔ وقار کے سرِعام قتل سے عوام میں اشتعال تھا۔ اس لئے ہجوم نے بند دکانوں پر پتھراؤ کر کے امن وامان خراب کرنے کی کوشش کی۔ ایسے کسی غیر متوقع حالات سے نپٹنے کے لئے پولیس پہلے سے ہی تیار تھی۔ اُس نے معمولی طاقت کا استعمال کر کے ہجوم کو منتشر کر دیا۔ اس کے بعد پولیس کو خبر ملی کہ مشتعل ہجوم کونسلر بندوقا کے گھر کی طرف بڑھ رہا ہے اور لوگوں کا ارادہ بندوقا کے گھر میں توڑ پھوڑ، آتش زنی کرنے کا ہے، پولیس پہلے ہی سے مستعد تھی کہ اس منصوبے پر بھی اس نے پانی پھیر دیا۔

اسی دوران شاہد نے تھانہ ہاؤسنگ کالونی میں اس واقعہ کی رپورٹ درج کرادی۔ ایف آئی آر میں عاطف خاں عرف بندوقا اُس کے دوست راجو چوہدری اور ارسلان احمد کو نامزد کیا گیا تھا۔ اِدھر یہ سب ہو رہا تھا اُدھر پوسٹ مارٹم کے لئے وقار کی لاش ڈسٹرکٹ ہسپتال میں بھیج دی گئی۔ اس کے ساتھ ہی پولیس نے ملزموں کی
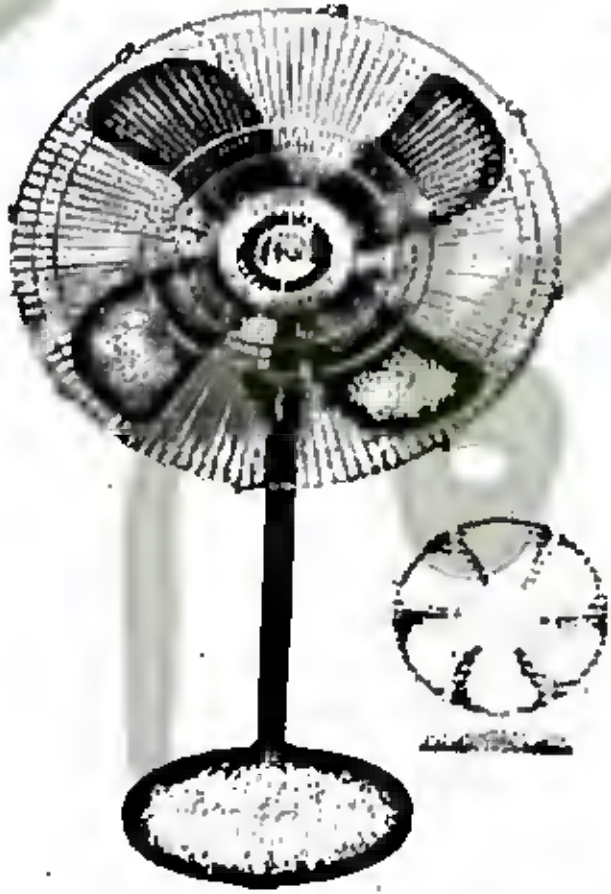
گرفتاری کے لئے اپنی مہم تیز کردی۔ آخر پولیس نے مخبر کی اطلاع پر آدھی رات کو جیل کے پیچھے ایک سنسان مقام سے قتل کے ملزم بندوقا کو گرفتار کرلیا۔ اس کے قبضے سے قتل میں استعمال ہونے والا ریوالور بھی برآمد کرلیا۔ یہ خبر پھیلتے ہی کہ ملزم گرفتار ہوگیا ہے۔ سخت سردی کے باوجود لوگ تھانہ ہاؤسنگ کالونی پر جمع ہونے لگے اور مطالبہ کرنے لگے کہ بندوقا کو ان کے حوالے کیا جائے۔

عوام کو دیکھتے ہوئے پولیس نے سخت حفاظت میں بندوقا کو وہاں سے کسی نامعلوم جگہ شفٹ کردیا۔ حقیقت میں بندوقا کو تھانہ صدر بازار لے جایا گیا تھا جہاں اُس سے پوچھ گچھ کی گئی تو وقار کے قتل کے پیچھے چھپا سچ سامنے آ گیا۔

بارہ سال قبل جب بندوقا نے عروبہ سے شادی کی تھی تب ہی سے وقار کا اس کے گھر آنا جانا تھا۔ بندوقا وقار کو مانتا بھی بہت تھا۔ بندوقا نے عروبہ سے کورٹ میرج تو ضرور کرلی تھی لیکن اس کے گھر والے اس سے خوش نہیں تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ بندوقا ان کی پسند کی شادی کرے۔ یوں بھی بندوقا نے عروبہ کو پشتینی مکان میں اپنے گھر والوں کے ساتھ نہیں بلکہ سیکٹر 6 میں فلیٹ لے کر رکھا ہوا تھا۔ بندوقا نے جب دیکھا کہ گھر والوں کی مرضی سے نکاح کئے بغیر اُس کا چھٹکارا نہیں ہے تو اس بارے میں اُس نے عروبہ سے بات کی۔ عروبہ بڑے دل والی لڑکی تھی۔ حالات کے مدِنظر اُس نے بندوقا کو ایک اور شادی کرنے کی اجازت دے دی۔ گھر والوں کی مرضی کے مطابق بندوقا نے برادری کی ایک لڑکی سے نکاح کرلیا اور بندوقا کی اصل بیوی کے روپ میں وہ اس کے گھر والوں کے ساتھ رہنے لگی۔ بندوقا کے دونوں ہاتھوں میں لڈو تھے، ایک گھر والی دوسری باہر والی۔

اس دوران وقار کی شادی جوہر ٹاؤن کے باشندے ضیاء اللہ کی بیٹی رانی کے ساتھ ہوگئی۔ بعد میں

روشنی

خدا کا گھر تو پہلے ہی بہت روشن ہے، تم بھلا اس میں اور روشنی کیا کرو گے۔ اگر روشنی کرنا ہی ہے تو اپنے اندر کرو جہاں اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ (دستگیر شہزاد)

رانی کے دو بچے ہوئے۔ اس وقت بیٹی زرینہ پانچ سال کی ہے جبکہ بیٹا ایاز ڈھائی سال کا۔

چونکہ بندوقا وقار پر مہربان تھا اس لئے اس نے وقار کو پراپرٹی کا کام شروع کرا دیا۔ ایک بار دھندہ چل گیا تو تقدیر کا ستارہ چمکتے دیر نہیں لگتی۔ اسی دوران جانے کیا ہوا کہ پولیس کے ٹاؤٹ کے طور پر بندوقا بدنام ہونے لگا۔ اس کے بارے میں کہا جانے لگا کہ پیسے لئے بغیر بندوقا کوئی کام نہیں کرتا۔ ایک طرف جہاں بندوقا کی مقبولیت کا گراف گر رہا تھا وہیں دوسری طرف وقار کا سماجی مرتبہ بڑھنے کے ساتھ ساتھ اس کے پاس آنے والی دولت کا انبار بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ اسی پیسے سے وقار نے اپنے لئے ایک لگژری فلیٹ خریدا تو تقریباً پندرہ لاکھ روپے کی ٹویوٹا کار بھی خرید لی۔ وہیں سے بندوقا کے دل میں وقار کے تئیں حسد کا جذبہ ابھرنے لگا اور اُسے خوف ہونے لگا کہ کہیں وقار اس سے آگے نہ نکل جائے۔ اسی لئے اُس نے وقار کو نقصان پہنچانے کے ارادے سے تین چار ڈیلنگ میں اپنے گاہکوں سے اڑنگا لگوا دیا۔ سودے رد ہوئے تو وقار کو وقتی طور پر نقصان نظر آنے لگا مگر کچھ دن بعد دوسری پارٹیوں سے ڈیل ہوئی تو وقار کو دس لاکھ روپے کا زائد فائدہ ہوا۔

اس خبر نے بندوقا کی کھوپڑی گھما دی۔ بعض بدخواہوں نے بندوقا کو بھڑکا دیا کہ وقار ہی اسے پولیس کے دلال کے طور پر بدنام کر رہا ہے۔ یہ سب اس لئے کہ عام لوگوں کے سامنے اس کی ساکھ خراب ہو جائے۔ آئندہ ہونے والے الیکشن میں وقار اس کے مقابلے میں

داغ اور عیب

جس طرح چاند کے داغ بڑھتے چاند کے ساتھ بڑے ہوتے ہیں اسی طرح عمر کے ساتھ انسان کے عیب بھی نمایاں تر ہو جاتے ہیں۔ (دستگیر شہزاد)

کھڑا ہو رہا ہے اور اس کا بندوقا سے مقابلہ ہوا تو جیت وقار کی ہو گی۔ یہ سن کر بندوقا کا خون کھول گیا۔ میری بلی اور مجھی سے میاؤں۔

بندوقا نے سنجیدگی سے مختلف پہلوؤں پر غور کیا کہ وقار اسے دھندے میں پیچھے دھکیلنے کی کوشش میں ہے۔ اس کے پاؤں تلے کی سیاسی زمین بھی کھینچ لینا چاہتا ہے۔ بندوقا نے وقار کو قابو میں کرنے کی گہرائی سے سوچ بچار کی تو اس نتیجے پر پہنچا کہ اس کا سہارا لے کر وقار جتنا آگے بڑھ چکا ہے وہاں سے اُسے کھینچ کر پرانی جگہ لانا ممکن نہیں رہا۔ اس لئے بہت غور کرنے کے بعد بندوقا نے وقار کے قتل کا منصوبہ بنا لیا۔ اپنے اس منصوبے میں اس نے ارسلان احمد اور راجو چوہدری کو بھی شامل کر لیا اور پھر 17 جنوری کو خود فون کر کے وقار کو بی ایس کمپلیکس بلایا اور گولیاں ماردیں۔ بندوقا نے چار فائر کئے تھے جس میں سے پہلا فائر مس ہو گیا تھا باقی کی تین گولیاں نشانے پر لگی تھیں۔

بندوقا نے اپنا جرم قبول کر لیا تو اُس کی نشاندہی پر ارسلان احمد اور راجو چوہدری کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ تادمِ تحریر تینوں ملزمان جیل میں تھے۔ انتقام بھی نشے جیسا ہے، جتنا پرانا ہو جتنی دیر سے لیا جائے اتنا ہی مزہ دیتا ہے لیکن جتنا مزہ دیتا ہے اُتنا ہی نقصان دہ ہوتا ہے۔ بیس برس بعد انتقام لینا اپنے قیمتی بیس برس کسی دشمنی سے مغلوب کر کے گھٹیا جذبات کی نذر کرنا ہے۔

●

کسی انسان کی بیوی کو بھی اس کے اتنے رازوں کا علم نہیں ہوتا جتنا کہ لنگوٹئے کو۔
آیئے! دیکھیں خادم حسین مجاہد کے لنگوٹئے ان کے کیا کیا پول کھولتے ہیں۔

لنگوٹئے کے قلم سے

جب یہ پیدا ہوئے تو ان کی والدہ نے انہیں اللہ کی عنایت سمجھتے ہوئے محمد عنایت نام تجویز کیا کیونکہ وہ ان سے قبل اپنے پہلے بچے کو کھو چکی تھیں لیکن ان کی دادی نے ان کا نام خادم حسین رکھ دیا اور حکومت چونکہ انہی کی تھی لہٰذا یہی نام رائج ہوا اور کاغذوں میں لکھا گیا۔ مجاہد کا اضافہ انہوں نے نام کو رعب دار بنانے کے لئے خود کیا کیونکہ ان کے خاکسارانہ نام سے لوگ ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے تھے۔

پھر بچپن میں مثانے میں انفکشن کے باعث جب سے بیمار ہوئے تو دیہاتی رواج کے مطابق عامل کے پاس لے گئے جس نے اسے سایہ یعنی جادو کے تعویذات کا شاخسانہ قرار دیا اور توڑ کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی حکم دیا کہ نام بدل کر امجد حسین کر دیا جائے تاکہ جادو کے اثرات کم ہو سکیں۔ یہ چند سال امجد حسین بھی رہے لیکن جب عاملوں سے خاصی جیبیں ہلکی کرانے کے بعد بھی ان کی حالت بہتر ہونے کی بجائے مزید بگڑتی گئی تو بالآخر لے جایا گیا اور ان کو یورالوجسٹ کے پاس جو انہیں ملک الموت کے ہاتھوں سے چھین لائے ورنہ خارورڈ قسم کی مائیاں تو ان کے گھر پہ سہ دینے بھی آ چکی تھیں۔

ان کے صحت یاب ہونے پر ان کے والد صاحب نے ان سب عاملوں کا شجرۂ نسب نئے سرے سے مرتب کرتے ہوئے اس میں کئی خبیث اور نجس جانوروں کا اضافہ کیا اور ان کا پرانا نام بحال کرنے کے ساتھ ساتھ سزا بھی مقرر کی کہ جو ان کو عامل کے دیئے ہوئے نام سے پکارے گا اس کا حشر کر دوں گا۔ یوں بچپن سے ہی ان کے تین نام ہو گئے بعد میں جب انہوں نے لکھنا لکھانا شروع کیا تو ان کی رفتار اتنی تھی کہ اخبارات و رسائل کم پڑ گئے نتیجتاً انہوں نے کئی ناموں سے لکھنا شروع کر دیا اور

اب بھی یہی صورتِ حال ہے۔ شاید اس کی لاشعوری وجہ بچن کے یہ واقعات بھی ہوں۔
قلمی ناموں کے علاوہ انہوں نے کئی فرضی مزاحیہ کردار بھی تخلیق کیے جو خاصے مقبول ہوئے جیسے فارغ خان خیالی، گفتار غازی، منطق فلسفی، آخری درویش، طوطی فرام نقار خانہ اور بابا شوقی۔ ان کے کرداروں کی خاص بات یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک اسم بامسمّٰی ہے۔ انہوں نے کچھ زنانہ کردار بھی متعارف کرائے جن کی کھلی وضاحت کی جائے تو کئی لوگوں کے دل ٹوٹ جائیں گے کیونکہ وہ انہیں اصلی شخصیات ہی سمجھتے ہیں۔ ان میں کشش سسٹرز زیادہ اہم ہیں جو اس مشترکہ نام کے علاوہ اپنے انفرادی ناموں سے بھی رسائل میں مردوں کے خلاف محاذ گرم کیے رکھتی تھیں اور خواتین انہیں اپنی لیڈر سمجھتی تھیں۔
بچپن کی تین سالہ بیماری میں حکیموں اور ڈاکٹروں نے ان پر ہر قسم کی دواؤں کے تجربات کیے تھے اور میڈیکل سٹورز پر موجود شاید ہی کوئی گولی ٹیکہ یا سیرپ ایسا ہو جو انہوں نے استعمال نہ کیا ہو۔ شاید اسی کا انتقام لینے کے لیے انہوں نے میڈیکل کورس کر کے میڈیکل سٹور بھی بنائے رکھا لیکن تغیر پسند طبیعت کے باعث مستقل بنیادوں پر کوئی بھی کاروبار نہ کیا اس لیے انہوں نے جو بھی کام شروع کیا وہ کچھ عرصے بعد ہی ان کے کسی بڑے یا چھوٹے کو سنبھالنا پڑا اس کا ان کو البتہ یہ فائدہ ہوا کہ بنا بنایا جما جمایا کاروبار مل گیا۔ انہوں نے کتنی ہی پرائیویٹ ملازمتیں کیں اور چھوڑیں حتیٰ کہ جب جوشِ جوانی کم ہو گیا تو گورنمنٹ جاب پر قناعت کر گئے۔ اس میں بھی اتنی تبدیلی کرتے رہتے ہیں کہ کبھی سکول بدل لیا تو کبھی کلاس۔ ہر نئے سکول میں آ کر کچھ عرصے بعد ہی فیصلہ سنا دیتے ہیں کہ پچھلا سکول بہتر تھا اور جو بھی کلاس بدلتے ہیں اسے پرانی کلاس سے بدتر قرار دے دیتے ہیں اور ممکن ہو تو دوبارہ بدل کر پہلی کلاس لے لیتے ہیں جس سے ان کے ساتھی ان سے شاکی رہتے ہیں۔
ان کا حال بھی ویسا ہی ہے جیسا محمد حسین آزاد کی تحریر ''انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا'' کے کرداروں کا تھا کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے بیماریاں بدلنے کی التجا کی اور جب وہ قبول ہو گئی تو کچھ عرصہ بعد ہی نئی بیماریوں سے تنگ آ کے پرانی لینے پر تیار ہو گئے جیسے پاکستانی عوام تنگ آ کے حکومت بدلتی ہے اور پھر جلد ہی نئی حکومت سے تنگ آ کے کہتی ہے کہ پرانی اچھی تھی۔
یہ پیدائشی طور پر تنقیدی مزاج رکھتے ہیں کیونکہ ان کے ننھیال ودھیال میں کئی ماہرین تنقید تھے۔ یہ ادبی تنقید کی بات نہیں ہو رہی بلکہ یہ تو تنقید برائے تنقید یا تنقید برائے مضحکہ تھی۔ شاید اسی لیے یہ طنز و مزاح کی طرف آ گئے حالانکہ یہ غزل، نظم، افسانہ کہانی، مضامین وغیرہ سب اتنی خوبصورتی سے لکھ لیتے ہیں جتنی خوبصورتی سے طنز و مزاح مگر ایک تو یہ طبعاً طنز و مزاح سے کافی مناسبت رکھتے تھے دوسرے قارئین نے ان کو اس حیثیت میں زیادہ قبولیت بخشی تو ان پر طنز و مزاح نگار کا ٹھپہ لگ گیا۔ ادیب بننے کی وجہ یہ تھی کہ لڑکپن سے ہی جو ڈائجسٹ، عمران سیریز، جمشید سیریز مل جاتی اندھا دھند پڑھ جاتے، بجلی نہ ہوتی تو دیا استعمال کرتے اس لیے جلد ہی عینک لگ گئی جبکہ گھر والے یہ سمجھتے رہے کہ بچے کی نظر سائنس پڑھ پڑھ کر کمزور ہو گئی ہے۔
یہ پیدائشی طور پر خوبصورت ہیں جوانی میں اور بھی رنگ نکھر آیا لڑکے لڑکیاں ان کی دوستی کے طلبگار رہتے، ان کا مزاج بھی رومانی تھا لیکن یہ انا پرست، خود پسند، مغرور، اکھڑ بھی تھے لہٰذا یہ حاکمانہ اور تنقیدی مزاج رکھنے کے باعث تعلقات خراب کر بیٹھتے حتیٰ کہ صنفِ نازک کی اداؤں اشاروں اور نخروں کو سمجھنے سے قاصر رہتے اور ان کی عنایات سے محروم ہو جاتے۔ کوئی لڑکی اظہارِ محبت

کرتی یا لو لیٹر دیتی تو اس کے جذبات کو سمجھنے کی بجائے اس کی غلطیاں نکالنا شروع کر دیتے اور وہ جھنجلا کر کہیں اور قسمت آزمانے چل دیتی اور ان کو سمجھ بھی نہ آتا کہ وہ ناراض کیوں ہوگئی۔ حتیٰ کہ ان کو بیوی بھی اپنے جیسی ناقد ہی ملی تو ان کی طبیعت صاف ہوئی۔

انہوں نے بطور مدیر کئی رسائل میں کام کیا اور اس تنقیدی مزاج کی وجہ سے کامیاب بھی رہے لیکن غیر مستقل مزاجی کی وجہ سے کہیں ٹکے نہیں۔ انہوں نے نابیناؤں کے لئے ایک فلاحی این جی او میں بھی کام کیا اور نابیناؤں کے ساتھ رہ کر بھی کئی چیزیں سیکھیں جو بعد میں ان کے کام آئیں۔ نابینا حضرات آنکھیں نہ ہونے کے باعث اپنی چیزیں مخصوص جگہوں پر رکھتے ہیں اور پھر انہیں تلاش کرنے میں انہیں دقت نہیں ہوتی۔ انہوں نے ان سے یہ چیز سیکھی اور اب لوڈشیڈنگ میں ان کو کوئی چیز تلاش کرنے میں کبھی دقت نہیں ہوئی۔ دوسرے نابینا آواز سے مخاطب کی پوزیشن اور سمت کا تعین کر کے اس کے مطابق اسے ڈیل کرتے ہیں حتیٰ کہ جھگڑے کی صورت میں بھی یہی تکنیک استعمال کرتے ہیں یعنی جس طرف سے آواز آئے اسی طرف مکہ یا تھپڑ لگا دیا۔ نابینا ٹیچر بچوں کو سزا بھی اسی اصول سے دیتے ہیں۔ انہوں نے بھی یہ فن ان سے سیکھا اور صبح جب بیوی ان کو جلدی جگانے آئے اور ان کا موڈ نہ ہو تو بند آنکھوں سے ہی صرف آواز سے اندازہ کر کے ہی لات کو حرکت میں لاتے تھے اور ان کا نشانہ پہلے پہل تو کبھی نہیں چوکتا تھا مگر اب بھابی خصوصاً سنڈے کو انہیں جگانے کے لئے لاتوں کی رینج سے دور ہو کر ہی انہیں آواز دیتی ہے اور کمبل ہٹانے کے لئے چھڑی کا سہارا لیتی ہے اور اگر پھر بھی زد میں آ جائے تو چھڑی سے دفاع اور حملے دونوں کا کام لیتی ہے کیونکہ حقوق نسواں کے دور میں بھی یہ گھریلو تشدد کے قائل ہیں اور اسے ایک شاندار تاریخی روایت قرار دیتے ہوئے قرآن مجید کی ایک آیت سے

اچھے اُستاد کے اوصاف

☆ درس و تدریس کے لئے سب سے اوّل چیز کتاب ہے۔ اس لئے اس کتاب و نصاب سے استاد کی گہری وابستگی اور پوری واقفیت ہونی چاہئے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اپنی کتاب کی عملی صورت تھے۔

☆ ایک اچھے استاد کے لئے لگن کے ساتھ ساتھ اس کے رویے، استقامت واستحکام کا ہونا بھی ضروری ہے۔ ایسا نہیں کہ آج رویہ کچھ اور کل کچھ اور ہو۔

معلم ہونا پیغمبروں کا منصب ہے رب العزت نے سب سے زیادہ عزت واحترام اور توقیر اہل علم کو دی ہے۔

☆ اچھے استاد کے لئے ضروری ہے کہ وہ وقت کے استعمال کی صلاحیت پیدا کر سکے، وقت کو ضائع کئے بغیر ہی کم وقت میں بڑی تبدیلی لائی جاسکتی ہے۔

☆ اچھا استاد ہمیشہ آسانیاں پیدا کرنے والا اور علم کو خوشخبری کے انداز میں دینے والا ہوتا ہے۔

☆ اچھا استاد ہمیشہ اچھا طالب علم رہتا ہے وہ ہمیشہ نئے علم، نئی روشنی کو اپنانے والا ہو۔

(ہما شہزادی-لاہور)

مرضی کے استدلال بھی کرتے ہیں جس میں سخت نافرمانی سے باز نہ آنے پر بیوی کو ہلکی سزا دینے کی اجازت دی گئی ہے جو کہ ہرگز عام نہیں ہے مگر یہ اپنے قدیم مولویانہ پس منظر سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔

لڑکپن میں یہ چھوٹے بہن بھائیوں کے لئے بھی ہلاکو خان بنے رہے۔ جب ان کی شادی ہوئی تو ان کی جان چھوٹی اب تو وہ کہہ سکتے ہیں کہ اس بات کا پتہ ہوتا تو ان کی شادی پہلے کرا دیتے کیونکہ یا تو یہ شادی جلد نہ ہونے کا غصہ ان پر اتارتے تھے یا طاقت اور جوانی کے جوش میں یہ آؤٹ آف کنٹرول ہو جاتے تھے اور اس کا اندازہ ان کو بھی نہ تھا۔

تعلیم میں ہمیشہ نمایاں رہے لیکن کالج میں رکھی سائنس اور پڑھتے اردو ادب رہے۔ لائبریری چاٹ ڈالی نتیجتاً ہمارا ملک ایک انجینئر کی خدمات سے محروم ہو گیا۔ شاید اس میں بھی کوئی حکمت تھی کہ یہ اس کی بجائے ادیب اور ٹیچر بن گئے ورنہ شاید الٹی سیدھی عمارتیں بنا کر تباہی مچاتے۔

جوان ہونے تک ان کی صحت ایسی تھی کہ ان کے ٹیچر ان کو سزا دینے کا خطرہ مول نہیں لیتے تھے اور نہ یہ کسی سے لڑائی جھگڑے کا اس کی ایک وجہ عینک بھی تھی۔ اس کے باوجود ان کو ورزش اور کھیل کا بے حد شوق تھا کہ شاید اسی طریقے سے صحت بن جائے پھر تیلے البتہ تھے اسی لئے ہاکی کے اچھے کھلاڑی تھے اور اکثر گول کرنے میں کامیاب ہو جاتے تھے حتیٰ کہ مخالف کھلاڑی کو ان کی ٹانگیں زخمی کر کے انہیں روکنا پڑا اس کے بعد انہوں نے ہاکی چھوڑ دی اور کرکٹ شروع کر دی۔ اپنے سے بڑے لڑکوں کے ساتھ ہارڈ بال کے ساتھ کھیلتے ہوئے ایک بار گیند ان کی گردن پر زور سے لگی اور کچھ دیر کے لئے گلا بند ہو گیا مالش وغیرہ اور پانی پینے کے بعد جب یہ بولنے کے قابل ہوئے تو کرکٹ سے بھی ریٹائرمنٹ کا اعلان کر دیا پھر فٹ بال سے ناطہ جوڑا اس میں بھاگتے ہوئے گول کرنے جا رہے تھے کہ مخالف کھلاڑی نے اڑنگا دیا زور سے گرے اور ہونٹ وغیرہ پھٹ گئے نتیجتاً فٹ بال بھی چھوڑ دیا اور پھر زنانہ قسم کی کھیلیں کھیل کر وقت گزارتے رہے یعنی ٹیبل ٹینس، بیڈمنٹن، سکوائش وغیرہ البتہ باز پھر بھی نہ آئے۔

بتے ہیں ایک آدھ بار ورزش کا بھی شدید دورہ پڑتا اور جم چلے جاتے۔ کراٹے سمیت بھاری ورزشیں کرتے اور ہاتھ پاؤں تڑواتے رہے۔ شادی کے بعد ورزش چھوڑ دی کہ اب ایک ہی ورزش کافی ہے نتیجتاً موٹے ہوتے گئے اور توند بھی نکال لی حالانکہ یہ کام تو بھابی کا تھا جو وہ کر نہ سکیں۔

میں آپ کے بھائی شنکر دیال کو مکمل طور پر زندگی سے فارغ نہیں کروں گا۔ بس اُسے اور اس کے بیٹوں کو ایسا مزہ چکھاؤں گا کہ وہ کبھی بھی آپ کی حویلی کی طرف میلی آنکھ سے نہ دیکھیں گے۔

قسط: 4 ☆ ------------------------ محمد رضوان قیوم

اور دیپا اکثر ہمارے گھر آتے رہتے تھے۔

کلدیپ اُن دنوں دونوں گھروں میں پریشانی کی کیفیت تھی۔ دھرم لعل نے اپنی مکاری سے لالہ اور میرے ابا کو قانون کے پھندے میں جکڑ لیا تھا جس سے بچنا مشکل لگ رہا تھا۔

ایک دن دیپا ہمارے گھر آئی اور اس نے باتوں باتوں میں ابا سے کہا۔ ''چچا مجھے معلوم ہے کہ آج کل سسر جی اور ساسو ماں اور آپ بھی اپنے اوپر لگے مقدمات میں گواہوں کے معاملہ میں پریشان ہیں اور اس معاملہ میں کوئی بھی آپ کی مدد کرنے کو تیار نہیں۔ میں ایک مشورہ دینا چاہتی ہوں''۔

''بولو بیٹی! تم کیا کہنا چاہتی ہو؟'' ابا نے شفقت سے کہا۔

''آپ ٹھنڈے ذہن کے انسان ہیں''۔ دیپا نے کہا۔ ''اور کسی بھی معاملہ کو بآسانی سمجھ جاتے ہیں لیکن سسر جی اپنے آگے کسی شخص اور اس کی جانب سے دی گئی کسی تجویز کو رتی برابر بھی اہمیت نہیں دیتے''۔ دیپا نے بڑے مایوس کن انداز لہجہ میں کہا۔

''چچا! اگر آپ لوگ یعنی سسر جی چاہیں تو میں آپ کے مقدمہ میں درکار پکی گواہیوں کے لئے اپنے پتا سے بات کروں۔ آپ یقین مانئے میری اس تجویز سے آپ کے ذہن میں تھمی اس مسئلہ کی کیل جھٹ سے نکل جائے گی۔ اگر آپ کو میری یہ تجویز اچھی لگے تو آپ میرے سسر سے بات کرلیں اور مجھے معلوم ہے۔ اگر میں نے ان کے سامنے یہ بات کی تو وہ مجھے جھڑک کر میری تجویز کر رد کر دیں گے''۔

ابا دیپا کی بات سن کر کسی گہری سوچ میں گم ہو گئے۔ ان کی نگاہیں بے خیالی میں دیپا کو گھور رہی تھیں۔

''میں نے کوئی غلط بات کردی تو اس گستاخی کی مجھے معافی دے دیجئے گا''۔ دیپا نے ابا کی نگاہوں سے گھبرا کر کہا۔

''نہیں نہیں بیٹی! تُو نے بڑی زبردست بات کر دی ہے''۔ ابا نے کہا۔

ابا نے لالہ جی کو جب گواہی کے معاملہ میں دیا گیا دیپا کا مشورہ سنایا تو لالہ حسب معمول بھڑک اٹھا۔

''بس یہ کسر رہ گئی تھی''۔ لالہ جی نے غصے سے کہا۔ ''جو لوگ میری حویلی کی چوکھٹ پر ماتھا رگڑ کر ہاتھ جوڑ کر مجھے پرنام کرتے ہیں۔ تُو کیا کہتا ہے کہ میں گاؤں جا کر ان ٹکے ٹکے کے لوگوں سے التجا کروں گا کہ وہ مجھ پر تھپے کیس کے لئے گواہیوں کا بندوبست کریں۔ یہ ناممکن ہے''۔

''لالہ یہ تُو نے کیا ناممکن ناممکن اور اپنی چوہدراہٹ کی رٹ لگا رکھی ہے''۔ ابا نے بھی غصے سے کہا۔ ''لگتا ہے تیری یہ اکڑ ہم دونوں کی آئندہ زندگی کو جیل کی سلاخوں کی زینت بنا دے گی''۔

''بات اکڑ کی نہیں ہے''۔ لالہ جی نے کہا۔ ''تُو ہی سوچ میں لڑکے والا ہوتا ہوا اچھا لگوں گا کہ میں گاؤں کے ایک معمولی سے دکاندار جو کہ میری بہو کا پتا ہے اس کے آگے ہاتھ جوڑوں کہ بھگوان کے واسطے تُو مجھ پر تھپے مقدمات کے لئے دو گواہان کا بندوبست کر۔ اس بات سے تو میری اور میرے پُرکھوں کی ساری ساکھ مٹی میں رُل کر رہ جائے گی''۔

اُس وقت تیری اس حویلی کی شان کہاں جائے گی جب تُو جیل کی سلاخوں کے پیچھے سڑے گا اور تجھ پر تھو تھو ہو گی''۔ ابا نے کہا۔

''اور تُو بھی تو میرے ساتھ ہوگا''۔ لالہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

''میرا کیا ہے۔ میں ایک غریب پھٹے حال انسان ہوں''۔ ابا نے بھی ہنستے ہوئے اسے کہا۔ ''اور ویسے بھی تم ہندو، سکھوں نے انگریزوں کی چاپلوسیاں کر کے ہندوستان میں بسنے والے ہم مسلمانوں کی کیا عزت رہنے

دی ہے“۔

لالہ نے کرسی پر بیٹھ کر اپنا سر پکڑ لیا۔ وہ کافی دیر تلک اسی حالت میں کچھ سوچتا رہا۔ بالآخر وہ کرسی سے اٹھا اور اس نے ابا کو کہا۔ ”اب مجھے واقعی یقین ہو چلا ہے کہ مجھ پر مسلط بے جا مقدمات کے لئے اپنے اردگرد سے کوئی گواہ میسر نہ ہوگا۔ ہاں تیری اس بات میں وزن ہے کہ دھرم لعل کی مکاری کا مقابلہ کرنے کے لئے ہمیں بھی عدالتوں میں جھوٹے گواہان پیش کرنے کے لئے اپنے سدھی مکیش کی بغلوں میں گھسنا پڑے گا“۔

”ارے بے وقوف میں تیری عقل میں اتنی دیر سے یہی بات تو گھسیڑنے کی کوشش کر رہا ہوں“۔ ابا نے جل کر کہا۔ ”تُو عدالت میں دھرم لعل کے خلاف پیش کرنے والے گواہوں کے لئے اپنی بہو کے میکے والوں کو پکڑ۔ تجھے اس نازک موقع پر اپنے مزاج میں گھسے کڑوے پن کو تھوک کر میٹھا بن کر ان سے اپنا مطلب نکالنا چاہئے“۔

”لیکن بھگوان کے واسطے تُو خود میرا یہ کام کر دے“۔ لالہ نے ابا سے کہا۔ ”میں نے چوہدراہٹ کے زعم میں اپنے سدھی کو خاصا ذلیل کیا تھا۔ اگر اب میں وہاں ضرورت مند بن کر جاؤں گا تو ہو سکتا ہے وہ بدلہ چکا دے اور اگر ایسا ہوا تو پھر معاملہ اور بگڑ جائے گا“۔

”میں تیرا یہ کام کر دوں گا تُو اس کی فکر نہ کر“۔ ابا نے کہا۔ ”لیکن میں جب تک گاؤں سے تیرے لئے گواہیوں کا بندوبست نہ کروں تُو ان لوگوں سے سیدھے منہ بات کرنا“۔

ابا دیپا کے گاؤں ڈھیروں تازہ خشک میوہ جات اور دیگر چیزیں بطور تحفہ لے کر پہنچے تو مکیش نے نہ صرف ان کا بڑے تپاک سے استقبال کیا۔ خدمت خاطر کے بعد ابا نے ساری صورت حال مکیش کو بتائی اور اس کو بتایا کہ وہ اس مشکل وقت میں کس قسم کی مدد کر سکتا ہے۔

”لالہ میرا سدھی ہے اور اس کے گھر میری بیٹی بہو بن کر گئی ہے“۔ مکیش نے ساری بات سن کر کہا۔ ”میں اور میرے بیٹے جوتا، لالہ جی کی عزت و شان میں گستاخی کرنے والے کی آنکھیں پھوڑ دیں گے۔ اس کے حق میں ہم گواہیاں تو کیا اپنی جانیں بھی دینے کو تیار ہیں“۔

اس کے بعد مکیش نے اپنے دونوں بیٹوں کو بلا کر کہا کہ ابھی ان کے ساتھ جاؤ اور یہ جیسا جہاں کہیں تم نے آنکھیں بند کر کے بغیر سوچے سمجھے ویسا ہی کرنا ہے۔

”لالہ جی میرے باپ جیسے ہیں“۔ پھر مکیش نے ابا کو مخاطب کر کے کہا۔ ”وہ میرے سر پر ہزار جوتے بھی مار لیں میں نرک میں جاؤں اگر میں ان کے سامنے اُف بھی کر دوں۔ لالہ جی سے کہنا کہ وہ کبھی اپنے آپ کو تنہا اور بے بس نہ سمجھیں ان کا ایک غریب بھائی موجود ہے۔ ان سے یہ بھی کہنا کہ بھگوان نہ کرے اگر ان پر کوئی بڑی مصیبت آئے تو مجھے وہ ایک آواز دیں میں ڈھیروں لٹھ بردار جوانوں کو لے کر آ جاؤں گا اور ان کے پسینے کی جگہ خون بہا دوں گا“۔

مکیش نے اپنے دونوں بیٹوں کو ابا کے ساتھ عدالت میں جھوٹی گواہی کے لئے بھیج دیا۔

”یار تُو نے تو آج اپنی دوستی کا حق ادا کر دیا“۔ لالہ ابا کی اس کامیابی سے بہت خوش ہوا۔ ”تُو نے تو میرے دماغ پر پڑا پریشانی کا بڑا بھاری پتھر اٹھا دیا ہے۔ اب میں اپنے آپ کو بہت ہلکا محسوس کر رہا ہوں“۔

لالہ جی نے مصنوعی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جب مکیش کے دونوں بیٹوں سے کہا کہ میں مکمل سہولیات سے لبریز اپنی حویلی کے نچلے حصہ میں تمہاری رہائش کا بندوبست کر دیتا ہوں۔

”معاف کرنا لالہ جی!“ دونوں نے اپنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ ”ہم جہاں بہن بیٹی بیاہتے ہیں وہاں کا کھانا ہم پر حرام کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہاں پانی ضرور مجبوری میں پی لیتے ہیں۔ ہمارے باپ نے تاکید کی تھی بہن کے سسرال میں جل پان (کھانا پینا) نہیں کرنا اور

اپنی چاچی کے گھر رہنا ہے''۔

''ارے نہیں بھائی تم میرے بیٹوں کی طرح ہو''۔ لالہ جی نے اصرار کیا۔ ''تم پرانے رسم و رواج کا مظاہرہ نہ کرو اور ویسے بھی پرکھوں کی رسمیں اب معدوم ہو چکی ہیں''۔

''لالہ جی! ہم فی الحال چاچی کے گھر چلتے ہیں۔ ہم وہیں رہیں گے اور ہاں جب آپ کو ہماری ضرورت ہو ہمیں بلا لینا''۔

لالہ اور سب نے ان دونوں کو حویلی کے اندر رہائش کے لئے بڑا زور دیا لیکن دونوں نہ رکے۔

''بڑی اکڑ ہے ان گھٹیا لوگوں میں''۔ لالہ جی نے ان کے جانے کے بعد بُرا سا منہ بنا کر کہا۔

''تُو دفع کر ان کی اکڑ کو''۔ ابا نے کہا۔ ''تُو فی الحال ان دونوں لڑکوں کو عدالت میں گواہیوں کے لئے استعمال کرا اور تُو ان کی اکڑ و کڑ کی پروا نہ کر''۔

مکیش کے بیٹے جوتا اور بونم اپنے چچا کے گھر چلے گئے۔ اس وقت بھی عدالتوں کا نظام آج کی طرح سُست رو اور تھکا دینے والا تھا۔ جوتا اور بونم جب بھی عدالت ابا اور لالہ کیدار ناتھ کے ساتھ گواہی کے لئے جاتے تو وہاں کبھی وکیل یا جج چھٹی پر ہوتا، یا دھرم لعل، شنکر دیال میں کوئی نہ کوئی رشوت وغیرہ دے کر رکاوٹیں ڈال کر اگلی لمبی تاریخ ڈلوا دیتے تھے۔

ادھر لالہ جی کی دلی خواہش یہ تھی کہ کسی طرح جوتا، بونم عدالت میں اس کے حق میں گواہی دیں اور وہ اپنے گاؤں جائیں۔

''یار عظیم! مجھے ان دونوں بھائیوں کی شکلوں سے کراہت محسوس ہوتی ہے''۔ لالہ اکثر ابا سے کہتا۔ ''میں زیادہ دیر ان کو برداشت نہیں کر سکتا''۔

ابا نے لالہ کو مشورہ دیتے ہوئے کہا ارے بے وقوف تُو ان کی شکلوں سے کراہت اور کپڑوں سے بدبو اٹھنے کا تصور بھول کر ان سے اپنا مطلب نکال اور میٹھا بن جا۔

ابا نے کچہری جا کر کسی رشوت خور عدالتی ریڈر کو بھاری رقم دے کر دونوں بھائیوں کی شہادت کروانے کی کوشش کی لیکن بد قسمتی سے وہاں شہادت نہ ہو سکی۔ آئندہ تاریخ کیونکہ لمبی تھی اس لئے دونوں بھائی گاؤں چلے گئے۔ ان کے جانے کے تقریباً ہفتے بعد لالہ کیدار ناتھ کو عدالت سے نوٹس ملا کہ وہ اگلے بیس روز میں حویلی کا قبضہ میڈیکل ڈیپارٹمنٹ کے حوالہ کر دے۔

یہ لالہ کے لئے ایک نئی بڑی مصیبت تھی۔ حویلی کے ماحول میں پریشانی کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ وہاں کے باسیوں کا کھانا پینا سب حرام ہو چکا تھا۔ حویلی میں کھانا ہمارے گھر سے پک کر جانے لگا تھا۔ دیپا کبھی کبھار ہمارے گھر آ کر اماں سے اپنا دُکھڑا روتی رہتی اور یہی کہتی رہتی تھی کہ وہ جس دن سے اس حویلی کے اندر دلہن بن کر آئی ہے اس نے ایک دن بھی یہاں سکون کا سانس نہیں لیا ہے۔ ابا اور اماں اسے صبر کی تلقین کرتے تھے۔

عدالتی نوٹس کے مطابق جوں جوں حویلی کو خالی کرنے کے دن قریب آ رہے تھے لالہ جی کی حالت پاگلوں کی طرح ہو رہی تھی۔ اسے کچھ سمجھ نہ آ رہا تھا۔ اس نے کئی تجربہ کار مقدمہ بازوں، قابل وکلاء سے مشورے کئے تو اسے یہی جواب ملا کہ اسے ہر حال میں عدالت کے حکم کے مطابق حویلی کا قبضہ دینا ہی پڑے گا۔

ایک دن بھرے بازار میں لالہ کو اس کے بھائی شنکر دیال اور اُس کے بیٹوں نے زبردستی روک لیا اور اُس پر طنزیہ جملے کسنے لگے۔ انہوں نے بدمعاشی والے انداز میں کہا کہ اب تیری تباہی، بربادی کے دن شروع ہو چکے ہیں۔ اس کے بیٹوں نے لالہ جی کا گریبان پکڑ کر اُس کی قمیص کے بٹن بھی توڑ دیئے۔

''لالہ کاش تُو میرے بیٹوں کا تایا نہ ہوتا''۔ شنکر دیال بڑے لوفر انداز میں لالہ کیدار ناتھ کے قریب آیا اور

بڑے گستاخانہ انداز میں اُسے کہنے لگا۔ ''میرا دل کرتا ہے کہ تیرے ساتھ ایسا سلوک کروں کہ تُو دنیا کے لئے عبرت کی تصویر بن جائے''۔ پھر اُس نے اپنے بیٹے کو مخاطب کیا جس نے لالہ جی کا گریبان پکڑ رکھا تھا۔

''ارے شرما بیٹے! چھوڑ دے اس کا گریبان ابھی ہم نے تیرے تایا کی حویلی سے بے دخلی کی رسوائی، اس کی در بدر کی ٹھوکریں اور پاگل پن دیکھنا ہے''۔

''جا تاؤ! تُو بھی کیا یاد کرے گا''۔ بھتیجے شرما نے لالہ کا گریبان چھوڑتے ہوئے کہا۔ ''جب تُو حویلی سے بے دخل ہو کر آئے تو اپنے پریوار کو لے کر ہمارے گھر کے پچھواڑے ڈنگروں کے اصطبل میں رہنے کے لئے آ جانا۔ ہم وہاں تیرے بے روزگار بیٹوں اور تجھے کسی نہ کسی کام میں کھپا لیں گے۔ ہمیں ویسے بھی ڈنگروں کی لید اٹھانے اور اُن کا بنڈا (خوراک) بنانے والے کمیوں کی ضرورت ہے۔ یاد رکھ ہم تجھے جینے نہیں دیں گے''۔

لالہ کیدارناتھ اپنے بھائی اور بھتیجوں سے ذلیل، چاک گریبان جب حویلی پہنچا تو سنتو تائی نے اُن کی ناگفتہ بہ حالت دیکھی تو انہوں نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر واویلہ کرنا شروع کر دیا۔

''ہائے رام لالہ جی تمہاری یہ حالت کس نے بنائی''۔

''اری تُو میری پروا نہ کر''۔ لالہ نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ''میں نے ابھی غسل کرنا ہے تُو بس میرے لئے دھوبی سے نیا سوٹ استری کروا دے''۔

اسی دوران کلدیپ باہر سے بڑے غصے میں آیا اور اس نے آتے ساتھ ہی چلاتے ہوئے کہا۔ ''ماتا جی! مجھے پتا جی کی گن نکال دو۔ میں نے چچا شنکر دیال اور اس کے خاندان کو نرک میں پہنچانا ہے''۔

''اچھا میں اب سمجھی''۔ سنتو تائی نے کہا۔ ''تیرے پتا کو اُس کلموئے شنکر دیال اور اس کے پلوں نے زدوکوب کیا ہے۔ جا کلدیپ میں تجھے اجازت دیتی ہوں تُو اپنے پتا کی بندوق لے۔ اپنے چچا اور اس کے پورے پریوار کو خون میں نہلا دے''۔

سنتو حویلی کے بڑے کمرے سے دونالی بندوق اٹھا کر لائی اور اس نے کلدیپ کے ہاتھوں میں تھما کر اُسے جوش دلاتے ہوئے کہا۔

''جا آج تجھے اپنے ماتا کے دودھ کی قسم، اپنے ظالم چچا اور اُس کے بیٹوں کو ناس کئے بغیر واپس نہ آنا''۔

ادھر دیپا نے سنا تو گھبرائی حالت میں بھاگتی ہوئی آئی اور کلدیپ کے پاؤں میں گر پڑی۔

''کلدیپ! بھگوان کے واسطے جوش میں ہوش نہ کھونا''۔ اس نے منت بھرے لہجے میں کہا۔ ''دیکھو تم اکیلے ہو اور وہ ظالم کئی بھیڑیوں کی صورت میں موجود ہیں۔ مجھے خطرہ ہے وہ تمہیں بھی نقصان پہنچائیں گے''۔

کلدیپ نے دیپا کی ایک نہ سنی اس نے بڑے بُرے طریقے سے لات مار کر پیچھے دھکیل دیا اور وہ انتہائی جوش و غصہ سے اپنے باپ کی بندوق لے کر باہر چلا گیا۔

فرش پر گری ہوئی دیپا جھٹ سے اٹھ کر ننگے پاؤں کلدیپ کے پیچھے بھاگی۔ ''ارے کوئی ہے جو کلدیپ کو روکے اس کے پیچھے جائے''۔

شنکر دیال اور اس کے بیٹے کیونکہ پھٹے ہوئے بدمعاش لوگ تھے اس لئے کلدیپ کے پیچھے محلہ کا کوئی بندہ اُن کے پیچھے نہ گیا۔ دیپا نے جب دیکھا کہ کلدیپ کے پیچھے کوئی محلہ دار نہیں جا رہا تو وہ بے بس ہو کر دوبارہ حویلی آئی اور اس نے سنتو تائی سے پوچھا کہ ماتا کہاں ہے۔ انہوں نے روتے ہوئے کہا کہ وہ اس وقت گراؤنڈ میں اپنے دوستوں کے ساتھ کھیل رہا ہوگا۔ دیپا نے سنتو تائی کو افسوس ناک انداز میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''لگتا ہے کہ آپ کلدیپ کی سگی ماں نہیں ہیں''۔

''تُو کیا بکواس کر رہی ہے؟'' سنتو تائی نے

آنکھیں نکال کر کہا۔ ''کوئی میرے پتی کو زدوکوب کرے اور میں خموشی سے تماشا دیکھوں''۔

''آپ کو اپنے پتی کی زندگی کی تو فکر ہے''۔ دیپا نے ذرا تیز لہجے میں کہا۔ ''لیکن آپ کو اپنے بیٹے کی رتی برابر بھی فکر نہیں ہے۔ اُسے آپ نے سسر جی کی بندوق تھما اور اُکسا کر ان بدمعاشوں کے ٹولہ سے لڑنے کے لئے بھیج دیا ہے''۔

لالہ جی نے دوسرے کمرے سے باہر آتے ہوئے بہو کی یہ بات سنی تو وہ لرز گیا۔

''لگتا ہے تیرا دماغ خراب ہو گیا ہے''۔ اس نے چلاتے ہوئے کہا۔ ''تُو نے واقعی کلدیپ کو میری بندوق دے کر شنکر دیال اور اس کے اتھرے لڑکوں سے لڑنے کے لئے بھیج دیا؟''

تھوڑی دیر بعد حویلی کے اندر محلے کے چند لوگ جن کے ساتھ ماما بھی تھا، وہ یہ بری خبر لے کر آئے کہ کلدیپ کو شنکر دیال اور اُس کے لڑکوں نے اپنی گلی کے نکڑ میں اس سے بندوق چھیننے کے بعد اتنے بُرے طریقے سے لاتوں، ٹھڈوں سے مارا پیٹا ہے کہ وہ شدید زخمی ہو گیا ہے۔ لوگوں نے اسے راج ہسپتال میں پہنچا دیا ہے جہاں وہ زندگی اور موت کے درمیان جھول رہا ہے۔ یہ خبر سن کر سنتو تائی نے ایک طرف واویلا مچایا اور انہیں کوسنا شروع کیا تو دوسری طرف دیپا نے چیخ و پکار کر کے پوری حویلی سر پر اٹھا لی۔

''میرے کلدیپ کو کچھ ہو گیا تو میں اس حویلی کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گی''۔ دیپا نے اپنی ساس کو گھورتے ہوئے کہا۔ ''اب میں بھی اس کے ساتھ مروں گی''۔ ادھر ماما نے بڑے جوش میں حویلی کی رسوئی میں گھس کر اپنے ہاتھ میں روٹی پکانے والا بیلن اٹھا لایا کہ میں شنکر دیال اور اس کے لڑکوں کے اس سے سر توڑ دوں گا۔

لالہ جی نے بڑی تیزی سے آگے بڑھ کر اسے کندھے سے پکڑا اور پھر اس کے رخسار پر تین چار تھپڑ رسید کرتے ہوئے کہا۔

''ایک چوہا جو شیر بن کر بھیڑیوں سے لڑنے ان کی کچھار میں گیا تھا وہ زخمی ہو کر ہسپتال میں پڑا ہوا ہے اب تُو جوش میں آ کر ان کے ہاتھوں مرنے جا رہا ہے اور دوسری جانب یہ ہماری بہو صاحبہ ہمیں دھمکی دے رہی ہیں کہ میرے پتی کو کچھ ہو گیا تو میں بھی اُس کے ساتھ مروں گی''۔

''سسر جی! آپ ہی بتلائیں میں کیا کروں؟'' دیپا روتے ہوئے لالہ جی کے قدموں میں گر کر گڑگڑا کر بولی۔ ''میرا پتی ہسپتال میں آپ کے بھائی بھتیجوں کے ہاتھوں زخمی پڑا ہوا ہے۔ اگر انہیں کچھ ہو گیا تو میں کیسے جی سکوں گی؟''

ماما بھی ہچکیاں لیتا ہوا اپنے پتا کے کندھے سے لپٹ کر رونے لگا۔

چند لمحوں بعد لالہ کی حویلی اہل محلہ سے بھر گئی جن میں ہمارا خاندان بھی شامل تھا۔

کسی نے لالہ جی کو مشورہ دیا کہ وہ شنکر دیال اور اس کے بیٹوں کے خلاف تھانہ میں رپورٹ کروائے۔

تھانہ میں شنکر دیال اور اس کے بیٹوں کے خلاف کلدیپ کو شدید زخمی اور لالہ کیدار ناتھ کو زدوکوب اور بھرے بازار میں تذلیل کرنے کے متعدد الزامات کا پرچہ کٹوا دیا گیا۔ لالہ جی، ابا اور محلے کے چند افراد جب ہسپتال پہنچے تو وہاں کلدیپ اتنا شدید زخمی نہ تھا جتنا کہ اس کی حالت کے بارے میں خبر آئی تھی۔ اس کو گھونسہ لگنے سے بائیں آنکھ سوج گئی تھی۔ اس کے علاوہ اس کے ماتھے، بازوؤں میں ہلکی چوٹیں آئی تھیں۔ ڈاکٹروں نے اس کی حالت کے بارے میں بتایا کہ خوش قسمتی سے کلدیپ کو کاری ضربات نہیں لگی تھیں۔ یہ C لیول کا زخمی ہے اور یہ اگلے دو چار دنوں میں ڈسچارج ہو جائے گا۔

دوسرے دن صبح کے وقت مکیش، اس کے دونوں بیٹے بمعہ قد آور دیہاتیوں کے ساتھ حویلی پہنچے۔

مکیش نے اپنے ساتھ آئے لٹھ برداروں کو کہا کہ وہ

حویلی کے باہر کھڑے رہیں۔ وہ اپنے دونوں بیٹوں کے ساتھ حویلی میں بڑے غصے کے عالم میں داخل ہوا۔ اس وقت حویلی میں اہل محلہ بھی جمع تھے۔

''کس نے میرے داماد اور سمدھی پر ہاتھ اٹھانے کی جرأت کی ہے؟'' اس نے گرج کر پوچھا۔

اس کے گرجدار سوال کا حویلی کے اندر موجود کسی نے جواب نہ دیا۔

''دیپا بٹی! ادھر میرے قریب آ اور مجھے بتا کہ کس نے کلدیپ اور تیرے سسر جی کو زخمی کیا ہے؟'' مکیش نے دیپا سے پوچھا۔

دیپا حویلی میں موجود لوگوں کو چیرتی ہوئی آگے بڑھی اور مکیش کے سامنے کھڑے ہو کر روتے ہوئے بولی۔

''پتا جی! میرے پتی کلدیپ اور سسر جی کو زخمی کرنے والے ظالم شنکر دیال اور اس کے بیٹوں کو نہیں چھوڑنا''۔

''اچھا تو بٹی لالہ جی اور داماد جی کو ان چوہوں نے کاٹا ہے''۔ مکیش نے قہر بھرے لہجے میں کہا۔ ''بیٹی تُو چنتا نہ کر دیکھ میں اُن نالی کے کیڑوں کو کس طرح لاٹھیاں مار مار کر ان کے دماغ سے گند نکالتا ہوں''۔

''ہم لوگ پہلے ہی کئی عذابوں کا شکار ہیں''۔ تائی سنتو نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔ ''تُو بھگوان کے واسطے اپنے کسی سخت اقدام کی بناء پر ہمیں مزید عذابوں کا شکار نہ کر دیجیو''۔

''شما کرنا سمدھن جی!'' مکیش نے سنتو تائی کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ ''آپ لوگوں نے شنکر دیال اور اس کے بیٹوں کی جانب سے کیئے گئے وار سہہ لئے، خیر یہ آپ کا اپنا معاملہ ہے لیکن میں ہرگز بھی یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ کوئی میرے ہوتے ہوئے میرے داماد اور سمدھی کو زدوکوب کرے۔ کسی کی اتنی جرأت نہیں ہے کہ وہ ہمارے سامنے ہمارے پریوار کو اس طرح ذلیل خوار کرے''۔

''تیرا پریوار اور تُو ہدی اور پدی کا شوربہ''۔ سنتو تائی نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''یہ تُو نے اتنی بڑی بات کیسے سوچ کر کہہ دی؟''

''معاف کرنا، کیا کلدیپ بھائی میرے جیجا جی اور میری دیدی دیپا آپ کی بہو نہیں ہے؟'' دیپا کے بھائی جونا نے آگے بڑھ کر بڑے جذباتی لہجے میں کہا۔ ''آپ کی مہربانی آپ ہمیں طعنے نہ دیں۔ ہم غریب ضرور ہیں لیکن مٹی کے بنے ہوئے نہیں کہ ہم کسی کی ٹھوکر لگنے سے ٹوٹ جائیں اور جس کا جی چاہے مار کوٹ کر بے عزتی کر کے چلا جائے''۔

''ہمارا تمہارا کوئی جوڑ نہیں بنتا تھا''۔ تائی سنتو نے اپنے اونچے خاندان کے زعم میں آ کر کہا۔ ''تم جیسے لوگوں سے ہمارا رشتہ جڑنا ہمارے عقل کے اندھے بیٹے کی ضد کا نتیجہ ہے اور یہ ایک حادثہ سے کم نہ تھا''۔

''یہ آپ بہت غلط اور ہمارے جی جلانے والی باتیں کر رہی ہیں''۔ مکیش نے دکھی لہجے میں کہا۔

''تُو اپنے دو بالشت کے پلے کی زبان کو لگام دے''۔ تائی سنتو نے نخوت بھرے لہجے میں کہا۔

مکیش نے انتہائی سرخ نگاہوں سے پہلے جونا کو دیکھا اور ایک زوردار تھپڑ اس کے گالوں پر رسید کرتے ہوئے کہا۔

''تیری کیسے جرأت ہوئی کہ نکا ہوتے ہوئے دیپا کی ساس ماں کے آگے زبان کھولے۔ چل سمدھن جی کے چرنوں میں بیٹھ کر معافی مانگ''۔

''اس سے کہہ کہ میرے چرنوں میں بیٹھ کر چرن پلید نہ کرے''۔ تائی سنتو نے غرور سے کہا۔

''بیٹا! ہم بیٹی والے ہیں''۔ مکیش نے اپنی آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو اپنے کرتے کے پلو سے صاف کرتے ہوئے جونا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''ہمارے

دھرم میں بیٹی والا ہونا ایک کمزوری کی علامت ہوتی ہے۔ بیٹے والے ہر لحاظ سے بیٹیوں والوں پر حاوی ہیں۔ چل بیٹا! سمدھن جی کے چرنوں کو چھوئے بغیر معافی مانگ''۔

جونا نے باول ناخواستہ ہاتھ جوڑ کر سنتو تائی کے قریب آ کر معافی مانگ لی۔

سنتو تائی اپنا بُرا سا منہ جھٹک کر غصے سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ لالہ کیدار ناتھ جو ابھی چپ تھا وہ انتہائی پریشانی اور افسردگی کی چال چلتے ہوئے مکیش کے پاس آیا اور اس نے مکیش کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے معذرت خواہانہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''سمدھی جی میں سنتو کی جانب سے کی گئی زیادتی کی معافی مانگتا ہوں''۔ لالہ جی نے کہا۔ ''وہ دراصل آج کل آپ کو تو پتا ہی ہے کہ مجھ سمیت اس حویلی میں بسنے والا ہر فرو شدید ذہنی کرب کا شکار ہے۔ آپ سنتو کی ترش کلامی کا بُرا نہ مانئے وہ زبان کی گرم لیکن دل کی ٹھنڈی ہیں''۔

''آپ میرے بڑے اور قابل احترام ہیں''۔ مکیش نے ہاتھ جوڑتے ہوئے انتہائی عاجزی سے کہا۔ ''آپ مجھ سے معافی مانگ کر مجھے شرمندہ نہ کریں۔ آپ یقین کریں میں نے سمدھن جی کی کسی بات کا بُرا نہیں مانا''۔

''ہاں ہاں پتا جی!'' دیپا نے بات سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''ماتا جی واقعی دل کی انتہائی نرم لیکن غصے کی ذرا تیز ہیں لیکن ان کا غصہ وقتی ہوتا ہے۔ کبھی کبھار ایک لمحے مجھے غصہ ہوتی ہیں تو دوسرے لمحے میرے کمرے میں خود آ کر مجھے پھل فروٹ سوغاتیں دے کر مجھ سے الفت کا اظہار کرتی ہیں''۔

''اچھا چھوڑو ان بے کار باتوں کو''۔ مکیش نے اکتاتے ہوئے کہا۔ ''لالہ جی اب آپ مجھے حکم دیں کہ آیا کہ میں آپ کے بھائی شنکر دیال اور اس کے بیٹوں کو ان کی بُری کرنی کا خمیازہ چکھاؤں''۔

لالہ جی نے اس طرح یک دم چپ لگالی جیسے کہ وہ کچھ سوچ رہا ہو۔

''مکیش تم رات کو عظیم کے گھر مجھے ملو''۔ پھر کچھ توقف کے بعد کہا۔ ''مجھے تم سے اس سلسلہ میں کچھ مشورہ کرنا ہے''۔

''ڈاکٹر کلدیپ کی حالت کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟'' مکیش نے تفکرانہ لہجے میں پوچھا۔

''خوش قسمتی سے اُسے کوئی کاری زخم نہیں آئے ہیں''۔ لالہ جی نے کہا۔ ''دیال شنکر اور اس کے لڑکوں نے اسے صرف ہاتھوں سے مارا ہے۔ اس کی وجہ سے اُسے صرف بیرونی چوٹیں آئی ہیں۔ بھگوان نے چاہا تو آج یا کل صبح ہسپتال سے ڈسچارج ہو جائے گا''۔

''پتا جی! آپ لوگ یہاں اپنی اِدھر اُدھر کی باتوں میں وقت ضائع کر رہے ہیں''۔ دیپا نے دخل اندازی کرتے ہوئے کہا۔ ''وہاں ہسپتال میں کلدیپ نہ جانے کس حالت میں ہوگا''۔

''ہسپتال میں کسی مریض کے پاس سوائے ایک تیماردار کے کسی کو رہنے کی اجازت نہیں ہے''۔ لالہ کیدار ناتھ نے دیپا کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ''وہاں جانا بیکار ہے۔ ویسے بھی خطرے کی کوئی بات نہیں ہے۔ امید ہے وہ کل صبح ہسپتال سے ڈسچارج ہو جائے گا''۔

''جیجا جی کے پاس کون ہے؟'' جونا نے پوچھا۔

''فی الحال کلدیپ کے پاس عظیم موجود ہے''۔ لالہ کیدار ناتھ نے جونا کو کہا۔ ''تم لوگ ابھی دیپا کے کمرے میں جا کر آرام سے جل پان کرو...... اور ہاں مکیش تم رات کو لازماً عظیم کے گھر آنا وہاں تم سے کچھ ضروری مشورے کروں گا''۔

ادھر ہمارے گھر رات کو لالہ جی مکیش کے آنے سے تقریباً پون گھنٹہ پہلے ہی آ گئے تھے۔ وہاں انہوں نے ابا سے حویلی کا معاملہ، اپنے بھائی شنکر دیال اس کے بیٹوں کی بدمعاشی اور میڈیکل بورڈ کی جانب سے حویلی پر قبضہ دینے کے عدالتی حکم کے دیگر معاملات پر بڑی تفصیل سے

بات چیت اور مشورے کئے۔

"یار عظیم! مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ میری عقل خبط ہو کے رہ گئی ہے"۔ لالہ جی نے ابا سے کہا۔ "اس کی وجہ یہ ہے کہ میں ذہنی طور پر پریشان ہوں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ کورٹ کچہریوں اور دیگر افسران کے معاملات میں کسی قسم کے اثر و رسوخ سے یکسر کمزور ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ حویلی میری مٹھی سے پھسل جائے گی"۔ لالہ انتہائی مایوس لگ رہا تھا۔

اس کے ساتھ ساتھ لالہ نے اپنے دل میں آئی بات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اس نے مکیش اور اس کے بیٹوں کو اس لئے برداشت کیا ہوا ہے کہ یہ دیہاتی بڑے دلیر، لٹھ مار اور کچھ بھی کرنے کو بے دریغ ہمہ تن تیار رہتے ہیں۔ لہٰذا وہ دل سے نہ چاہتے ہوئے بھی ان بیساکھیوں کو حویلی کی جانب دیکھنے والی تمام بدنظروں کے خلاف استعمال کرے گا۔

"ہاں لالہ!" ابا نے اس کی بات کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ "میں نے تو تجھے پہلے ہی کہا تھا کہ تو ان گنواروں کے ساتھ بے شک بھاری دل سے سہی مگر میٹھا بن جا اور ان سے اپنے وہ مقاصد حاصل کر جو تو خود نہیں کر سکتا"۔

"یار عظیم! میرا دل روتا ہے"۔ لالہ نے کرب کے عالم میں کہا۔ "میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ میری زندگی میں کوئی ایسا دن بھی آئے گا جب میں ایسے ٹکے ٹکے لوگوں کی مدد لینے پر مجبور ہو جاؤں گا"۔

لالہ کیدار ناتھ کا وہ حال تھا کہ رسّی جل گئی پر بل نہ گئے۔ حویلی اور شان و شوکت اس کے ہاتھ سے نکلی جا رہی تھی۔ شنکر دیال اور وکیل دھرم لعل نے اس کا جینا حرام کر رکھا تھا اور وہ جھوٹی اکڑ دکھا رہا تھا۔

"یار لالہ تو یہ بات دل سے مان لے کہ تیری اب حیثیت اس بڈھے شیر کی مانند ہے جس کے دانت ہل

رہے ہوں اور پنجے کمزور ہو چکے ہوں"۔ ابا نے اسے آئینہ دکھاتے ہوئے کہا۔ "اب تُو دیکھنے میں شیر مگر اندر سے بھیگی بے بس بلی ہے"۔

لالہ نے ابا کی بات کا بُرا نہ مانا۔ ابا نے اسے یہ مشورہ دیا کہ وہ مکیش اور اس کے بیٹوں کو اس طرح احتیاط سے استعمال کرے کہ اُس پر کوئی حرف نہ آئے۔

"یار لالہ! سنتو بھابی بڑے بُرے طریقہ سے دیپا اور اس کے باپ بھائیوں کو ذلیل کرتی ہے"۔ ابا نے لالہ سے کہا۔ "ذرا اس کو سمجھا ورنہ یہ سہارا بھی کھو بیٹھو گے"۔

"ہاں، اس کا بھی مجھے دلی طور پر افسوس ہے"۔ لالہ نے اعتراف کیا۔ "لیکن کیا کروں اس خبیث طبیعت سنتو کا دماغ ہر وقت آسمان پر چڑھا رہتا ہے"۔

"دیکھ لالہ! اگر تُو نے اپنے ان دیہاتی رشتہ داروں سے اپنے مقاصد حاصل کرنے ہیں تو تُو سنتو بھابی کی گز بھر لمبی زبان کو لگام دینے کی کوشش کر"۔ ابا نے لالہ جی کو تنبیہ کی۔

تھوڑی دیر میں مکیش حسب وعدہ طے شدہ وقت پر ہمارے گھر آ گیا۔ ابا نے مکیش کو کرسی پر بیٹھنے کو کہا تو وہ جھجک گیا۔ ہندوؤں میں ذات پات کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے اور یہی اب پاکستان کے مسلمانوں میں بھی رواج پا گئی ہے۔

"ارے سدھی جی! آپ برہمن، ٹھاکر ذات اعلیٰ ارفع آسمانی اوتار ہیں"۔ اس نے بڑے عاجزانہ طور پر ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ "میں بھلا ایک نیچی ذات سے تعلق رکھنے والا دیہاتی کیسے آپ کے ساتھ بیٹھ کر بات کر سکتا ہوں۔ یہ پاپ مجھ سے نہ کرائیں"۔

"نہیں، نہیں تم یہ غلط سوچتے ہو"۔ ابا نے اس سے کہا۔ "یہ ذات پات کا سلسلہ دراصل کم عقل جاہل انسانوں کی اختراع ہے"۔

"عظیم صاحب! یہ تو آپ میری دل جوئی کے الفاظ ادا کر رہے ہیں"۔ مکیش نے حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "لیکن حقیقت میں کیا آپ کو معلوم نہیں ہے کہ ہندو دھرم میں برہمن ٹھاکر لوگ اپنے آپ کو آسمان سے اتری ہوئی اعلیٰ مخلوق سمجھتے ہیں"۔

"چھوڑو یہ اونچ نیچ کی بے معنی باتیں"۔ ابا نے کہا۔ "تم لالہ جی کے برابر کرسی پر بیٹھو"۔

ابا مکیش کو لالہ جی کے ساتھ والی کرسی پر بٹھانے کی بڑی ضد کرتے رہے لیکن وہ نہ بیٹھا اور سامنے پڑے سٹول کو کھینچ کر لالہ سے ذرا ہٹ کر بیٹھ گیا۔ ابا نے خوش اخلاقی والی مسکراہٹ طاری کرتے ہوئے مکیش کو چڑھاتے ہوئے کہا۔

"آپ میرے گھر پر آئے، یقین کریں میرا دل بہت خوش ہوا"۔ ابا نے مکیش کا حوصلہ بڑھانے کے لئے اس کی عزت افزائی کرتے ہوئے کہا۔ "میرے لئے آپ قابل احترام ہیں اور میں آپ کی دل کی گہرائیوں سے عزت کرتا ہوں"۔

"یہ آپ کا بڑا پن ہے"۔ مکیش نے عاجزی کا اظہار کرتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "میں بھی اپنے من میں آپ کی عزت اس طرح کرتا ہوں جیسے میرے باپ برابر ہیں۔ آپ نے مجھ ناچیز کو اپنے آنگن میں پدھارنے کا شرف دیا میں اس کے لئے مشکور ہوں"۔

اسی دوران مکیش کے سامنے اس کی تواضع کے لئے اس زمانہ کے لحاظ سے بڑی مہنگی، اعلیٰ بازاری آئٹمز رکھ دی گئیں جن میں کاجو کی برفی، زعفرانی حلوہ اور کیری والے میوؤں کے ساتھ اعلیٰ ٹھرا بیئر تھی۔

مکیش نے اپنی تواضع کی خاطر اتنی مہنگی اعلیٰ اشیاء دیکھیں تو بڑا حیران ہوا۔

"ارے عظیم صاحب! میری اتنی اوقات کہاں؟" اس نے ابا سے کہا۔ "کہ ایسے مہنگے میوؤں، زعفرانی حلوہ جات اور Dyxel کی اعلیٰ بیئر کے ذائقے چکھوں۔ ارے ہم غریب دیہاتی لوگ تو گاؤں میں دال، ساگ

کے علاوہ بہت زیادہ ہوا تو دیسی ساخت کا ٹھنڈا استو پی کر عیاشی کر لیتے ہیں۔ یہ تو آپ نے مجھے میری اوقات سے زیادہ عزت دے دی‘‘۔

’’ارے نہیں آپ کے آنے سے ہمیں بہت خوشی ہوئی ہے‘‘۔ ابا نے کہا۔ ’’اور پھر ویسے بھی ہمارے گھر میں پہلی بار آئے ہیں۔ اب تو آپ سے ہمارے کئی رشتے ہیں‘‘۔

’’یہ آپ کا ظرف ہے جو ایسا کہتے ہیں‘‘۔ مکیش نے ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ’’آپ نے تو اپنی اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے میرا دل بڑھا دیا لیکن سمدھن جی تو ہمیں اپنا رشتہ دار ہی نہیں تصور کرتیں‘‘۔

’’ارے مکیش بھائی! دل چھوٹا نہ کریں اور سنتو بھابی کی باتوں پر دھیان نہ دیں‘‘۔ ابا نے مکیش کو دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔ ’’بھلا حقیقت کو کوئی جھٹلا سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ لالہ جی کے سمدھی ہیں اور دیپا اس حویلی کی بڑی بہو ہے اور اس حوالہ سے آپ میرے بھی بھائی سے کم نہیں ہیں‘‘۔

’’چلیں یہ سوغات لیں اور بیئر پئیں‘‘۔ لالہ جی نے مکیش سے کہا اور میز پر پڑی بوتل سے دو گلاسوں میں بیئر ڈال کے ایک اس نے خود اپنے سامنے رکھا اور دوسرا مکیش کے ہاتھوں میں تھما دیا۔

’’ہاں تو لالہ جی! آپ نے مجھ اَن پڑھ دیہاتی کو حویلی سے جڑے کن معاملات کے مشورہ کے لئے بلوایا ہے‘‘۔ مکیش نے بیئر پیتے ہوئے کہا۔

’’مکیش جی! آپ ذرا ہمارے قریب تو آئیں‘‘۔ ابا نے اس سے کہا۔ ’’آپ سے بہت ضروری باتیں کرنی ہیں‘‘۔

مکیش سٹول سے اٹھ کر لالہ جی کے ساتھ خالی کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔ لالہ کیدار ناتھ نے خوشی کا سحر توڑتے ہوئے اپنے لب ہلانے شروع کیے۔

"مکیش جی! آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ میں آج کل حویلی سے لگے کئی ناگہانی مقدمات کی وجہ سے شدید ذہنی اذیت کا شکار ہوں"۔ لالہ جی نے بات شروع کرتے ہوئے کہا۔ "ایک طرف میرے بھائی شنکر دیال اور اس کے بیٹوں نے اس حویلی کی ملکیت پر اپنا دعویٰ ٹھونکا ہوا ہے تو دوسری جانب اسی کمبخت یعنی میرے بھائی نے مجھے مزید تنگ کرنے کے لئے اس حویلی کی ملکیت کے لئے میڈیکل ڈیپارٹمنٹ کو پیچھے لگا دیا ہے اور وہ محکمہ عدالت سے اس حویلی کی ملکیت کا مقدمہ جیت چکا ہے اور دوسرے مجھے عدالت سے حکم ملا ہے کہ تم اگلے چند دنوں میں اس کی ملکیت متعلقہ محکمے کو دو۔ یہی نہیں، کمبخت دھرم لعل وکیل نے بھی ہم پر ہتک عزت کے دو کیس دائر کئے ہوئے ہیں"۔ پھر لالہ جی نے چپ سادھ لی جیسے کچھ سوچنے لگے ہوں۔

"صرف اسی پر بس نہیں مکیش جی!" ابا نے بات کو آگے بڑھاوا دیتے ہوئے کہا۔ "ایک طرف حویلی لالہ جی کے ہاتھ سے نکلی جا رہی ہے اور دوسری طرف بڑی پریشانی اس کے بھائی شنکر دیال اور اس کے بیٹوں کی جانب سے ہے۔ انہوں نے نہ صرف اس کی بھرے بازار میں تذلیل کی ہے بلکہ کلدیپ کو بھی شدید زخمی کیا ہے"۔

مکیش نے اپنی کمر میں پڑے رومال سے اپنے چہرے پر آئے پسینے کو پونچھتے ہوئے کہا۔ "اب آپ دونوں بڑے مجھے مشورہ دیں کہ میں ناچیز آپ کے ان معاملات میں کیا مدد کر سکتا ہوں"۔

ابا اس کے مزید قریب آ کر بولے۔ "مکیش جی آپ ہماری ان مشکلات میں کئی طریقوں سے مدد کر سکتے ہیں"۔

"آپ صرف اشارہ کریں"۔ مکیش نے کہا۔ "بھگوان کی سوگند اگر آپ کے حکم سے ایک انچ بھی پیچھے ہٹا تو مرد کا بچہ نہ کہنا"۔

"ہمیں معلوم ہے کہ تم ایک جی دار انسان ہو"۔ ابا نے مکیش سے کہا۔ "اور معاملہ فہم بھی ہو۔ اسی لئے ہم نے تمہیں یہاں اپنے پاس ان مسائل کو حل کرنے اور مشورہ کے لئے بلایا ہے"۔

"آپ صرف حکم کریں اور پھر میرا کام دیکھیں"۔ مکیش نے سینے پر ہاتھ رکھ کر پُرعزم لہجے میں کہا۔

"اچھا وعدہ کرو یہ باتیں جو ہمارے اور تمہارے درمیان ہو رہی ہیں اس کی رتی برابر بھی ہوا باہر نہیں نکلے گی"۔ ابا نے اس سے کہا۔ "بقول تمہارے تم ہم دونوں کو باپ کی عزت دیتے ہو"۔

"عظیم صاحب! اس میں کوئی شک ہے"۔ مکیش نے بڑے جذباتی انداز میں کہا۔ "کہو تو ابھی اپنے سینے میں برچھی مار کر اپنا دل آپ کے سامنے رکھ دوں"۔

"مکیش جی! ہمیں آپ کی سادہ طبیعت اور خلوص کا بخوبی اندازہ ہے"۔ ابا نے کہا۔ "ہمیں یقین ہے کہ وقت پڑنے پر آپ پیچھے نہیں ہٹیں گے"۔

"آپ لمبی باتیں نہ کریں"۔ مکیش نے کہا۔ "بس یہ بتائیں میرے لئے کیا حکم ہے؟"

"حکم نہیں التجا ہے، مکیش جی!" لالہ جی نے اپنے غرور کو ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔ "میں نے آپ لوگوں سے ایک کام بڑی رازداری سے لینا ہے"۔

"کیا کام؟" مکیش نے تفکرانہ انداز میں پوچھا۔

"اس حویلی کے سکون کو جو آگ لگی ہوئی ہے اُس کی چنگاری میرے بھائی شنکر دیال نے پھینکی ہے"۔ لالہ نے مکیش سے کہا۔ "اس مکار نے مجھے مختلف نوعیتوں کی مقدمہ بازیوں میں اتنا الجھا دیا ہے کہ میں نہ تین میں رہا نہ تیرہ میں۔ اس نے دو چار دن پہلے بھرے بازار میں نہ صرف مجھے ذلیل خوار کیا بلکہ اس کے بیٹوں نے مجھ سے دست درازی بھی کی ہے اور کلدیپ کے ساتھ انہوں نے جو کیا وہ تو آپ کو پتا ہی ہے"۔

''اچھا لالہ جی! آپ مجھے اس امر کی کتنی اجازت دیں گے کہ میں آپ کے بھائی شنکر دیال اور اس کے بیٹوں کو کتنا سبق کھاؤں؟''

''تم میرے لئے کچھ کر سکتے ہو تو اتنا کرو''۔ لالہ نے کہا۔ ''کہ شنکر دیال اور اس کے دونوں خبیث بیٹوں کو جان سے نہ مارنا بس اُن کی ٹانگیں، بازو توڑ کر ان کے دلوں میں ہماری ایسی دھاک جما دو کہ وہ کبھی بھی ہمیں نقصان نہ پہنچانے کا تصور یا ہمت نہ کریں''۔

''سدھی جی! آپ اس بات کی چنتا نہ کریں''۔ مکیش نے اعتماد سے کہا۔ ''میں آپ کے بھائی شنکر دیال کو مکمل طور پر زندگی سے فارغ نہیں کروں گا۔ بس اُسے اور اس کے بیٹوں کو ایسا مزہ چکھاؤں گا کہ وہ کبھی بھی آپ کی حویلی کی طرف میلی آنکھ سے نہ دیکھیں گے...... رہا سوال ہیلتھ ڈیپارٹمنٹ کے اس حویلی پر عدالتی قبضہ کا تو بھگوان نے چاہا اُسے بھی اپنے طریقہ سے نمٹ لوں گا''۔

''کیسے نمٹے گا؟'' لالہ جی نے اس سے پُرتجسس انداز میں استفسار کیا۔

''دھیرج مہاراج! شانتی رکھو''۔ مکیش نے کہا۔ ''یکدم چٹکی بجاتے ہی سارے مسئلے حل نہیں ہوتے۔ ہر مسئلے کو حل کرنے کے لئے ایک الگ طریقہ اور کچھ وقت درکار ہوتا ہے۔ لالہ جی! آپ ابھی سنتو پی کر آرام سے بےفکر ہو کر سو جائیں''۔

''دیکھو بھائی! مروا نہ دینا''۔ لالہ جی نے خوف کا اظہار کیا۔

''معاف کرنا لالہ جی! آپ کے شریر (جسم) میں خرگوش کا دل ہے''۔ مکیش نے کھل کر کہا۔ ''اگر آپ نے اسی طرح ڈر کر اور پھونک پھونک کر جینا ہے تو پھر ہیلتھ ڈیپارٹمنٹ اور شنکر دیال سے حویلی کے مقدمہ بازی، پھڈوں کا کیا تردد کرنا، آپ ویسے ہی حویلی ان کے حوالے کر دیں اور خود باہر سڑک پر بیٹھ جائیں''۔

''مکیش! تُو واقعی صحیح کہتا ہے''۔ ابا نے خوش ہو کر کہا۔ ''لالہ سچ میں ایک بزدل، عقل سے پیدل انسان ہے''۔

''اچھا جا جو تجھے بہتر لگے وہ کر''۔ لالہ جی نے عاجز آ کر کہا۔ ''بھگوان کے واسطے ہمارا یہ راز کبھی منہ سے نہ پھوٹیو، یہ ہماری عزت کا معاملہ ہے''۔

''آپ کی عزت میری عزت ہے''۔ مکیش نے کہا۔ ''اور کوئی آپ کی تذلیل کرے وہ میری بھی تذلیل ہے۔ آپ میری طرف سے بےفکر رہیں، آپ لوگوں اور میرے درمیان جو باتیں ہوئی ہیں ان کی کبھی بھی ہوا باہر نہیں جائے گی''۔ اس کے بعد مزید کچھ بات چیت ہوئی اور پھر مکیش چلا گیا۔

''یار! یہ گدھا ہمیں کہیں الٹا عذاب میں نہ ڈال دے''۔ اس کے جانے کے بعد لالہ نے ابا سے کہا۔

''تم بالکل فکر نہ کرو لالہ!'' ابا نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''مکیش ایک دلیر، جہاندیدہ آدمی ہونے کے ساتھ ساتھ لڑائی مار کٹائی، عدالتوں، تھانوں کے معاملات کو بخوبی سنبھالنے والا انسان ہے۔ یہ ضرور کوئی نہ کوئی کام کر ڈالے گا''۔

اُسی رات مکیش اس کے دونوں بیٹوں جونا، بونم اور ان کے ساتھ آئے لٹھ بردار دیہاتیوں نے شنکر دیال کے محلہ میں جا کر اس کے گھر میں شب خون مارتے ہوئے اُن کی لاٹھیوں، ڈنڈوں سے خوب مرمت کی۔ ان لوگوں نے شنکر دیال کی دائیں ٹانگ توڑی اور اس کے دونوں بیٹوں کے سر پھاڑ دیئے لیکن ان کی عورتوں کو زدوکوب نہ کیا۔ مکیش اور اس کے بیٹوں نے وہاں شنکر دیال کو دھمکاتے ہوئے کہا کہ اگر ان لوگوں نے آئندہ لالہ جی، اس کے پریوار اور حویلی پر میلی نظر ڈالی یا اسے نقصان پہنچانے کی کوشش کی تو ہم تجھ سمیت پورے خاندان کو لہو میں نہلا دیں گے۔ لالہ کو لاوارث نہ سمجھنا۔

لالہ جی کو جب مکیش کی اس واردات کا علم ہوا تو وہ اتنا خوفزدہ ہوا کہ وہ حویلی چھوڑ کر اپنے ایک قریبی دوست کے گھر جا چھپا۔ اُسے یہ اندیشہ تھا کہ شنکر دیال اس کارروائی کا بدلہ ضرور لے گا یا پھر پولیس میں رپورٹ تو ضرور ہی کرے گا۔

اُدھر حویلی میں شنکر دیال کی بیوی اور محلّہ کی کچھ عورتیں چیختی چلاتی کوسنے دیتی ہوئی آ گئیں۔ شنکر دیال کی بیوی نے چیخ چیخ کر پوری حویلی کو سر پر اٹھا لیا۔ اُس نے سنتو تائی اور دیپا کو دھمکی دی کہ وہ اس حویلی کو برباد کر دے گی۔ سنتو تائی تو اس کی آمد سے ڈر کر چھپ گئی لیکن دیپا نے اس کا زبانی لڑائی میں برابر کا مقابلہ کرتے ہوئے کہا کہ جا تُو نے جو کرنا ہے کر لے۔

شنکر دیال کی بیوی چیخ و پکار کرتی ہوئی تھک ہار کر حویلی سے چلی گئی۔

لالہ اپنے دوست کے گھر دو روز چھپا رہا اس نے جب دیکھا کہ شنکر دیال اور اس کے بیٹوں نے مکیش کی مار کھا کر کوئی ردعمل نہیں کیا ہے یعنی نہ پولیس میں رپورٹ، نہ جوابی حملہ وغیرہ تو وہ سیدھا ہمارے گھر میں آ کر چھپ گیا۔ مکیش کو جب لالہ کی ہمارے گھر آمد کا علم ہوا تو وہ بھی ہمارے گھر آ گیا۔

''سمدھی جی! میں نے آپ کے حکم کے مطابق آپ کے بھائی شنکر دیال اور اس کے بیٹوں کو اتنی سزا دی ہے جتنی وہ سہہ سکیں''۔ مکیش نے بتایا۔ ''ورنہ سچی بات ہے مجھے ان پر اتنا غصہ تھا کہ میرا دل کرتا تھا کہ میں انہیں موت کا مزہ چکھا دوں''۔

''ان بے غیرتوں کے لئے اتنا سبق کافی ہے''۔ لالہ جی نے قدرے لرزتے ہوئے کہا۔ ''مجھے تو اب بھی ڈر لگ رہا ہے کہ کہیں وہ کمبخت ہم پر کوئی کاری جوابی حملہ نہ کر دیں''۔

''سمدھی جی! اس قسم کے کاموں میں بزدلی سے نہیں بلکہ پتا پانی کو یکجا رکھنا پڑتا ہے''۔ مکیش نے لالہ کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''آپ اس طرح ڈرتے رہے تو یقین کریں آپ کی حویلی کل نہیں آج ہی آپ کے دشمنوں کے ہاتھوں میں ہوگی اور آپ کی زمانہ میں رسوائی الگ ہو گی۔ اب آپ شانت ہو کر میری اگلی چند باتیں غور سے سنیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ اس خوف سے پُرسکون ہو جائیں کہ شنکر دیال اور اس کے بیٹے آپ کو مزید کوئی نقصان پہنچائیں گے۔ اب رہا سوال آپ کی حویلی کے قبضہ کا، یہ ایک قانونی معاملہ ہے۔ اس کو ہم اپنی لٹھ بازیوں، لڑائی جھگڑوں سے حل نہیں کر سکتے۔ سمدھی جی! آپ نے وہ مثال تو سنی ہوگی کہ لوہا لوہے کو کاٹتا ہے''۔

''مکیش جی! ہم سے ایسی ذو معنی باتیں نہ کرو جو ہمیں سمجھ نہ آئیں''۔ لالہ جی نے الجھتے ہوئے کہا۔ ''یہ لوہا، لوہے کو کاٹتا جیسی الجھن والی باتیں سمجھ سے باہر ہے''۔

''مجھے آپ کیا ایک سخت مگر حقیقت پر مبنی بات کہنے کی اجازت دیں گے؟'' مکیش نے لالہ جی کی طرف اجازت طلب نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیوں نہیں بھائی جی! جو آپ کے دل میں بات ہے اُسے کہہ دو''۔ لالہ جی نے کھلے دل سے کہا۔ ''ہم تمہاری کسی بات کا بُرا نہیں مانیں گے''۔

''شکریہ سمدھی جی!'' مکیش نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ''دراصل میں حویلی کے معاملات بارے آپ کو جو حقائق بتانے لگا ہوں وہ وقتی طور پر آپ کو کڑوے لگیں گے مگر حقیقت ہمیشہ کڑوی ہوتی ہے۔ میں بڑی معذرت کے ساتھ یہ بات کہوں گا کہ آپ نے اپنی بے عقلی، کنجوسی اور جاگیردارانہ اکڑ کی وجہ سے اپنے راستہ میں جلتے کوئلوں کے پہاڑ کھڑے کر دیئے ہیں۔ اب ان کو عبور کرنا اور ان کی آگ بجھانا آپ کے لئے انتہائی کٹھن مرحلہ ہوگا لیکن بھگوان کی دیا سے میرے دماغ میں اتنی شکتی موجود ہے جس کی مدد سے آپ کے سارے مسائل کو حل کر سکتا

ہوں“۔ مکیش کی یہ باتیں سن کر لالہ جی کے وجود کو ایک لمحے کو جھٹکا لگا۔ اس نے سرخ نگاہوں سے مکیش کو گھورتے ہوئے اُسے کچھ کہنا چاہا تو ابا نے لالہ کے کندھوں پر ہاتھ مار کر اسے چپ رہنے کی تنبیہ کی۔

مکیش نے ابا کے اشارے کی اس ادا کو بھانپتے ہوئے یکدم چپ سادھ لی۔

”نہیں نہیں آپ بات جاری رکھیں بھائی صاحب!“ ابا نے بات پلٹتے ہوئے مکیش سے کہا۔ ”میں نے لالہ کو اس لئے ٹھونگا مارا ہے کہ درمیان میں بولنے کی بجائے غور سے سنیں“۔

”سمدھی جی! معافی چاہتا ہوں“۔ مکیش نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ ”اگر آپ کو میری اب تک کوئی بات بُری لگی ہو تو کیا میں اپنے ہونٹ سی لوں؟“

”نہیں نہیں تم اپنی بات مکمل کرو“۔ لالہ جی نے جبراً مسکراتے ہوئے کہا۔ ”تم اپنی بات پوری کرو، میں بُرا نہیں مانوں گا“۔

”سمدھی جی! سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ میں وہ صلاحیت ہی نہیں ہے کہ آپ کسی ہاتھی کو پال سکیں“۔ مکیش نے کہنا شروع کیا۔

”ہاتھی سے تیری کیا مراد؟“ لالہ نے بات کاٹ کر پوچھا۔

”سمدھی جی! بھگوان کے واسطے میری بات نہ کاٹیں“۔ مکیش نے کہا۔ ”مجھے وہ بولنے دیں جو میں بولنا چاہتا ہوں۔ آپ نے مجھ سے پوچھا ہے کہ ہاتھی سے کیا مراد ہے؟ ہاتھی سے مراد یہ ہے کہ آپ ایک وسیع و عریض حویلی اور اس سے ملحقہ کئی دکانوں کے مالک ہیں لیکن آپ کے اندر اس حویلی کی ساکھ سنبھالنے کی بالکل بھی اہلیت موجود نہیں ہے اور دوسرے آپ اپنی جاگیردارانہ رعونت کے زعم میں کسی دوسرے انسان کو انسان ہی نہیں سمجھتے۔ آپ نے یو پی کے بڑوں کی وہ حکایت نہیں سنی کہ انسان اپنے اچھے بُرے رویوں سے دوسرے انسانوں کے دل جیتتا اور ہارتا ہے۔ آپ اگر بالغ نظر ہوتے تو آپ اپنے بھائی شنکر دیال سے خوش اخلاقی، چاپلوسی سے ملتے اور اس کی کوئی نہ کوئی کمزوری پکڑ کر اس کا دھیان اس حویلی کے اوپر سے ہٹاتے اور دوسرے آپ کو چاہئے تھا کہ آپ کچھ رقم میڈیکل ڈیپارٹمنٹ کے وکیل کو بطور رشوت دے کر اسے خرید سکتے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر آپ سرکاری وکیل کی مٹھی گرم کرتے تو وہ متعلقہ ڈیپارٹمنٹ کے کیس کی الٹی سیدھی وکالت کرتا اور آخری غلطی یہ ہوئی کہ آپ نے اس اہم کیس کی وکالت کے لئے دھرم لعل جیسا ٹٹ پونجیا وکیل کیا۔ سونے پہ سہاگہ یہ کہ آپ نے اس کی فیس بھی تھوڑی کر کے توڑ توڑ کر دی اور اس کے ساتھ ساتھ آپ نے اس اہم کیس کو انتہائی ہلکا لیا اور آپ نے کبھی کچہری جا کر جھانکا تک نہیں کہ حویلی کا یہ اہم کام کہاں جا رہا ہے۔ میرے خیال میں آپ کی اس عدالتی شکست میں دھرم لعل قصوروار نہیں ہے۔ آپ نے اسے جتنی اور جس طریقہ سے فیس دی اس نے ویسی ہی اس کیس کی وکالت کی“۔

”تمہارا یہ تجزیہ تمہارے جہاں دیدہ ہونے کا ثبوت ہے“۔ ابا نے مکیش کو سراہتے ہوئے کہا۔ ”تم نے لالہ جی کو ان کمزوریوں اور غلطیوں کی حقیقی تصویر دکھا دی ہے جن کی وجہ سے اسے آج بدترین پریشانی کے دن دیکھنے پڑ رہے ہیں“۔

”اچھا تو ہمیں اس حویلی کو ہیلتھ ڈیپارٹمنٹ سے بچانے کے لئے کیا کرنا چاہئے؟“ لالہ جی نے مکیش سے پوچھا۔ وہ اب مکیش کی باتوں سے خاصے متاثر نظر آ رہے تھے۔

”لالہ جی! آپ کی حویلی کی بے دخلی کی عدالتی ڈگری کو ہائی کورٹ سے حکم امتناعی کے ذریعے روکا جا سکتا ہے“۔ مکیش نے مشورہ دیتے ہوئے کہا۔ ”اور دوسری بات یہ ہے کہ ہائی کورٹ سے لوئر کورٹ کی جانب سے دی گئی ڈگری کو تڑوانا کوئی اماں جی کا کھیل نہیں ہے۔ اس کام کے

لئے آپ کو لازماً کوئی قابل وکیل کرنا پڑے گا"۔

"ہاں تو مکیش جی! تمہارے خیال میں ہمارا یہ کام کون سا قابل وکیل کر سکتا ہے؟"

"سمدھی جی! آپ کو اپنی لاکھوں روپے کی اس حویلی کو بچانے کے لئے چند ہزار روپوں کی بھینٹ دینی پڑے گی"۔ مکیش نے ایک لمحہ سوچا اور پھر کہا۔ "میرے خیال میں آپ نوشہ کمل بیرسٹر کے ہاتھوں میں یہ معاملہ دے دیں۔ مجھے پورا یقین ہے کہ وہ ہائی کورٹ سے حکم امتناعی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا"۔

نوشہ کمل اُس وقت کا قابل ترین اور نہایت مہنگا وکیل تھا۔ لالہ جی کے پسینے چھوٹ گئے۔

"لیکن نوشہ کمل وکیل کی اتنی بھاری فیس کون بھرے گا؟" لالہ جی نے روایتی کنجوسی سے کہا۔

"سمدھی جی! میں نے آپ کو پہلے ہی بتلا دیا ہے کہ آپ کے پاس دو راستے ہیں"۔ مکیش نے سنجیدگی سے کہا۔ "ایک تو یہ کہ آپ اپنی لاکھوں روپے کی حویلی لٹا دیں یا ہزاروں کا کڑوا گھونٹ پی کر اسے بچا لیں۔ باقی آپ خود سمجھدار ہیں اور اپنی مالی حیثیت کو بخوبی سمجھتے ہیں آپ اپنا فیصلہ کرنے میں آزاد ہیں جو آپ بہتر سمجھیں"۔

"مکیش جی! آپ کے یہاں آنے اور مشورہ کا بہت شکریہ"۔ ابا نے کہا۔ "ہم ذرا اس معاملہ پر باہمی مشورہ کر لیں اور اُس کی روشنی میں ہم اگلا قدم اٹھائیں گے"۔

"عظیم صاحب! میری آپ سے گزارش ہے کہ آپ جو بھی فیصلہ کریں وہ بڑی سوچ سمجھ کر اور جلدی کریں"۔ مکیش نے کہا۔ "کیونکہ آپ کے پاس اس معاملہ کو سلجھانے کے لئے وقت بہت کم ہے۔ اچھا میں اب چلتا ہوں۔ اگر آپ کا اس معاملہ کو وکیل نوشہ کمل کو دینے کا ارادہ ہو تو مجھے یاد کر لیجئے گا۔ میں ایک حوالہ سے اُسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ بھگوان نے چاہا تو آپ کے تمام جھگڑے معاملات مناسب فیس کے ساتھ سلجھ جائیں گے"۔

مکیش جب ہمارے گھر سے چلا گیا تو ابا اور لالہ جی سر جوڑ کر مکیش کی تجاویز اور وکیل نوشہ کمل کے بارے میں عرق ریزی سے سوچنے لگے۔

میں وہاں کھڑا اپنے ابا عظیم اور تاؤ لالہ کیدار ناتھ کو باہم مشورہ کرتے دیکھ رہا تھا۔ اسی دوران لالہ جی کی نظر مجھ پر پڑی تو اشارے سے مجھے اپنے پاس بلایا۔

"ایک کام کر باسو!" لالہ جی نے مجھ سے کہا۔ "بھاگ کر بازار جا اور وہاں سے بابا مولدر سنگھ کو بلا کر لا"۔

مولدر سنگھ ایک پرانا مقدمہ باز اور قانون اور عدالتی معاملات کی سمجھ بوجھ رکھنے والا بوڑھا شخص تھا۔ اس کی بازار میں پرچون کی دُکان تھی۔ میں اسے بلا کر لے آیا۔ اس کی خاطر تواضع کے بعد ابا اور لالہ جی نے اُس سے حویلی کے بارے میں عدالتی ڈگری اور دیگر مقدمات کے بارے میں اس کی رائے مانگی تو اس نے بھی ان دونوں کو یہی مشورہ دیا کہ وہ فی الحال اس حویلی کو بچانے کے لئے شہر کے مشہور وکیل نوشہ کمل کو ہائر کر لیں لیکن اس نے دونوں کو یہ بھی بتلایا کہ نوشہ کمل وکیل کی فیس کم از کم دو ہزار روپے ہے۔

قارئین گرامی! اُس زمانہ میں سونے کی قیمت 70 روپے فی تولہ تھی۔

وکیل کی فیس سن کر لالہ ایک لمحے کو چونکا اور بڑبڑایا دو ہزار روپے فیس۔

"جی ہاں لالہ جی! نوشہ وکیل کوئی ٹکے مار معمولی ایڈووکیٹ نہیں ہے"۔ بابا مولدر سنگھ نے کہا۔ "وہ ولایت سے قانون کی موٹی موٹی کتابیں پڑھ کر آیا ہے۔ اس کے سامنے تو بڑے بڑے بیرسٹر، جج بھی گھٹنے ٹیک دیتے ہیں ...... جس نے بھی نوشہ وکیل کو ہائر کرنے کا مشورہ دیا ہے وہ سولہ آنے درست ہے"۔ جاتے جاتے بابا مولار سنگھ انہیں یہ کہہ گیا کہ تم لوگوں نے پہلے ہی بہت دیر کر دی ہے تم پہلی

فرصت میں نوشہ کمل وکیل سے رابطہ کرو۔

دوسرے روز لالہ جی اور ابا مکیش سے ملے۔ ابا نے اُسے کہا کہ وہ آج لازماً ان کے ساتھ وکیل نوشہ کمل کے پاس چلے۔ شام کو مکیش حویلی میں اپنے ہاتھوں میں ایک بڑا تھیلا لیے آیا۔ ابا اور لالہ نے اس سے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ مکیش نے کہا کہ اس تھیلے میں وکیل کی کمزوری بند ہے۔

''کیسی کمزوری؟'' لالہ جی نے حیران ہو کر پوچھا۔

''سمرمی جی! اس میں ہمارے گاؤں کی بنائی ہوئی خاص ٹھرے (دیسی شراب) کی بوتلیں ہیں''۔ مکیش نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ہمارے گاؤں کا ٹھرا بہت مشہور ہے اور یہ کمبخت نوشہ کمل اس ٹھرے کا رسیا ہے۔ دراصل ہمارے گاؤں کا ایک چھوکرا پربھو ناتھ اس کی گاڑی کی ڈرائیوری کرتا ہے وہ یہ ٹھرا اُس کے ذریعہ گاؤں سے منگواتا ہے۔ مجھے معلوم تھا آپ نے لازماً اس کے پاس جانا ہے۔ اسی لئے میں نے آج ہی یہ بوتلیں گاؤں سے منگوالی ہیں اور ویسے بھی پربھو وہاں موجود ہوگا۔ اس کے توسط سے نوشہ کمل ہمارے کیس میں معمول سے ہٹ کر مدد کرے گا''۔

لالہ اور ابا جب مکیش کے ساتھ اس کے چیمبر میں پہنچے تو وہاں اس کے کئی کلائنٹ بیٹھے وہئے اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے لیکن مکیش نے اس کے ڈرائیور پربھو سے مل کر بات کی تو نوشہ کمل نے ان کو جلدی اندر بلا لیا۔

اپنا مدعا پیش کرنے سے پہلے مکیش نے لاسا گاؤں کی بنی ٹھرے کی خاص بوتلوں کا بھرا تھیلا اس کی جانب بڑھا دیا۔ نوشہ نے ان بوتلوں کو دیکھتے ہی خوشی سے کہا۔

''جی آپ نے یہ بہت اچھا کیا، میرے دماغ کے انجن کو چلانے والا پٹرول لے آئے۔ ہاں، اب بتلائیں کہ آپ کا کیا مسئلہ ہے؟''

لالہ جی اور ابا نے وکیل کو شروع سے آخر تک مختصر تفصیل بتلائی۔ نوشہ کمل نے مقدمہ کی پوری فائل کے صفحات کا اپنی انگلیوں کی پوروں سے الٹ پلٹ کر کے سرسری جائزہ لینے کے بعد لالہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''میں سارا کیس سمجھ گیا ہوں۔ اب اس کا صرف یہی حل ہے کہ تمام معاملات کو پس پشت رکھتے ہوئے فی الحال عدالتی ڈگری کے خلاف ہائی کورٹ سے حکم امتناعی لینا چاہئے کیونکہ مقررہ تاریخ کو لامحالہ ہیلتھ ڈیپارٹمنٹ کی ہر ممکن کوشش ہوگی کہ وہ آپ سے حویلی کا ملکیتی بنیاد پر قبضہ لے لے اور وہ آپ کو انہیں بغیر کسی حجت کے دینا پڑے گا''۔

نوشہ کمل کی باتیں سن کر لالہ جی کے ماتھے پر پریشانی سے پسینے کی بوندیں نمایاں ہونے لگیں۔

''بھگوان کے واسطے مجھے ڈوبنے سے بچا لو''۔ اس نے بے بسی سے منتیں کرنا شروع کر دیں۔

''دیکھو میں اپنے تئیں محنت کرنے اور بالکل کھری بات کہنے والا انسان ہوں''۔ نوشہ کمل نے کہا۔ ''میں اپنی فیس کی لالچ میں ہرگز آپ کو وہ مشورہ نہیں دوں گا جس کی بناء پر آپ کا نقصان ہو جائے۔ میری باتیں غور سے سنو...... پہلی باست تو یہ ہے کہ لالہ جی آپ میرے پاس حویلی کا کیس اس حالت میں لے کر آئے ہیں جب اس میں بالکل بھی جان نہیں ہے''۔

''وکیل صاحب! میں بڑے مان سے اور آپ کی قابلیت، شہرت سن کر آیا ہوں''۔ لالہ جی نے گڑگڑا کر کہا۔ ''بھگوان کے واسطے کچھ اوپائے کریں''۔

''لالہ جی! آپ چنتا نہ کریں''۔ نوشہ کمل نے اسے دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔ ''میں پہلے کوشش کروں گا کہ کسی طرح ہائی کورٹ سے حویلی کی بے دخلی کے خلاف حکم امتناعی حاصل کروں مگر یہ کام انتہائی کٹھن نظر آتا ہے۔ میں اپنا ہر ممکن زور لگا دوں گا۔ آپ ایسا کریں میرے پاس یہ فائل چھوڑ دیں تاکہ میں اس کی اچھی طرح سٹڈی کر کے ہائی کورٹ میں حکم امتناعی کی درخواست دائر کر سکوں''۔

''وہ فیس کا کیا حساب کتاب ہوگا؟'' ابا نے متفکرانہ انداز میں اُس سے پوچھا۔

''میں ویسے اس قسم کے چھوٹے اور مردہ کیس نہیں لیتا''۔ نوشہ کمل نے کہا۔ ''لیکن آپ کیونکہ میرے ڈرائیور پربھو کے توسط سے آئے ہیں تو میں آپ سے اس کیس کی فیس اڑھائی ہزار لوں گا۔ ویسے اگر کوئی اور ہوتا تو میں اُس سے کم از کم تین چار ہزار لیتا اور دوسرے آپ شکر کریں کہ میں آپ کا یہ کیس لے رہا ہوں''۔

مکیش نے لالہ جی کے کان میں کہا کہ مجھے صرف پندرہ سو روپے دیں۔ میں وکیل سے فیس کا معاملہ نمٹاتا ہوں۔ لالہ نے پندرہ سو روپے مکیش کے ہاتھ میں رکھ دیئے۔

''اگر میری فیس کے بارے میں کھسر پھسر ہو رہی ہے تو یاد رکھو کہ میں تم سے وہی فیس لوں گا جو میں نے تمہیں بتلائی ہے''۔ نوشہ کمل نے بھانپ کر کہا۔ ''بلکہ میں نے پربھو کی وجہ سے انتہائی کم کر دیئے ہیں''۔

''وکیل صاحب! آپ نے پربھو کی وجہ سے ہمارا لحاظ کیا ہے''۔ مکیش نے کہا۔ ''تو اب آپ میری اور اپنے پٹرول کی خاطر کچھ اور رعایت کر دیں''۔

''اتنے سے پٹرول سے میرے دماغ کا کتنا انجن چلے گا''۔ نوشہ کمل نے مسکرا کر کہا۔ ''یہ تو اونٹ کے منہ میں زیرے والی مثل ہو گی''۔

''وکیل صاحب! آپ ہمارے گاؤں کی سوغات کی فکر نہ کریں، میرا آپ سے وعدہ ہے کہ میں آپ کو آپ کی طلب پہنچاتا رہا کروں گا''۔ مکیش نے لوہا گرم دیکھ کر چوٹ لگائی۔

''میں چاہوں تو کیٹرس (اُس زمانے میں مہنگی ترین شراب) کی پیٹیاں منگوا سکتا ہوں''۔ نوشہ کمل نے کہا۔ ''لیکن جو نشہ تمہارے گاؤں کا بنا دیسی ٹھرا دیتا ہے وہ مزہ کسی قیمتی شراب میں موجود نہیں ہے''۔

مکیش نے زبردستی اس کی جیب میں پندرہ سو روپے ٹھونس دیئے تو وہ بولا۔ ''ارے یہ کیا کر رہے ہیں؟ اس سے تو بہتر ہے کہ میں آپ کا کیس مفت ہی لڑ لیتا ہوں''۔

''ارے آپ ہمارا کیس مفت کیوں لڑیں گے؟'' مکیش نے کہا۔ ''ہم یہ گوارا نہیں کر سکتے''۔

''نہیں نہیں آپ یہ رقم واپس لے لیں''۔

کافی تکرار کے بعد مکیش نے لالہ کو کہا کہ وکیل صاحب کو سو روپے اور دیں۔ نوشہ کمل نہیں نہیں کرتا رہا لیکن اس کے باوجود مکیش نے سو روپے مزید اس کی جیب میں ٹھونس دیئے۔

''یہ زیادتی ہے''۔ نوشہ کمل نے کہا۔

''میں ہر زیادتی کا ازالہ کر دوں گا''۔ مکیش نے کہا۔

''آپ کی سپلائی میں کمی نہیں آنے دوں گا''۔

''لیکن یاد رہے، یہ فیس جو آپ نے مجھے دی ہے وہ صرف حویلی کے حکم امتناعی کی ہے''۔ نوشہ کمل نے کہا۔

''نوشہ کمل وکیل کے چیمبر سے نکل کر یہ تینوں حویلی میں آ گئے تو مکیش نے لالہ کیدار ناتھ سے کہا۔

''سمدھی جی! آپ نے حویلی کو خالی کرنے کے خوف سے جو موٹا چھوٹا سامان باندھ رکھا ہے وہ آپ واپس اپنی جگہ پہنچا دیں''۔ مکیش نے کہا۔ ''اور آپ مجھے یاد رکھیں گے کہ آپ کو صحیح قابل وکیل کے پاس لے کر گیا ہوں''۔

''ہاں مکیش جی میں تمہارا دل کی گہرائیوں سے شکر گزار ہوں''۔ لالہ جی نے کھلے دل سے اعتراف کرتے ہوئے کہا۔ ''تم نے مجھ بھٹکتے ہوئے کو درست راستہ دکھایا اور میرے دماغ پر چڑھا بوجھ ہی اتار دیا''۔

ابھی یہ لوگ آپس میں مختلف امور پر تبادلہ خیال ہی کر رہے تھے کہ حویلی کے اوپری کمرے سے ماتا اور دیپا کی بیک وقت مشترک دلخراش چیخوں کی آوازیں آئیں۔

''بھگوان خیر کرے!'' تینوں مکیش، لالہ اور راہا ہڑبڑا کر جب حویلی کے اوپر حصے میں بڑے کمرے میں پہنچے تو اُن کی نگاہوں کے سامنے دیپا اور ماتا زمین پر پڑے مچھلی کی مانند تڑپ رہے تھے۔ سنتو تائی بھی گھبرائی ہوئی وہاں پہنچ گئی تھی۔

(جاری ہے)

بدزبان

میں بدزبان ضرور ہوں لیکن بدکردار نہیں۔ میں ان ہوس کے مارے
گِدھوں کے سامنے اپنے جسم کا دسترخوان نہیں سجا سکتی، یہ رات کے اندھیرے
میں میرے گھر امداد کے نام پر میری عزت کی قیمت لگانے آتے ہیں۔

ثناء زبیر گوندل

"باجی! آپ کیسے جان سکتی ہیں کہ عورت کی ازدواجی زندگی جب بے سائباں ہو جائے تو ہمارا نام نہاد مہذب معاشرہ اُس سے کیسے کیسے امتحان لیتا ہے۔ یہ وہ عورت ہی جان سکتی ہے، جو اس کرب سے گزرتی ہے یا پھر رجو جانتی ہے جس نے یہ غم سہا ہے، جس نے معاشرے کی سفاکی کی جھلک دیکھی ہے"۔

یہ الفاظ رجو کے تھے۔ رجو ایک غریب بیوہ عورت ہے جو ہمارے گھر جھاڑو برتن کے لئے آتی ہے۔ رجو کی کہانی ہمارے معاشرے کی ہر اس عورت کی کہانی ہے جو بھری جوانی میں بیوہ ہو جاتی ہیں تو معاشرے کے لٹیرے انہیں کٹی پتنگ سمجھ کر لوٹنے کی کوشش کرتے ہیں۔

نام تو تھا اس کا راج بی بی مگر رجو کہلانے لگی۔

امیر ہوتی تو شاید راج بی بی ہی رہتی مگر غربت نے پہلا وار اس کے نام پر کیا اور اس کے اصل نام کو چھین لیا اور وہ صرف رجو رہ گئی۔ یوں تو غریب کی بیٹی تھی مگر حسن کی دولت سے مالا مال تھی۔

رجو نے کرم دین عرف کرمو کے گھر میں جب آنکھ کھولی تو ہر طرف دکھوں کے ڈھیر، مسائل کے پہاڑ اور مصائب کے انبار تھے۔ رجو کا جنم لینا بھی کسی مسئلے سے کم نہیں تھا، پہلے ہی ایک بھائی دو بہنیں، ماں باپ اور ایک بوڑھی دادی مہنگائی اور غربت کی چکی میں پس رہے تھے، اوپر سے رجو کی آمد۔ رجو کا باپ کرم دین ذات کا تو ملک تھا مگر ملکیت میں ایک چھوٹے سے گھر کے علاوہ کچھ نہ تھا اور گھر بھی مفلسی کا منہ بولتا شاہکار۔

رجو کا باپ کرمو کسی کے کھیتوں میں محنت مزدوری کرتا تھا مگر معاوضہ بہت ہی کم ملتا جو اس کے گھریلو اخراجات کے لئے ناکافی تھی۔ رجو کی پیدائش پر کوئی بھی خوش نہیں تھا سوائے اس کے باپ کے۔ رجو کی ماں اور دادی تو باقاعدہ رونے لگیں کہ ایک اور مصیبت نازل ہو گئی۔ وہ تو بیٹے کی آس لگا کر بیٹھے تھے تاکہ بیٹوں کی "جوڑی" بن جائے مگر یہ کم بخت پیدا ہو گئی۔ بوجھ کی دو سلیں تو پہلے ہی موجود تھیں۔

"اس طرح میری بیٹی کو کوسنے مت دو"۔ کرمو ان کو سمجھاتا۔ "لڑکی ہونے میں اب اس کا کیا قصور؟ وہ تو اللہ کے حکم سے ہمارے گھر آئی ہے۔ اس کا نصیب بھی اس کے ساتھ ہے۔ یہ تو میری راج بی بی ہے راج بی بی۔ دیکھنا راج کرے گی راج۔ اللہ نے اپنی رحمت بھیجی ہے، تم لوگ پریشان نہ ہو"۔

یوں اس ننھے وجود کا نام راج بی بی رکھ دیا گیا جو راج بی بی تو نہ بن سکی مگر رجو ضرور بن گئی کیونکہ وہ اپنے سیاہ مقدر میں غربت مفلسی اور دکھوں کے سوا کچھ لکھوا کر نہیں آئی تھی۔ سو اس کی زندگی میں کبھی روشنی کا میلا نہ لگ سکا۔

وقت کا دریا بہتا رہا، رجو کچھ بڑی ہوئی تو آس پاس غربت کی دلدل کو دیکھا۔ اس کے بہن بھائی ماں باپ کے ساتھ کھیتوں میں کام کرنے کے لئے جاتے تھے، وہ بھی ان کے ساتھ جانے لگی۔ کیونکہ دادی گھر میں ہوتی تھی، گھر کے کام کاج کرتی تھی مگر وہ رجو کو پیار نہ کر سکی۔ رجو اس نفرت سے فرار کے لئے اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ بہت چھوٹی عمر میں جانے لگی۔ وہ سب کام میں مصروف ہو جاتے تو وہ وہاں بیٹھ کر ریت مٹی سے گھر بنانے لگتی کیونکہ گھر بنانا لڑکیوں کے خمیر میں ہوتا ہے۔

اس نے اپنی خواہشوں کو صبر کی سل کے نیچے دبا دیا۔ وہ بھی اب بہن بھائیوں کے ساتھ والدین کا ہاتھ بٹانے لگی۔ صبر اور شکر کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔ وقت کا پنچھی اڑتا رہا۔ غربت کے جھمیلوں میں الجھے رجو کے والدین کو جب احساس ہوا کہ ان کی بڑی دو بیٹیاں تو جوانی کی دہلیز چھو چکی ہیں۔ اس احساس نے اُن کی راتوں کی نیند اڑا دیں اور دن کا چین غارت کر دیا کیونکہ مفلسی کا وہی عالم تھا، کچھ پس انداز نہ تھا۔ رشتوں کی

تلاش ایک اور کٹھن مرحلہ، وہ سوچتے اور بس سوچتے رہ جاتے۔ ہر طرف مہنگائی، غربت و مفلسی و مسائل کے گرداب نظر آتے تو دو بیٹیوں کی جوانی ان کے ناتواں وجود پر برق رعد ثابت ہوتی، معاشرے کی بے لگامی ان کو خوف زدہ کئے رکھتی کہ بغیر جہیز کے ان کی بیٹیوں کو کون بیاہنے آئے گا؟ یہ سوچ ان کو اندر سے غمگین کر دیتی اور وہ وقت سے پہلے بوڑھے لگنے لگے۔ گردش دوراں اپنے چکر میں تھی کہ تلاش بسیار کے بعد اپنے جیسا ہی ایک غریب مزدور گھرانہ ان کی بیٹیوں کا مقدر ٹھہرا کیونکہ ان کے مقدر نے یاوری نہ کی کہ وہ کسی کھاتے پیتے گھرانے کا حصہ بنتی۔ اس نے بھی رشتے اس شرط پر قبول کئے کہ ہم بھی اپنی بیٹی کا رشتہ آپ کے بیٹے کو دیں گے۔ ان کی بیٹی چھوٹے قد کی سانولی سی لڑکی تھی جبکہ رجو کا بھائی خاصا خوش شکل اور اونچے لمبے قد کاٹھ والا لڑکا تھا۔ والدین تو پہلے ہی مجبور تھے کہ یہ بوجھ کس طرح اتار پائیں اور بیٹیاں اپنے اپنے گھر کی ہو جائیں۔ ان کو یہ شرط غنیمت لگی اور انہوں نے ہاں کر دی۔

بہنوں کی رخصتی کے بعد کام کا سارا بوجھ رجو کے کندھوں پر آ گیا۔ گھر کا کام کرتی، والدین کے ساتھ کھیتوں میں کبھی خوشی سے اور کبھی مجبوری سے کام کرتے جانے لگی۔ مشقت اور مسائل کے الجھاؤ نے والدین کو خاصا کمزور کر دیا۔ بھائی بھابی کے ساتھ علیحدہ ہو چکا تھا۔ وقت کی مسافت کو کوئی نہ ماپ سکا۔ گزرتے ماہ و سال نے کچھ اور گرد اس خاندان پر ڈالی۔ غربت و مسائل کے وہی تانے بانے تھے کہ رجو بھی جوان ہو گئی۔ بوڑھے والدین کے سینے پر یہ پتھر کی سل ان کی پیرانہ سالی میں کچھ اور اضافہ کر گئی۔ وہ سوچوں میں غلطاں دکھنے لگے کہ بوجھ کی اس سل کو کیسے سرکایا جائے۔

رجو کا باپ کرمو اب بہت خاموش رہنے لگا تھا۔ کام سے فارغ ہوتا تو لامتناہی سوچوں کے تانے بانے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیتے، وہ اپنی بوڑھی گدلائی ہوئی آنکھوں سے رجو کے وجود کو دیکھتا تو کانپ کر رہ جاتا کہ کیسے اس بوجھ کو اتار پاؤں گا؟ جو بھی تھا اُسے اپنی راج بی بی بہت پیاری تھی۔ خاموش سی، دبی دبی رہنے والی وہ کچھ اور اداس ہو جاتی۔ جب باپ کو حسرت بھری نظروں سے اپنی طرف دیکھتا پاتی اب وہ بھی تو کوئی انجان نہیں تھی کہ باپ کی نظروں کا مطلب نہ سمجھ پاتی مگر پھر بھی وہ انجان بن جاتی کیونکہ وہ بھی تو اپنے حالات واقعات سے آگاہ تھی۔ وہ جوان تو ہو چکی تھی مگر حالات نے اس کی آنکھوں میں خواب بھی سجنے نہ دیئے۔ بس دل میں اک آس صرف آس سی بس گئی تھی کہ کبھی کوئی اُسے بیاہنے آئے گا۔ وہ بھی پیا دیس چلی جائے گی۔ اس سے آگے وہ کچھ نہ سوچ پاتی کیونکہ اپنے حالات کے پیش نظر اس نے اپنے خواب بھی محدود کر لئے تھے۔

رجو کی دادی یوں تو بیمار تھی مگر اس کی زبان میں رجو کو دیکھ کر زہر سی بھر جاتی اور وہ کرمو کی شامت لے آتی۔ ہاں کرمو! دیکھ یہ تیری راج بی بی ہے راج بی بی۔ یہ تو کوئی آفت ہے کہاں راج کرے گی؟ ہم پر آفت بن کر ٹوٹی ہے۔ کم بخت کو جوان ہوتے بھی دیر نہیں لگی۔ ہم نے تو اس کے بخت کھلتے نہیں دیکھے، ہمارے گھر میں تو اس کے بھاگوں سے کوئی روشنی نہیں ہوئی۔

دادی کے کوسنوں کی دو دھاری تلوار اسے زخم زخم کر دیتی۔ بیچاری خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتی، اپنی کم مائیگی پر سسک اٹھتی، بے قصور ہوتے ہوئے بھی قصوروار گردانی جاتی۔

''میں بخت آور نہیں تو اس میں بھی میرا کیا قصور ہے؟'' وہ سوچتی۔

رجو کا باپ اب بھی اپنی گدلی بوڑھی آنکھوں سے اپنی بیٹی کی سانولی پیشانی کو حسرت سے دیکھتا تھا کہ زندگی کے آسمان پر رجو کے بختوں کا چاند طلوع ہو جائے تو وہ

راج بی بی بن جائے، مگر کہاں؟ کچھ لوگ بدقسمتی کے دھنی ہوتے ہیں اور رجو ان میں سے تھی، رجو کے نصیب تو تاباں نہ ہو سکے مگر اس کا باپ غربت کے ہاتھوں ہار گیا۔ اُسے پتا ہی نہ چل سکا کہ کب اس کے اندر ''کالے یرقان'' جیسا موذی مرض بسیرا کر گیا ہے۔ اب غربت اور بیماری کی مزید جنگ شروع ہوگئی۔ رجو کی دادی نے البتہ غربت بھری زندگی سے کنارہ کشی کر لی۔ کرمو کی بیماری عدم توجہ اور عدم علاج سے آخری سٹیج پر پہنچ گئی۔

رجو اور اس کی ماں اب دونوں مل کر محنت مزدوری کر کے اس کنبے کا بوجھ اٹھاتے گئیں۔ بھائی تو پہلے ہی اپنی بیوی کے ساتھ علیحدہ ہو کر اپنے حصے کی جنگ لڑ رہا تھا کیونکہ اس عرصے میں وہ تین بچوں کا باپ بن چکا تھا اور حالات جوں کے توں تھے، پیشہ وہی مزدوری، کبھی کام مل جاتا کبھی نہ ملتا مگر پیٹ کی آگ تو ہر روز بجھانی پڑتی تھی۔ سسکتی زندگی کے باب تمام ہو رہے تھے کہ رجو کے باپ کا ایک پرانا دوست نذیر اس کے گھر آیا۔

خود کو وہ چوہدری نذیر کہتا تھا کیونکہ وہ چند ایکڑ اراضی کا مالک تھا مگر سب لوگ اسے جیلر کہتے تھے۔ اب تو وہ بھی بڑھاپے کی دہلیز کو چھو چکا تھا۔ صحت پھر بھی قابل رشک تھی، سمجھیں کہ ہٹا کٹا بڑھاپا تھا اس کا کیونکہ وہ بکرے کے گوشت، دیسی گھی اور دودھ کا بہت رسیا تھا، اس کے تین بیٹے تھے۔ دو تو پڑھ لکھ کر ملازمت کرنے لگے۔ ایک ٹیچر لگ گیا اور دوسرا فوج میں بھرتی ہو گیا مگر تیسرا بیٹا عادل چٹا ان پڑھ رہ گیا کیونکہ سکول کا نام لیتے ہی اس کی جان نکلتی تھی۔ پڑھنا تو دور کی بات ہے بڑے دو بیٹوں کی شادی بڑے آرام سے خاندان میں ہی تکمیل پا گئیں اور علیحدہ ہونے میں انہوں نے دیر نہ لگائی۔ باپ سے زمین کا حصہ بھی وصول کر لیا۔ الگ گھر بنا کر رہنے لگے۔ پرانے گھر میں نذیر عادل اور اس کی ماں جلال بی بی عرف جلاں رہتے تھے۔ دونوں باپ بیٹا ہڈ حرام بنے رہتے کچھ کام نہ کرتے۔ کبھی گھر میں کچھ کھا پی لیا ورنہ اپنی اپنی قبیل کے دوستوں کے گھر دھرنا دیئے بیٹھتے وہیں کھا پی کر گزارا کر لیتے۔ عجیب نکمی اور بےکار زندگی تھی ان کی۔

اماں جلاں اچھی عورت تھی۔ گھر چلانے والی عورت، وہ دونوں باپ بیٹے کو سمجھاتی کہ گھر کو گھر سمجھو، اسے سرائے نہ سمجھو۔ کچھ کام دھندہ کیا کرو اور عزت کی روٹی کھاؤ۔

''تم نے اپنے ساتھ ساتھ عادل کو بھی بگاڑ دیا ہے''۔ وہ شوہر سے کہتی۔ ''تیرا تو وقت گزر گیا جیسا تیسا بھی مگر عادل یوں کیسے گزارے گا؟''

پھر اماں جلاں اپنی توپوں کا رخ عادل کی طرف موڑ لیتی۔ ''عادل بیٹا کوئی کام ڈھونڈو آوارگی میں اپنا وقت ضائع نہ کرو۔ نہ تو تم نے کچھ پڑھا ہے کہ تمہیں کوئی ملازمت مل جاتی اب باپ کی طرح سارا دن آوارگی میں نہ پڑا رہ''۔

عادل ایک کان سے سنتا اور دوسرے سے نکال دیتا۔ یا پھر کہتا اماں بس تُو پریشان نہ ہوا کر میں کل سے ہی کام ڈھونڈنے جاتا ہوں۔ دیکھنا اماں میں کتنا پیسہ کماؤں گا۔ گھر دولت سے بھر دوں گا۔ عادل کی باتوں پر اماں کچھ دیر کے لئے خوش فہم سی ہو جاتی۔ مگر نہ وہ کل آئی نہ عادل کام پر گیا۔ خوش فہمیوں کی باگ سنبھالے اماں جلاں اچانک بیمار ہوئی اور پھر جانبر نہ ہو سکی۔ عادل کی خوشیوں کی آس اور اس کے سر پر سہرا سجانے کا خواب اماں کے ساتھ ہی دفن ہو گیا اور اماں منوں مٹی تلے جا سوئی ہمیشہ کے لئے، کبھی نہ آنے کے لئے۔ نذیر اور عادل کچھ دن بہت غمگین رہے مگر پھر وہی روٹین صبح کے نکلے شام کو لوٹتے، اب تو کوئی ڈانٹ پھٹکار کرنے والا بھی کوئی نہیں تھا، مکمل طور پر آزاد۔

نذیر کے دونوں بڑے بیٹے ماں کی وفات پر آئے اور کچھ دنوں بعد واپس اپنے اپنے گھر چلے گئے۔ باپ اور

بھائی کی الٹی عادات اور مزاج کی وجہ سے انہیں اپنے گھر آنے کی دعوت نہ دے سکے۔ وہ جانتے تھے کہ یہ لوگ اپنا آپ بدلنے والے نہیں ہیں۔ ہمارے گھروں میں بھی خرابی پیدا نہ کر دیں، وہ اپنے باپ کو جانتے تھے کہ بہت پیٹو اور چٹخارے دار آدمی ہے اور عادل لوفر...... ساتھ لے گئے تو چند دن میں ہی ہمارا کباڑا ہو جائے گا۔ سدھرنے والے تو یہ نہیں، سو دونوں بھائیوں نے جاتے ہوئے باپ کو مشورہ دیا کہ ابا اب تُو عادل کی شادی کر دے۔ یہ اب اس گھر اور آپ لوگوں کی ضرورت ہے۔ عورت کے بغیر گھر نہیں چل سکتا۔

لوگوں نے نذیر کے دونوں بڑے بیٹوں کے خلاف بہت باتیں کیں کہ دونوں بے غیرت ہیں۔ بیویوں سے دبتے ہیں۔ اپنے بوڑھے باپ اور چھوٹے بھائی کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ گئے ہیں۔ ''مگر وہ گھر کے بھیدی تھے'' جانتے تھے کہ ان کو اپنے گھر لے گئے تو گھروں میں الجھاؤ پیدا ہو جائیں گے، اس لئے انہوں نے خاموشی بہتر جانی۔

نذیر اور عادل کا واقعی وہی چلن رہا، دونوں اپنی اپنی روش پر قائم رہے۔ باپ کی جیب میں چار دھیلے ہوتے تو خوب عیش کرتا، بکرے کا گوشت دیسی گھی اور مصالحوں میں خوب بھون کر کھاتا، کبھی دیسی گھی اور سوجی کا حلوہ، ساتھ میں دودھ پتی چلتی، عادل گھر ہوتا تو احسانِ عظیم کرتے ہوئے اسے بھی اس ضیافت میں شامل کر لیتا۔

ایک دن عادل تندور پر روٹیاں لینے گیا تو محلے کی عورتیں کھڑی باتیں کر رہی تھیں۔ عادل کو دیکھ کر ایک عورت کہنے لگی۔ ''اللہ بخشے اماں جلاں اچھی عورت تھی۔ اس کے جانے کے بعد یہ باپ بیٹا ڈھنگ سے روٹی بھی نہیں کھا سکتے۔ چاچے نذیر کو چاہئے کہ اب عادل کی شادی کر دے۔ عورت گھر میں آئے گی تو ساری مجبوریاں ختم ہو جائیں گی۔

یہ شادی والی بات عادل کے دل کو بہت لگی، اس لمحے عادل کو بھی باپ پر غصہ آیا جو اس طرف دھیان نہیں دے رہا تھا۔ وہ روٹیاں لے کر گھر پہنچا تو باپ کا غصہ آسمان کو چھو رہا تھا۔ بھوک سے اس کا بُرا حال تھا۔

''او کم بخت کتنی دیر لگا دی تم نے، کیا کوہ قاف چلا گیا تھا کسی پری سے روٹیاں لینے؟ تندور تو اتنی دور نہیں ہے اتنی دیر میں دس چکر لگ جاتے ہیں۔ پر تمہیں کیا؟ کہ کب سے بوڑھا باپ گھر میں بھوکا بیٹھا ہے؟''

کھانا کھا کر باپ کا موڈ کچھ اچھا ہوا تو موقع دیکھ کر عادل نے بہت شرما کر باپ کو بتایا کہ تندور پر کھڑی فلاں بہن کہہ رہی تھی کہ اب چاچے نذیر کو چاہئے کہ وہ عادل کی شادی کر دے تا کہ گھر کا نظام بہتر طور پر چل سکے۔

''کون کرے گا تم لوفر سے شادی؟'' آج چاچا نذیر بھی پھٹ پڑا۔ ''ہاں بتا کون دے گا تم بے کار کو اپنی بیٹی؟ جا، اپنی اسی بہن سے کہہ دے جا کر کہ وہ تیری شادی کروا دے۔ تم جیسے بے روزگار جاہل اور نکمے آدمی کو اپنی بیٹی دے کر کسی نے اپنی عزت کا جنازہ نہیں نکالنا۔ اب میری بوڑھی ہڈیوں میں تو دم نہیں ہے کہ تمہیں اور تیرے کنبے کو پال سکوں، خود کو بوجھ اٹھانے کے قابل کرو''۔

چاچا نذیر اپنے کئی رشتہ داروں اور ذات برادری کے لوگوں سے ''اندر خانہ'' عادل کے رشتے کی بات کر چکا تھا، ہر طرف سے کورا جواب بھی وصول کر چکا تھا۔

یہی چوہدری نذیر عرف جیرا اپنے پرانے دوست کرمو سے ملنے گیا تو اس کے خراب حالات دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ اس نے رجو کو دیکھا تو اُسے عادل کے لئے رجو بھا گئی کیونکہ یہ غربت و مفلسی کے ہاتھوں مجبور گھرانہ تھا، یہاں اُسے رشتہ ملنے کی امید بندھ گئی اور تو کوئی عادل کو رشتہ نہ دیتا اپنی بیٹی کا۔

نذیر نے جھٹ کرمو کے حالات سے آگاہی

حاصل کی، کرمو نے بھی اپنی داستان الم اُسے کہہ سنائی تو نذیر نے ہمدردیوں اور تسلیوں کے پھاہے اس کے رستے زخموں پر رکھے۔ کرمو خود کو چند دن کا مہمان ہی سمجھتا تھا، اتنی بڑی بیماری اور عدم علاج موت کا پیش خیمہ ہی تو تھا۔ باتوں باتوں میں کرمو نے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ مرنے سے پہلے رجو کے ہاتھ پیلے کردوں مگر کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ یہ اپنے گھر کی ہو جاتی تو میں سکون سے مر تو سکتا نا۔ سوچتا ہوں کہ میرے بعد اس کا کیا ہوگا؟ کرمو کی بیماری سے گدلائی اور مرجھائی ہوئی آنکھوں سے دو آبی قطرے گر کر زمین میں سما گئے، اس لمحے نذیر کو بھی اپنی مراد پوری ہوتی نظر آئی۔

"کرمو یار! تُو میرے ہوتے پریشان نہ ہو"۔ اس نے کرمو کو دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔ "مجھے تو پتا ہی نہیں تھا کہ تیرے حالات اس نہج پر پہنچ چکے ہیں ورنہ کب کا تیرا یار تیرا ساتھ دے چکا ہوتا۔ آج سے رجو میری بیٹی ہے کرمو! میں اپنے عادل کے لئے تجھ سے رجو کا ہاتھ مانگتا ہوں۔ میں اسے اپنی بیٹی بنا کر رکھوں گا"۔

"بے مائیگی، بے بسی اور غربت و مفلسی کے شاہکار گھر میں اس لمحے نذیر کا رجو کے لئے دست سوال دراز کرنا کرمو کو کسی اور ہی دنیا میں لے گیا۔ اسے نذیر ایک فرشتہ دکھا جو اس کا دکھ بانٹنے آ گیا تھا۔ جسے جہیز کے نام پر بھی کسی چیز کی ضرورت نہیں تھی۔ صرف رجو بیٹی کی ضرورت تھی۔ کرمو خوش فہم ہوا کہ میری بیٹی رجو اب تو راج بی بی بن جائے گی، تقدیر کی مسکراہٹ کو نہ پا سکا۔ رجو کے لئے اس کے دل میں جو پریشانی کا "جوار بھاٹا" برپا تھا، وہ تھم چکا تھا، اس نے جلدی سے اپنی بیوی کو بلایا اور ساری بات اسے کہہ سنائی، خوشی اس کے جھریوں بھرے چہرے سے چھلکی پڑ رہی تھی۔ بیوی بھی سن کر خوش ہوئی کہ کوئی وسیلہ تو بنا اور انہوں نے عادل کو دیکھے بغیر حالات جانے بنا نذیر کو ہاں کہہ دی اور چائے کی ایک پیالی پر رجو کی منگنی تکمیل پا گئی۔ نذیر سے یہ خوشی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی، اس نے اٹھ کے کرمو کے ناتواں وجود کو اپنی بانہوں کے حصار میں لے لیا اور بولا۔ کرمو تُو نے آج یاروں والا کام کیا ہے۔ مَیں تیرا بڑا احسان مند ہوں اور تمہیں اب یار بن کے دکھاؤں گا۔

رجو سگھڑ اور خوبصورت تھی اور جسمانی طور پر مکمل بھی تھی، جو اُسے اپنے نکمے عادل کے لئے بیٹھے بٹھائے مل گئی تھی۔

پندرہ مارچ کی صبح کرم دین ملک اور اس کے گھر والوں کو سب سے حسین دکھی، کیونکہ آج چوہدری نذیر ان کی بیٹی کو اپنی بہو بنانے آ رہا تھا اور وہ بھی بغیر جہیز کے۔ آہ! غریب کو خوشیاں؟

عادل نے منہ دکھائی میں چاندی کی ایک انگوٹھی رجو کی انگلی میں سجا دی اور کہا کہ اسے کبھی اتارنا مت، ایک دوسرے سے وعدے وعید اور ساتھ رہنے کی قسمیں کھائی گئی، وفا کرنے کے وعدے کئے گئے، وہ جاگتے رہے اور رات دبے پاؤں گزر گئی۔

عادل کے دونوں بھائیوں نے شادی کے چار دن بعد باری باری دونوں کی دعوت کی۔

رجو اور عادل کی خوشی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی کہ ہم بھی اتنے اہم ہو گئے ہیں گمان حدیں چھونے لگا۔ پھر دونوں بڑے بھائیوں نے ضروری سودا سلف لا کر انہیں دیا اور ساتھ ہی نصیحت بھی کی کہ اب تم دو ہو گئے ہو کل کو تمہاری اولاد بھی ہوگی،، باپ بھی تمہارے ساتھ ہے۔ جلد از جلد کوئی روزگار تلاش کرو اور کمانے کی فکر کرو۔ کیونکہ ہمارے ساتھ اپنے کافی مسائل ہیں۔ ہم اب دو دو گھروں کا بوجھ تو نہیں اٹھا سکتے، شادی پر یہ بھی پیسے ہم نے خرچ کئے ہیں۔ تم دونوں مل کر اپنی ذمہ داریوں کو سمجھو اور نبھاؤ۔

کچھ دن تو بھائیوں والے سودے سلف سے نکل

گئے پھر جیب خالی باپ سے مدد لینے کی کوشش کی تو کورا جواب بلکہ سننے کو پھٹکار بھی ملی کہ جو کچھ تھا وہ تو تم پر لگا چکا ہوں۔ اب تم دونوں جو چاہو جیسے چاہو زندگی گزارو۔ میں بوڑھا کب تک تم لوگوں کا ساتھ نبھاؤں۔ رجو اور عادل دونوں کافی پریشان ہو گئے اور سوچنے لگے کہ مسائل کی طنابیں کیسے اور کیونکر کھینچ پائیں۔ پھر عادل نے ہمت کی اور اپنے لئے روزگار ڈھونڈنے لگا۔ کسی جاننے والے نے اسے وقتی طور پر ایک چائے کے ہوٹل پر کام پر لگا دیا۔ روزانہ جو مزدوری ملتی اس سے گھر کا چولہا کسی حد تک چلنے لگا۔ رجو نے گھر کا سارا کام سنبھال لیا۔ کپڑے دھوتی، استری کرتی، کھانا بناتا، سسر کی بہت خدمت کرتی، وقت پر کھانا دیتی، حقہ گرم کر کے دیتی، پھر بھی اس کی ذات میں خامیاں ہی نذیر کو نظر آتیں۔ آج ہانڈی میں نمک تیز ہے، روٹی کس طرح پکائی ہے؟ گوشت پکانا تو تمہیں آتا ہی نہیں ہے۔ پر تمہارا بھی کیا قصور؟ تمہارے گھر گوشت پکتا تو تمہیں پکانا آتا نا۔ نذیر نے اپنی عامیانہ اصلیت دکھانی شروع کر دی۔

رجو کو اپنے گھر کے مسائل، مفلسی و کسمپرسی کی دبیز تہہ یہاں بھی جمی نظر آتی۔ وہ بیچاری سدا کی کم گو اپنے سسر کی بدزبانی پر بھی خاموش رہتی، کبھی عادل کو بتاتی تو عادل اسے سمجھاتا کہ بزرگ اسی طرح کرتے ہیں۔ تُو دل میلا نہ کر میں ہوں نہ تیرے ساتھ اور رجو خوش ہو جاتی۔

رجو کا باپ لگتا تھا رجو کی رخصتی کے انتظار میں ہی تھا، شادی کے ایک ماہ بعد ہی کرمو کی بیماری زور پکڑ گئی، پھر ایک دن خون کی الٹی کے بعد وہ دوبارہ سانس نہ لے سکا اور اپنی مفلسی، مسائل، تنگدستی، کسمپرسی، حسرتوں اور غربت کی گٹھری لے کر زمین کے سینے میں دفن ہو گیا۔

چاچا نذیر کے چال چلن وہی پرانے تھے۔ جیب گرم ہوتی تو خود گوشت بھون کر کھاتا رجو کو ہانڈی کے قریب بھی نہ پھٹکنے دیتا۔ کبھی بہت دل چاہتا تو رجو اور عادل پر بھی کرم نوازی کر دیتا ورنہ چھٹی۔ رجو کو تو پہلے ہی روکھی سوکھی کھانے کی عادت تھی، سو کبھی شکوہ نہ کرتی۔

ان دنوں نذیر بہت ترنگ میں رہنے لگا، وجہ کوئی نہ جان سکا، گردشِ دوراں نے ایک اور پلٹا کھایا اور رجو اور عادل کی ذات پر ایک کاری وار ہوا۔ ایک بڑی ضرب لگی، نہ سہی جانے والی مگر وہ کمال ہمت سے سہہ گئے کہ اور کوئی چارہ بھی تو نہ تھا۔ عادل صبح سے کام پر گیا ہوا تھا اور رجو گھر کے کام کاج میں مصروف تھی، نذیر آج دوپہر میں ہی ضیافت اڑا کر کمرے میں لیٹا ہوا تھا، رجو کام سے فارغ ہو کر اپنے کمرے میں آرام کی غرض سے چلی گئی۔ دیسی گھی میں بھنے ہوئے بکرے کے گوشت نے کام دکھایا اور نذیر کے سفلی جذبات بیدار ہو گئے۔ اس لئے اسے گھر میں موجود رجو بیٹی اور بہو نظر نہ آئی، صرف ایک عورت نظر آئی، وہ اٹھا اور رجو کے کمرے میں داخل ہو گیا، وہ انسان سے شیطان بن چکا تھا، رجو کی عزت پر رال ٹپکانے لگا۔ وہ رجو سے ''رقص ابلیس'' کی جسارت کرنے لگا۔ پہلے پہلے تو رجو سمجھ ہی نہ پائی، اسے سامنے کھڑا شخص پہلے اپنا باپ کرمو نظر آیا، باپ کی صورت نظر آیا، پھر اپنا سسر نظر آیا جس کی وہ بہو تھی اور پھر شیطان میں تبدیل ہوتا نظر آیا تو رجو برق رعد میں تبدیل ہو گئی۔ اس نے اپنے اوپر جھکے بوڑھے گدھ کو پوری قوت سے دھکا دیا اور خود بھاگ کر دروازے سے باہر نکل گئی۔ وہ چائے کے ہوٹل پر جا پہنچی جہاں عادل ابھی کام کر رہا تھا۔ عادل اسے وہاں دیکھ کر حیران و پریشان ہو گیا، جلدی سے رجو کی طرف بڑھ آیا اور آنے کی وجہ پوچھی۔ رجو گھبرائی ہوئی تھی کانپتی آواز میں اسے گھر چلنے کو کہا۔ عادل کو کسی انہونی کا احساس ہونے لگا۔

گھر پہنچ کر رجو نے سارا واقعہ کہہ سنایا اور زار زار رونے لگی۔ عادل کے رونگٹے کھڑے ہو گئے کہ کیا کوئی باپ بیٹے کی عزت پر بھی شب خون مار سکتا ہے۔ اس کی

سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں مفلوج ہونے لگیں۔ ایک دم سناٹے میں آ گیا کہ کیا کوئی باپ اپنی بیٹی کی عزت برباد کر سکتا ہے؟ کیا کوئی اپنی بہو کو ابلیسی تسکین کا نشانہ بنا سکتا ہے؟ غصے اور غم نے عادل کے دماغ کو جیخ کر رکھ دیا۔ تو وہ کف اڑانے لگا۔ واہی تباہی بکنے لگا۔

نذیر جو رجو کے گھر سے نکلتے ہی اپنے کمرے میں گھس کر سوتا بن گیا۔ عادل کی اونچی آواز سن کر بھاگ کر باہر نکلا اور بولا۔ یہ باہر کیا تماشا ہو رہا ہے؟ کیوں چیخ رہے ہو، کیا تکلیف ہے تم دونوں کو؟ عادل باپ کے قریب گیا اور جھپٹ کر اس کا گریبان پکڑ لیا۔

"بتا ابا تُو نے ایسا کیوں کیا ہے؟" اس نے غم و غصے میں دوڑ کر پوچھا۔ "آج تُو باپ نہیں رہا، تُو شیطان بن گیا ہے۔ بتا تُو نے میری عزت پر کیوں ہاتھ ڈالا ہے؟"

فریبی بوڑھا فریب کرنے لگا۔ "مجھے بھی تو کچھ بتاؤ ناں ہوا کیا ہے اور تم نے میرا گریبان کیوں پکڑ رکھا ہے؟" چہرے پر بلا کی بے شرمی لئے وہ ان کو سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

سادہ سی مسکین سی رجو اس کے فریب دیکھ کر حیران رہ گئی۔ عادل نے سارا ماجرا باپ کے گوش گزار کیا۔

"یہ جھوٹ ہے، الزام ہے مجھ بوڑھے پر"۔ نذیر نے ڈھٹائی سے کہا۔ "کیا میں ایسا کر سکتا ہوں؟ تم لوگ میرے سفید بالوں میں راکھ ڈال رہے ہو۔ ہوش میں آؤ عادل تم اس کمینی عورت کے فریب میں آ گئے ہو۔ ہاں ہاں اس کمین ذات سے یہ امید کی جا سکتی ہے۔ احسان فراموش کہیں کی۔ بھوکے ننگے گھر کی عورتیں جب پیٹ بھر کر کھاتی ہیں تو ان کو پھر ہضم نہیں ہوتا، وہ اسی طرح پھٹتی ہیں۔ ان کی اپنی تو کوئی عزت ہوتی نہیں ہے، دوسروں کی بھی خراب کر دیتی ہیں۔ اس کے باپ کو پیسے دے کر اپنے خرچے پر اسے بیاہ لایا ہوں اس کی ہوا تو بدلنی تھی...... ایسی عورتوں کا کوئی دین ایمان نہیں ہوتا، عزت تو دور کی بات ہے"۔

اتنا بڑا جرم کر کے بھی اس کی بے شرمی حدوں کو چھو رہی تھی۔ "میں تو اپنے کمرے میں سو رہا تھا، مجھے اگر یہ پتا ہوتا تو کہیں باہر ہی نکل جاتا۔ یہ مجھے گھر سے نکالنا چاہتی ہے"۔

رجو بھی کھڑی تھی کہ جانے اب کیا ہوگا؟ مگر عادل باپ کی عیار فطرت سے واقف تھا، اسے رجو کی بات پہ یقین تھا سو وہ باپ کے فریب میں نہ آیا۔ جھگڑے کی آواز سن کر چند محلے کی خواتین آ گئیں، سارا معاملہ سن لیا۔ کچھ رجو کو ٹھیک کہہ رہی تھیں کچھ نذیر کو، اور کانوں کو ہاتھ لگا کر توبہ توبہ کرنے لگیں۔ عادل نے رجو کو ضروری سامان باندھنے کو کہا۔ جب وہ باندھ چکی تو اسے لے کر گھر سے نکل پڑا۔ سنگدل باپ نے اسے ایک بار بھی نہ روکا۔ عادل نے رجو کو ایک دوست کے گھر چھوڑا اور خود باہر نکل گیا۔ دوست کو سارا واقعہ سنایا اور مدد کی اپیل کی۔ دوست نے اپنے ہمسائے کا ایک دو کمروں کا خالی گھر جو کافی پرانا تھا اور کچھ عرصے سے بند پڑا تھا، عادل کو رہنے کے لئے مانگ کر دیا۔ مطلب بغیر کرائے کے۔ وہ دونوں وہاں رہنے لگے، وہی شب و روز، عادل ہوٹل پر کام کرنے چلا جاتا اور رجو گھر کے کام کاج میں مصروف رہتی۔

لیل و نہار کا سفر جاری تھا، عادل کی اپنے مالک سے کسی بات پر بدمزگی ہوگئی تو اس نے اسے ہوٹل سے نکال دیا پھر اسی دوست کے باپ نے اسے شہر میں ایک شوگر مل کے احاطے میں واقع باغیچے میں مالی رکھوا دیا اور ایک چھوٹا سا کوارٹر بھی لے دیا۔ عادل رجو کو بھی شہر لے کر چلا گیا۔ دن گزرنے لگے کہ خوش کن انکشاف ہوا کہ وہ والدین بننے والے ہیں۔ دونوں کی خوشی کی انتہا نہ رہی، ان کے گھر بیٹی نے جنم لیا۔ نومولود کو دیکھ کر عادل پر تو

شادیٔ مرگ کا عالم طاری ہوگیا، اس نے جھٹ دکان سے مٹھائی خریدی اور آس پڑوس میں تقسیم کردی اور اللہ کا شکر ادا کیا کہ رجو اور بیٹی دونوں صحت مند ہیں۔ زندگی یوں ہی تمام ہو رہی تھی پہلی بیٹی ابھی دو سال کی تھی کہ دوسرے بچے کے آثار نمودار ہو گئے۔ کم مزدوری اور بڑھتے مسائل۔

اس بار رجو نے ایک بیٹے کو جنم دیا جو ہو بہو عادل کی کاپی تھا۔ دونوں میاں بیوی خوش تھے کہ ہماری ذات کی تکمیل ہوگئی ہے۔ بیٹا اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے بڑا ہو کر ہمارا سہارا بنے گا۔ ابھی سے خواب شروع ہو گئے۔ ابھی سے امیدیں بندھ گئیں۔ مسائل بہت بڑھ گئے اور وسائل نہ ہونے کے برابر۔ رجو نے حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے ساتھ والے محلے میں دو گھروں میں صفائی کا کام ڈھونڈ لیا کیونکہ عادل کی صحت دن بدن گر رہی تھی۔ وہ نیک گھرانے تھے۔ مزدوری کے علاوہ بھی اس کی کافی مدد کر دیتے تھے۔ بچوں کے فالتو کپڑے دے دیتے۔ بچا ہوا کھانا بھی۔ باپ اور بھائیوں نے تو کبھی مڑ کر نہ دیکھا کہ عادل اور رجو کس حال میں ہیں؟ نذیر اب بھی اُسی گھر میں رہتا تھا، کھانا پینا بڑا بیٹا پہنچا دیتا۔ ضیافت کا سلسلہ ابھی بھی جاری لگا۔ دونوں بیٹے کبھی کبھی جیب بھی گرم کر دیتے تھے۔ تو اُسے کوئی مشکل پیش نہ آتی۔ کھاتا پیتا اور رات گئے تک چوک کی محفلیں انجوائے کرتا، نماز روزے کی فکر سے عاری۔ جیسے آب حیات پی کر آیا ہو۔ آخرت کو سدھارنا نہیں۔

وقت کی باگ پر کون ہاتھ رکھ سکا ہے کبھی، اسے تو بس گزرنا ہوتا ہے اور وہ گزر ہی جاتا ہے۔ یہ جانے بغیر کہ کس کے حصے میں کیا آیا ہے اور کون محو انتظار ہے۔ عادل کا بیٹا دو سال کا تھا کہ ایک اور بچے کی آمد و تخلیق کا مرحلہ شروع ہو گیا۔ اب دونوں میاں بیوی پریشان ہو گئے کہ مہنگائی اور محدود تنخواہ میں پہلے بچوں کا نان و نفقہ ہی پورا نہیں ہو رہا۔ ایک اور بچے کی آمد کیا ہوگا، کس طرح ہو گا، ہر طرف سوالیہ نشان؟ مگر قدرت کے کاموں میں کوئی مداخلت نہیں کر سکتا، دنیا میں جس کا نزول ہونا ہے اسے کوئی نہیں روک سکتا اور جس نے سفر آخرت پر جانا ہے اسے کوئی نہیں بچا سکتا۔ آنے اور جانے کی اس رمز کو قدرت ہی جانتی ہے، انسان تو بس تابع ہے۔

سفاک باپ کی بے غیرتی، بھائیوں کی بے اعتنائی، رشتہ داروں کی بے حسی، رجو کے گھر والوں کے ابتر حالات، دنیا والوں کی بے حسی، مسائل اور غربت و مفلسی کی بغل میں گھرا خاندان، عادل پہلے ہی بیمار کمزور اور اپاہج نما شخص تھا، سارا دن کام کرتا اور سوچیں اس کا دماغ چاٹا کرتیں، کہاں تک برداشت کرتا، ذہنی تناؤ اور جسمانی شفقت نے اسے اندر سے کھوکھلا کر دیا تو ایک دن باغیچے میں کام کرتے ہوئے اسے اچانک سینے میں درد شروع ہوا۔ جو بڑھتے بڑھتے شدت اختیار کر گیا۔ کمزور بدن اس حملے کو سہہ نہ سکا اور ذہن بے ہوشی کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔ ایک اور مزدور وہاں سے گزر رہا تھا اس نے عادل کو بے ہوش دیکھا تو کچھ اور مزدوروں کو اکٹھا کر لیا اور جلدی سے عادل کو اٹھا کر سرکاری ہاسپٹل کی طرف بھاگے۔ ایمرجنسی میں عادل کا چیک اپ کروایا۔ ڈاکٹر کی رپورٹ کے مطابق عادل کو ذہنی تناؤ اور جسمانی مشقت کے باعث بلڈ پریشر کے اچانک شوٹ کر جانے سے انجائنا کا حملہ ہوا تھا۔ ڈاکٹر نے اسے دوائیں لکھ کر دیں اور ساتھ تاکید کی کہ عادل کو ذہنی تناؤ سے بچایا جائے۔ اسے سکون کی بہت ضرورت ہے۔ جسمانی محنت بھی ابھی اس کے لئے موزوں نہیں۔ یہ مکمل آرام اور مکمل علاج سے بہتر ہو سکتا ہے۔ ورنہ یہ سب کسی بڑے حادثے کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتا ہے۔

رجو کو جب حادثے کا پتہ چلا تو وہ بھی پریشان ہو کر رونے لگی۔ خود اس کی اپنی حالت بھی کچھ عجیب سی ہو رہی

تھی، عادل نے اپنی اور رجو کی حالت دیکھتے ہوئے اچانک گاؤں جانے کا فیصلہ کرلیا۔ اسے اب اپنی زندگی کا بھروسہ نہیں رہا تھا۔ وہ اس خیال سے واپس آ گیا کہ چلو گاؤں والے تو پھر بھی اپنے ہیں، کچھ نہ کچھ تو ساتھ دیں گے ہی۔ شہر میں تو سب پرائے لوگ ہیں۔ اگر مجھے کچھ ہو گیا تو گاؤں والے بچوں کا کچھ آسرا تو بنیں گے ہی۔ اپنے گھر والوں سے تو اسے کوئی امید نہ تھی، بھائیوں کو چاہئے تھا کہ باپ کو سمجھاتے الٹا وہ باپ کے ساتھ مل کر عادل سے ناراض تھے کہ اس نے اپنی بیوی کے ساتھ مل کر باپ پر گھناؤنا الزام لگایا ہے۔

عادل اپنا غریب خانہ سمیٹ کر گاؤں آ گیا، گاؤں کے ایک آدمی نے اس کی حالت دیکھ کر اپنا خالی پڑا مکان اسے رہنے کے لئے دے دیا۔ زندگی عجب دوراہے پر کھڑی تھی۔ کچھ لوگوں نے مدد کی تو نظام زندگی آگے بڑھا۔ رجو کے ہاں اس سال پھر بیٹی پیدا ہوئی۔ شاید قدرت کوئی اور امتحان لینا چاہ رہی تھی۔ رجو کی پیدائش کی طرح اس بچی کی پیدائش پر بھی کوئی خوش نہ ہوا۔ بلکہ ایک اور بوجھ محسوس ہوا۔

رمضان شروع ہوا تو بہت سے لوگوں نے اس کنبے کی حالت کے پیش نظر اپنے صدقات، زکوٰۃ عادل کے گھر دینے شروع کر دیئے۔ برادری والوں نے بھی قریبی رشتے دار کی حیثیت سے عطیات ان کے گھر پہنچائے، عادل لیتے ہوئے شرمندہ ہوتا مگر مجبور تھا، پیسے کی کمی کے باعث عادل کا علاج چھوٹ چکا تھا۔ گھر کا خرچہ مشکل سے پورا ہوتا تھا۔ علاج کی گنجائش کہاں سے نکلتی، اس کی صحت دن بدن گرتی جا رہی تھی، ہڈیوں کا ڈھانچہ بن چکا تھا۔

پھر اچانک وہ ہوا جس کی آہٹ عادل کچھ دنوں سے محسوس کر رہا تھا، عادل کے سینے میں درد کی ایک لہر اٹھی، لہر اتنی شدید تھی کہ پل بھر میں عادل کے ناتواں وجود کو بے ہوشی کے پاتال میں اتار گئی۔ رجو اس کے سینے پر ہاتھوں سے مالش کرنے لگی۔ رجو کی ماں بھاگ کر ڈاکٹر کو بلا لائی مگر ڈاکٹر کے آنے تک عادل اس عذاب جیسی زندگی سے ناطہ توڑ چکا تھا، سسکتی زندگی کے پیش نظر عادل کو موت بھی کسی مہربان ماں کی طرح لگی ہوگی، جس نے غربت کی چکی میں پسنے سے بچا کر اپنی آغوش میں سمیٹ لیا تھا۔

عادل تو چلا گیا مگر عادل کے گھر میں بھری جوانی میں بیوہ ہونے والی رجو رہ گئی، روتی بلکتی بین کرتی ہوئی، جسے دنیا کی فریب کاریوں اور گرم سرد کا کچھ علم نہ تھا۔ دنیا کے کیا ڈھب ہیں کیا وطیرے ہیں ان سے انجان ''چھوٹی سی دنیا کی باسی''۔ عادل کی وفات کے بعد تین بچوں کا ساتھ، غربت، مسائل، کسمپرسی، بیوگی، ڈراؤنی زندگی کسی خونخوار بلا کی مانند اس کے سامنے کھڑی تھی، خون آشام درندوں کا دیس، جوانی میلی کچیلی ہی سہی مگر تھی تو جوانی ہی، عادل کے باپ اور بھائیوں نے ایک بار پھر اس کنبے کو بے یار و مددگار چھوڑ دیا۔

برادری والوں نے کچھ شرم دلائی تو باپ نے احسان کرتے ہوئے کہا کہ چلو میرے والے گھر میں رجو اور بچوں کو چھوڑ جاؤ کیونکہ وہاں عادل کا بھی ایک کمرہ ہے۔ مگر رجو نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ جو شخص عادل کا باپ نہ بن سکا، وہ میرا کیا باپ بنے گا؟ اِ جو عادل کی زندگی میں مجھے بیٹی نہ بنا سکا وہ اب کیا بنائے گا؟

عادل کی بھابیاں اپنے شوہروں سے الگ پریشان کہ کہیں وہ ہمدردی میں آ کر رجو اور بچوں کو گھر نہ لے آئیں، برادری کے کچھ بزرگوں نے عادل کے بھائیوں کو غیرت دلائی کہ رجو جوان ہے بیوہ ہوگئی ہے۔ اب یہ تمہارے ہی گھر کی عزت ہے۔ کل کلاں کو کچھ ہو گیا تو کیا کرو گے۔ زمانے کے چلن سے تو تم آگاہ ہو ہی تم دونوں میں سے کوئی ایک ہمت کرے اور رجو سے نکاح کرے

تا کہ کل کوئی اس کی عزت پر انگلی نہ اٹھا سکے۔ ازدواجی تعلق رکھو یا نہ رکھو، مگر اسے اپنا نام دے دو۔ دنیا والوں کی نظر میں اسے ایک مقام مل جائے گا۔ شادی شدہ ہونے کا مقام، بھائی تو پہلے ہی راضی نہ تھے مگر یہ خبر جب ان کی بیویوں کے کانوں تک پہنچی تو وہ طوفان مچا وہ طوفان مچا کہ دونوں بھائیوں نے ہمیشہ کے لئے توبہ کر لی اور پلٹ کر ان کی خبر تک نہ لی۔ ادھر رجو نے بھی اٹل فیصلہ کر لیا کہ دوسری شادی نہیں کروں گی۔

وہ اکیلی اپنی اور بچوں کی بقا کی جنگ لڑنے کے لئے تیار ہو گئی کہ اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی تو نہ تھا۔ رجو نے اپنی زندگی کا یہ اذیت ناک سفر بھی شروع کر دیا۔ بہت خاموشی کے ساتھ۔ وہ جیسے تیسے زندگی کی گاڑی کھینچنے لگی۔

پھر اس کی زندگی میں ایک زلزلہ آیا، جو اس کی زبان کو قہر آلود کر گیا۔ زہر اندر بھرا تو زبان کے راستے بہنے لگا۔ اپنی مجبوریوں کا بوجھ تو اس نے جیسے تیسے خاموشی سے برداشت کر رکھا تھا مگر مجبوریوں کے عوض اپنی عزت و ناموس کا سودا برداشت نہ کر سکی، خاموشیاں ٹوٹ گئیں، رونے دھونے کو اس نے اپنا ہتھیار نہ بنایا۔ سارے آنسو اپنے اندر اتار لئے۔ غیض و غضب کی آبیاری ہوئی تو زبان کف اڑانے لگی۔ اندر دکھ اور درد کے بھڑکتے الاؤ نوک زبان پر شعلے بن کر بھڑکنے لگے تو وہ بدزبان بن گئی۔ بدتمیز اور بدتہذیب رجو، اپنی عزت و ناموس کی حفاظت کے لئے اسے یہ ہتھیار راس آنے لگا۔ بے شک اس کے بدلے میں وہ بدزبان مشہور ہو گئی مگر یہ قیمت اسے مہنگی نہ لگی۔

بدزبانی اور بداخلاقی و بدتہذیب کا دور اس دن شروع ہوا جس دن عمر حیات چوہدری جو برداری میں عادل کا دور کا چاچا لگتا تھا۔ بارئیش اور صاف ستھرا آدمی دکھتا تھا۔ وہ خود کو دوسروں سے ممتاز اور نیک خیال کرتا تھا۔ اس کے پاس روپے پیسے کی کمی نہیں تھی۔ وہ اکثر رجو اور بچوں کی مالی مدد کر دیا کرتا تھا، کبھی صدقے سے کبھی خیرات و زکوٰۃ سے ان کا حصہ نکال دیا کرتا تھا۔ رجو بھی اس کو چاچا جی کہتی تھی اور اس کی بہت عزت کرتی اور شکر گزار رہتی کہ چاچا عمر حیات ہمارا بہت خیال رکھتا ہے۔ مگر اس شام وہ رجو کی مدد کرنے نہیں آیا تھا بلکہ اس شام خریدار بن کر آیا۔ رجو کی مجبوریاں خریدنے آیا، دولت کے بدلے، مدد کے پردے میں، رجو کی عصمت کا سودا کرنے آیا۔ وہ رجو جس کے پاس سوائے عزت کے اور کوئی دولت نہیں تھی۔

چوہدری محمد حیات جس کے سفید براق کپڑوں پر کبھی شکن تک نہیں ہوتی تھی، کلف لگی سفید پگڑی کا اونچا شملہ، پاؤں میں ہمیشہ زری کھسہ ہوتا، اپنی بیٹھک میں اونچی مسند پر بیٹھتا، ہر لحاظ سے باعزت اور وضع دار دکھتا مگر اس کی سوچ کی غلاظت، گندگی اور تنگ نظری کون جانتا تھا، عام حالات میں تو وہ رجو کو اپنے گھر میں نوکرانی بھی نہ رکھتا، وہ اسے میلی کچیلی اور گندی دکھتی، اس سے گھن آتی، کراہت محسوس ہوتی مگر اس شام اسے وہ صرف عورت نظر آئی۔ مجبور، کمزور عورت، مسائل میں گھری تنہا عورت، سفلی جذبات کی تسکین کے لئے موزوں عورت، اس شام وہ رجو کے گھر آیا تو اس کی نیت صاف نہ تھی۔

"تو پریشان نہ ہوا کر جب پیسوں کی ضرورت ہو تو مجھ سے مانگ لیا کر"۔ اس نے رجو کے ہاتھ میں کچھ نوٹ تھماتے ہوئے کہا۔ "نہ ضرورت ہو تب بھی مانگ لیا کر اور ہاں تو جوان ہے، صاف ستھری رہا کر"۔ اور شیطانی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "میں ہوں نا، تیری مدد کرنے کے لئے، آج میرے گھر میں کوئی نہیں ہے تو اچھے سے کپڑے پہن کر بیٹھک میں آ جانا..... میں تمہاری اور مدد کر دوں گا۔ یہ موقع نہ گنوانا"۔ یہ کہتے ہوئے اس بڈھے عمر حیات کو اپنی عمر اور مرتبے کا بھی کچھ لحاظ نہ رہا۔

شکر گزار کمزور رجو نے جب بات سمجھی تو درد کی

ایک کربناک کی لہر اس کے پورے وجود میں دراڑ ڈال گئی، کیا ایسا بھی ہونا تھا؟ کیا مالی مدد کے عوض میری عصمت کا سودا بھی کرنا تھا کسی نے۔ میرے پاس لٹانے کے لئے ہے ہی کیا؟ ایک عزت کا گوہر آبدار ہی تو ہے میری متاع جان کیا اسے بھی کوئی لوٹنے آ گیا ہے۔ مگر یہ سودا میں کبھی نہیں کروں گی۔ اس کے خون میں دکھ اور غصے سے ابال سا آیا۔ اسے سامنے سفید لباس میں کھڑا شخص کسی گندی نالی کا کیڑا نظر آیا۔ بہت بدصورت اور غلیظ، بے حیا اور بے غیرت، ہوس زدہ آنکھوں والا، دکھ کرب میں ڈھلا تو من زہریلا ہوتا گیا اور پھر رجو کی زبان سے شعلے لپکنے لگے، رجو نے اس لمحے خود میں بے پناہ طاقت محسوس کی۔ اپنے ایمان کی طاقت، اس نے دروازے پر کھڑے چوہدری عمر حیات کے منہ پر وہ رقم دے ماری جو ابھی ابھی وہ مدد کے نام پر دے چکا تھا۔ اسے یہ توقع ہی نہیں تھی کہ رجو انکار کرے گی۔ اس کے چہرے سے شیطانی مسکراہٹ غائب ہوئی تو وہاں حیرت نمودار ہوگئی، کیا رجو بھی انکار کرسکتی ہے؟ لا چوہدری عمر حیات نے بے غیرتی سے پھر جسارت کی۔ ''رجو پاگل نہ بن میری بات سمجھ''۔

مگر رجو غیرت کی آگ میں دھڑا دھڑ جل رہی تھی، وہ بولی تو اس کے لہجے میں چٹانوں کی سی سختی تھی۔

''عمر حیات تُو نے بہت غلط اندازہ لگایا ہے''۔ اس نے دبنگ لہجے میں کہا۔ ''میں غریب تو ضرور ہوں مگر بدکردار عورت نہیں ہوں۔ میں اپنی عزت پر اپنی جان قربان کردینے کا حوصلہ رکھتی ہوں۔ تم نے اگر میری مدد کی ہے تو اللہ کے نام پر کی ہے۔ مجھ پر کوئی احسان نہیں کیا۔ اگر تم اپنی ہوس کی تسکین کرنا چاہتے ہو تو اپنی ماں اور بہن کے پاس جاؤ، اپنی بیٹی کا جسم نوچو اور اپنی بہوؤں کی عزت خراب کرو۔ بدکردار انسان عزت دار بنے پھرتے ہو۔ میں بتاؤں گی لوگوں کو تیرے کرتوت''۔ رجو نے مغلظات بکے، موٹی موٹی ناقابل اشاعت گالیوں کا انبار لگا دیا۔ وہ بپھری ہوئی شیرنی بنی ہوئی تھی، آج اس نے زبان کے سارے قفل کھول دیئے۔ کچھ لوگ اکٹھے ہوئے انہوں نے رجو سے وجہ پوچھی مگر رجو اپنی عزت کی وجہ سے خون کا گھونٹ پی کر بات گول کرگئی۔

مگر چوہدری عمر حیات نے لوگوں میں یہ مشہور کر دیا کہ میں تو رجو کو صدقہ و خیرات کی رقم دینے گیا تھا مگر اس نے لینے سے انکار کردیا تھا اور کہا کہ میں تو صدقے کے پیسے نہیں کھاتی، کسی اور کو دے دو۔ جب بچوں کو دینے لگا تو باقاعدہ لڑنے لگی اور بکواس کرنے لگی۔

''بس جی مفت میں صدقہ و خیرات کھا کھا کے اس کو بدہضمی ہوگئی ہے''۔ عمر حیات نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔ ''میں تو آئندہ باز آیا اس کی مدد کرنے سے، بہت بدلحاظ اور بدزبان عورت ہے''۔

لوگوں کے دلوں میں بھی یہ گمان ہونے لگا کہ رجو نے بہت بدزبانی کی ہے عمر حیات سے۔ ویسے بھی امیر کی بات پر ہر کوئی یقین کرلیتا ہے، چاہے جھوٹی ہی کیوں نہ ہو۔ مگر غریب اور مفلس کی سچی بات پر بھی کوئی یقین نہیں کرتا جب ایسی صورت حال بن چکی ہو، یہ بھی ہمارے معاشرے کا ایک المیہ ہے۔

وقت کے سمندر میں ایک اور چہرہ اعجاز ابھرا جس نے ساری زندگی بے کار میں گزار دی تھی۔ اب وہ بھی ساٹھ کے پیٹے میں تھا، نہ گھر نہ گھاٹ، اس نے زندگی بھر شادی نہ کی یا شاید اس سے کسی نے شادی نہ کی تھی۔ مست ملنگ بنا رہتا، کبھی ایک در تو کبھی دوسرے در۔ نہ کام نہ دھندا بلکہ یوں سمجھو نہ کام کا نہ کاج کا بس دشمن اناج کا تھا۔ اسے سب برادری والے آوارہ بھائی کہتے تھے۔ ساٹھ سال کی عمر میں اسے بھی شادی کا شوق چڑھا تو اس کی نظر انتخاب رجو پر ٹھہری۔ ذرا دیر نہ لگائی اور رجو کے در پہ اپنا رشتہ لے کر پہنچ گیا۔ رجو کے غیظ و غضب سے جھلسا تو پھر

بھاگنے میں دیر نہ لگاء اور پھر رجو کو بدزبان مشہور کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ برادری محلے کے اور بہت سے نام نہاد عزت داروں نے رجو کی عزت کا سودا کرنا چاہا مگر وہی بدزبانی، طوفانِ بدتمیزی، گالیوں کی بوچھاڑ، واہی تباہی، ماں بہنوں کے کوسنے ملتے بیٹیوں کی عزت پہ ہاتھ پڑتا تو بھاگنے میں پھر دیر نہ لگاتے۔ یوں رجو بدزبان اور زبان دراز مشہور ہوگئی۔ ہر کوئی اپنے کرتوت کے پس پردہ اُسے بدزبان مشہور کرتا گیا۔ یہاں تک کہ عورتوں اور بچوں میں بھی بدزبان اور بداخلاق مشہور ہوگئی۔ عورتیں بھی اب اس سے دامن بچانے لگی تھیں۔

رجو کے اپنے بچے بھی اس سے نالاں رہتے کہ پتا نہیں ماں ایسا کیوں کرتی ہے۔ لوگ تو اُن کو پیسے دینے آتے ہیں اور ماں ان سے بدتمیزی کرتی ہے۔ گالیاں دیتی ہے۔ مگر ان کے ننھے ذہن کیا جانیں، ماں کس کرب سے گزرتی ہے؟ جب کوئی مدد کرنے کے نام پر اس کا خریدار بن کر آتا ہے ان کی ماں کو اپنی داشتہ بنانا چاہتا ہے۔ کبھی بچے ماں سے الجھ پڑتے۔ ماں تمہیں کیا ہوگیا ہے، تُو کیوں ایسی ہوگئی ہے، کیوں لڑائی کرتی ہے لوگوں سے؟ وہ ہمیں پیسے دیتے ہیں، وہ نہیں دیں گے تو ہمارا گزارا کیسے ہوگا۔ وہ اس کے سامنے سوالیہ نشان کھڑا کر دیتے۔

وہ بیچاری بچوں کو کیا بتاتی کہ وہ کتنی مجبور ہے۔ زبان درازی اور گالی گلوچ کا ایک ہی تو ہتھیار ہے جو وہ ہوس پرستوں کے خلاف اٹھا سکتی ہے اور کسی حد تک وہ ہتھیار کامیاب بھی ہو چکا تھا۔ اب کوئی اس کے گھر کی طرف آتے ہوئے سو بار سوچتا تھا۔

میں اسی محلے سے ذرا ہٹ کر اچھے گھر والے علاقے میں رہتی ہوں۔ رجو میرے گھر صفائی ستھرائی کے لئے آتی ہے۔ مجھے اللہ نے خوشحالی دے رکھی ہے اس لئے میں بھی کبھی مالی مدد کے نام پر کچھ رقم گاہے بگاہے اس کے لئے بھیجتی رہتی تھی۔ میں ہر کسی کے دکھ درد میں شریک

ہوتی اور لوگوں کو مخلص مشورے بھی دیتی ہوں۔ رجو کی بدزبانی کی کہانیاں جب زبان زد عام ہوئیں تو میں نے رجو کو سمجھانے کا ارادہ کر لیا۔

اگلے دن جب رجو کام کے لئے میرے پاس آئی تو میں رسمی علیک سلیک کے بعد بڑے سبھاؤ سے رجو کو سمجھانے لگی کہ انسان جتنا بھی مشکلات میں ہو، حالات جیسے بھی ہوں انسان کو میٹھی زبان اور اچھے اخلاق سے مقابلہ کرنا چاہئے۔ بدزبانی انسان کی خوبیوں کو بھی خامیوں میں بدل دیتی ہے۔

رجو میرا کا اشارہ سمجھ گئی اور میری ساری بات ساری نصیحت سن لینے کے بعد بولی تو اس کا لہجہ لہولہو ہو رہا تھا، کرب اس کے چہرے پر پھیل گیا۔ وہ زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔ میرا پُرشفقت رویہ اور سمجھانے کا محبت بھرا انداز آج اسے رلا گیا۔ وہ روئی تو روتی ہی چلی گئی۔ آنسوؤں پر بند باندھنا اس کے لئے مشکل ہو گیا۔ ورنہ تو سارے آنسو اپنے اندر اتار لینے کے فن سے وہ آگاہ ہو گئی تھی۔ مگر وہ میرا پُرشفقت لہجہ سہار نہ پائی اور لہو رنگ آبی قطروں سے اپنا دامن بھگونے لگی۔ میں نے اسے جی بھر کر رونے دیا تاکہ دل کی ساری کثافتیں دھل جائیں، بوجھ کم ہو اور وہ کچھ بول سکے۔ وہ سمجھ گئی کہ کوئی بڑی بات کوئی بڑی وجہ ہے جو رجو کی آنکھیں نم آلود ہیں۔ بہت رونے کے بعد رجو قدرے سنبھل گئی۔ گریہ زاری سے سرخ آنکھیں پریشان حلیہ اور غم کی آمیزش لئے لہجہ مجھے بھی اداس کر گیا۔ وہ بولی اور بولتی چلی گئی۔

پھر وہ سب کی ہوس کی کہانی سناتی چلی گئی۔

"میں غریب ضرور ہوں مگر میں ان کی لی گئی مدد کے عوض ان کی جسمانی تسکین کا سامان نہیں بن سکتی، میں ان کی داشتہ نہیں بن سکتی۔ ان کے لئے اپنے وجود کا خوان نہیں سجا سکتی۔ میں ان ہوس کاروں کے ساتھ میٹھی زبان کیسے بول سکتی ہوں؟ میں بدزبان ضرور ہوں لیکن بدکردار نہیں ہوں۔ آپ ہی بتائیں میں کون سی زبان بولوں؟ حزن ملال کے سارے رنگ اس کے چہرے پر آویزاں ہو گئے، دکھ میں ڈوبے لفظ اس کے ہونٹوں پر ٹوٹنے لگے۔

"لمحہ لمحہ مجھ پر زندگی پہاڑ بن کر گزر رہی ہے۔ مجھے بدزبان مشہور کرنے والوں کے اپنے قلوب وضمیر پر سیاہی جم چکی ہے۔ ان کے لباس تو سفید ہیں مگر باطن میلے ہیں۔ کبھی کسی نے مجھے رشتوں کا مان نہیں دیا۔ کسی نے کبھی مجھے بیٹی اور بہن نہیں سمجھا۔ میں ان کی نظر میں ایک عورت ہوں صرف عورت...... مجبور، لاچار اور تنہا عورت۔ وہ میری مدد کر کے میری مجبوریوں کے عوض میری عصمت خریدنا چاہتے ہیں، مجھے اپنی عیاشی کا سامان بنانا چاہتے ہیں۔ جوان تو جوان میرے باپ کی عمر کے لوگ بھی اپنی گم شدہ جوانی کی پیاس میرے جسم سے بجھانا چاہتے ہیں۔ کوئی نام نہاد با اخلاق مجھ سے نکاح کرنے کو تیار نہیں...... پھر میں ان کے نزدیک بدزبان، جاہل اور تھرڈ کلاس ہوں، بہت گندی، گندے کپڑوں اور میلے کچیلے جسم والی۔ میرے کپڑے اور جسم میلا ضرور ہے مگر میرا کردار میلا نہیں ہے...... بہت صاف اور اجلا ہے۔ میرے پاس عصمت کی دولت ہی تو ہے جس کی حفاظت میں ہر حال میں کروں گی......

"اگر میں بدزبانی والا ہتھیار استعمال نہ کروں تو یہ بے غیرت مجھے نوچ کر کھا جائیں۔ کل کو میری دو بیٹیاں ہیں وہ بھی جوان ہو جائیں گی پھر میں کیا کروں گی۔ میں نے اپنی اور اپنی بیٹیوں کی عزت محفوظ رکھنے کے لئے اس ہتھیار کا استعمال کر رکھا ہے۔ باجی! اب آپ فیصلہ کریں کہ میں بدزبان ہوں یا مجبور ہوں"۔

میرے پاس رجو کے کسی سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔

***

گزشتہ کچھ عرصے میں تین مرتبہ کشمیر جانے کا موقع ملا۔ وہاں ان لوگوں کے حالات دیکھتے اور محسوس کیے۔ اپنے احساسات کو صفحہ قرطاس پر منتقل کر رہا ہوں۔ کشمیر سیاستدانوں کے لئے ایک ایسا فٹ بال ہے جسے کک لگانے میں مقابل ٹیموں کو کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ کشمیر پاکستان کے لئے اس کی ''جنت کشمیر'' ہے تو بھارت کے لئے ''اٹوٹ انگ'' ہے لیکن یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ دونوں ملکوں کے سیاستدانوں کو دنیا کے اس مالا مال چھوٹے سے خطے سے بے پناہ دلچسپی ہے لیکن اس خطے پر آباد انسانوں سے کسی کو بھی دلچسپی نہیں ہے۔ اگر دلچسپی ہوتی تو وہاں کے اُن معصوم لوگوں کے بارے میں سربراہان مملکت ضرور گفتگو کرتے جو ہند جنگجوؤں اور سکیورٹی فورسز کی کراس فائرنگ میں مارے جاتے ہیں۔ کشمیر حکمران طبقے کے لئے مسئلہ نہیں بہانہ ہے۔

☆ ---------- 0300-9667909 ---------- دستگیر شہزاد

سبھی ہوئی پیلی دھوپ جلدی جلدی پہاڑوں کے پار اتر گئی اور جھٹ پٹا چاروں طرف یوں چھانے لگا جیسے ڈر کی پرچھائیاں دل میں بیٹھنے لگتی ہیں۔ ہوا کے لمبے سانس بے چینی سے بھرے ہوئے تھے۔ سردی کی چبھن چھری کی طرح اندر گھس رہی تھی۔ اسامہ بغلوں میں ہاتھ دبائے دفتر سے نکلا اور گردن جھکائے گھر کی طرف چل پڑا۔ اس کے پاؤں مٹی کے ڈھیلوں اور چھوٹے چھوٹے پتھروں پر ٹیڑھے میڑھے پڑ رہے تھے۔ وہ ایسے چل رہا تھا جیسے اپنے وجود سے بچ رہا ہو۔

سیڑھیوں والی گلی اتر کر وہ بازار میں آ پہنچا۔ بازار سنسان تھے۔ دو کتے بجلی کے کھمبے کے پاس چپ چاپ بیٹھے ہوئے تھے۔ اسامہ کو دیکھ کر دُم ہلاتے اس کے پاس آ گئے۔ وہ اسامہ کو پہچانتے تھے اور اسامہ انہیں۔ اس وقت اُسے لگا کہ وہ اُسے کاٹ کھائیں گے مگر وہ بنا بھونکے اُس کے ساتھ چل پڑے۔ اسامہ رُک گیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ اُس کے ساتھ چلیں۔ اس وقت اُسے واقف کاروں پر بھی بھروسہ نہیں تھا۔ "دُر دُر" کرتے ہوئے اپنے پاؤں سے انہیں دُور ہٹانا چاہا۔ کتے پیچھے ہٹ گئے۔ وہ سمجھ گئے یہ آدمی اپنے آپ میں نہیں ہے۔

اسامہ آگے بڑھ گیا۔ موڑ مڑتے ہی اس نے ان پانچوں کو دیکھا تو ایک دم ڈر گیا۔ وہ سب کو اچھی طرح جانتا تھا۔ اسی قصبے کے لڑکے تھے۔ کل تک سب اُسے انکل یا بھائی کہتے تھے۔ آج کافر کہتے ہیں یا پھر کوئی نام نہیں لیتے۔ اوئے، اے، ابے کہہ کر بلاتے ہیں۔ ایک تو ان میں نریندر پال ہے اُس کے لنگوٹیے یار ڈاکٹر اندر پال کا بیٹا۔ اس نے نریندر پال کو اپنی گود میں کھلایا تھا۔ بہت نیک سیرت لڑکا تھا۔ شعر و شاعری کا بھی بہت شوق رکھتا تھا۔ اُس کے پاس علامہ اقبال کے شعر بھی سمجھنے آتا تھا۔ پر اب پتہ نہیں اسے یہ باتیں یاد بھی ہیں یا نہیں۔ اب تو اس کے چہرے پر سے اُس کی خاندانی شرافت بھی کم ہونے لگی ہے۔

دوسرا لڑکا سندیپ ہے۔ سرکار نے اُس کے سر کی قیمت ایک لاکھ روپیہ لگا رکھی تھی۔ دیکھنے میں بھولا بھالا لگتا تھا پر اُس نے کم سے کم دس کشمیری مسلمان مارے ہیں کئی دوسرے بھی۔ وہ ہمیشہ پولیس والی وردی پہنے رکھتا ہے۔ پولیس کو چکمہ دیتا ہے۔ ساری دنیا کی سیاست میں دلچسپی لیتا ہے۔ امریکہ سے نفرت ہے اُسے۔ اس کا باپ چونگی کے محکمے میں بڑا افسر ہے۔ اس لئے وہ اپنے گھر میں نہیں رہتا۔

تیسرا سریش ہے۔ ایک نمبر کا شیطان۔ چیتے جیسی آنکھیں، بھوری داڑھی، کالی ٹوپی پہنے رکھتا ہے۔ مزاج گرم ہے اس کا۔ بندوق کے بغیر کبھی نہیں رہتا۔ رات کو بھی چھاتی پر رکھ کر سوتا ہے۔ ہر مہم پر آگے رہنے کا اُس میں ولولہ ہے۔ بہتوں کی جان لے چکا ہے۔ کسی کو مار کر پچھتاتا نہیں۔

چوتھا کشور راوت ہے۔ تیز طرار، ہر وقت گھبرایا ہوا۔ بے چین اپنے باپ کو بھی مارنے کی دھمکی دے چکا ہے۔ (اگر اُس کی جاسوسی کی تو) مذہب کے لئے مرنے کی خواہش ہے اُس کے دل میں جینز شرٹ اور جیکٹ پہنے رکھتا ہے۔ بندوق کی بجائے ہمیشہ بھرا ہوا پسٹل کمر میں ٹھونس رکھتا ہے۔ نشانہ کبھی خطا نہیں ہوتا۔

پانچواں سنیل کمار ہے۔ اونچا لمبا، ہمیشہ بے تکی باتیں کرتا ہے۔ آنکھیں سرخ مگر اُن میں درندگی نہیں۔ بزدلی اور کم ظرفی عیاں ہوتی ہے۔ آگے آگے رہنے کی کوشش کرتا ہے مگر ہمیشہ پیچھے رہ جاتا ہے۔ ہندو مذہب کے نام پر اُس سے کچھ بھی کروایا جا سکتا ہے۔ بات کرتے کرتے اپنی ٹوپی سے چھیڑ خانی کرتا رہتا ہے۔ وہ ایک بار گجرات میں ٹریننگ لے کر آیا ہے۔

ان پانچوں کو پورا یقین ہے کہ جلد ہی کشمیر ہندوستان کا حصہ بن جائے گا اور یہ بھی اس آنے والی

ہندو سرکار کے اہم عہدے دار بنیں گے۔ پانچوں آج کل اپنے آپ کو اس قصبے کا مختارِ کل سمجھتے ہیں۔ یہ جو بھی کہہ دیں اس کی مخالفت کوئی نہیں کرتا۔ مسلمان لوگوں کو بھگانے میں انہی کا ہاتھ ہے۔ ان کے تعلقات ہندوستانی جاسوسوں کے ساتھ ہیں۔ ان کے پاس رائفلیں، کارتوس اور ہتھ گولے ہیں۔ ان کے گھر والوں کو بلاشبہ مسلمان تنظیموں کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں (بلکہ زیادہ تر کو نفرت ہی ہے) لیکن وہ یہ بھی نہیں چاہتے کہ ان کے جوان بیٹے، ان کی آنکھوں کے تارے، ان کے جگر کے ٹکڑے ایک ایسے خطرناک راستے پر چلیں جہاں ہر قدم پر موت کھڑی ہے مگر وہ کیا کریں؟ ان لڑکوں کو سمجھا سمجھا کر تھک چکے ہیں۔ اسامہ ان لڑکوں کی ہر بات جانتا ہے۔ اس وقت وہ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ اسی لئے انہیں ایک ساتھ دیکھ کر اُس کا دل دہل گیا ہے۔ اسامہ کو دیکھ کر ان پانچوں نے آپس میں نظر ملائیں اور آنکھوں آنکھوں میں ٹھان لیا کہ جو بات انہوں نے سوچی ہے اُس پر عمل کریں گے۔ جب اسامہ ڈرتے ہچکچاتے اُن کے پاس سے گزر گیا تو پانچوں اُس کے پیچھے چل پڑے۔ ڈھلان اترتے اترتے اسامہ کے کانوں میں ان کے قدموں کی آواز پڑی تو وہ کانپ اٹھا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا، اُسے پیچھے مڑتے دیکھ کر سریش جھٹ بول اٹھا۔

''آج رات بہت سے ہندو جنگجو یہاں پہنچنے والے ہیں''۔

سریش نے اور بھی فلیتہ لگایا۔ ''ان میں بہت سے غیر ملکی بھی ہیں''۔ ان کا مقصد اسامہ کو ڈرانا ہے مگر ان کی باتیں جھوٹی نہیں۔ آج سچ مچ ہندو جنگجوؤں نے آنا ہے۔ یہ سب ہندوستانی فوج کے تربیت یافتہ لوگ ہیں۔ ان کا مقصد مسلمانوں کو چن چن کر مارنا ہے۔

''اگر انجمن اتحادِ اسلام کو پتہ چل گیا تو کراس فائرنگ ہوگی۔ ہندوستانی پولیس کی مدد کے لئے ہمیں تیار رہنا چاہئے''۔ کشور راوت بولا۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ اسامہ پر ان باتوں کا اثر ہو رہا ہے۔ سنیل کمار نے کہا۔

''اس محلے میں سبھی لوگوں سے کہہ دینا چاہئے کہ وہ ان کی مدد کے لئے تیار رہیں''۔

''جو اُن کی مدد نہیں کرے گا اُسے غدار سمجھا جائے گا''۔ سندیپ نے زوردار آواز میں کہا۔ ''اسے اڑا کر رکھ دیں گے''۔

اسامہ کے چہرے کا رنگ اڑتا جا رہا ہے۔ ہاتھ پاؤں کی طاقت کم ہوتی جا رہی ہے۔ اب اُس میں اتنی بھی ہمت نہیں کہ پیچھے مڑ کر دیکھ سکے۔ آخری موڑ مڑ کر جب وہ گھر کے پاس پہنچا تو وہ پانچوں رُک گئے۔ انہوں نے اندازہ لگایا کہ اسامہ پر اُن کی باتوں کا کتنا اثر ہوا ہے۔ اسامہ گھر کے سامنے رک گیا۔ دستک دیتے ہوئے اس نے پیچھے دیکھنے کی ہمت کی۔ اُس کے دس بارہ برس کے بیٹے تقی حسین نے کھڑکی سے گردن نکال کر باہر جھانکا۔ اُس نے اسامہ کو بھی دیکھا اور موڑ پر کھڑے اُن پانچوں کو بھی۔

اس نے فوراً اپنی گردن اندر کر لی۔ ''بابا آ گئے'' کہتے ہوئے وہ کنڈی کھولنے بھاگا۔

دروازہ کھلا تو اسامہ نے اندر جانے سے پہلے اُن پانچوں کی طرف دیکھا۔ وہ سبھی اُسی طرف دیکھ رہے تھے۔ اسامہ جھٹ اندر چلا گیا۔ اُس کا سانس تیز چل رہا تھا۔ ٹوپی سر سے اتار کر بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے دہلیز کے اندر بوٹ کھولے اور ایک نکڑ میں جا کر بیٹھ گیا۔ اُس کی ماں خدیجہ، بیوی حجاب زہرا، دو بیٹیاں مومنہ اور عنبرین اور تقی حسین اُسے گھیر کر کھڑے ہو گئے۔ وہ سبھی خوفزدہ تھے۔

''اب ہم یہاں نہیں رہ سکتے''۔ اسامہ بڑبڑانے لگا۔ ''قصبے کے سبھی لڑکے، لڑکے نہیں دہشت گرد میرے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ وہ ہمیں نکال کر ہی دم لیں گے''۔

اس کی ماں اس کے پاس بیٹھتی ہوئی بولی۔ ''وہ سوچتے ہیں سبھی مسلمان یہاں سے چلے گئے ایک ہم ہی کیوں یہاں ٹکے رہ گئے''۔

''یہی بات ہے شاید''۔ اسامہ نے کہا۔ ''وہ ہمیں آرام سے بیٹھنے نہیں دیں گے۔ کل رات کی طرح آج بھی پتھر ماریں گے''۔

''یہ مشٹنڈے اتنا بھی نہیں سوچتے کہ ہم کہاں جا سکتے ہیں''۔ اس کی بیگم حجاب زہرا نے روہانسی ہو کر کہا۔ ''ہم غریب لوگ ہیں، دربدر ہو جائیں گے''۔

''وہ ہمارے بارے میں کیوں سوچیں گے؟'' اسامہ چڑ کر بولا۔

''کیا ہو گیا ہے ان لڑکوں کو؟ پہلے انہوں نے کبھی ایسی آفت نہیں اٹھائی تھی''۔ یہ کہتے ہوئے خدیجہ نے ساوار سے کٹورے میں چائے ڈال کر اسامہ کو دی۔

''ہمیں اب یہاں سے چلے جانا چاہیے''۔ کہتے ہوئے اسامہ نے چائے کا گھونٹ بھرا۔ اسی وقت باہر کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ سب دہل گئے بچوں کے چہروں کا رنگ سفید پڑ گیا۔ سب پر سناٹا چھا گیا۔ دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز پھر آئی۔ اسامہ نے چائے کا کٹورہ ایک طرف رکھا اور کانپتی ٹانگوں کے ساتھ اٹھا۔ پھر کھٹ کھٹ کی آواز سنائی دی۔ وہ دھیرے دھیرے آگے بڑھا۔ سب اُس کے پیچھے پیچھے چل دیئے۔ اس نے انہیں وہیں رکنے اشارہ کیا، سب رُک گئے۔ خود وہ یوں دروازے کی طرف جا رہا تھا جیسے موت کے منہ میں جا رہا ہو۔ دروازے کے پاس پہنچ کر اُس کی ہمت نے پھر اُس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اس نے دراڑ کے پیچھے میں سے جھانک کر دیکھا۔ کچھ نظر نہیں آیا۔ آخر اُسے دروازہ کھولنا ہی پڑا۔

اُس کے سالے نعمان نے بلا تاخیر اندر آ کر کنڈی لگا دی۔ اُسے دیکھ کر سب کی جان میں جان آئی۔ سب پھر پیچھے آ گئے۔

''ہم نے گھر چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے''۔ نعمان نے آگے آتے ہوئے کہا۔ ''ایک ٹرک کا بندوبست ہو گیا ہے، سویرے پانچ بجے ہم لوگ نکل جائیں گے تاکہ گاؤں میں کسی کو بھنک نہ لگے''۔

''جاؤ گے کہاں؟'' خدیجہ نے پوچھا۔

''آزاد کشمیر!''

''وہاں رہو گے کہاں؟''

''پہلے جموں سے تو نکلیں کوئی تو ٹھکانہ ملے گا''۔ نعمان نے کہا۔ ''سنا ہے گورنمنٹ نے یہاں سے جانے والوں کے لئے آزاد کشمیر میں کیمپ بنا دیا ہے''۔

''اپنا گھر چھوڑ کر وہاں کیسے رہو گے؟ کیا کرو گے''۔ خدیجہ ابھی بھی تذبذب میں تھی۔

''جان بچ گئی تو کچھ بھی کر لیں گے''۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد نعمان نے کہا۔ ''کس نے سوچا تھا کہ اپنا گھر بھی کبھی چھوڑنا پڑے گا۔ میں تو آزاد کشمیر کے ضلع باغ میں ایک ہی بار گیا ہوں۔ اب پورے کنبے کو لے کر جانا ہے۔ ٹرک والا پانچ ہزار روپے پر مانا ہے۔ اگر تم لوگ بھی چلتے ہو تو آدھا آدھا کر لیں گے''۔

''میں نے بھی جانے کی ٹھان لی ہے''۔ اسامہ نے کہا۔ ''ان لڑکیوں کی وجہ سے بڑا ڈر لگتا ہے۔ اس قصبے میں صرف ہمارا ہی مسلمانوں کا گھر رہ گیا ہے۔ دہشت گردوں نے ڈرانا دھمکانا شروع کر دیا ہے''۔

''پھر تو تمہیں ضرور نکل جانا چاہیے''۔ نعمان نے کہا۔

اُس کی بہن حجاب زہرا اب چپ نہیں رہ سکی۔ بولی۔ ''بھائی ہمارا جانا اتنا آسان نہیں''۔

''کیوں؟''

''ہمارے پاس تو ٹرک والے کو دینے کے لئے بھی پیسے نہیں''۔ حجاب نے بتایا۔ ''تین مہینے پہلے تو یہ دوبارہ نوکری پر لگے ہیں۔ اس کے پہلے دو برس تک بیکار بیٹھے

رہے۔ گھر میں جو کچھ تھا سب ختم ہو گیا۔ اس وقت تو ہمارے پاس ایک کوڑی نہیں، اگر کچھ ہوتا تو ہم کب کے نکل گئے ہوتے"۔

"چلو میں ٹرک کے پیسے نہیں لیتا"۔ نعمان نے کہا۔ "تم میری بہن ہو تمہارے لئے اتنا تو کر سکتا ہوں۔ تم لوگوں کا اب یہاں رہنا ٹھیک نہیں"۔

"پھر بھی میرا دل گواہی دیتا ہے کہ ہم لوگوں کو یہاں سے نہیں جانا چاہئے"۔ خدیجہ نے کہا۔

"کیوں؟" نعمان نے پوچھا۔

اس وقت باہر دروازے پر دستک ہوئی۔ سب چونک اٹھے...... دھڑکنیں تھم گئیں۔ اسامہ کانپتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔ سب اُسے ہی دیکھ رہے تھے۔ اُس نے دروازے کی درز میں سے دیکھنے کا جتن کیا پر کچھ دکھائی نہیں دیا۔ دوبارہ کھٹ کھٹ ہوئی۔ اُسے کنڈی کھولنی پڑی۔ ششی بالا نے پھرتی سے اندر آ کر کنڈی لگا دی۔ کن ٹوپ پہنے ہوئے لمبی داڑھی کے ساتھ وہ عجیب سا لگ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں دہشت چھائی تھی، جسم کانپ رہا تھا۔ وہ اسامہ کے والد کا جگری یار تھا۔ اس گھر میں اُسے ہمیشہ اپنا بڑا بزرگ سمجھا گیا تھا۔

"چاچا جی آپ؟" اسامہ نے حیرانی سے کہا۔

"مجھے چاچا مت کہہ"۔ ششی بالا نے روتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تمہارے منہ سے چاچا سن کر آج مجھے شرمندگی کا احساس ہو رہا ہے۔ کیا ہو گیا ہے زمانے کو؟ آگ لگ گئی ہے۔ بھائی بھائی کا دشمن بن گیا ہے"۔ یہ کہہ کر اُس نے خدیجہ کو دیکھا تو ایک لمحے کے لئے دیکھتا ہی رہ گیا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"بھابی! تم گواہ ہو"۔ وہ خدیجہ کے پاس جا کر بولا۔ "ساٹھ سالوں تک میں نے تمہیں سگی بہنوں سے زیادہ عزت دی ہے۔ اقبال میرا لنگوٹیا یار تھا۔ اُس کے جانے کے بعد بھی میرا تمہارا یہ رشتہ نہیں ٹوٹا لیکن وہ مجھ سے زیادہ خوش قسمت تھا۔ مجھ سے پہلے چلا گیا۔ اسے یہ دن نہیں دیکھنا پڑے۔ بڑا کلیجہ چاہئے یہ دن دیکھنے کے لئے"۔

سب اُس کی طرف آنکھیں پھاڑے دیکھ رہے تھے۔ لگتا تھا اُس پر دیوانہ پن چھا گیا ہے۔ اُس کے منہ سے الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر نکل رہے تھے۔ وہ کہے جا رہا تھا۔

"اس وقت میں یہی کہنے آیا ہوں کہ جتنی جلدی ہو سکے یہاں سے نکل جاؤ۔ پہلے میں سوچتا تھا میرے ہوتے ہوئے تمہیں کوئی کچھ نہیں کہے گا پر اب محسوس ہوتا ہے کہ میں تمہاری حفاظت نہیں کر پاؤں گا۔ ان گمراہ ہو چکے لڑکوں کو اگر پتہ چلا کہ میں یہاں آیا تھا تو ہو سکتا ہے وہ مجھے بھی گولی مار دیں۔ انسان گولیوں سے بھی سستا ہو چکا ہے۔ بھگوان کا خوف نکل گیا ہے سب دلوں سے۔ میرا بھی بھروسہ اٹھ گیا ہے زمانے سے"۔ یہ کہہ کر ششی بالا رونے لگا۔ پھر اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولا۔ "میں ساری عمر بھگوان کی پوجا کرتا رہا لیکن آج اپنے پڑوسیوں کی حفاظت نہیں کر سکتا۔ بھابی! مجھے معاف کر دینا میں مجبور ہو گیا ہوں۔ میں جاتا ہوں، بس یہی کہنے کے لئے آیا تھا۔ کہ جتنی جلدی ہو سکے یہاں سے نکل جاؤ"۔

سبھی سکتے میں تھے۔ ششی بالا آنسو پونچھتے ہوئے باہر نکل گیا۔ اسامہ نے دروازہ بند کیا اور پھر نعمان کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔

"تو جا نعمان ہم صبح پانچ بجے سے پہلے تیرے گاؤں پہنچ جائیں گے"۔ اس نے کہا۔

"ٹھیک ہے"۔ نعمان نے کہا اور دروازے کی طرف چل پڑا۔ پھر ایک بار اُس نے منہ موڑ کر اُن کی طرف دیکھا اور بولا۔ "اب پھر ارادہ نہیں بدل لینا، شاید یہ تمہارے لئے آخری موقع ہے۔ خدا پر بھروسہ رکھو، روزی روٹی دینے والا وہی ہے، یہاں دی تو وہاں بھی دے گا"۔

''چلو جلدی جلدی ابھی سے تیاری شروع کر دو''۔ نعمان کے جانے کے بعد اسامہ نے کہا۔ ''وقت بہت کم ہے''۔

سبھی جلدی جلدی اندر والی کوٹھری میں آ گئے۔ اندر آ کر بوکھلائے ہوئے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ اس ڈھنگ سے جانے کی تیاری کرنا ایک ایسا کام تھا جس کے بارے میں کبھی سوچا نہیں تھا۔

''کیا کیا لے جانا ہے؟'' حجاب زہرا نے پوچھا۔

''جو بھی لے جانا ہے خود ہی اٹھا کر لے جانا ہے''۔ اسامہ نے کہا۔ ''اندھیرے میں گھر سے نکلنا ہے اور اس طرح نکلنا ہے کہ کسی کو خبر نہ ہو''۔

''تم سبھی چلے جاؤ میں یہیں رہوں گی''۔ خدیجہ کی بات سن کر سبھی حیران ہو کر اُس کی طرف دیکھنے لگے۔

''یہ تم کیا کہہ رہی ہو ماں؟'' اسامہ نے گھبرا کر پوچھا۔

''میں یہیں رہوں گی''۔ فیصلہ کن لہجہ۔

''پر کیوں؟''

''مجھے یہیں مرنا ہے''۔

''یہاں سے نکل کر ہم سب بچ جائیں گے''۔ اسامہ نے کہا۔

''مجھے کس سے بچنا ہے؟'' بوڑھی خدیجہ نے کہا۔ ''میں تو یہاں سے نکل کر بھی زیادہ دنوں تک جیوں گی نہیں مرنے کے لئے میں کہیں کیوں جاؤں۔ ساٹھ سال جس گھر میں رہی میں وہیں مروں گی''۔

اسامہ دل ہی دل میں تڑپ اٹھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ماں کو کیسے سمجھائے۔ اُس کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔ ''ماں تمہیں اکیلے چھوڑ کر ہم کیسے جا سکتے ہیں؟''

''بیٹا! میں تم لوگوں کے ساتھ رہوں گی تو تم مجھے ہی سنبھالتے رہو گے''۔ خدیجہ نے کہا۔ ''میری بوڑھی ہڈیاں بھاگنے میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکیں گی۔ پردیس میں میرے سانس نکل گئے تو میری لاش بھی تم پر بوجھ بن جائے گی''۔

سبھی کا دل بھر آیا۔ اسامہ رونے لگا۔ اپنے آپ کو قابو میں کرتے ہوئے بولا۔ ''ایسا نہ کہو ماں، اگر تم نہیں جاؤ گی تو ہم میں سے کوئی نہیں جائے گا۔ ہم سب ایک ساتھ یہاں مریں گے''۔ یہ کہہ کر وہ ایک کونے میں چلا گیا اور منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ خدیجہ آہستہ آہستہ چلتی اُس کے قریب آ گئی اور اپنے آنسو پونچھ کر اُس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ اسامہ اور بھی زیادہ سسکنے لگا۔

''سمجھنے کی کوشش کر بیٹا!'' خدیجہ نے نرم لہجے میں کہا۔ ''میں اپنی زندگی جی چکی ہوں۔ تجھے ابھی جینا ہے، ان بچوں کی خاطر جینا ہے، اپنی ذمہ داریوں کو نبھانا ہے۔ میری فکر چھوڑ ان بچوں کی سوچ۔ تیری بیٹیاں جوان ہو رہی ہیں، تجھے پتہ نہیں، تب تُو چھوٹا تھا جب سینتالیس میں ہندوؤں نے یہاں حملہ کیا تھا۔ انہوں نے کتنے ظلم کئے تھے۔ انہوں نے عورتوں کے ساتھ بھیڑیوں جیسا سلوک کیا تھا۔ تیرے سالے نعمان نے ٹھیک کہا ہے کہ دوبارہ پتہ نہیں یہ موقع ملے یا نہیں بچوں کو لے کر نکل جا''۔

''میں تمہیں اکیلا چھوڑ کر نہیں جاؤں گا ماں!'' اسامہ نے جیسے کوئی فیصلہ سنا دیا۔ سب چپ تھے، کسی کو کچھ سوجھ نہیں رہا تھا، بچے بھی بدحواس ہو گئے تھے۔

حجاب زہرا کچھ سوچ کر آگے آئی اور بولی۔ ''اگر آپ نہیں جائیں گے تو میں بچوں کو لے کر اپنے بھائی کے ساتھ چلی جاؤں گی''۔

''کیا کہا؟'' اسامہ کو حجاب زہرا کی بات سن کر حیرانی ہوئی۔ ''تم وہاں جا کر در بدر ہو جاؤ گی اور ساتھ ہی بچے بھی''۔

''جان بچ گئی تو کوئی نہ کوئی راستہ نکل آئے گا''۔ حجاب نے کہا۔

''وہ ٹھیک کہہ رہی ہے''۔ خدیجہ نے کہا۔ ''جان بچ گئی تو روزی روٹی کا وسیلہ بھی ہو جائے گا۔ میں تمہیں یہاں نہیں رہنے دوں گی۔ تمہیں اپنے بچوں کا خیال رکھنا چاہئے، تم اُن کے باپ ہو ان کی ذمہ داری سے منہ کیسے موڑ سکتے ہو؟''

اچانک گولیاں چلنے کی آواز آئی، سب کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ خدیجہ کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔ ''آج پھر کراس فائرنگ ہونے لگی ہے''۔

''وہ لڑکے ٹھیک کہہ رہے تھے''۔ اسامہ کہنے لگا۔ ''پولیس آئی ہوگی اور انجمن تحفظ اسلام والوں کو پتہ چل گیا ہوگا''۔

خدیجہ رسوئی کی طرف بڑھتی ہوئی بولی۔ ''تم لوگ جانے کی تیاری کرو، میں تمہارے لئے چاول پکاتی ہوں۔ ساتھ لے جانے کے لئے بھی تو کچھ کھانے کو چاہئے''۔

''تم بھی تیار ہو جاؤ ماں!'' اسامہ نے پھر اصرار کیا۔

''ضد مت کرو''۔ خدیجہ نے رسوئی میں جاتے ہوئے کہا۔

گولیاں چلنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ بچے ایک دوسرے سے لگ کر کھڑے تھے۔ حجاب زہرا نے جلدی جلدی کچھ سامان اکٹھا کرنا شروع کیا۔ اچانک گلی میں سے کچھ لوگوں کے دوڑنے بھاگنے کی آوازیں آنے لگیں۔ ڈرتے ڈرتے اسامہ نے کھڑکی کا پلہ تھوڑا سا کھولا اور باہر دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ بھاگتے بھاگتے وہ لوگ اُسی کھڑکی کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے۔ دونوں کے سانس پھولے ہوئے تھے۔ وہ آپس میں کھسر پھسر کرنے لگے۔

''یہاں نہیں کھڑے ہونا چاہئے''۔ سنیل کمار کہہ رہا تھا۔ ''اسامہ ہماری باتیں سن سکتا ہے، اُدھر چلتے ہیں''۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو''۔ سریش کی آواز آئی۔

''چلو چلیں''۔ دونوں وہاں سے چل پڑے۔

اسامہ کھڑکی سے پیچھے ہٹ گیا۔ اُدھر گلی کے اندھیرے میں سنیل کمار اور سریش باتیں کرتے کرتے ہوشیاری سے آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ ''پتہ نہیں یہ اسامہ کب اپنے گھر والوں کو لے کر یہاں سے دفع ہو گا۔ اس کا خالی گھر ہمارا اڈہ بن سکتا ہے''۔

سنیل کمار کی بات سن کر سریش بولا۔ ''اور کچھ دنوں تک نہیں گیا تو چپ چاپ سب کو ٹھکانے لگا دیں گے''۔ باتیں کرتے کرتے دونوں وہاں پہنچے جہاں نریندر پال، سندیپ اور کشور راوت پہلے سے موجود تھے۔

''میں تو پہلے ہی کہہ رہا تھا کہ پولیس کو آج مت بلاؤ''۔ طیش میں آیا ہوا سندیپ کہہ رہا تھا۔ ''ہو گیا نہ دونوں کا خاتمہ''۔

''ہمارے دو آدمی ہمارے لئے دو ہزار کے برابر ہیں''۔ جوش میں کانپتا ہوا کشور راوت بولا۔ ''آخر ہماری تعداد سینکڑوں میں ہی تو ہے اور مقابلہ کر رہے ہیں ہزاروں مسلمان مجاہدین کا۔ مگر وہ نہیں جانتے ہمارے ساتھ بھگوان ہے''۔

''جب جنگ لڑی جاتی ہے تو تعداد نہیں دیکھی جاتی''۔ سنیل کمار نے اپنی ٹوپی گھماتے ہوئے کہا۔ ''اور یہ بھی نہیں دیکھا جاتا کہ ادھر کتنے ہیں اور اُدھر کتنے۔ دنیا نے دیکھ لیا کہ پاکستان نے کس طرح دہشت گردوں کو نانی یاد کرا دی''۔

اسی وقت نریندر پال نے کوئی آواز سنی۔ ''چپ کرو، سنو کیا آواز آ رہی ہے''۔ سبھی چوکنے ہو کر سننے لگے۔ صاف سننے کے لئے کھڑکی کی طرف بڑھے۔ اندھیرے میں کچھ بھائی نہ دے رہا تھا لیکن پھر پولیس کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

''پولیس آ رہی ہے''۔ نریندر پال بولا۔

کشور راوت جوش میں آ گیا۔ ''چلو اپنی بندوقیں نکال لیں''۔

نریندر پال نے اُسے روکا۔ ''پاگل نہ بنو، پہلے ہی ہمارے دو ساتھی ختم ہو چکے ہیں''۔

سندیپ بولا۔ ''یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اس وقت صبر سے کام لینا چاہئے''۔

سریش نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ ''ہر وقت صبر، ہر وقت صبر، صبر کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ میری مانو باہر گھپ اندھیرا ہے، ہم دو چار پولیس والوں کو گولیوں سے بھون سکتے ہیں، وہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔ ہمیں اپنے ساتھیوں کی موت کا بدلہ لینا چاہئے''۔

''ہم ہاتھ نہیں آئیں گے''۔ سنیل کمار بولا۔ ''یہ ٹھیک ہے مگر انہیں بہانہ تو مل جائے گا گھروں کے اندر جانے لگا۔ تلاشی لینا شروع کر دیں گے۔ عورتوں بچوں کو باہر اتنی سردی میں کھڑا کر دیں گے''۔

''ہمیں اس وقت چپ چاپ اپنے اپنے گھر چلے جانا چاہئے''۔ نریندر پال نے اس کی تائید کی۔ ''پولیس اس وقت ڈھلان کے پاس پہنچ گئی ہوگی۔ چلو!''

کشور راوت غصے میں آ کر بولا۔ ''نریندر پال! کبھی کبھی مجھے محسوس ہوتا ہے تم بڑے بزدل ہو''۔

''میں...... میں بزدل ہوں؟'' نریندر پال چیخا۔ ''بعد میں تمہیں احساس ہوگا کہ میں نے تمہیں بچا لیا ہے''۔

سندیپ نے آگے آ کر کہا۔ ''اس میں کوئی شک نہیں کہ نریندر پال نے کئی موقعوں پر ہم سب کی رہنمائی کی ہے۔ ہمیں بچایا ہے''۔

''ہم مجبور بھی تو ہیں''۔ سنیل کمار بولا۔ ''اپنے سے اتنی بڑی طاقت کا مقابلہ کر رہے ہیں''۔ پھر اس نے کان لگا کر پولیس بوٹوں کی آوازیں سنیں اور بولا۔ ''کافی نزدیک آ گئے لگتے ہیں۔ چلو نکل چلیں، وہ ہمیشہ اس جگہ کی ٹوہ لے کر نکلتے ہیں''۔ سبھی وہاں سے نکلنے لگے۔

نریندر پال نے سندیپ کو اس کے بازو سے پکڑ کر روک لیا اور کہنے لگا۔ ''تم گھر نہیں جا سکتے اس لئے سیدھے اپنے ٹھکانے پر چلے جاؤ۔ میں تمہاری ماتا سے مل کر آتا ہوں اور تمہارا کھانا لے کر تمہارے پاس پہنچتا ہوں''۔

''میں آج ماتا سے خود ملنا چاہتا ہوں''۔ سندیپ نے کہا۔ ''جی چاہ رہا ہے، کھانا بھی وہیں کھاؤں گا''۔

''ہوشیار ہو کر جانا، پولیس تمہاری گھات میں ہے''۔

''تم فکر مت کرو''۔

''سب سے زیادہ فکر مجھے تمہاری ہے''۔ نریندر پال نے کہا۔ ''پولیس تمہارے لئے یہاں گشت لگاتی ہے۔ تمہارے سر کی قیمت وصول کرنا چاہتی ہے''۔

''میرا سر اتنا سستا نہیں''۔ سندیپ نے جیب سے ٹوپی نکالی اور سر پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''ابھی تک میں نے صرف دس مسلمانوں کو مارا ہے، مجھے ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ ابھی میرے سر کی قیمت اور بھی بڑھے گی''۔

دونوں باتیں کرتے کرتے دوسرے لڑکوں کے پیچھے چل پڑے۔ پہلے سب نے اندازہ لگا لیا کہ پولیس کس طرف سے آ رہی ہے۔ پھر وہ دوسری طرف والی گلی میں داخل ہو گئے۔ گشت کرتے کرتے پولیس مکئی کے کھیتوں کے پاس پہنچ گئی۔ ان کی رائفلیں بھری ہوئی تھیں۔ اُن کے جوتوں کی ٹھوکروں سے پتھروں کے دل سہمے ہوئے تھے۔ درختوں پر کوے گھونسلوں میں دبکے ہوئے ہل جل بھی نہیں رہے تھے۔ چڑیوں نے جیسے اپنے سانس روک لئے تھے۔ گلہریوں نے اپنی دمیں اپنے منہ میں دبا لی تھیں۔ گھروں میں لوگ لحافوں میں کانگڑیاں دبائے اور بھی سکڑ گئے تھے۔ پولیس بوٹوں کی آوازیں انہیں چابکوں کی مار جیسی لگ رہی تھیں۔ ششی بالا کو نیند

نہیں آ رہی۔ اُس کے ہاتھ پیر ہر وقت کانپتے رہتے ہیں۔ اُسے محسوس ہوتا ہے قیامت آ چکی ہے۔ ہر وقت بڑبڑاتا رہتا ہے۔ اس وقت بھی وہ کھڑکی سے باہر جھانک کر پولیس کو گشت کرتے دیکھ رہا تھا۔ پولیس والے جب گلی پار کر گئے تو کھڑکی کا پلہ جو ذرا سا کھلا تھا اس نے بند کر دیا۔ اس کی بیوی چولہے کے پاس بیٹھی انگیٹھی کے کوئلے دہکانے کی کوشش کر رہی تھی۔

''اُف بھگوان کتنا اندھیرا ہے باہر، کچھ بھی نظر نہیں رہا''۔ ششی بالا اُس کی طرف دیکھ کر کہنے لگا۔ ''اندھیرا چیخ رہا ہے۔ ہر گلی میں، ہر دل میں''۔ اس کی بیوی پشپا اُس کی طرف دیکھ نہیں رہی تھی، سن ضرور رہی تھی۔ دونوں اکیلے ہیں، ایک دوسرے کا ساتھ ہے، کئی بار تو ساری ساری رات باتیں کرتے رہتے ہیں بنا ایک دوسرے کی طرف دیکھے۔ ششی بالا کہے جا رہا تھا۔

''مجھ سے اب برداشت نہیں ہوتا، میری عقل ہی ماری گئی ہے۔ یہ کیسے ہو گیا؟ یہ قیامت کیسے آ گئی؟ آدمی شیطان بن گیا؟ بھگوان کا ڈر ہی نکل گیا دلوں سے۔ تمہیں پتہ ہے مسلمانوں کا عقیدہ ہے پرانے زمانے میں یہ ساری وادی پانی سے بھری ہوئی تھی، ایک جھیل کی طرح، پانی ہی پانی تھا۔ اب اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ میرا تو دم گھٹنے لگا ہے اس اندھیرے میں''۔

''سبھی ایک دوسرے سے ڈرنے لگے ہیں''۔ پشپا بولی۔ ''کسی کو کسی پر بھروسہ نہیں''۔

''اسی لئے میں اسامہ کو کہہ کر آیا ہوں کہ بال بچوں کو لے کر نکل جاؤ''۔ ششی بالا نے کہا۔ ''اب میں تمہاری حفاظت نہیں کر سکتا''۔

''ان لوگوں نے ہمارے بچوں پر کتنے ظلم کئے ہیں''۔ پشپا نے کانگڑی میں پھونک مارتے ہوئے کہا۔

ششی بالا اس کی بات سن کر چونکا۔ ''اُن لوگوں نے؟ کن لوگوں کی بات کر رہی ہو تم؟ کیا اسامہ نے ہمارے بچوں کو مارا ہے؟ کیا قصور ہے ان مسلمانوں کا جو گھر سے بے گھر ہو گئے؟ تمہارے دماغ میں زہر بھر گیا ہے۔ اسامہ بھی تو بچہ ہی ہے، آج اُس جیسا کوئی مظلوم ہے؟ غریب آدمی چھوٹے چھوٹے بچوں کو لے کر انجان جگہ جانے پر مجبور ہو گیا۔ اپنی بوڑھی ماں کو بھی سنبھال پائے گا یا نہیں؟ او میرے بھگوان! ان پر اپنی کرپا کا سایہ رکھنا''۔ کہہ کر اس نے اپنے ہاتھ اوپر اٹھائے اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ وہ سچے دل سے دعا کر رہا تھا کہ اُس کے لنگوٹیے یار اقبال کے بچے یہاں سے جا کر جہاں بھی رہیں سلامتی سے رہیں۔

پولیس کے سپاہی اب اسامہ کے گھر کے آگے سے گزر رہے تھے۔ کھڑکی کی دراڑ میں سے وہ بوٹوں کو چھلانگیں لگاتے دیکھ رہا تھا۔ اندھیرے میں دکھائی نہ دے رہے تھے پر اُن کی آوازیں دیواروں، چھتوں کو ہلا رہی تھیں۔ جب وہ وہاں سے گزرے اور اُن کی آوازیں بھی اندھیرے میں ڈوبنے لگیں تو اسامہ کھڑکی سے ہٹ کر وہاں آ کر کھڑا ہو گیا جہاں گھر کے سب لوگ کھڑے تھے۔ نزدیک ہی وہ چھوٹا موٹا سامان تھا جو انہیں لے جانا تھا۔

''پولیس کے ڈر سے سب گھروں میں دبک گئے ہیں''۔ خدیجہ نے کہا۔ ''تم لوگ جلدی جلدی نکل جاؤ''۔

اسامہ صرف اتنا ہی کہہ پایا۔ ''ماں ان کو وہاں سیٹل کر کے میں جلدی تمہیں لینے واپس آ جاؤں گا۔ گھبرانا نہیں''۔

خدیجہ نے انتہائی صبر اور ضبط سے اپنے آنسو روک رکھے تھے۔ اس نے صرف اتنا ہی کہا۔ ''باتوں میں وقت مت گنواؤ، جلدی سے نکلو''۔

سب نے تھوڑا تھوڑا سامان اٹھایا اور دروازے کی طرف بڑھے۔ خدیجہ نے کھانے کے سامان والی گٹھری حجاب زہرا کو دی۔ اسامہ نے بھری ہوئی آنکھوں سے

ماں کی طرف دیکھا۔

"بیٹا! حوصلہ رکھو، مجھے یہاں کوئی خطرہ نہیں"۔ خدیجہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "حالات ٹھیک ہو جائیں گے تو واپس آ جانا، وہاں تمہیں بڑی ذمہ داری نبھانی ہے۔ فون کرتے رہنا، جاؤ اب نکلو"۔

اسامہ نے دروازہ کھولا تو دوبارہ ماں کی طرف دیکھا۔ خدیجہ نے اس کا ہاتھ چوم کر کہا۔ "جاؤ اب پیچھے مڑ کر مت دیکھو، میرا تو صرف جسم ہی یہاں سمجھو، روح تو تم لوگوں کے ساتھ ہے...... جاؤ سکھی رہو"۔

ایک ایک کر کے سب اندھیرے میں نکل گئے۔ خدیجہ دروازے میں کھڑی رہی جیسے کوئی پیڑ کی ڈالیں کاٹ ڈالتا ہے۔ ایک کے بعد ایک ویسے ہی سب الگ ہو رہے تھے۔ اس نے جی کڑا کر لیا تھا۔ سوکھی آنکھوں سے وہ سب دیکھ رہی تھی۔ وہ پتھر بن چکی تھی، وہ گرنے لگی مگر دروازے کا پلہ پکڑ کر اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور پھرتی سے اندر جا کر دروازہ بند کر لیا۔ اندر آتے ہی اس کے صبر کا بندھ ٹوٹ گیا۔ ایکا ایکی وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ چیخیں اونچی ہونے لگیں تو دونوں ہاتھوں سے منہ دبا لیا۔ دیر تک وہ ویسے ہی روتی رہی۔ رونا رکا تو ایکا ایکی اُسے اکیلے پن کا احساس ہوا۔ اُس نے چاروں طرف دیکھا اُسے ہر چیز ان سی لگی۔ آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں ابھرنے لگیں۔ دم گھٹنے لگا، وہ کانپنے لگی۔ اسے محسوس ہوا اس بے رحم تنہائی میں وہ زندہ نہیں رہ سکتی۔ کانپتے قدموں سے وہ بستر کی طرف بڑھی، وہاں پہنچتے ہی اُس نے جلدی سے رائی اوڑھ لی اور یوں دبکی جیسے کوئی دبوچنے آ رہا ہے۔

روز کی طرح سویرا ہو گیا۔ روز کی طرح پارس ناتھ ہاتھ میں ڈول تھامے دودھ دینے آیا اور دروازہ کھٹکھٹانے لگا۔ وہ حیران ہوا پہلے تو یہ دروازہ پہلی کھٹکار پر ہی کھل جاتا تھا۔ آج اتنی دستکوں کے بعد بھی کوئی کھول نہیں رہا۔ بار بار کھٹکھٹانے کے بعد بھی جب کسی نے دروازہ نہیں کھولا تو اُس کے دل میں اندیشہ جاگا وہ زور زور سے ہاتھ مارنے لگا۔ وہ گھبرا سا گیا۔ ڈول کو ہاتھوں میں پکڑے وہ وہاں سے بھاگا۔ ڈھلان اتر کر وہ کشور راوت کے گھر کے باہر پہنچا۔

"کشیا او کشیا!"

کشور راوت نے کھڑکی میں سے جھانکا۔ "کیا بات ہے؟"

"نیچے آ جلدی کر"۔

کشور راوت سمجھ گیا کوئی خاص بات ہے۔ اُس نے کھڑکی بند کر دی۔ پارس ناتھ گھبرایا ہوا نیچے اُس کا انتظار کرنے لگا۔ اُس نے دیکھا ڈول سے کچھ دودھ باہر چھلک رہا ہے۔ پینٹ میں پستول ٹھونستے ہوئے کشور راوت باہر آیا۔

"چل جلدی چل"۔ پارس ناتھ بولا۔ "مجھے لگتا ہے اسامہ کے گھر سے سب لوگ چلے گئے ہیں"۔

"چل دیکھیں"۔ حیران ہو کر کشور راوت بولا۔ "راستے میں نریندر پال، سریش سب کو لے لیتے ہیں۔ پہلے بھی ایک بار ایسے ہی پارس ناتھ نے اطلاع دی تھی جب نور الٰہی اپنے کنبے کے ساتھ رات کے اندھیرے میں بھاگا تھا"۔

نریندر پال، سریش، سندیپ، سنیل کمار اور کشور راوت سب اکٹھے ہو کر اسامہ کے گھر کے باہر پہنچے۔ سبھی کے دل کی دھڑکن بڑھ گئی تھی۔ وہ تو کب کے یہ چاہتے تھے کہ یہ گھر خالی ہو جائے۔ سندیپ نے دروازہ کھٹکھٹانا شروع کیا۔ پر کسی نے کنڈی نہیں کھولی۔ "اندر سے کنڈی لگی ہے کوئی تو ہے"۔ یہ کہہ کر اس نے پھر کھٹکھٹانا شروع کیا۔

بوڑھا ششی بالا اور نریندر پال کا باپ ڈاکٹر اندر پال بھی وہاں آ گئے تھے۔ راجیش دکاندار بھی پھرتی میں

کانگڑی دبائے آ گیا۔ ایک طرف سے کچھ عورتیں بھی جھانکنے لگیں۔

اب سندیپ کے ساتھ کشور راوت بھی دروازے پر ہاتھ مارنے لگا۔

''عجیب بات ہے''۔ سریش نے بندوق کندھے پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''گھر کے سب لوگوں نے خودکشی تو نہیں کرلی''۔

''کیا بکواس کررہے ہو''۔ نریندر پال نے کہا۔

''پھر کیا بات ہے؟ اندر سے دروازہ کیوں بند ہے؟'' کشور راوت نے پوچھا۔ سب چپ ہو گئے۔

سندیپ نے اس چپ کو توڑا۔ ''سب مل کر دھکا دیتے ہیں، کنڈی ٹوٹ جائے گی''۔

''ٹھہرو''۔ نریندر پال نے سمجھا دیا۔ ''دیکھو، وہ ٹوٹا ہوا کھمبا پڑا ہے اسے اٹھا کر دروازے پر مارتے ہیں''۔ چاروں نے کھمبا اٹھالیا۔ آس پاس اور بھی لوگ جمع ہو گئے تھے جیسے کوئی تماشا ہورہا ہو۔ وہ چاروں جب کھمبا اٹھا کر دروازے کی طرف جانے لگے تو اچانک کنڈی کھلنے کی آواز آئی، وہ رک گئے۔ سب نے دیکھا دروازہ کھلا اور خدیجہ سامنے کھڑی تھی۔ کھمبا اٹھائے ہوئے وہ چاروں سکتے میں آ گئے۔ دوسرے سب لوگ بھی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے۔

خدیجہ کا چہرہ مردے کی طرح اکڑا ہوا تھا جیسے کسی لکڑی میں جھریاں کھدی ہوئی ہوں۔ اس کی آنکھیں پتھرائی ہوئی تھیں۔ اسے لگا کہ چاروں لڑکے کھمبا اٹھا کر اسے مارنے آرہے ہیں اور کھمبا اس کی طرف آرہا ہے۔ وہ بچ نہیں سکتی، وہ بے ہوش کر گر پڑی۔

سب کو لگا کہ خدیجہ کی جان نکل گئی ہے۔ کسی میں ہمت نہیں تھی کہ آگے بڑھ کر اُسے اٹھاتا۔ کچھ لمحوں کے بعد وہ خود ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔ بے حرکت آنکھوں سے اُس نے سب کی طرف دیکھا اور خوف سے کانپتے ہاتھوں سے دروازہ بند کرلیا۔ یہ دوسرے دن کی بات ہے۔

وہ پانچوں جنگل کے بیچوں بیچ بنائے ہوئے اپنے ٹھکانے پر گولیاں چلانے کی پریکٹس کررہے تھے۔ وہ کھیتوں میں سے کدو توڑ کر لے آئے تھے اور باری باری انہیں گولیوں سے اڑا رہے تھے۔ اس طرح وہ لوگوں کو ڈرا کر بھی رکھتے تھے۔

''بڑھیا بے ہوش ہو جانے کی بجائے مر جاتی تو ہماری پرابلم ختم ہو جاتی''۔ سنیل کمار کہہ رہا تھا۔

''تم کہو تو میں ابھی اُس کو مار دیتا ہوں''۔ سریش بولا۔ ''وہیں کہیں دفن بھی کردوں گا۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوگی''۔

''میں تو سوچتا ہوں اپنے ہاتھوں مارنے سے بہتر ہے اُسے پولیس سٹیشن چھوڑ آئیں''۔ سندیپ نے کہا۔ ''وہ لوگ اُسے وہاں بھیج دیں گے جہاں اُس کے گھر کے لوگ گئے ہیں۔ ہم اتنا رسک بھی کیوں اٹھائیں''۔

''میرے خیال میں سریش ٹھیک کہہ رہا ہے''۔ کشور راوت نے آگے آ کر کہا۔ ''ستر اسی سال کی بڑھیا نے آج نہیں تو کل مرنا ہی ہے، اسے مار کر بھی پاپی نہیں بنیں گے''۔

نریندر پال اس بات کے حق میں نہیں تھا، وہ درخت پر سے کود کر نیچے آیا اور بولا۔ ''بھگوان نے مارنا ہوتا تو اب تک اسے مار دیا ہوتا، ہم اپنے سر پر یہ پاپ کیوں لیں؟ میرے خیال میں وہ اتنی ڈر چکی ہے اور اُسے اپنے بچوں کے جانے کا اتنا غم ہے کہ وہ خود ہی تھوڑے دنوں میں مر جائے گی، دیکھا نہیں وہ ہمیں دیکھتے ہی کیسے بے ہوش ہو کر گر پڑی تھی''۔

''تم بھول رہے ہو کہ ہمیں اس مکان کی کتنی ضرورت ہے''۔ کشور راوت نے کہا۔ ''اگر وہ مکان ہمارے قبضے میں ہوتا تو ہم اپنے ساتھیوں کو بچا لیتے۔ اس مکان کے پیچھے جو ڈھلان ہے وہاں سے وہ بھاگ سکتے

تھے۔ چلو کچھ روز اور انتظار کر لیتے ہیں۔ اُسے نہیں مارتے مگر ہمیں قصبے کے تمام لوگوں سے کہہ دینا چاہیے کہ اس سے کوئی بات نہ کرے، اسے کوئی چیز نہ پہنچائی جائے، تھوڑے دنوں میں وہ خود ہی بھوکی پیاسی مر جائے گی“۔

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو“۔ سریش نے کہا۔ ”کھانے پینے کا سامان ہی نہ ملے گا تو زندہ کیسے رہے گی؟“

نریندر پال کو یہ بات بھی پسند نہیں آئی بولا۔ ”ایسی تکلیف دینے سے تو اچھا ہے اُسے مار ہی دیں“۔

سندیپ طیش میں آ گیا۔ ”نریندر پال تُو ہر بات میں روڑے اٹکانے لگا ہے۔ تمہیں اس فساد میں شامل ہی نہیں ہونا چاہیے تھا۔ کیا تُو نہیں جانتا کہ جب فساد ہوتا ہے تو کئی معصوم اور بے گناہ لوگ بھی مارے جاتے ہیں؟ ہمارا مقصد کشمیر پر قبضہ کرنا ہے۔ اتنے بڑے مقصد کے سامنے ایک بیمار بڑھیا کی کیا اوقات ہے؟ کیا قیمت ہے اس کی جان کی؟“

سندیپ کی پُر جوش باتیں سن کر سریش اور بھی بے قابو ہو گیا۔ اس نے اعلان کرتے ہوئے کہا۔ ”ہمیں نریندر پال کی باتوں پر توجہ نہیں دینی چاہیے۔ میں ابھی جاتا ہوں اور سب گھروں اور دکانوں پر بول دیتا ہوں کہ اس بڑھیا کی کوئی دستگیری نہ کرے“۔ سب کے چہروں پر ناقابل تسخیر ارادہ تھا۔ نریندر پال اداس تھا۔

☆......○......☆

چاولوں کا پانی اُبل کر باہر پڑنے لگا تو خدیجہ چونکی۔ اس نے پتیلی کو چولہے پر سے اٹھا کر نیچے رکھا، مانڈ نکالا اور تھالی میں بھات ڈالنے لگی۔ اس کی بھوک مر چکی تھی، جسم میں بے انتہا کمزوری تھی پھر بھی پیٹ میں کچھ جھونکنا ضروری تھا۔ ایک لقمہ منہ میں ڈالا لیکن کھایا نہ گیا۔ اسے یاد آیا وہ کیسے بچوں کو بھات ڈال ڈال کر دیتی تھی۔ بچے کیسے ”پہلے مجھے پہلے مجھے“ کی رٹ لگاتے تھے اور جب وہ ایک کو دیتی تھی تو دوسرا جھپٹ کر لے جاتا تھا۔ آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے تھے۔ آج اس کے پاس کوئی نہیں تھا۔ وہ اکیلی تھی۔ اتنی اکیلی کہ اپنا وجود ایک بھوت جیسا لگنے لگا تھا۔ بھات کا لقمہ کتنی دیر تک اس کے منہ میں پڑا رہا۔

☆☆☆

مندر سے نکل کر ششی بالا بازار کی طرف چل پڑا۔ اُس کی رفتار میں ایک جوش تھا۔ قدموں میں مضبوطی تھی۔ آج عبادت کے بعد وہ ایک تذبذب میں سے باہر نکل آیا تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ دل کی بات مانے گا۔ وہ جانتا تھا بساطی کی دُکان والا راجیش بھگوان پرست آدمی ہے، وہ اُس کی بات ضرور مان جائے گا۔ رات اُسے نیند نہیں آئی تھی۔ وہ اندھیرے میں سے چھت کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا رہا تھا۔ ٹڈیوں کی ایک تار آوازیں اُس کے کانوں میں پڑتی رہیں اور وہ اپنے جگری یار اقبال کی بیوی اپنی بھابی خدیجہ کے بارے میں سوچتا رہا۔ اُسے خیال آتا رہا کہیں اس کے پاس کوئلے ہی نہ ختم ہو گئے ہوں۔ سردی میں منجمد ہو جائے گی۔ چاول، چائے، نمک یہ ساری چیزیں کہاں سے لائے گی وہ بدبخت، کسی کو اس کی پروا نہیں، سبھی ڈرتے ہیں ان غنڈوں سے۔ اس نے ٹھان لیا کہ وہ خدیجہ کو کچھ ضروری سامان پہنچوائے گا۔

راجیش کی دُکان پر آ کر اُس نے تھوڑی چیزیں خریدیں پھر اُن کو ایک گٹھری میں باندھا اور راجیش سے کہا کہ یہ خدیجہ کو دے آ۔ راجیش کا رنگ فق ہو گیا۔ آس پاس دیکھا اور اس بات کی تسلی کی کہ اُس وقت کوئی اور وہاں نہیں تھا۔ اس نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”ششی بالا جی! مجھے کیوں مرواتے ہیں آپ؟“

”تمہیں بھگوان کا واسطہ ہے راجیش!“، ششی بالا نے منت کرتے ہوئے کہا۔ ”جا دے کر آ کوئی کچھ کہے تو میرا نام لینا۔ میں اب مرنے کے لئے بھی تیار ہوں۔ میں

یہاں، دکان کی نگرانی کروں گا۔ جا بھگوان تمہیں اس پُن کے کام کا صلہ دے گا"۔

راجیش کو لگا اس کام سے انکار کرنا پاپ ہے۔ گٹھری اٹھا کر ڈرتا ڈرتا وہ چل پڑا۔ اس نے دور سے سریش کو دیکھا۔ اُس کے ہاتھ میں بندوق تھی اس سے بچ کر نکلنے کی کوشش کی مگر پکڑا گیا۔

"اوئے یہ کیا ہے تمہارے ہاتھ میں؟"

"کچھ نہیں سامان ہے"۔

"کہاں لے جا رہے ہو؟"

"اُدھر!"

"اُدھر کدھر؟"

"خدیجہ کے گھر"۔

"تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا؟" سریش نے سخت لہجے میں کہا۔ "تمہیں اپنی جان کی فکر ہے یا نہیں۔ کیا حکم دیا تھا تمہیں؟"

راجیش کی جان سوکھنے لگی تھی، اُس سے بات نہیں ہو پا رہی تھی۔ سریش نے اُسے دھکے دے کر وہاں سے نکال دیا۔

اُس وقت گھر میں خدیجہ کچھ کھانے پکانے کی تیاری کر رہی تھی۔ پھونک پھونک کر نڈھال ہو گئی تھی وہ کوئلے کچھ تپے تو اُس نے چائے کا پیکٹ اٹھایا دیکھا تو اس میں چائے ختم ہو چکی تھی۔ وہ جھنجھلا اٹھی۔ خالی پیکٹ کو دور پھینک مارا۔ چائے کے بغیر کیسے رہے گی؟ کب تک اس طرح چلے گا؟ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

ڈاکیا سائیکل پر سوار خدیجہ کے گھر کی طرف جا رہا تھا، گلی کے سرے پر پہنچ کر وہ سائیکل پر سے اتر گیا۔ اس وقت راجیش کی دُکان پر دودھ والا پارس ناتھ بھی کھڑا تھا اور من موجی طبیعت والا اجے سنگھ یادو بھی۔

"ڈاکیا صاحب نمسکار!" ڈاکیے کو دیکھ کر اجے سنگھ یادو نے آواز دی۔ "آج کس کے نام پر پروانہ لے کر آئے ہیں؟"

"آپ کا نہیں ہے"۔

"ہمیں کون لکھے گا، میں نے تو یونہی پوچھ لیا کہ کون قسمت والا ہے جسے کسی نے یاد کیا؟"

"اسامہ کی ماں خدیجہ کی چٹھی ہے"۔ ڈاکیے نے کہا۔ "اسامہ نے لکھی ہوگی۔

سبھی ایک دوسرے کے منہ کی طرف دیکھنے لگے۔ اُس وقت راجیش نے دیکھا۔ دور سے تین لڑکے آ رہے ہیں۔ اُس نے آگے بڑھ کر ڈاکیے سے کہا۔ "وہ دیکھو لڑکے آ رہے ہیں، جلدی سے نکل جاؤ ورنہ وہ ساری چٹھیاں چھین لیں گے"۔

ڈاکیے نے کشور راوت، سندیپ اور سنیل کمار کو آتے ہوئے دیکھا۔ وہ گھبرا گیا۔ اس نے خدیجہ کے نام کا لفافہ راجیش کے ہاتھوں میں دیتے ہوئے کہا کہ یہ لوگ خدیجہ تک چٹھی نہیں پہنچانے دیں گے، تم اسے دے دینا۔ میں جاتا ہوں۔ راجیش نے جلدی جلدی وہ لفافہ اپنی گدی کے نیچے چھپا دیا۔ سنیل کمار، سندیپ اور کشور راوت نے وہاں پہنچتے ہی راجیش کو گھیر لیا۔ ان کے ہاتھوں میں رائفلیں بھی تھیں۔

"ڈاکیا کون سی چٹھی دے کر گیا ہے؟"

"میرے بھائی کا خط ہے"۔

"دکھاؤ"۔

راجیش نے ایک طرف پڑا ہوا بھائی کا خط اٹھا کر دکھایا۔

"کشمیر سے آیا ہے؟"

"ہاں!"

"کیا کرتا ہے وہاں؟"

"ایک ہوٹل میں خانساماں ہے"۔

"پچھلے ہفتے بھی اُس کا خط آیا تھا"۔

"وہ تو لکھتا ہی رہتا ہے۔ پچھلے ہفتے جو خط آیا تھا وہ

بھی دیکھ لو"۔ بوری کے نیچے سے اُس نے ایک اور خط نکال کر دکھا دیا۔ سنیل کمار نے رعب ڈالتے ہوئے کہا۔

"کان کھول کر سن لو، جو ہم سے چالاکی کرے گا اُس کا کام تمام کر دیں گے"۔ یہ کہہ کر تینوں اپنی اپنی رائفلیں سنبھالتے ہوئے وہاں سے چل پڑے۔ وہ دور موڑ تک پہنچ گئے تو اجے سنگھ یادو اپنی چھڑی اپنے ہاتھ پر مارتے ہوئے بولا۔

"یہ کیا تھانے دار ہیں کہ کس کی چٹھی آئی ہے اور کس کی نہیں۔ ناک میں دم کر رکھا ہے ان غنڈوں نے، جان سولی پر ٹانگ دی ہے"۔

"یہ ہوتے کون ہیں ہم پر حکم چلانے والے"۔ پارس ناتھ بولا۔

راجیش نے دونوں کو روکا۔ "دھیرے بولو۔ آج کل ایسی باتیں ہوا بھی اڑا کر لے جاتی ہے۔ شکر ہے غریب خدیجہ کو اس کے بال بچوں کی خیر خبر تو ملے گی"۔

"یہ خط اُسے پہنچائے گا کون؟" پارس ناتھ نے پوچھا۔

"آہستہ بولو پارس، رات کو میں چوری سے یہ چٹھی اُس کی کھڑکی میں پھینک آؤں گا"۔ راجیش نے کہا۔

"اگر ان سر پھروں کو خبر ہو گئی تو تمہاری دُکان کو آگ لگا دیں گے"۔ اجے سنگھ یادو نے کہا۔

"ان کے باپ کا راج ہے؟" راجیش طیش میں آ گیا۔ اُسی وقت اُس نے دیکھا ششی بالا گلی میں سے نکل کر آ رہا ہے۔ اُسے دیکھ کر وہ سوچنے لگے کہ خدیجہ کی چٹھی کے بارے میں اُسے بتائیں یا نہیں۔

"کیا بات ہے، مجھے دیکھتے ہی تم چپ کیوں ہو گئے؟" ششی بالا نے قریب آ کر پوچھا۔ "اس طرح کیا گھور رہے ہو؟"

راجیش نے بتایا کہ اسامہ کی چٹھی آئی ہے۔

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کسی اور کی لکھی ہوئی ہو"۔ ششی بالا نے کہا۔ "مجھے دکھاؤ وہ چٹھی"۔

راجیش نے وہ چٹھی نکال کر ششی بالا کو دی۔ ششی بالا نے بڑی احتیاط سے لفافہ کھولنے کی کوشش کی تا کہ وہ پھٹے نہیں۔ چٹھی باہر نکالتے ہوئے کہنے لگا۔ "خدیجہ تو خود پڑھ بھی نہیں سکتی، اُسے تو پڑھ کر ہی بتانا پڑے گا۔ کیسا زمانہ آ گیا ہے۔ دوسروں کی چٹھیاں کھولنی پڑ رہی ہیں۔ توبہ، توبہ، مجھے معاف کرنا میرے بھگوان!" وہ چٹھی پڑھنے لگا۔

اچانک ششی بالا کے ہاتھ کانپنے لگے اور ہاتھ میں پکڑی ہوئی چٹھی بھی۔ اُس کی آنکھیں بھر گئیں۔ اُس نے راجیش کی طرف چٹھی پھینکی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ بڑبڑا رہا تھا۔ "نہیں نہیں، میں یہ چٹھی پڑھ کر نہیں سنا سکتا، یہ میرے بس کی بات نہیں۔ مجھے بخش میرے بھگوان یہ تُو نے کیا کیا"۔ سب حیران پریشان تھے۔ ششی بالا دو قدم چل کر پھر لوٹا اور انہیں کہنے لگا۔ "تم بھی یہ چٹھی لے کر خدیجہ کے پاس مت جانا، مر جائے گی بد بخت۔ بند کر دو اس لفافے کو۔ کیسا نصیبہ لے کر پیدا ہوئی وہ۔ ہم مجبور انسان اُس کے واسطے کچھ نہیں کر سکتے۔ اے بھگوان دیا کر دیا کر"۔ یہ کہتے ہوئے وہ ڈگمگاتے قدموں سے گھر کی طرف چل پڑا۔

راجیش، اجے سنگھ یادو اور پارس ناتھ بھی بت بنے اُسے جاتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ اُن کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ راجیش نے چٹھی اپنے ہاتھوں میں لے لی۔

☆☆☆

خدیجہ کا دم گھٹ رہا تھا، وہ کبھی کھڑکی کے قریب جاتی، کبھی دروازے کے۔ وہ کھلے میں جانا چاہتی تھی۔ پھیپھڑے بھر کر سانس لینا چاہتی تھی۔ دور اونچے برف سے لدے ہوئے پہاڑ دیکھنا چاہتی تھی۔ درختوں کو جھولتے ہوئے بادلوں کو اُن سے لپٹتے ہوئے دیکھنا چاہتی

تھی۔ ہوا کے جھونکوں کو اپنے جسم کے ساتھ محسوس کرنا چاہتی تھی مگر خوف زدہ تھی۔ کنڈی کی طرف ہاتھ بڑھاتی، پھر کھینچ لیتی تھی۔ اُسے لگتا وہ اس گھٹن میں مرجائے گی۔

اچانک اُس نے دیکھا چولہے کے پیچھے ایک طرف پلاسٹک کا ایک لفافہ پڑا ہوا ہے، حیران ہوکر اُس نے فوراً آگے بڑھ کر اُسے اٹھایا۔ دیکھا اُس میں کلو بھر چاول، کچھ کوئلے، چائے کا ایک پیکٹ اور ایک پیکٹ نمک کا تھا۔ چولہے کے پیچھے کی چھوٹی سی کھڑکی کا پلا کھلا تھا۔ وہ سمجھ گئی کسی نے رحم کھا کر اُس کے لئے یہ چیزیں پھینکی ہیں۔ مگر ایسا رحم دل آدمی کون ہوسکتا ہے؟ اسامہ کا دوست ڈاکٹر اِندر پال ہوسکتا ہے۔ اُس کی بیوی اوشا ہوسکتی ہے لیکن نہیں، اُن کا بیٹا روپن انہیں ایسا ہرگز نہیں کرنے دے گا پھر اور کون ہوسکتا ہے؟

ششی بالا...... ہاں وہ ہوسکتا ہے۔ بے چارہ یہ چیزیں یہاں پھینکتے ہوئے کتنا ڈرا ہوگا۔ خدیجہ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اُسی وقت گولیاں چلنے کی آوازیں آنے لگیں۔ اُس نے لپک کر چھوٹی کھڑکی بند کردی۔ باہر بیچ بیچ فائرنگ ہو رہی تھی۔ گولیاں چلاتے پولیس والے آگے بڑھ رہے تھے۔ وہ سندیپ کو پکڑنا چاہتے تھے۔ سندیپ اور دوسرے لڑکے اُن کی گولیوں کا جواب دیتے ہوئے پیچھے پیچھے ہٹ رہے تھے۔ وہ چاہتے تھے کسی طرح وہ گاؤں کی پچھلی ڈھلان اتر جائیں تو پھر پولیس ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ سندیپ اُن کے ہاتھ نہیں آسکتا تھا لیکن اُس جنگل تک پہنچتے پہنچتے پولیس کی ایک گولی نریندر پال کے کندھے کو زخمی کرگئی۔

پولیس نے جب دیکھا کہ سبھی دہشت گرد جنگل میں جا چھپے ہیں تو وہ واپس چل دیے۔ وہ جانتے تھے سندیپ اب اُن کے ہاتھ نہیں لگنے والا۔

اُدھر سبھی لڑکوں نے نریندر پال کو کسی طرح خفیہ اڈے پر پہنچایا اور اُسے پانی پلایا اور اُس کی مرہم پٹی کی۔ دوائی بھی کھلائی پھر سب اِدھر اُدھر لیٹ گئے۔ وہ تھک چکے تھے، آج انہیں کچھ زیادہ ہی بھاگنا پڑا تھا۔

نریندر پال بولا۔ ''سندیپ! میں تمہیں ہمیشہ کہتا ہوں، بچ کر رہا کرو''۔

''یہ پولیس مجھے کبھی نہیں پکڑ سکے گی''۔ سندیپ نے جواب دیا۔

سنیل کمار بھی پاس ہی لیٹا تھا۔ اٹھ کر اپنی ٹوپی سیدھی کرتے ہوئے بولا۔ ''آج ہمارے ساتھ اگر ہندو جنگجو ہوتے تو ہم ان پولیس والوں کو جنگل میں گھیر کر ختم کرڈالتے۔ اب ہم اور جوانوں کو بھی بلائیں گے جب ان کے لئے ٹھکانے کا بندوبست کرلیں گے''۔

''اب بہت ہوگیا''۔ کشور راوت بولا۔ ''میری مانو اُس بڑھیا کو آج ہی ختم کرڈالتے ہیں۔ اب ہمارے لئے اس گھر سے بہتر ٹھکانا اور کوئی نہیں ہوسکتا''۔

سریش جوش میں آکر کھڑا ہوگیا۔

''میں ابھی اُسے نرک میں پہنچا کر آتا ہوں''۔

سندیپ نے سنجیدگی سے سوچتے ہوئے کہا۔ ''مجھے بھی لگتا ہے اُس کی موت کا وقت آگیا ہے''۔

کشور راوت اٹھ کھڑا ہوا۔ ''چلو ابھی چلتے ہیں''۔

نریندر پال سے برداشت نہیں ہو رہا تھا مگر وہ جانتا تھا اس وقت اس کی کوئی نہیں سنے گا۔ پھر بھی وہ چپ نہیں رہ سکا۔ ''سنو، ایک بار پھر سوچ لو''۔

سریش بولا۔ ''اب ہم تمہاری نہیں سنیں گے۔ تم یہیں بیٹھو ہم یہ پُن کما کر آتے ہیں''۔ سب چل پڑے۔ سنیل کمار نے نریندر پال سے کہا کہ تمہارا زخم ابھی تازہ ہے، گھر چلے جاؤ۔

نریندر پال نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''نہیں، میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا''۔ وہ بھی سب کے پیچھے چل پڑا۔

دور سے آ رہی ایک کتے کے رونے کی آواز اندھیرے کو چیر کر گہری کھائیوں میں گر رہی تھی۔ قصبہ سویا ہوا تھا۔ ڈھلانوں، پگڈنڈیوں پر بڑے بڑے پتھروں نے اپنے سانس روکے ہوئے تھے۔ وہ سہم کر دبک گئے تھے۔ گھر گھر رضائیوں کمبلوں میں گھسے ہوئے لوگ جاگ رہے تھے مگر اُن کے اندر بے چینی کی بچھو بوٹی انہیں ڈس رہی تھی۔ کوئی ہل جل نہیں رہا تھا۔ سبھی اس خوف سے سکڑ گئے تھے کہ ابھی کوئی دستک دے گا اور اُن کے سامنے اُن کی جان نکال کر لے جائے گا۔

رائفلیں اٹھائے وہ پانچوں بے دھڑک قصبے کی گلیوں میں آ گئے پھر ندی پار کرتے ہوئے وہ مکئی کے کھیتوں میں سے ہو کر خدیجہ کے گھر کے باہر پہنچے اور دروازے کے سامنے کھڑے ہو گئے۔

''دروازہ توڑ دیتے ہیں''۔ سریش نے کہا۔

کشور راوت نے سمجھایا۔ ''محلے والے جاگ جائیں گے''۔

''محلے والے جاگ جائیں گے تو ہم کچھ نہیں کر پائیں گے''۔ نریندر پال بولا۔

''کس کی مجال ہے ہمیں روکنے کی؟'' سریش اپنی اونچی آواز کو قابو میں رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔

''جو آگے آئے گا اُسے گولی مار دیں گے''۔

''اتنا کچھ کرنے کی ضرورت نہیں''۔ سنیل نے آگے ہو کر کہا۔ ''میں کھڑکی سے سلاخیں موڑ کر نکال دیتا ہوں، پھر وہاں سے اندر جا کر دروازہ کھول دیتا ہوں''۔

''اگر خدیجہ نے شور مچا دیا تو؟''

''میں اسی وقت اُس کا گلا دبا دوں گا''۔ سنیل کمار نے جواب دیا۔ وہ کھڑکی کی طرف گیا اور ایک ایک کر کے کھڑکی کی پانچوں سلاخیں موڑ کر باہر نکال دیں پھر آہستہ آہستہ وہ اندر کود گیا۔ ایک نکڑ میں خدیجہ رضائی میں دبکی ہوئی تھی۔ دھیمے دھیمے اُس کے کراہنے کی آواز سنائی دی۔ سنیل کمار ایک لمحے کے لئے اُسے دیکھتا رہا۔ پھر اُس نے دروازے کے پاس جا کر کنڈی کھول دی۔ وہ چاروں اندر آ گئے۔ انہوں نے آگے بڑھ کر خدیجہ کی طرف دیکھا۔ اُس کے کراہنے کی آواز سنی۔

نریندر پال بولا۔ ''بیمار ہے شاید''۔

سنیل کمار آگے جا کر خدیجہ کے پاس بیٹھ گیا۔ وہ کچھ بڑبڑا رہی تھی۔ سنیل کمار نے اُس کے منہ سے کان لگائے اور پھر بولا۔ ''پانی مانگ رہی ہے''۔

نریندر پال نے ایک طرف پڑے ہوئے جگ میں سے ایک گلاس میں پانی ڈالا اور خدیجہ کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ اُس کے منہ میں تھوڑا سا پانی ڈالا۔ پھر اُس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر دیکھا اور کہنے لگا۔ اسے بڑا تیز بخار ہے۔ کشور راوت، سندیپ اور سنیل کمار اُسی طرف دیکھ رہے تھے۔ کشور راوت دھیمے سے بولا۔ اچھا ہوا یہ بیمار ہے، اگر ہم اسے مار دیں گے تو اسے مصیبتوں سے چھٹکارا ملے گا اور ہمیں پُن۔ نریندر پال تیزی سے اُس کے پاس جا کر بولا۔ ایک بیمار لاچار بڑھیا کو مار کر پُن کمانا چاہتے ہو؟

''ہم اسے مارنے ہی تو یہاں آئے ہیں''۔ سندیپ نے کہا۔

سریش نے بندوق اوپر اٹھائی اور بولا۔ ''ایک ہی گولی، اس کا کام تمام کردے گی''۔

سنیل کمار نے ہاتھ بڑھا کر اُس کی بندوق نیچے کرتے ہوئے کہا۔ ''میرے خیال میں یہ خود ہی مر جائے گی''۔

''میں بھی یہی چاہتا ہوں''۔ نریندر پال بولا۔ ''میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ اس حالت میں اسے مارنا پاپ ہے، بھگوان بھی تمہیں معاف نہیں کرے گا۔ سنیل کمار ٹھیک کہہ رہا ہے، اس کے بچنے کے آثار نہیں ہیں۔ کل تک یہ خود ہی مر جائے گی۔ ہمارا کام بھی ہو جائے گا اور ہم پاپ کرنے سے بھی بچ جائیں گے''۔

''تم ہمیشہ بزدلی کی باتیں کرتے ہو''۔ کشور راوت نریندر پال پر جھنجلا اٹھا۔

''زخم بھی تو مجھے ہی لگتے ہیں''۔ نریندر پال نے اپنے کندھے کی طرف اشارہ کیا۔ ''پھر بھی تم مجھے بزدل کہتے ہو''۔

خدیجہ اور اونچی آواز میں کراہنے لگی تھی۔ سنیل کمار نے اُس کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''شاید اور پانی مانگ رہی ہے۔ میں دیتا ہوں''۔ وہ خدیجہ کی طرف جانے لگا تو سندیپ غصے میں آ گیا۔ ''تو اسی طرح اسے پانی پلاتا رہا تو وہ مر جائے گی۔ چلو یہاں سے نکل چلو۔

''نہیں میں پانی پلا کر آتا ہوں''۔ کہہ کر سنیل کمار نے جگ اٹھایا لیکن سریش کی گھرکی سن کر رُک گیا۔ خبردار جو تو نے اسے پانی پلایا تو۔ سریش نے بندوق اٹھالی تھی۔ سب ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ سنیل کمار نے جگ وہیں واپس رکھ دیا اور باہر نکل گیا۔ سب اُس کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔

☆☆☆

ڈاکٹر اندر پال لیٹا ہوا تھا، سویا نہیں تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ اس کی بیوی بھی جاگ رہی ہے، پر کوئی کچھ بول نہیں رہا تھا۔ بچے سو رہے تھے مگر باہر کا دروازہ کھلا تھا کیونکہ نریندر پال نے ابھی آنا تھا۔ وہ آئے گا تو ٹھیک، نہیں آئے گا تو بھی ٹھیک۔ اس کی فکر کرنے کا اب کوئی فائدہ نہیں۔ سب بھگوان کے ہاتھ میں ہے۔ پہلے دروازہ کھلنے پر بند ہونے کی آواز کانوں میں پڑی۔ وہ سمجھ گئے نریندر پال آ گیا ہے۔ اوشا چپ چاپ اٹھی اور رسوئی میں جا کر کھانا پروسنے لگی۔ نریندر پال کھانے بیٹھ گیا۔ ڈاکٹر اندر پال بھی آنکھیں ملتے ملتے اور ڈھیلی چال چلتے وہیں آ بیٹھا۔ نریندر پال نے زخمی کندھے کو اور بھی اودکوٹ کے نیچے چھپالیا اور چپ چاپ کھانا کھاتا رہا۔

''کیا بات ہے آج تو بڑا چپ چاپ ہے''۔ ڈاکٹر نے پوچھا۔ ''کراس فائرنگ میں کوئی زخمی تو نہیں ہوا؟''

''نہیں''۔

''آج اتنی دیر تک کہاں تھے؟'' اوشا نے پوچھا۔

''آج ہم اسامہ کی ماں خدیجہ کو مارنے گئے تھے''۔

ڈاکٹر اندر پال اور اوشا دونوں سکتے میں آ گئے۔ اوشا دکھی دل سے بولی۔

''تم سب نرگ میں جاؤ گے''۔ ڈاکٹر اندر پال نے تڑپ کر کہا۔ ''نریندر میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ تو میرے دوست کی ماں کو......''

''سنئے تو سہی، ہم جب وہاں پہنچے تو دیکھا وہ خود ہی مر رہی تھی''۔

''کیا ہوا اُسے؟'' دونوں گھبرا گئے۔

''بہت زیادہ بخار چڑھا ہوا تھا اُسے، ہم اُسے پانی پلا کر واپس آ گئے''۔

''میں اُسے دیکھ کر آتا ہوں، دوائی بھی دے آؤں گا''۔ ڈاکٹر اٹھنے لگا۔

''آپ مت جائیے، سریش وغیرہ نے دیکھ لیا تو......''

لیکن ڈاکٹر رک نہیں پایا وہ اپنا بیگ اٹھا کر چل پڑا۔ اوشا نے نریندر پال سے کہا۔ تُو پیچھے پیچھے جا نگرانی رکھنا۔

ڈاکٹر اندر پال نے خدیجہ کے گھر میں جانے سے پہلے اِدھر اُدھر دیکھا کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا اور پھر جلدی سے اندر چلا گیا۔ اُسے پتہ نہیں لگا کہ گلی کے سرے پر ایک دیوار کی اوٹ میں کھڑا نریندر پال اس پر نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ اندر جا کر اُس نے دروازہ بند کیا اور خدیجہ کی طرف دیکھا۔ خدیجہ بے چینی سے کراہ رہی تھی۔ ڈاکٹر کو ایک ایسی شرمندگی کا احساس ہو رہا تھا جو اُسے اندر ہی اندر نوچ رہی تھی۔ آہستہ آہستہ آگے بڑھتا ہوا وہ اُس کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ اُس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا خدیجہ نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ جانے پہچانے ہاتھ تھے۔ وہ ایک ٹک ڈاکٹر کی طرف دیکھتی رہ گئی۔

''کیا حال ہے ماں جی؟'' ڈاکٹر نے پیار بھری روتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''ماں جی کہہ رہے ہو اور اتنے دنوں کے بعد میری خبر لینے آئے ہو؟'' خدیجہ نے دکھ بھری آواز میں کہا۔ ''ایک بار آ کر نہیں پوچھا کہ بدنصیب ماں جی اکیلی رہتی ہو گی۔ تُو تو اسامہ کا جگری یار ہے''۔ خدیجہ کا طعنہ ڈاکٹر اندر پال کے دل کے آر پار ہو گیا۔ خدیجہ کہہ رہی تھی۔ ''تجھے یاد ہے ایک بار تمہارے کہنے پر میں نے اُسامہ کو کتنا مارا تھا؟''

ڈاکٹر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ گلوبند کے ساتھ آنکھیں پونچھتے ہوئے بولا۔ ''بس ماں جی! اب اور کچھ مت کہو۔ میں نے سچ مچ پاپ کیا ہے، پر یہ زہر تو سارے ماحول میں پھیل چکا ہے۔ ہم سب حیوان بن چکے ہیں۔ کیا کیا جائے؟ پر میں تمہیں کچھ نہیں ہونے دوں گا۔ لے دوا کھا لے۔ صبح تک بخار اتر جائے گا''۔ وہ بیگ میں سے دوائیاں نکالنے لگا۔

''نہیں اِندر پال میں دوائی نہیں کھاؤں گی''۔ خدیجہ نے کمزور آواز میں کہا۔ ''میں جلدی سے جلدی مر جانا چاہتی ہوں۔ مجھ سے یہ اکیلا پن برداشت نہیں ہوتا۔ بچوں کے بنا کیا کرنا ہے جی کر۔ اسامہ بچوں کو لے کر پتہ نہیں کہاں دَر دَر کی ٹھوکریں کھا رہا ہو گا؟''

''بھگوان ان کے ساتھ ہے، وہ جہاں بھی ہوں...... لے تُو دوا کھا''۔ ڈاکٹر اندر پال نے کہا۔

''نہیں مجھے نہیں کھانی''۔

''میں تو تمہیں کھلا کر ہی جاؤں گا۔ ٹھہرو ذرا پانی لے آؤں''۔ اُس نے جگ میں سے گلاس میں پانی ڈالا اور بولا۔ ''دوا نہیں کھانے کی تمہاری پرانی عادت ہے۔ ماں جی! کیا مجھے پتہ نہیں کہ دوا نہیں کھانے کے لئے تم کتنے بہانے کر سکتی ہو؟ پر آج میں تمہارا کوئی بہانہ نہیں چلنے دوں گا۔ لے منہ کھول''۔

خدیجہ نے اُس کا ہاتھ ہٹا دیا اور روتے ہوئے بولی۔ ''دیکھ اندر پال میرے ساتھ زور زبردستی والی بات مت کر، میں جینا نہیں چاہتی۔ تو دوائی کیوں کھاؤں گی؟ لے جا اپنی دوا اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دے''۔

''دیکھو ماں جی! دوا تو تمہیں کھانی ہی پڑے گی''۔ اندر پال نے کہا۔ ''ورنہ میں اپنے یار اسامہ کو کیا منہ دکھاؤں گا؟''

''اسامہ یہاں کہاں ہے جو تجھے پوچھے گا؟''

''وہ یہاں نہیں ہے اس لئے تو میری ذمے داری بڑھ گئی ہے۔ دوا کھلائے بنا میں نہیں جاؤں گا''۔

''تُو کچھ بھی کر لے میں نہیں کھاؤں گی''۔ یہ کہہ کر خدیجہ نے منہ پھیر لیا۔

''ڈاکٹر رو پڑا۔ سسک سسک کر بولا۔ ''میں تیرے پاؤں پڑتا ہوں ماں جی! اب اور شرمندہ مت کر۔ تجھے میری قسم ہے، لے دوا کھا لے''۔ ڈاکٹر نے ہاتھ بڑھا کر اُس کے منہ میں دوا الٹ دی۔ پانی کا گلاس بھی اُس

کے منہ سے لگایا۔ خدیجہ نے دوا کھائی۔ ڈاکٹر اپنے آنسو پونچھنے لگا۔

خدیجہ کی آنکھیں بھی بھر آئی تھیں۔

ڈاکٹر نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "میں کل پھر آؤں گا۔ گھبرانا مت، میں ضرور آؤں گا"۔ خدیجہ اُسے دروازے سے باہر جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔

دوسرے روز انہونی ہوگئی۔ کشور روات، سندیپ اور سریش مکئی کے کھیتوں کے پاس ٹین کی بنی ہوئی جھونپڑی کے باہر بیٹھے اپنے ہتھیاروں کی صفائی کر رہے تھے۔ یہ جھونپڑی اُس مسلمان گھرانے کی تھی جو ان کھیتوں کا مالک تھا اور جو پچھلے برس یہاں سے ہجرت کر گیا تھا۔ ہتھیار صاف کرتے ہوئے اچانک سندیپ نے زیندر پال کی ماں ادشا کو چوری چوری خدیجہ کے گھر کی طرف جاتے دیکھا۔ انہیں شک ہوا اور اُس کے پیچھے چل پڑے۔ ادشا نے انہیں پیچھے آتے دیکھا تو بھاگی۔ اب تو اُن تینوں کو پورا یقین ہوگیا کہ وہ خدیجہ کے پاس ہی جا رہی ہے۔ وہ اس کے پیچھے بھاگنے لگے۔ ادشا ٹوٹی ہوئی کھڑکی کے راستے گھر کے اندر داخل ہوگئی اور کھڑکی بند کر دی۔ اتنی دیر میں وہ تینوں بھی وہاں پہنچ گئے۔ وہ دروازہ کھٹکھٹانے لگے۔ اندر ادشا نے جلدی جلدی اپنی جیب میں سے دوا کی شیشی نکالی اور خدیجہ کو دوا پلانے لگی۔ خدیجہ ویسے ہی نڈھال تھی۔ دروازے کی کھٹکار لگاتار آ رہی تھی۔ ادشا نے جب دوا پلا دی تو اُس نے دروازہ کھول دیا۔

"کیا بات ہے؟" اُس نے پوچھا۔ کشور راوت نے رعب دار آواز میں پوچھا۔

"ہم سے پوچھے بنا آپ اندر کیسے چلی گئیں؟"

"خدیجہ بیمار ہے، اُسے دوائی پلانی ضروری تھی"۔ ادشا نے کہا۔

"ہم نے فیصلہ کیا ہے، اُسے کوئی دوائی نہیں دے

سچی باتیں

☆ اللہ اُن کو دوست رکھتا ہے جو دوسروں پر رحم کرتے ہیں، احسان کرتے ہیں اور ان کی بھلائی چاہتے ہیں۔ (القرآن)

☆ اللہ تعالیٰ اُس شخص پر رحم نہیں کرتا جو لوگوں پر رحم نہیں کرتا۔ (الحدیث)

☆ عقل مند وہ ہے جو دوسروں کی نصیحتیں سنتا ہے۔ (حضرت سلیمانؑ)

☆ اگر تم لوگوں کے قصور معاف کرو گے تو اللہ تمہارے قصور معاف کرے گا۔ (حضرت ادریسؑ)

☆ تین چیزیں محبت بڑھانے کا ذریعہ ہیں: (1) سلام کرنا (2) دوسروں کے لئے مجلس میں جگہ خالی کرنا (3) مخاطب کو بہترین نام سے پکارنا۔ (حضرت عمر فاروقؓ)

☆ خاموشی غصے کا بہترین علاج ہے۔ (حضرت عثمان غنیؓ)

گا"۔

"تم نے فیصلہ کیا ہے"۔ ادشا نے کہا۔ "میں تمہارا فیصلہ نہیں مانتی"۔

اُن کی سمجھ میں نہیں آیا کہ آگے کیا کہیں آخر وہ زیندر پال کی ماں ہے۔ اُسی وقت ادشا نے دیکھا اور بھی کئی عورتیں آ رہی تھیں۔ اُدھر اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

"وہ دیکھو وہ بھی آ رہی ہیں، تم کس کس کو روکو گے؟"

ان تینوں نے دیکھا پشپا، ریتا، انورادھا وغیرہ کئی عورتیں اسی طرف آ رہی تھیں۔ انورادھا سنیل کمار کی ماسی لگتی تھی۔ وہ دروازے تک پہنچی تو اس نے سریش کی بندوق کی نوک ہاتھ مار کر پیچھے ہٹا دی اور سب عورتیں بے دھڑک ان کے پاس سے نکل گئیں۔ ادشا نے دروازہ بند

کر دیا۔ وہ تینوں چپ چاپ وہاں سے چل پڑے۔ سبھی عورتیں خدیجہ کو گھیر کر بیٹھ گئیں۔ خدیجہ لیٹی رہی، اٹھنے کی ہمت اُس میں نہیں تھی۔ انورادھا نے اُس کے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ماسی! ہم بہت شرمندہ ہیں، اتنے دنوں تک تمہارے پاس نہیں آ سکیں۔ پشپا اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بولی۔ ہمارے لڑکوں نے انتہا کر دی ہے چاروں طرف دہشت پھیلا دی ہے۔ گھر سے نکلنا مشکل ہے۔

''ہم سب ڈر گئے ہیں چاچی!'' ریتا نے کہا۔

''ایسی بات نہیں کہ تمہارا خیال نہیں آیا۔ پر اپنی جان کا ڈر تو سبھی کو ہوتا ہے''۔

خدیجہ ان کی باتیں سن کر رونے لگی۔ بولی۔ ''مجھے بھی ابھی پتہ چلا کہ جان کا ڈر کیا ہوتا ہے۔ پہلے تو میں بھی کہتی تھی کب اس جینے سے چھوٹوں''۔

''ہم تمہیں مرنے نہیں دیں گے اماں!'' اوشا نے پیار سے کہا۔

''مجھے تو یوں لگتا ہے میں نے مر کر دیکھ لیا''۔ خدیجہ نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

''اکیلے رہنے سے ایسا ہوا''۔ انورادھا بولی۔ ''تم بھی اپنے بچوں کے ساتھ چلی جاتیں تو اچھا تھا''۔

''میں نے سوچا پردیس میں جا کر کیا مرنا؟'' خدیجہ نے کہا۔ ''اپنے گھر میں مروں گی۔ مگر جب اکیلے پن میں جان نکلنے لگی تو گھبرا گئی۔ روح نکلنا بھی کوئی آسان بات نہیں''۔

''اسامہ بھائی کا بھی کوئی پتہ نہیں لگا؟'' ریتا نے پوچھا۔

پشپا کو اچانک کچھ یاد آیا بولی۔ ''میں نے سنا ہے تمہارے نام کوئی چٹھی آئی ہے لیکن لوگوں نے تم تک پہنچنے نہیں دی''۔

''کیا کہا؟'' خدیجہ بے ساختہ اٹھ بیٹھی۔ ''میرے نام چٹھی آئی ہے؟ کس کے پاس ہے وہ چٹھی؟ مجھے کیوں نہیں دی؟''

''راجیش دکاندار کو ڈاکیا دے گیا۔ میں نے تو اتنا ہی سنا''۔ کہتے ہوئے پشپا کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔

''میں ابھی اُس سے چٹھی لیتی ہوں''۔ خدیجہ نے بے چینی سے کہا۔ ''اس نامراد کو کیا حق تھا میری چٹھی اپنے پاس رکھنے کا''۔ یہ کہتے کہتے وہ کھڑی ہو گئی اور تیزی سے باہر جانے لگی، عورتوں نے اُسے روکنے کی کوشش کی۔

''ماسی! تُو بیمار ہے گر جائے گی''۔

''نہیں مجھے کچھ نہیں ہوگا''۔

''چاچی! تُو مت جا، میں راجیش کو بلا لاتی ہوں''۔

''نہیں، میں خود ہی جاؤں گی۔ اُس سے پوچھوں گی اُس نے میری چٹھی دبا کر کیوں رکھی؟''

عورتیں اُسے روک نہیں سکیں، وہ بھاگ گئی۔

گھر سے تھوڑی دور گلی کے سرے پر جہاں مکئی کے کھیتوں کے پاس ٹین کی جھونپڑی تھی وہاں سریش، سنیل کمار اور سندیپ کھڑے تھے۔ وہ خدیجہ کو بدحواسی میں ننگے پاؤں بھاگتے دیکھ کر حیران ہوئے۔ خدیجہ انہیں اَن دیکھا کر کے نکل گئی۔ تھوڑی دور جا کر کھڑی ہو گئی۔ اُس وقت اُسے احساس نہیں تھا کہ یہی دہشت گرد ہیں۔ وہ واپس بھاگتی ہوئی اُن کے پاس آئی اور بچوں کی سی معصومیت کے ساتھ بولی۔ میری چٹھی آئی ہے، راجیش کے پاس۔ اسامہ کی ہی ہوگی۔ میں ابھی اُس سے لے کر پڑھوں گی، بھلا بتاؤ اُسے میری چٹھی اپنے پاس رکھنے کا کیا حق ہے؟ یہ کہہ کر وہ پھر بازار کی طرف بھاگنے لگی۔

ان تینوں کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ حیران ہو کر وہیں کھڑے رہے۔ چڑھائی چڑھتے ہوئے گرتی پڑتی وہ ہانپ رہی تھی۔ جب وہ راجیش کی دکان پہ پہنچی تو وہاں ٹوٹے ہوئے سانسوں سے شور مچا دیا۔ ''کہاں ہے میری چٹھی، دے مجھے جلدی کر۔

راجیش کے ہاتھ میں ترازو پکڑا رہ گیا۔ وہ خوف زدہ ہو کر خدیجہ کی طرف دیکھنے لگا۔ پارس ناتھ اور اجے سنگھ یادو بھی وہیں تھے۔ ہڑبڑا کر کھڑے ہو گئے۔ وہ جانتے تھے چٹھی میں کیا لکھا ہے۔ سبھی کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ خدیجہ بنا رُکے بولے جا رہی تھی۔ ''میرے اسامہ کی لکھی ہوئی چٹھی تُو نے مجھے دی کیوں نہیں؟ تیری اتنی ہمت کیسے ہوئی چٹھی دبا کر رکھنے کی؟ تُو اتنا بے غیرت ہے، میرا منہ کیا دیکھ رہا ہے؟ دے میری چٹھی''۔

سبھی بت بن گئے تھے۔ راجیش نے آہستگی سے ترازو ایک طرف رکھا اور اپنی گدی کے نیچے سے چٹھی نکال کر اُس کی طرف بڑھائی۔ خدیجہ نے جلدی جلدی لفافہ پھاڑ کر چٹھی نکالی اور دیکھنے لگی۔ مگر وہ پڑھتی کیسے، وہ پڑھنا نہیں جانتی تھی۔ راجیش سے بولی۔ تُو ہی پڑھ کر سنا۔ مجھے تو پڑھنا نہیں آتا۔

راجیش نے ہچکچاتے ہوئے چٹھی لے لی جو اردو میں لکھی ہوئی تھی اور دھیمی آواز میں پڑھنا شروع کیا۔

''پیاری ماسی جی! میں اسامہ کا عزیز کشمیر سے آپ کو چٹھی لکھ رہا ہوں''۔ راجیش چٹھی پڑھتے پڑھتے رک گیا اور بولا۔ ''یہ اسامہ کی نہیں نعمان کی چٹھی ہے''۔

''ہاں ہاں نعمان میری بہو کا بھائی ہے، تُو آگے پڑھ''۔

راجیش پھر کانپتی آواز میں پڑھنے لگا۔ ''ہم سب وادی میں سے کیسے نکلے اور کیسے پہنچے بتا نہیں سکتے۔ مصیبت پر مصیبت آتی رہی۔ اسامہ اور میں نے جہاں تک ہو سکا مل کر حالات کا سامنا کیا۔ پر کیا بتاؤں، کیسے بتاؤں۔ کڑاکے کی سردی سڑک کے کنارے سونے کی وجہ سے اسامہ کو نمونیا ہو گیا''۔ راجیش بس اتنا ہی پڑھ سکا۔ آگے پڑھنا اُس کے لئے محال ہو گیا۔ خدیجہ ایک ٹک اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ راجیش کا رنگ اڑ گیا تھا۔ اُس نے سہمے ہوئے خدیجہ کی طرف دیکھا۔

''کیا بات ہے تُو چپ کیوں ہو گیا، وہاں جاڑے میں سڑک کے کنارے سونے سے اسامہ کو نمونیا ہو گیا، اب کیا حال ہے اُس کا، ٹھیک ہو گیا؟'' خدیجہ کی ستر سالہ تجربہ کار آنکھیں جو بھانپ رہی تھیں، دل اُسے ماننے پر راضی نہیں تھا۔ وہ کچھ اور سننا چاہتی تھی۔ راجیش کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ پارس ناتھ اور اجے سنگھ یادو بھی گھبرا گئے تھے۔ خدیجہ نے بے چین ہو کر پھر کہا۔

''کیا بات ہے راجیش! تُو بولتا کیوں نہیں؟ میری بات کا جواب کیوں نہیں دیتا، اسامہ راضی تو ہے؟'' انتہائی لاچار ہو کر وہ چیخی۔ ''تُو چٹھی کیوں نہیں پڑھتا، دے مجھے''۔ اُس سے چٹھی لے کر وہ اجے سنگھ یادو کی طرف مڑی۔ ''لے بھائی تُو ہی پڑھ کر سنا۔ اُس کے منہ کو تو تالا لگا ہے''۔

پر اجے سنگھ یادو کی ہمت بھی نہ پڑی کہ چٹھی کو اپنے ہاتھ میں لیتا صرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا رہا۔ اب خدیجہ کا ضبط بھی چھوٹنے لگا۔ اُسی وقت اُس نے ششی بالا کو آتے دیکھا۔ وہ اُس کی طرف بھاگی۔ ششی بالا کا خون رگوں میں جم گیا تھا۔ وہ جانتا تھا چٹھی میں کیا لکھا ہے۔ اُسے خدیجہ کے سامنے پڑھنے کا حوصلہ نہیں تھا، خدیجہ ایک دم چیخ پڑی۔

''کیوں نہیں سناتا مجھے پڑھ کر...... تمہیں کیا ہو گیا ہے؟''

ششی بالا کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ خدیجہ اور بھی بے صبر ہو گئی۔ ششی بالا رونے لگا، بلکتے ہوئے بولا۔

''ظلم ہو گیا بھابی! قہر ڈھے گیا، قیامت آ گئی''۔

''خدیجہ کی جان نکلنے لگی وہ چیخی۔ ''کیا ہو گیا ششی بالا! ایسی کیا بات ہو گئی؟''

''میرا کلیجہ پھٹا جا رہا ہے...... کیسے کہوں کہ اسامہ نمونیا سے بچ نہیں پایا اور اللہ کو...... پیارا ہو گیا ہے''۔

سنتے ہی خدیجہ بے ہوش ہوکر گر پڑی۔ راجیش اور دوسرے لوگ اُسے سنبھالنے آگے بڑھے، ششی بالا روتا جا رہا تھا۔

خدیجہ کی کوٹھری سہمی ہوئی، ڈری ہوئی سانس روکے ہوئے تھی۔ خدیجہ آخری سانسوں پر تھی، ڈاکٹر اندر پال اُس کے پاس یوں بیٹھا تھا جیسے ڈوب رہی کشتی کے پاس ملاح بیٹھا ہوا ہو۔ اوشا اور انورادھا دروازے کے پاس کھڑی رو رہی تھیں اور ششی بالا ایک طرف دیوار کے ساتھ لگا دل ہی دل میں بھگوان سے معافیاں مانگ رہا تھا، خدیجہ بڑبڑا رہی تھی۔

''میرا اسامہ بڑا نازک طبیعت کا تھا، میں نے اُسے بڑے لاڈ پیار سے پالا تھا۔ جب اُس نے آنکھیں بند کی ہوں گی تو مجھے یاد کیا ہوگا۔ پر مجھے تو پتہ بھی نہیں چلا۔ میں تو یہی سوچتی رہی میرے مرنے کا اسامہ کو بڑا دُکھ ہوگا۔ اُس نے کب سوچا ہوگا کہ اُس کے مرنے کی سُن کر مجھ پر کیا بیتے گی۔ اب میں جینا نہیں چاہتی، اندر پال! اب مجھ میں سانس لینے کی ہمت بھی نہیں۔ میں جانا چاہتی ہوں۔ یہاں سے چلے جانا چاہتی ہوں'' ۔ یہ کہتے ہوئے اس نے آنکھیں بند کرلیں۔

ڈاکٹر اندر پال رونے لگا، پیچھے کھڑی عورتیں بھی سسکنے لگیں۔ باہر بہت سے لوگ بیٹھے ہوئے تھے، کچھ کھڑے بھی تھے۔ کسی کو پتہ نہیں تھا کہ خدیجہ اس جہان سے جا چکی ہے۔ وہ سوچ رہے تھے ڈاکٹر اسے دوا پلا رہا ہے۔ اُن لوگوں میں پشپا بھی تھی، ریتا بھی تھی، ایک طرف مرد لوگ تھے جن میں پارس ناتھ اور اجے سنگھ یادو بھی تھے۔ تھوڑی دوری پر راجیش کانگڑی لئے بیٹھا تھا، سب دُکھی تھے۔

سب سے زیادہ غم نریندر پال کو ہوا۔ وہ پتھر جیسا بے حس بن کر اپنے ابا ڈاکٹر اندر پال کو روتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اچانک ڈاکٹر نے اپنی آنکھوں پر سے ہاتھ ہٹایا تو اس کی نظر نریندر پال پر گئی۔ غصے سے اُس کی آنکھوں سے چنگاریاں پھوٹنے لگیں۔ اُس کا جسم کانپنے لگا۔ وہ نریندر پال کی طرف بڑھا۔ نریندر پال اس کا ارادہ بھانپ گیا لیکن وہ اپنی جگہ سے ہٹا نہیں۔ اُس کے نزدیک پہنچتے ہی ڈاکٹر نے اُس کے گال پر اتنی زور سے طمانچہ مارا کہ وہ منہ کے بل دور جا گرا۔ جہاں وہ گرا وہاں ابھی ابھی سنیل کمار، سندیپ، کشور راوت اور سریش آ کر کھڑے ہوئے تھے۔ سریش نے بے قابو ہوکر اپنی رائفل اوپر اٹھائی اور کشور راوت نے پسٹل پر ہاتھ ڈالا لیکن سنیل کمار اور سندیپ نے ان دونوں کو روک دیا۔

ڈاکٹر پھر آگے بڑھا اور نریندر پال کو لاتوں مکوں سے دھننے لگا۔ وہ گالیاں بھی دیتا رہا۔ ''طاعون زدہ، خنزیر بدمعاش میں تیری جان لے لوں گا۔ تم لوگ وحشی بن چکے ہو، لعنت ہے تم پر'' ۔

نریندر پال مار کھاتے کھاتے پیچھے ہٹتا جا رہا تھا اور ڈاکٹر مارتے مارتے اور گالیاں بکتے اُس طرف بڑھتا جا رہا تھا جس طرف نریندر پال کے ساتھی کھڑے تھے۔ عورتیں اپنا رونا بھول گئی تھیں اور انہوں نے ایک دوسرے کو تھام لیا تھا۔ ششی بالا نے کوٹھری سے باہر آ کر یہ ہنگامہ دیکھا تو جلدی سے آگے بڑھ کر ڈاکٹر کو روکنے لگا۔

''بس بس بہت ہوگیا۔ چھوڑ اسے پاگل مت بن۔ یہ لڑکے گمراہ ہو چکے ہیں، تم تو بے قابو مت ہو جاؤ'' ۔

ڈاکٹر نے مارنا بند کیا تو گلوبند سے آنسو پونچھتے ہوئے بولا۔ ''چاچا! انہوں نے میری ماں کو مار دیا ہے'' ۔

''تم تو جانتے ہو میرا ان سے کیا رشتہ تھا'' ۔ ششی بالا نے اسے چپ کرایا اور کہنے لگا۔ ''اس کا گھر والا میرا جگری یار تھا۔ یہ میری سگی بہنوں سے بڑھ کر تھی۔ میں سب سے ڈرتے ڈرتے گھبراتے اس گھر میں چائے، چاول، کوئلے اور نمک پھینکتا رہا۔ گردن تنگ کی قسم کون سا منہ لے کر جاؤں گا اُس رب کے سامنے'' ۔

نریندر پال منہ سے بہتا خون پونچھ رہا تھا۔ اس کے ساتھ اور دوسرے سب لوگ بھی اُن دونوں کی باتیں سن رہے تھے۔

"میں چھٹی نہیں دیتا تو اماں کچھ روز اور جی لیتی"۔ راجیش بولا۔

"سب بھگوان کے ہاتھ میں ہے"۔ پارس ناتھ نے کہا۔ "اس میں تمہارا کوئی دوش نہیں"۔

"اماں کے کفن دفن کا کیا کرنا ہے؟" اجے سنگھ یادو کی بات سن کر سب چونک اٹھے۔

"اب تو جو کرنا ہے ہمیں ہی کرنا ہے"۔ پارس ناتھ بولا۔

"مگر جو کرنا ہے اسلامی طریقے سے کرنا ہے"۔ ڈاکٹر اندر پال نے کہا۔ "میں کسی مسلمان کو ڈھونڈ کر لاتا ہوں جو اس کا جنازہ پڑھ دے گا۔ باقی ہم کرلیں گے"۔

اندر خدیجہ کو نہلا دیا گیا اور عورتوں نے اُسے کفن پہنا کر چارپائی پر لٹا دیا تھا۔

انورادھا نے خدیجہ کا ماتھا چومتے ہوئے کہا۔ "کتنی خوبصورت دکھ رہی ہے خدیجہ"۔

اوشا بولی۔ "شادی کے بعد جب میں اس محلے میں آئی تو یہ عمر کی ڈھلان پر تھی مگر پھر بھی سب سے زیادہ خوبصورت تھی، گاتی بھی بہت اچھا تھی، میں نے ہمیشہ اسے اپنی ساس ہی سمجھا"۔

ریتا بولی۔ "بے چاری کی قسمت دیکھو، کس حالت میں مرنا تھا اس نے"۔

پشپا نے کہا۔ "ہم نے کبھی سوچا تھا اس کا کفن دفن ہمیں ہی کرنا پڑے گا"۔

دروازے پر دستک ہوئی، اوشا نے اٹھ کر دروازہ کھولا وہاں پارس ناتھ کھڑا تھا۔ اس نے پوچھا۔ "سب ہو گیا"۔

"ہاں سب تیار ہے"۔ اوشا نے جواب دیا۔

ٹوٹی ہوئی دیوار کے ملبے پر شمشی بالا گھٹنوں پر گردن دبائے یوں بیٹھا تھا جیسے وہ بھی اس دنیا سے جا چکا ہو۔ اُسے اپنا یار نعمان یاد آ رہا تھا۔ اُس کی شادی میں وہ باراتی بن کر گیا تھا۔ بڑی موج مستی کی تھی۔ خدیجہ کو پہلی بار دیکھ کر وہ دیکھتا رہ گیا تھا۔ کتنی خوبصورت تھی وہ۔ تب مشکل سے چودہ پندرہ برس کی ہوگی وہ۔

دروازہ کھلنے کی آواز سن کر اُس کا دھیان ٹوٹا۔ جنازہ اٹھا کر باہر لا رہے تھے، وہ کھڑا ہو گیا۔ ڈاکٹر اور دوسرے لوگ بھی کھڑے ہو گئے۔ جب لوگوں نے جنازے کو کندھوں پر اٹھایا تو بے اختیار عورتیں رونے لگیں۔ سبھی کے دل بھر آئے، ان پانچوں کے بھی۔

خدیجہ کی کوٹھری بھی اپنی روح کو جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ دور گلی کے پار مکئی کے کھیتوں اور قبرستان تک۔

جنازہ پڑھ کر قبر پر مٹی ڈالی جا رہی تھی، اچانک دور سے گولیاں چلنے کی آواز سنائی دی۔

سب چونک اٹھے۔ دور نیچے پولیس جیپ سے اتر رہی تھی۔

"سندیپ پولیس پھر تیرے پیچھے لگ گئی ہے"۔ وینی نے چیخ کر کہا۔ "تو یہاں سے بھاگ، ہم انہیں روکتے ہیں"۔

باقی سب لوگ منتشر ہونے لگے، پولیس گولیاں چلاتے چلاتے آگے بڑھ رہی تھی۔

ان پانچوں نے بھی ہتھیار نکال لیے اور پولیس کی فائرنگ کا جواب دینے لگے۔

"بائیں طرف لڑکوں نے مورچہ بنا لیا اور دائیں طرف پولیس نے۔ بیچ میں قبر پر مٹی ڈالی جا رہی تھی اور دونوں طرف سے کراس فائرنگ ہو رہی تھی۔

خاک ہو کے بھی مہکتے ہیں گلابوں کی طرح
چند چہرے جو مقدس ہیں کتابوں کی طرح

●●●

ضربِ سکندری

"صاحب بنگالی ضرور ہوں مگر بے غیرت نہیں۔ آپ کو چھوڑ کر کیسے جاتا"۔

☆ balochsk@yahoo.com سکندر خان بلوچ

آج جب میں اپنی پرانی البم دیکھ رہا تھا تو ایک بہت ہی یادگار فوٹوگراف پر نظر پڑی تو پھر آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ یہ الوداعی ڈنر کے بعد کا سین تھا جس میں ہم سب نے مل کر ایک بنگالی آفیسر کو کندھوں پر اٹھا کر ڈانس کر رہے تھے۔ یہ فوٹو پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول کا تھا اور کندھوں پر اٹھایا جانے والا آفیسر کیپٹن احمد علی بنگالی تھا جس کی ڈھاکہ پوسٹنگ پر اسے الوداعی ڈنر دیا گیا تھا اور پھر فوجی روایت کے مطابق اسے کندھوں پر اٹھا کر ہلہ گلہ کیا گیا۔ اس فوٹوگراف میں کئی پرانے بنگالی ساتھی مثلاً کیپٹن ضیاء الدین۔ کیپٹن صلاح الدین۔ میجر ضیاء الرحمٰن اور کیپٹن مجیب وغیرہ بہت ہی خوشی کے موڈ میں تھے۔ مشرقی پاکستانی اور مغربی پاکستانی آفیسرز میں کسی قسم کی تفریق نہ تھی۔ سب نے ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑ کر الوداع ہونے والے دوست کو اٹھا رکھا تھا۔ احساس ہوتا تھا کہ جیسے کل ہی کی بات ہو۔ کیسے دن تھے مگر آج معلوم نہیں کہ ان میں کون کون زندہ ہے اور جو زندہ ہیں ان سے مل بھی نہیں سکتے۔ پھر 1971ء کا پُر آشوب دور نظروں میں پھرنے لگا جب یہی لوگ ہماری جان کے دشمن بن گئے تھے۔ بہرحال سب تو برابر نہ تھے لہٰذا اس دور کی کچھ یادیں ان مخلص لوگوں کی امانت سمجھ کر اپنے قارئین کے سامنے پیش خدمت ہیں۔

گو مشرقی پاکستان ہم سے علیحدہ ہو گیا جس کی سب سے بڑی وجہ شاید ہماری اپنی سیاسی غلطیاں تھیں جن کو بعد میں عوامی لیگ نے بھارت کے ساتھ مل کر بھارت ہی کے مذموم عزائم کا آلہ کار بن کر پایہ تکمیل تک پہنچایا لیکن یہ کہنا بالکل غلط ہوگا کہ تمام بنگالی پاکستان مخالف تھے یا خدانخواستہ غدار تھے۔ غدار تو محض چند ہی لوگ تھے۔ عوام کی اکثریت محبِ وطن پاکستانی تھی۔ وہ اپنے

حقوق کے لئے تو لڑنا چاہتے تھے لیکن پاکستان مخالف یا علیحدگی کی پسند ہرگز نہ تھے۔ انہیں علیحدگی پر مجبور کرنے میں اس وقت کے مغربی پاکستان سے کامیاب ہونے والی ایک خصوصی سیاسی شخصیت کے سیاسی عزائم بھی تھے۔ عوامی لیگ اور بھارت نے مؤثر پروپیگنڈا، دھونس، دھاندلی اور نقد رقم کے ذریعے حالات سے فائدہ اٹھایا۔ عوام کو اور خصوصاً نوجوان نسل کو اس حد تک گمراہ کیا کہ مشرقی پاکستان بنگلہ دیش میں بدل گیا۔ اس کے باوجود تمام بنگالیوں کے جذبہ حب الوطنی پر شک کرنا بہت بڑی زیادتی ہوگی۔ یہاں صرف چند واقعات پیش کیے جارہے ہیں۔

پہلا واقعہ 29 مارچ 1971ء کا ہے جب چٹاگانگ پر باغی قابض ہوگئے اور انہوں نے تمام اہم مقامات پر گھاتیں لگا رکھی تھیں۔ 24 فرنٹیئر فورس کو میلا سے 26 مارچ کو چٹاگانگ گریژن کی مدد کے لئے روانہ کی گئی لیکن وہ چٹاگانگ سے چند میل پہلے ایسٹ بنگال رجمنٹ کے باغیوں کی گھات کا شکار ہوگئی۔ کمانڈنگ آفیسر اور بہت سے جوان شہید ہوگئے۔ اُن کی مدد کے لئے چٹاگانگ سے نمبر 2 کمانڈو بٹالین کی کمپنی بھیجی گئی جو تین دن پہلے مغربی پاکستان سے ڈھاکہ پہنچی تھی اور اسی دن یا شاید ایک دن پہلے چٹاگانگ پہنچائی گئی تھی۔ یہ کمپنی بھی راستے ہی میں ایسٹ بنگال رائفلز کی گھات کا شکار ہوگئی۔ کمانڈنگ آفیسر سمیت تین آفیسرز اور تیس جوان موقعہ پر شہید ہوگئے اور باقی تقریباً بیس جوان زخمی ہوگئے جن میں دو آفیسرز بھی شامل تھے۔

ان زخمیوں میں کیپٹن ڈاکٹر محمد حسین بھی شامل تھا۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس کا تعلق مغربی پاکستان سے تھا۔ اس آفیسر کے ساتھ ایک بنگالی نرسنگ اسسٹنٹ سپاہی نذرالاسلام تھا جو معجزانہ طور پر زخمی ہونے سے بچ گیا۔ جب کیپٹن محمد حسین کو تھوڑا ہوش آیا تو اس نے دیکھا

کہ اس کا اسسٹنٹ سپاہی نذرالاسلام اس کے ساتھ بیٹھا تھا۔ شام کا وقت تھا کیپٹن محمد حسین نے اسے اور اس کے ساتھ چند اور جوانوں کو جو زیادہ زخمی نہ تھے حکم دیا کہ وہ کچھ دیر وہیں انتظار کریں جب اندھیرا ہو تو چپکے سے پیچھے چلے جائیں اور واپس جاکر کمپنی کمانڈر کو رپورٹ کریں۔ یہ کہہ کر وہ پھر بے ہوش ہوگیا۔ گھنٹے بعد اسے پھر کچھ ہوش آیا تو نذرالاسلام تاحال اس کے ساتھ بیٹھا تھا۔ کیپٹن محمد حسین نے اسے ڈانٹا کہ وہ واپس کمپنی میں کیوں نہیں گیا۔

سپاہی نے جواب دیا: ''صاحب بنگالی ضرور ہوں مگر بے غیرت نہیں۔ آپ کو چھوڑ کر کیسے جاتا''۔ پھر کیپٹن محمد حسین نے اسے کوئی مددگار بلانے کے لئے بھیجا تو وہ دس منٹوں میں تین آدمی ساتھ لایا جنہوں نے کپتان صاحب اور دوسرے زخمیوں کو محفوظ مقام تک پہنچایا۔ یہ تمام لوگ بنگالی تھے۔ کیپٹن محمد حسین نے اظہار تشکر کے طور پر اپنی وردی کا قیمتی غیر ملکی بیلٹ (Belt) اسے تحفے میں دیا۔

سپاہی نذرالاسلام پوری جنگ میں کمانڈو کمپنی کے ساتھ رہا۔ ہتھیار ڈالنے سے ایک دن پہلے اسے یونٹ کی طرف سے پانچ ہزار روپے دے کر حکم دیا گیا کہ چپکے سے بھاگ جائے اور اپنے لوگوں کے ساتھ مل جائے لیکن اس عظیم انسان نے یہ کہہ کر جانے سے انکار کر دیا: ''صاحب میں پاکستان کا سپاہی ہوں جو کچھ آپ کے نصیب میں ہے وہی میرے نصیب میں ہے۔ میں نہیں جاؤں گا'' لہٰذا وہ یونٹ میں ہی رہا اور دو سال بھارت میں قید کاٹی۔ واپس مغربی پاکستان آیا۔ جب حالات ذرا بہتر ہوئے تو اس نے اپنے عزیز و اقارب سے ملنے کے لئے واپس بنگلہ دیش جانے کی خواہش کی لیکن اس کی عرضی سرخ فیتے کی ایسی نذر ہوئی کہ وہ دفتروں کے چکر لگا کر تھک گیا۔ یہ درخواست منظور کرانے میں اسے ایک

سال سے بھی زیادہ عرصہ لگ گیا۔ افسوس کہ یہاں لوگوں نے اس کے ساتھ اچھا سلوک نہ کیا جس کا وہ مستحق تھا۔ اس سے زیادہ حب الوطنی شاید ممکن نہ ہو۔

دوسرا واقعہ میجر آصف ہارون کے ساتھ پیش آیا۔ جو 1971ء کی جنگ میں نمبر 4 فرنٹیئر فورس رجمنٹ میں کمپنی کمانڈر تھا۔ اس یونٹ نے "ھلی" کے محاذ پر 19 دنوں تک دشمن کے پورے ڈویژن کو ناکوں چنے چبوائے۔ میجر محمد اکرم شہید نشان حیدر اسی عظیم یونٹ کا عظیم فرزند تھا۔ میجر محمد اکرم کی شہادت کے بعد اس کمپنی کی کمان میجر آصف ہارون نے سنبھالی۔ انہوں نے "معرکہ ھلی" کے نام سے بعد میں اپنی یادداشتیں قلمبند کیں۔ انہی کی کتاب سے انہی کے الفاظ میں ایک ایسا ہی واقعہ پیش کیا جا رہا ہے جو یقیناً ہم سب کے لئے درس عبرت ہے۔ میجر آصف ہارون بریگیڈیئر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔

"ہم اپنے دفاع سے اتنے مطمئن تھے کہ ہمیں دشمن کی کسی بھی یلغار کی پروا نہ تھی۔ اچانک ہمیں 11 دسمبر 1971ء کو تقریباً 3 بجے سہ پہر بریگیڈ ہیڈ کوارٹر سے "کھیت لال" کے علاقے کی طرف پیچھے ہٹ کر مورچہ بند ہونے کا حکم ملا۔ یہ حکم میرے لئے بڑی حیرانی کا باعث تھا۔ کیونکہ دشمن کے تابڑ توڑ حملوں اور سرتوڑ کوشش کے باوجود 4 ایف ایف ھلی کے قلعے کی بلا شرکت غیرے پاسبان تھی۔ بسا اوقات ہم پیچھے بھی ہٹے لیکن ہر بار ایک نئی قوت کے ساتھ واپس بھی پلٹے۔ دشمن کی ہر نئی یلغار کو اپنے قدموں تلے روند ڈالا اور دشمن ہر بار ہمارے مقابلے میں ناکام و نامراد لوٹا۔ آخر تھوڑی سی سوچ بچار کے بعد یہ بات بھی سمجھ میں آ گئی کہ پیچھے ہٹنے کا حکم ناگزیر تھا کیونکہ ہر گزرتا ہوا لمحہ پاکستان لڑاکا دستوں کے درمیان خلاء کو مزید وسیع کر رہا تھا جس کا صرف ایک ہی

غزل

مزاجِ شمع میں کچھ ذوقِ پروانہ بھی ہوتا تھا
کسی کا نام اس محفل میں دیوانہ بھی ہوتا تھا
پریشاں حسرتوں کی بے نقابی دیکھنے والو!
اشاروں پر ہمارے رقصِ پروانہ بھی ہوتا تھا
جہاں الفت نبھانے کے حسیں اقرار ہوتے تھے
قریبِ شہر یارو! ایک ویرانہ بھی ہوتا تھا
یقینِ زندگی کو معتبر جس نے کیا ساغر
حقیقت کے صحیفوں میں وہ افسانہ بھی ہوتا تھا

"ساغر صدیقی" (روبینہ۔ لاہور)

نتیجہ نکلتا کہ دشمن ہمارے لڑاکا دستے کو انفرادی طور پر گھیر کر تباہ و برباد کرنے میں کامیاب ہو جاتا۔ چونکہ 11 دسمبر کی شام بہ امر مجبوری ھلی کو خالی کر دیا گیا اور دشمن کی ھلی پر قبضہ کی حسرت اس وقت پوری ہوئی جب 4 ایف ایف از خود وہاں سے کوچ کر چکی تھی اور یوں ھلی کی جنگ کا باب بھی اختتام پذیر ہوا۔

کھیت لال کا لمبا مارچ بہت ہی پُر خطر اور اعصاب شکن تھا۔ دشمن کے خطرناک حصار سے نکلنا بھی کسی معجزے سے کم نہ تھا۔ ہم نے رات کا انتظار کیا اور ہر کمپنی نے لڑتے لڑتے ایک مختلف محور پر باقاعدہ پس قدمی کرتے ہوئے دشمن کے گھیرے کو توڑا۔ یہ سفر رات کی تاریکی میں شروع ہوا۔ راستہ کٹھن بھی تھا اور اَن دیکھا بھی۔ کئی دنوں سے دشمن کے خلاف نبرد آزما رہنے والے جوان بے حد تھکے ہوئے تھے لیکن وہ بلا تامل اپنے کمانڈروں کے شانہ بشانہ چل رہے تھے۔ ان کے چہرے تروتازہ، حوصلے بلند اور جوان تھے۔ انہوں نے نئے جذبوں کے ساتھ نئی منزل مقصود کی طرف قدم بڑھائے اور تیس میل کا کٹھن سفر طے کر کے صبح سات بجے

کھیت لال کے قریب گاؤں کدوا پہنچے۔

راقم الحروف نے محسوس کیا کہ جوانوں نے رات کا کھانا بھی نہیں کھایا۔ خالی پیٹ ساری رات سفر میں رہے تھے۔ اس لئے کھانا اور آرام جوانوں کے لئے انتہائی ضروری تھا۔ چنانچہ میں نے اسی گاؤں کے قریب کمپنی کو آرام کرنے کا حکم دیا اور ان کے کھانے کے بارے میں سوچنے لگا۔ کدوا گاؤں کے لوگوں کو جونہی ہماری آمد کا علم ہوا تو انہوں نے جوق در جوق آگے بڑھ کر ہمارا پُر تپاک استقبال کیا اور ہماری خاطر و مدارات میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ ہم نے یہاں تقریباً دو گھنٹے قیام کیا۔ اس دوران اسی گاؤں کا ایک ساٹھ ستر سالہ بوڑھا بنگالی میرے پاس آیا اور اس نے جذبات سے لبریز آواز میں بتایا کہ اس گاؤں کے سب باشندے مسلمان ہیں اور تمام پاکستان سے محبت کرتے ہیں اور ان کے دلوں میں افواج پاکستان کی بھی بڑی عزت ہے۔ سفید لمبی داڑھی اور نورانی چہرے والے اس بزرگ نے مزید یہ بتایا کہ پاکستان کے حامی ہونے کی وجہ سے مکتی باہنی اور ہندوستانی فوج نے ان کے گاؤں پر بمباری کرنے کی دھمکی دی تھی۔ میں نے اسے اور گاؤں کے دوسرے لوگوں کو ہر ممکن طریقے سے تسلی دی، ان کے جذبات کو سراہا۔ گاؤں کے لوگوں نے ہم سے اپنی محبت کا بھرپور ثبوت دیا۔ بچے، جوان اور بوڑھے اپنے گھروں سے کھانے پینے کا جو سامان بھی انہیں ملا، ہمارے لئے لے آئے۔ کھانے میں گڑ چاول کی پھولیاں بھی تھیں اور چاول سالن بھی۔ ان لوگوں کا جذبہ اور محبت کا اظہار دیکھ کر میری آنکھیں بھیگ گئیں اور میں نے سوچا کہ حالات خواہ کچھ بھی ہو جائیں پاکستان کی محبت کو دلوں سے نکالا نہیں جا سکے گا۔ ان جیسے سچے، سادہ اور بے لوث مسلمانوں کے دلوں میں پاکستان ہمیشہ زندہ رہے گا۔

میرا جی چاہا کہ چھوٹے چھوٹے معصوم بچوں کو کچھ پیسے ہی دے دوں۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو صرف دس روپے نکلے۔ میرے دل کو ٹھیس پہنچی کہ جن بچوں نے ہماری محبت کا حق ادا کر دیا تھا انہیں دینے کے لئے میرے پاس صرف چند روپے تھے۔ ان روپوں کو میں نے ان بچوں میں تقسیم کر دیا۔ اسی اثناء میں گاؤں کے کچھ معزز لوگ بھی آ گئے اور انہوں نے سب نوجوانوں کو کھانے کی دعوت دی اور ایک بیل بھی ذبح کرنے کی اجازت چاہی۔ ہمارے پاس چونکہ وقت بہت کم تھا۔ ہمیں اپنی یونٹ سے ملنے اور نئے احکامات حاصل کرنے کی بھی جلدی تھی تاکہ ہمارا قومی مشن پایہ تکمیل تک پہنچ سکے۔ اس لئے میں نے ان سے دلی معذرت کرتے ہوئے جانے کی اجازت چاہی اور کدوا کے لوگوں نے ہمیں بمشکل جانے کی اجازت دی۔ سفید داڑھی والے وہ بزرگ جو اسلام اور پاکستان کی محبت سے سرشار تھے، راستہ بتانے کے لئے ہمارے ساتھ چل پڑے اور دو میل تک ہمارے ساتھ چلتے رہے۔ میں نے بڑی مشکل سے انہیں واپس بھیجا۔ کدوا کے لوگوں نے جو حسن سلوک ہم سے کیا اسے میں کبھی فراموش نہیں کر سکوں گا۔ میں سوچتا ہوں کہ کدوا جیسے نہ جانے کتنے گاؤں اور ہوں گے جن کی امیدوں اور خواہشات کا مرکز پاکستان تھا۔ ان لاکھوں لوگوں کے لئے میرا دل آج بھی تشکر کے جذبات سے لبریز ہے جو ہر قسم کے زہریلے پروپیگنڈے اور وطن دشمن عناصر کی دھمکیوں کے باوجود پاکستان اور افواج پاکستان کے نہ صرف حامی تھے بلکہ برملا اس کا اظہار بھی کرتے تھے''۔

اسی طرح غفار گاؤں نامی علاقے میں ایک مکتب تھا جس میں ایک نوجوان بنگالی عبدالمنان درس و تدریس کے فرائض سرانجام دیتا تھا۔ یہ بڑا جوشیلا مسلمان اور سچا محب وطن پاکستانی تھا۔ یہ سارا علاقہ ایک ہندو زمیندار کی ملکیت تھا جس کی علاقے میں بہت بڑی حویلی تھی۔ یہ شخص غریب بنگالی مسلمانوں کا خون نچوڑتا لیکن اس کی

تمام دولت کلکتہ کے بنکوں میں جمع تھی۔ کلکتہ میں بھی بہت بڑا بنگلہ تھا۔ اہلخانہ وہیں رہائش پذیر تھے۔ بچے بھی کلکتہ ہی میں زیر تعلیم تھے۔ یہ لوگ کبھی کبھی علاقے میں آتے تو غریب بنگالی مزارع ڈالیوں کی شکل میں تحائف پیش کرتے۔ اس شخص کو پاکستان کے ساتھ جو محبت ہو سکتی تھی اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ نوجوان عبدالسنان اکثر اسلام اور پاکستان کے حق میں بڑی جوشیلی تقریریں کرتا جو اس ہندو زمیندار کو قطعاً ناپسند تھیں۔ ایک دن اس ہندو زمیندار نے اس نوجوان کو بلایا اور یوں پاکستان کے حق میں بولنے کے لئے تنبیہ کی۔ اسے بتایا کہ اگر آئندہ اس نے ایسی کوشش کی تو نتائج کا خود ذمہ دار ہوگا۔ اسے مزید بتایا کہ پاکستان سے تمہاری مدد کے لئے یہاں کوئی نہیں آئیگا۔ نوجوان نے بے دھڑک جواب دیا: ”میرے لئے میرا خدا ہی کافی ہے“ پھر دوسرے ہی دن وہ مکتی باہنی کے ہاتھوں شہید ہو گیا۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون)

بریگیڈئیر سعد اللہ خان اس علاقے کا فوجی کمانڈر تھا۔ اسے جب پتہ چلا تو اسے بہت افسوس ہوا۔ وہ اس کے خاندان سے افسوس کے لئے اس کے گھر روانہ ہوا۔ اس کا گھر غفار گاؤں قصبے سے 17 میل دور تھا جہاں تک کسی قسم کی سڑک نہ تھی بلکہ ایک معمولی سا کچا راستہ تھا۔ بریگیڈئیر صاحب بائیسکل پر وہاں پہنچے۔ اس کا خاندان ایک چھوٹی سی کچی جھونپڑی میں رہائش پذیر تھا۔ بیوہ کے علاوہ والدین، ایک بھائی اور دو چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔ بریگیڈئیر صاحب نے فاتحہ پڑھی۔ بچوں کو پیار کیا اور اپنی جیب سے نقد امداد دی۔ یہ سارا علاقہ ”ہندی پاکستان“ تھا۔ یہ لوگ آخر تک پاکستان مخالف لوگوں سے لڑے۔ لڑتے لڑتے اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ یہ لوگ حب الوطنی کی زندہ مثال تھے۔

ایک دن تنگیل کے علاقے میں بریگیڈئیر سعد اللہ خان کے پاس ایک بوڑھا شخص آیا اور علیحدگی میں مل کر بتایا کہ وہ کچھ جوان اور ایک رائفل چاہتا ہے۔ تفصیل اس نے یہ بتائی کہ اس کا بیٹا ایسٹ بنگال رجمنٹ میں سپاہی تھا۔ 26 مارچ کو اس نے ایک مغربی پاکستانی کو شہید کیا اور بھارت بھاگ گیا۔ اب وہ بھارت سے کوئی نیا مشن لے کر دوبارہ اس علاقے میں آیا تھا۔ پیشتر اس کے کہ وہ یہاں کوئی نقصان کرے یہ بزرگ یعنی اس کا باپ اسے ختم کرنا چاہتا تھا۔ بہرحال اسے رائفل تو نہ دی گئی لیکن اس کے ساتھ کچھ جوانوں کی ایک پارٹی بھیجی گئی اور اس کے بیٹے کو پکڑ لیا گیا۔ اس نے ایک دفعہ پھر رائفل مانگی۔ جب رائفل نہ ملی تو اس نے پارٹی سے اپنے بیٹے کو اس کے سامنے گولی سے اڑانے کی خواہش ظاہر کی بہرحال اسے سب کے سامنے تو گولی نہ ماری گئی لیکن ہیڈ کوارٹر میں لا کر بند کر دیا گیا۔ پاکستان کے نام پر باپ بیٹے کو قتل کرنا چاہتا تھا، بھلا اس سے زیادہ حب الوطنی کیا ہو سکتی تھی؟ عظیم تھے یہ لوگ مگر افسوس کہ ہم ان کی حفاظت نہ کر سکے۔

ان کے علاوہ اور بھی لاکھوں لوگ تھے جنہوں نے پاکستان سے کھل کر حب الوطنی کا مظاہرہ کیا۔ اس سلسلے میں وہاں کی جماعت اسلامی۔ البدر اور الشمس رضا کار تنظیموں نے اپنی ہر چیز ملک کی سلامتی پر نچھاور کر دی۔ سب سے زیادہ نقصان بھی انہی لوگوں نے اٹھایا۔ جماعت اسلامی کے جناب طفیل محمد وہ واحد سیاسی لیڈر تھے جو اگلے مورچوں تک گئے اور اپنے جوانوں کی ہمت بندھائی لیکن شاید وقت ہمارے خلاف تھا۔ ہم میدان جنگ میں نہیں بلکہ میدان سیاست میں شکست کھا گئے اور ڈھاکہ ہمیشہ کے لیے ڈوب گیا۔ آئیں ہم سب مل کر ان عظیم محب وطن بنگالیوں کو اپنا خراج عقیدت پیش کریں جو مغربی پاکستانیوں کے ساتھ ساتھ اس پاک وطن پر قربان ہوئے۔

جب تک نہ جلیں دیپ شہیدوں کے لہو سے
کہتے ہیں کہ جنت میں چراغاں نہیں ہوتا

⭘⭘⭘

آنکھ والوں کے لئے عبرت ہے

ہماری ماں کے قاتل آپ ہیں۔آپ نے جو مال حرام اسے کھلایا، اسی کی وجہ سے اس کو کینسر ہوا ہے۔

نوید اسلام صدیقی

چند دن قبل چوبرجی چوک کے پاس عبد اللہ صاحب نظر آ گئے۔ میں نے کہا کہ آپ تو ایسے غائب ہوئے ہیں جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ کہنے لگے ایک لمبی داستان ہے، ان شاء اللہ اتوار کے دن آپ کے گھر حاضر ہوں گا اور جی بھر کے باتیں کریں گے۔

اتوار کے دن عبد اللہ صاحب میرے غریب خانہ پر تشریف لے آئے۔ پہلے میں اُن کا مختصر تعارف کرا دوں۔ عبد اللہ صاحب رہنے والے تو اوکاڑہ کے ہیں لیکن ساری زندگی لاہور میں گزری ہے۔ میں مئی ۷۵ء میں، اور عبد اللہ صاحب جولائی ۷۵ء میں مسقط پہنچے۔ میں فوج میں ملازمت کرتا تھا اور وہ محکمہ صحت میں ملازم تھے۔ ہماری ایک دوسرے سے واقفیت وہیں مسقط میں ہوئی۔

ہماری ملاقات کئی سال بعد ہو رہی تھی، ہم پرانی یادیں تازہ کرتے رہے۔ میں نے اُن سے پوچھا۔

"آپ کے دوست انور علی کا کیا حال ہے؟"

کہنے لگے۔ "خس کم جہاں پاک۔"

میں نے کہا۔ "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں آپ تو کہا کرتے تھے کہ وہ نورانی فرشتہ ہے۔"

کہنے لگے۔ "شیطان بھی تو ہزاروں برس سجدے

میں سرمارنے کے بعد گمراہ ہوگیا تھا۔ خدا تعالیٰ انسان کو بچائے آدمی کے لیے آج کے دور میں گمراہ ہونے کے بہت زیادہ امکانات ہیں۔

پانچ چھ ماہ قبل انور علی نے مجھے فون کیا، اور کہا کہ میں نے آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے، موت کا فرشتہ میرے سرہانے بیٹھا ہوا ہے آپ آج ہی میرے پاس آئیں، میں اُن کے بتائے ہوئے پتہ پر اُن کے پاس پہنچ گیا۔ قسم خدا کی اتنا ڈراؤنا، خوفناک اور منحوس چہرہ میرے سامنے تھا کہ دیکھنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔

انہوں نے بتایا کہ یہ میری بیٹی کا مکان ہے، بیچاری بیوہ ہوگئی ہے اور کراچی سے یہاں لاہور آگئی ہے۔ میں نے یہ مکان بیچنے کے لیے بنایا تھا، اس کو دے دیا ہے۔ میں نے کہا جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے آپ کے پانچ بیٹے ہیں وہ کدھر ہوتے ہیں۔ کہنے لگے میں نے سب کو مکان بنوا کر دیے، وہ اپنے اپنے گھروں میں اپنے بال بچوں کے ساتھ رہ رہے ہیں۔ کبھی کبھار ہی کوئی مجھے پوچھنے آتا ہے۔

دراصل وہ سب اتنے معروف ہیں کہ اُن کو اِدھر آنے کا وقت ہی نہیں ملتا۔ میں نے کہا وہ کس کام میں معروف ہیں؟ کہنے لگے ہر بیٹے کو میں نے اُس کی اپنی مرضی کا کاروبار شروع کرنے کے لیے جتنا پیسہ اُس نے مانگا دیا، سب کے کاروبار کامیاب رہے بلکہ ضرورت سے زیادہ ہی کامیاب ہوگئے۔

اُن کے پاس ہی اُن کا نواسہ بیٹھا ہوا تھا، انہوں نے اسے کچھ اشارہ کیا اور اُس نے اُن کے منہ میں دو چمچ پانی ڈالا۔ انہوں نے بتایا کہ اُن کے گردے جواب دے رہے ہیں، ہفتے میں ایک (یا دو) دفعہ جناح ہسپتال جاتا ہوں وہ گردوں کو واش کرتے ہیں۔ ڈاکٹروں نے کہا ہے کہ کسی بھی وقت آپ کی موت واقع ہوسکتی ہے۔ میں نے اپنے بچوں کو صورت حال سے آگاہ کر دیا ہے، وہ کہتے ہیں آپ بھی دعا کریں کریں ہم بھی دعا کر رہے ہیں۔

تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد وہ کہتے تھے کہ میں نے ایک ضروری بات کرنی ہے، لیکن پھر کوئی اور بات چھیڑ دیتے۔

میں نے کہا مجھے اجازت دیں کیونکہ دفتر والوں نے تاکید کی تھی کہ گاڑی کہیں اور جانی ہے اس لیے جلد واپس بھیج دیں۔ انہوں نے کہا کچھ دیر اور بیٹھتے، میں نے آپ سے ایک ضروری بات کرنی تھی، اگر آپ نے ضرور ہی جانا ہے تو جلد پھر آنا۔ میں نے کہا ضرور آؤں گا اور اُن کے گھر سے باہر نکل آیا۔

باہر گلی میں نسیم صاحب مل گئے، اُن کا مکان بھی قریب ہی ہے۔ نسیم صاحب سے میرا تعارف بھی انور علی ہی نے کرایا تھا۔ میں نے نسیم صاحب سے کہا انور صاحب کے بیٹے بہت بُرے نکلے ہیں۔ پانچ بیٹے ہیں، باپ بسترِ مرگ پر ہے لیکن ناخلف اولاد ملنے تک کی روادار نہیں۔ نسیم صاحب نے کہا کہ ایسی بات نہیں ہے۔ سب سے بڑا بیٹا جب بھی آتا ہے، آتے ہی بحث شروع کردیتا ہے کہ آپ نے ہم کو مالِ حرام کیوں کھلایا۔ جن لوگوں سے آپ نے رشوتیں لیں اب اُن کی بد دعائیں آپ کا پیچھا کر رہی ہیں، انور علی صاحب نے اُسے کہا ہے کہ میرے سامنے نہ آیا کرو، جب بھی تم آتے ہو، آتے ہی الٹی سیدھی باتیں شروع کردیتے ہو۔ بیٹا نمبر دو جب بھی آیا وہ کہتا تھا کہ ہماری ماں کے قاتل آپ ہیں۔ آپ نے جو مالِ حرام اسے کھلایا، اسی کی وجہ سے اس کو کینسر ہوا ہے۔ اُس کا آنا جانا بھی خود انور علی صاحب نے بند کرایا ہے۔ بس ایسے ہی کچھ قصے ہیں جن کی وجہ سے وہ بچے نہیں آتے۔ یہ عذابِ الٰہی بھی ہوسکتا ہے کہ جس اولاد کے لیے مالِ حرام حاصل کرتے رہے وہی آخر میں دغا دے گئی۔ نسیم صاحب نے کہا کہ انور علی تو ڈاکٹروں کے مطابق ایک زندہ لاش ہے، کسی وقت بھی ہارٹ فیل ہوسکتا ہے۔

نسیم صاحب نے مجھ سے میرا موبائیل نمبر مانگا، میں نے نمبر اُن کو دے دیا۔

چند دن قبل نسیم صاحب کا فون آیا انہوں نے بتایا کہ آپ کے دوست انور علی کا انتقال ہوگیا ہے، جنازہ رات کو بارہ بجے کے قریب پڑھا گیا۔ مرنے کے بعد منہ کے راستے گندگی خارج ہونا شروع ہوگئی، جس کی وجہ سمجھ نہیں آرہی تھی، عجیب قسم کی بدبو دور دور تک آرہی تھی۔ کئی لوگ کہہ رہے تھے کہ جو حرام کھایا ہے وہ باہر نکل رہا ہے۔ خدا ایسی موت کسی کو نہ دے۔

☆☆☆☆☆

میں نے کہا مسقط میں جب تک ہم رہے ہیں، آپ نے ہمیشہ ہر ملاقات میں انور علی کو نورانی فرشتہ کہا، ہمیشہ اُس کی تعریف کرتے رہے آخر یہ چکر کیا ہے؟ آپ تو کہا کرتے تھے کہ آج کے دور میں ایسا آدمی کم ہی نظر آتا ہے۔ مجھے یاد ہے آپ نے بتایا تھا کہ انور علی صاحب نے بی کام کرنے کے بعد ایک چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ کے ساتھ تین سال گزارے تھے اور آرٹیکل شپ مکمل کرلی تھی۔ لیکن جب اُن کو معلوم ہوا کہ چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ لوگوں کے حسابات میں ہیر پھیر کرکے ان کا انکم ٹیکس کم کروادیتے ہیں تو انہوں نے اس کو ناجائز سمجھا اور ایک معمولی نوکری کرلی۔

عبداللہ صاحب نے کہا کہ شاید اس کے بعد کے حالات میں نے آپ کو نہیں بتائے۔ کچھ عرصہ کے بعد انور صاحب کو ایک سرکاری ادارے میں ملازمت مل گئی تھی، وہاں اوپر سے نیچے تک ہر ایک رشوت کھا رہا تھا، افسروں نے کہا کہ تم بے شک رشوت نہ لو لیکن ہمیں ہمارا حصہ لاکر دو، کئی اور بھی ایسے نیک کلرک تھے جو رشوت نہیں لیتے تھے لیکن افسروں کے لیے رشوت جمع کرکے باقاعدگی سے اُن کے گھر پہنچا دیتے تھے۔ کسی آدمی نے حضرت کو مسئلہ بتایا کہ جو رقم کوئی اپنی خوشی

عاجزی

جس انسان نے رب کے سامنے جھکنا سیکھ لیا وہی علم والا ہے کیونکہ علم والے کی پہچان عاجزی اور جاہل کی پہچان تکبر ہے۔ (نسیم سکینہ صدف)

سے دیتا ہے وہ جائز ہوتی ہے جو مانگی جائے وہ ناجائز ہے۔ انہوں نے یہ فتویٰ کئی لوگوں سے ڈسکس (Discuss) کیا۔ کم ہی لوگوں نے تائید کی لیکن وہ کہتے تھے کہ میرا دل کہتا ہے کہ یہ جائز ہے، میرا ضمیر بالکل مطمئن ہے، اگر یہ رزق حرام ہوگا تو وقت خود ہی ثابت کردے گا۔

کچھ عرصہ بعد حضرت رگڑے میں آگئے، کئی سال سروس معطل رہی، اپیل چلتی رہی، آخر کئی لاکھ رشوت دے کر نوکری بحال کروائی۔ اب انہوں نے پچھلی کسر نکالنی شروع کی۔ ایک آدمی کے ساتھ مل کر پراپرٹی کا کاروبار شروع کردیا، مجھے کہتے تھے یہ واحد کاروبار ہے جس میں کم سے کم سو فیصدی منافع لازمی ہے۔ اُن کی باتیں سن سن کر میں نے بھی مسقط سے کمایا ہوا کافی پیسہ اُن کی نذر کردیا۔ انسان جب ایک دفعہ حرام کو حلال کرلیتا ہے تو پھر اپنے پرائے کا کوئی خیال نہیں رہتا، انور علی مجھ سے بھی فراڈ کرنے سے باز نہ آیا۔

اب جو وہ یہ کہتا تھا کہ میں نے آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے وہ غالباً یہی تھی کہ اُس نے میرا جو پیسہ ہضم کرلیا ہے وہ میں معاف کردوں، لیکن وہ ڈر بھی رہا تھا کہ کہیں میں وہ پیسہ مانگ ہی نہ لوں۔ اللہ تعالیٰ ہر ایک کو رزقِ حرام سے بچائے۔

شام تک عبداللہ صاحب میرے پاس رہے پھر چلے گئے۔

سر اٹھا کے جیو!

☆ قیصر عباس

اُٹھا کے جینے کی دشمن سوچوں کے خلاف آپریشن سر ضروری ہے۔ ایسی منفی سوچیں سب کچھ ہوتے ہوئے آپ سے سر اٹھا کے جینے کا حق چھینے رکھتی ہیں۔

ان زہریلی سوچوں کی خواہشوں کا محور و مرکز تو دراصل آپ کو سر جھکا کر جینے کی ترغیب دینا ہے لیکن اگر ٹھان لے تو ہم میں سے کوئی بھی اپنے خلاف اس سازش کو ناکام بنا سکتا ہے۔

زہریلی، آلودہ اور دشمن سوچوں کی پہچان کر کے انہیں گرفتار کرنا، اُن کے خلاف مقدمات قائم کرنا، انہیں سزا دلوانا اور اُن سزاؤں پر عمل درآمد کروانا آپ کا فرض ہے۔ ان دشمن سوچوں کے پیچھے کھوج چھوڑتے وقت یہ جان لیجیے کہ کون سی چیزیں، واقعات اور حالات ان سازشی سوچوں کو پروان چڑھاتے ہیں؟ اپنے بارے میں آپ کے زہریلے خیالات اور ذلت آمیز احساسات کہاں سے جنم لیتے ہیں۔

اپنے بارے میں آپ کی سوچ کیسی ہے؟

خود کے بارے میں آپ کے احساسات و جذبات کو آپ کیا نام دیں گے؟

اپنی سوچوں اور احساسات کو نظر انداز کرنے کا فائدہ نہیں۔ انہیں توجہ دیجیے، پہچانیے، سمجھیے، جانیے، پرکھیے اور جائزہ لیجیے کہ دوست اور دشمن احساسات کی نیت میں کتنا فرق ہے۔

آپ کبھی بھی کسی واقعے کی وجہ سے پریشان یا اداس نہیں ہوتے۔ دراصل اس واقعے کے بعد آپ کے اندر شروع ہونے والے ڈائیلاگ، جملوں کے تبادلے، سوچیں اور خود کلامیاں آپ کو پریشان کرتی ہیں۔ آپ کو کسی واقعے کے بعد اٹھ کے کھڑے ہونا ہے یا نڈھال ہو کے گر جانا ہے اس کا فیصلہ آپ کے ذہن میں چلنے والے مکالموں سے ہوتا ہے۔

فرض کریں کسی نے آپ کو برا بھلا کہا لیکن آپ کو اس کا علم نہیں ہوا۔ اس لئے آپ اس بارے میں پریشان نہیں ہوئے لیکن جیسے ہی آپ کو یہ بات پتہ چلی آپ فوراً پریشان ہو گئے۔ آپ کا اعتماد کم ہونا شروع ہو گیا۔ آپ نے اس بات کو دل پہ لگا لیا جس سے آپ کی کارکردگی متاثر ہونے لگی۔

سچ تو یہ ہے کہ پریشان ہو کے آپ نے ثابت کر دیا کہ دوسرے آپ کے بارے میں جو سوچتے ہیں وہ اس سے کہیں اہم ہے جو آپ خود کے بارے میں سوچتے ہیں۔ تو پھر آپ کی زندگی میں کس کی رائے زیادہ اہم ہے؟ خود کے بارے میں آپ کی اپنی رائے یا دوسروں کی؟

اس طرح کی سازشی سوچیں، حقیقت کو توڑ مروڑ کر آپ کے سامنے پیش کرتی ہیں۔ آپ کے "اموشنز" سے کھیلتی ہیں۔

فرض کریں آپ دفتر میں کام کر رہے ہیں۔ آپ کے پاس سے آپ کا باس گزرتا ہے اور آپ کی طرف دیکھتا نہیں یا سلام نہیں کرتا۔ اس واقعے کے بعد آپ خود سے کیا کہیں گے؟

"اُس نے مجھے جان بوجھ کے نظر انداز کیا؟"

"باس کی نگاہوں میں میری کوئی اہمیت نہیں؟"

"ظاہر ہے باس کے پاس مجھ سے بات کرنے سے زیادہ اہم چیزیں ہیں۔"

"میں اس لائق ہی نہیں کہ باس مجھے توجہ دے؟"

ادھر ان میں سے کسی سوچ نے آپ کے ذہن میں جگہ بنائی، اُدھر پڑ گیا آپ کو پریشانی یا ڈپریشن کا دورہ۔ اس واقعے کے بعد آپ کے ذہن میں کیا چل رہا ہوگا؟

غصے کا زور؟

نفرت کی بھرمار؟

بے اعتمادی کا ٹریلر؟

خود کے فضول، بے کار ہونے کی سوچ؟

ہو سکتا ہے آپ کا دل آپ کو احتجاج پہ اکسا رہا ہو۔ آپ کے غصے کا رُخ خود اپنی طرف مڑ جائے، آپ دل میں باس کو برا بھلا کہنا شروع کر دیں۔ باس کے اس رویے کا الزام کسی ساتھی ورکر پہ لگا دیں۔ آپ سوچیں باس کے اس رویے کے پیچھے گزشتہ ہفتے رُونما ہونے والا فلاں واقعہ ہو سکتا ہے۔

اب اصل سوال یہ ہے کہ آپ اپنے باس کو کتنی اچھی طرح جانتے ہیں؟ کیا واقعی اس نے ایسا جان بوجھ کر کیا ہوگا؟

ہو سکتا ہے آج باس کا برا دن چل رہا ہو۔ ہو سکتا ہے اس نے سچ مچ آپ کو دیکھا ہی نہ ہو۔ ہو سکتا ہے اسے کوئی بہت بھیانک خبر ملی ہو۔ ہو سکتا ہے وہ کسی پریشانی کی وجہ سے گہری سوچوں میں گم ہو۔

آپ کو ان میں سے کسی بھی بات کا علم نہیں ہے۔

میرا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ زندگی میں کسی واقعے کا کوئی مطلب نہیں ہوتا سوائے اس مطلب کے جو آپ اسے دیتے ہیں۔

آپ کے ساتھ جو کچھ ہوتا ہے اس کے ساتھ کیا معنی وابستہ کرنے ہیں اس کا اختیار صرف آپ کے ہاتھ میں ہے۔ آپ کسی واقعے کے ساتھ جو معنی وابستہ کریں گے وہی آپ کی ذہنی، جسمانی اور جذباتی کیفیت کے ذمہ دار ہوں گے۔

اپنے اندر کی آوازوں کو کھلے عام مت چھوڑیئے۔

اپنی خودکلامیوں پر کڑی نگاہ رکھئے۔ اس لئے کہ اندر کی آوازیں آپ کی عزت نفس کی ایسی کی تیسی پھیر سکتی ہیں۔ یہی آوازیں آپ کی خوداعتمادی کو تباہ کرنے کی طاقت رکھتی ہیں۔

اپنے اندر کی سازشی آوازوں کے خلاف آپریشن کرنے سے پہلے ان کی صحیح شناخت ضروری ہے۔ ایسا نہ ہو اس آپریشن میں آپ "دوست آوازوں" کو بھی دبا دیں۔

اپنے ذہن کے خانوں میں گونجنے والی منفی آوازوں کے ڈائیلاگ سے ہم سبھی تنگ تو آ جاتے ہیں لیکن یہ نہیں جان پاتے کہ انہیں کنٹرول کرنے کا طریقہ کیا ہے؟ سیکھنا چاہتے ہیں؟ یہ سیکھنا کیوں ضروری ہے؟ چلئے ایک بار دوہرا دیتا ہوں کہ آپ کے ساتھ پیش آنے والا کوئی واقعہ نہیں بلکہ اس واقعے کے بعد کی آپ کی "سازشی سوچیں" آپ کو پریشان اور ہلکان کرتی ہیں۔ ان سوچوں کا سراغ لگاتے ہوئے ہوسکتا ہے آپ حیرت سے شرمندہ ہوں یہ جان کر کہ آپ کا اپنے ساتھ رویہ کتنا درشت، تکلیف دہ اور غیر مناسب ہے۔

آپ کے ذہن میں پروان چڑھنے والی سازشی سوچوں کو 13 گروہوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں آپ کی شخصیت کے اعتماد پر خودکش حملے کرنے والی سوچیں رفتہ رفتہ 13 قبیلوں میں تقسیم ہو چکی ہیں۔

دشمن سوچوں کے پہلے قبیلے کا نام ہے

"مفروضے"

"فرض کر لینا" سازشی سوچوں کی سب سے بڑی چال ہے۔ ساری منفی فکر انہی غیر حقیقی مفروضوں سے جنم لیتی ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ آپ کے تمام مفروضے خود کو پچھاڑنے والے، گرانے والے، دبانے والے اور مار مکانے والے ہوتے ہیں۔ آپ صورت حال کی مکمل تصویر دیکھے بغیر اپنے طور پر مفروضے قائم کرتے ہیں جو اکثر اوقات منفی سوچ پر مبنی ہوتے ہیں۔ ان مفروضوں کا فوکس ہمیشہ تصویر کے تاریک ترین بلکہ بدترین پہلو ہی بنتے ہیں۔ بدترین کے تصور کے بعد خوش کون رہ سکتا ہے؟ ان مفروضوں کو پرکھنے کی زحمت آپ گوارا نہیں کرتے۔ آپ نے جو فرض کر لیا چاہے اس کی کوئی دلیل، وضاحت، گواہی یا ثبوت ہو نہ ہو، آپ پہ تو جیسے اپنے مفروضوں پر ڈٹے رہنا فرض ہوگیا ہے۔

اگر فرض ہی کرنا ہے، وہ بھی بغیر ٹھوس ثبوت یا شواہد کے تو پھر آپ کچھ اچھا فرض کیوں نہیں کر لیتے؟ اچھا فرض کیا تو سازشی سوچوں کے حربے بے اثر ہو جائیں گے۔ خودکش جیکٹ بے کار ہو جائے گی۔ آپ کی شخصیت کی دھجیاں اڑنے سے بچ جائیں گی۔

کسی نے آپ کو لفٹ نہیں کروائی اور آپ نے بغیر حقائق جانے سمجھ لیا کہ وہ آپ کو ناپسند کرتا ہے، اسے آپ سے چڑ ہے، وہ آپ کا دشمن ہے؟ آپ اپنے مفروضوں کو ٹیسٹ کرنے کا فیصلہ کیوں نہیں کر لیتے؟

وعدہ کریں آئندہ جب بھی آپ کچھ 'فرض' کریں گے آپ پہ فرض ہے کہ اس کو حقائق کی کسوٹی پر پرکھیں۔ اپنے باس کے پاس جائیں اور پوچھیں۔ "باس! آپ میرے پاس سے گزر گئے، مجھے ہیلو تک نہیں کہا۔ کیا مجھ سے کوئی غلطی ہوگئی ہے یا آپ میرے کسی کام سے ناخوش ہیں؟"

جعلی مفروضوں پہ مبنی، غیر حقیقی، خود کو کچلنے والے خیالات کو چیلنج کیجئے۔ ان مفروضوں کو کھلے عام بتا دیجئے کہ آئندہ ان کی من مانی نہیں چلے گی۔ انہیں اپنے ہونے کا ثبوت دینے کے لئے کئی 'ٹیسٹ' پاس کرنے پڑیں گے۔ ہوسکتا ہے سازشی گروہ آپ کی بیداری دیکھ کر ویسے ہی اپنا بوریا بستر گول کر لے۔

اچھا بتائیے اگر آئندہ کبھی اس قسم کے مفروضوں

نے آپ کے ذہن میں گھسنے کی کوشش کی تو آپ کیا کریں گے؟

''مجھے پتہ ہے میرا آئیڈیا کسی کو پسند نہیں آئے گا''۔

''مجھ سے اس پراجیکٹ میں غلطیاں نہ ہوں یہ کیسے ممکن ہے؟''

''میں جانتی ہوں سب مجھ سے نفرت کرتے ہیں''۔

''میں جتنا مرضی بن سنور لوں، مجھے کوئی نوٹس بھی نہیں کرے گا''۔

''اس مقابلے میں اتنے بڑے بڑے آرٹسٹ آ رہے ہیں، میری دال وہاں نہیں گلے گی''۔

''میرا ترقی کا کوئی چانس نہیں ہے''۔

آئندہ ان میں سے کسی مفروضے نے سر اٹھایا تو آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس کا سر کیسے کچلنا ہے؟ بغیر ٹیسٹ کے کسی مفروضے کی بات پر کان نہیں دھرنے ہیں، سازشی سوچوں کو بے نقاب کرنا ہے۔

سازشی سوچوں کے دوسرے قبیلے کا نام ہے ''بات کا بتنگڑ''

اس سے مراد ہے بات کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنا۔ ایک معمولی سے واقعے کو زندگی کے ہر پہلو پر حاوی کر لینا۔ کسی ایک کی غلطی پر سبھی کو قصوروار سمجھنے لگنا۔ بات کو بتنگڑ بنا کر ہم کسی چھوٹی سی بات کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنے رُکے رہنے کی وجہ بنا لیتے ہیں۔

''مجھے ہمیشہ شکست ہی ہوتی ہے''۔

''مجھ سے ہر کام میں غلطیاں ضرور ہوتی ہیں''۔

''ہر کوئی مجھ سے نفرت کرتا ہے''۔

''سبھی سمجھتے ہیں کہ میں بے وقوف ہوں''۔

''میں کبھی کوئی اچھا کام نہیں کر سکتی''۔

اوپر کی مثالوں میں ''ہمیشہ''، ''ہر کام میں''، ''ہر کوئی''، ''سبھی''، ''کبھی'' کے الفاظ بات کو بتنگڑ بنانے کی سازشیں ہیں۔ اس قسم کی سوچوں کے ہوتے ہوئے کس کا مورال بلند ہو سکتا ہے؟ ایسی سوچوں کی موجودگی میں بھلا سر اٹھا کر کون جی سکتا ہے؟

میں آپ کو چیلنج کر کے کہتا ہوں کہ آپ کی زیادہ تر سازشی سوچیں غلط، نامکمل، جھوٹی، اور بے سر و پا ہیں۔ یہ سوچیں انصاف پہ مبنی نہیں ہیں۔ ان ڈائیلاگز کے پیچھے کسی قسم کی تحقیق نہیں ہوتی۔ بس جو منہ میں آیا کہہ دیا۔ آپ کا فرض ہے کہ ان الفاظ کو چیلنج کریں۔

مثلاً اگلی بار جب آپ کی سازشی سوچ کہے کہ ''میں ہر کام میں غلطیاں کرتا ہوں'' تو آپ پوچھیں۔

''ہر کام میں؟''

''کیا میں ہر ایک کام میں واقعی غلطیاں کرتا ہوں؟''

''کیا غلطی کئے بغیر میں نے آج تک کبھی کوئی کام نہیں کیا؟''

''اس لمحے کے بارے میں کیا خیال ہے؟ کیا اس وقت بھی میں کچھ غلط کر رہا ہوں''

اگر آپ سے ''ہر کام'' غلط نہیں ہوتا تو پھر یہ بیان غلط ثابت نہیں ہو گیا؟ اس بیان کی تردید کر کے آپ نیا بیان کچھ اس طرح کیوں جاری نہیں کر دیتے کہ ''اگرچہ ایک آدھ بار مجھ سے کھانا خراب ہوا ہے لیکن مجموعی طور پر میں ایک اچھا شیف ہوں''۔

تیسرا سازشی گروہ ''چاہیے'' کی بیماری کا وائرس پھیلاتا ہے

کیا آپ اکثر خود سے کہتے ہیں کہ ''مجھے ایسا ہونا

چاہئے، مجھے ویسا ہونا چاہئے''۔ جب کبھی آپ کے ذہن میں اس قسم کی سوچ آئے تو اس کا مطلب ہے کہ فی الحال جیسا آپ کو ہونا چاہئے، آپ ویسے نہیں ہیں۔ یا جو آپ کو کرنا چاہئے، آپ وہ نہیں کر رہے۔

''مجھے اپنا وزن کم کرنا چاہئے''۔

''مجھے زیادہ دوست بنانے چاہئیں''۔

''مجھے اپنی آمدنی بڑھانی چاہئے''۔

''مجھے اپنی صحت پر زیادہ توجہ دینی چاہئے''۔

''مجھے غصے پر کنٹرول کرنا چاہئے''۔

'چاہئے، چاہئے، چاہئے' کی بھرمار زندگی کو الجھنوں سے بھر دیتی ہے۔ ''مجھے کیا کیا کرنا چاہئے'' کے بارے میں سوچ سوچ کے خون سوکھتا ہے۔ ہر ''چاہئے'' کے بعد کبھی خود پہ غصہ آتا ہے، کبھی دوسروں پہ۔ کبھی فرسٹریشن ہوتی ہے تو کبھی اپنی کم مائیگی کا احساس۔ کبھی اپنی صلاحیتوں پر شک گزرنے لگتا ہے تو کبھی ناامیدی جڑ پکڑنے لگتی ہے۔ کبھی اپنے وجود سے ہی چڑ ہونے لگتی ہے۔

آپ خود کو ناکام و نامراد سمجھنے لگتے ہیں۔ اپنی ذات کے بارے میں آپ کے خیالات مرجھانے لگتے ہیں۔ خوداعتمادی دُم دبا کر بھاگنے لگتی ہے۔ چاہئے، چاہئے، چاہئے کی تکرار کے بعد لگتا ہے کہ ابھی تک آپ نے زندگی میں کیا کرایا کچھ نہیں ہے۔

''چاہئے'' بتاتا ہے کہ ابھی جس کا کام آپ سوچ رہے ہیں وہ نامکمل ہے۔

اس مسئلے کا حل سادہ ہے۔ بہت ہی سادہ۔ ''چاہئے'' کو ''چاہتا ہوں'' سے بدل دیجئے۔ یہ کہنے کی بجائے کہ ''مجھے اپنی بیوی سے تعلقات مضبوط بنانے چاہئیں'' یہ کہہ کے دیکھیں کہ ''میں اپنی بیوی سے مضبوط تعلقات بنانا چاہتا ہوں''۔

''میں اپنے بچوں کو زیادہ وقت دینا چاہتا ہوں''۔

''چاہئے'' میں ایک کسک ہے، ایک قسم کی ہار ہے، ایک شرمندگی ہے۔ ''میں چاہتا ہوں'' میں عزم ہے، ارادہ ہے، مقصد ہے، کمٹمنٹ ہے۔

اس سے بھی بہتر یہ ہوگا کہ چاہئے کی بجائے ''میں کیسے کرسکتا ہوں'' کہہ کر دیکھئے۔

''میں اپنے شعبے میں ترقی کیسے کرسکتا ہوں؟''

''میں زیادہ دوست کیسے بنا سکتا ہوں؟''

''میں آمدنی میں اضافہ کیسے کرسکتا ہوں؟''

''میں اپنا وزن کم کیسے کرسکتا ہوں؟''

''میں اپنا غصہ کیسے قابو میں لاسکتی ہوں؟''

''میں دوسروں کے دل کیسے جیت سکتی ہوں؟''

بات سمجھ میں آرہی ہے؟

کس طرح لفظوں کے ذرا سے ہیر پھیر سے آپ اپنی سازشی سوچوں کے سارے ہتھیار ناکارہ بنا سکتے ہیں۔

چوتھا سازشی گروہ ''لیبل'' لگانے کا ماہر ہے

کیا بچپن میں کبھی کسی نے آپ کا کوئی الٹا سیدھا نام ڈالا جس سے آپ کو چڑ ہوتی تھی؟ اس ''نِک نیم'' کو ہی لیبل کہتے ہیں۔

کیا کبھی آپ نے کسی کو نیچے لکھے ہوئے ''القابات'' سے نوازا ہے؟

تنک چڑھا، فراڈیا، کنجوس، نکما، شرمیلا، جھوٹا، موڈی، خودسر، ضدی، محنتی، سخی، لڑاکا، خوش اخلاق، منہ زور، حاسد، کمینہ، آوارہ، رومانٹک، ملنسار، جھگڑالو، ہنس مکھ وغیرہ وغیرہ''۔

کیا کبھی کسی نے آپ کے لئے ان میں سے کوئی ''لقب'' استعمال کیا ہے؟

کیا ابھی تک ان میں سے کسی ''لیبل'' سے جان چھڑانا آپ کو مشکل لگتا ہے؟ اگر کوئی اس پرانے ''لیبل''

سے آپ کو یاد کرے تو کیا اب بھی غصہ آتا ہے؟
ان سے کہیں خطرناک لیبل وہ ہیں جو سازشی آوازیں آپ کے ماتھے پر آویزاں کر دیتی ہیں۔ کیا آپ نے کبھی خود سے خود کو کہتے سنا ہے کہ:
''میں ایک ہارا ہوا شخص ہوں''
''میں بے وقوف ہوں''
''میں بے وقعت ہوں''
''میں مِس فٹ ہوں''
''میں بزدل ہوں''
''میں بھگوڑا ہوں''
''میں بدھو ہوں''
''میں پینڈو ہوں''
''میں سُست ہوں''
''میں بدقسمت ہوں''
''میں ناسمجھ ہوں''
''میں بدصورت ہوں''
''میں بوجھ ہوں''
ان ''لیبلز'' کی قید سے خود کو آزاد کرانے کا وقت آن پہنچا ہے۔ خبردار! اپنے اوپر اس قسم کے ''سائن بورڈ'' آویزاں مت کیجئے۔ پہلے سے موجود سائن بورڈ اتار کے پھینک دیجئے۔ ان کی بجائے ایسے لیبل اپنے اوپر سجایئے جو سر اٹھا کے جینے کو آسان بنائیں۔

پانچواں دشمن قبیلہ ''تعریف کی تردید'' کا دلدادہ ہے

''آپ نے تو آج کمال کر دیا''
''یہ کام بس آپ ہی کر سکتے تھے''
''شاندار! چھا گئے ہیں آپ''
''بہت اعلیٰ! آپ نے تو سب کو حیران کر دیا''
اس قسم کی باتوں کے جواب میں عموماً آپ کا ردِ عمل کیا ہوتا ہے؟''
''یہ تو کوئی بھی کر سکتا ہے''
''آپ میرا دل رکھنے کے لئے کہہ رہے ہیں؟''
''میں اس لائق کہاں؟''
''نہیں جناب، میں نے ایسا کچھ نہیں کیا''
''اس میں کون سی بڑی بات ہے''
''تعریف کی تردید'' کرنا اپنے خلاف سازش سے کم نہیں ہے۔ اپنے لئے تعریف کے الفاظ سننے کے بعد آرام سے ''شکریہ'' کہنے میں کیا مشکل ہے؟ لیکن اندر بیٹھا ناقد بڑی ڈھٹائی سے تعریف کو مسترد کر کے آپ پر یہ ثابت رکنا چاہتا ہے کہ آپ تعریف کے لائق نہیں۔ اپنے بارے میں مثبت باتوں کو نظر انداز کرنے کی عادت کبھی آپ کا اعتماد بحال نہیں ہونے دیتی۔
کیا کمال سٹریٹجی ہے کہ دوسروں کی منفی، دل دکھانے والی، ہمت توڑنے والی، حوصلہ شکن باتوں کو تو من وعن بغیر چیلنج کیے سچ مان کر دل پہ لگا لیا جائے لیکن تعریف کے بول سنے اَن سنے کر دیئے جائیں۔
اپنے بارے میں اچھی باتوں کو رد کرنا عزتِ نفس کو کھوکھلا کرنے کی شروعات ہیں۔ جب بہت سے بڑے بڑے لیڈرز اور اداروں کے سربراہوں کی کامیابیوں کو سراہا جاتا ہے تو اُن کے لئے یہ کہنا جائز ہے کہ:
''اس میں میرا کوئی کمال نہیں''
''یہ ٹیم ورک کا نتیجہ ہے''
''یہ کون سی بڑی بات ہے''
کیونکہ وہ پُراعتماد، کامیاب اور مانے ہوئے کھلاڑی ہیں۔ جبکہ آپ ابھی کامیابی کی پہلی سیڑھی پر ہیں۔ اعتماد، تعریف، عزتِ نفس اور حوصلہ آپ کے لئے ''آکسیجن'' کی طرح ہے۔ اگر آپ اپنی کامیابی کا ''کریڈٹ'' لینے سے انکار کر دیں گے تو اعتماد کہاں سے

بڑھے گا؟ شخصیت کے جوہر کیسے نکھریں گے؟ صلاحیتوں کو جلا کہاں سے ملے گی؟ پُراعتماد رکھنے کی آرزو کیسے پوری ہوگی؟

آج کے بعد آپ کے کام کی سچی تعریف ہو تو کھلے دل سے اُسے قبول کریں۔ تعریف کرنے والے کے ''شاباش کے انجکشن'' کو ضائع ہونے سے بچائیں۔ تعریف کے کلمات کہنے والے کے ممنون نظر آئیں۔ تعریف کو قبول کریں، اس کی قدر کریں اور اسے خود اعتمادی کی عمارت میں ایک اینٹ کا درجہ دریں۔

چھٹا زہر آلودہ تیر پھینکنے والے قبیلے کو ''مسٹر پرفیکٹ'' کہتے ہیں

کیا آپ اُن لوگوں میں سے ہیں جو ہر چیز کو ''پرفیکٹ'' دیکھنا چاہتے ہیں؟ جن کو ہر چیز، ہر وقت، ہر حال میں جیسے وہ چاہتے ہیں ویسے ملنی چاہئے، نہیں تو وہ کبھی خود سے خوش نہیں ہوں گے؟ کیا آپ کو اپنے آگے ایسے اونچے رسے لگانے کی عادت ہے جنہیں آپ کبھی پھلانگ ہی نہ پائیں؟

''میں مان ہی نہیں سکتا کہ ایسا ہوا ہوگا؟''

''ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟''

''یہ زیادتی ہے''۔

''اس کے بعد وہ ہنسی خوشی رہنے لگے'' صرف پریوں اور شہزادوں کی کہانیوں میں ہوتا ہے۔ یہ دنیا پرفیکٹ نہیں ہے۔ نہ ہی آپ، نہ ہی آپ کے آس پاس بسنے والے لوگ اور نہ ہی اردگرد کی کوئی اور چیز۔ اگر معاملے میں ''پرفیکٹ'' سے کم پر آپ کا خون کھولے تو یہ اپنے ساتھ کھلی زیادتی ہے۔ میں مانتا ہوں اپنے فن کے اظہار کے معاملے میں آپ کو ''پرفیکشن'' کی جستجو ضرور کرنی چاہئے۔ فن کے معاملے میں سمجھوتا بددیانتی ہے۔ مگر زندگی کے ہر معاملے میں، ہر چھوٹی بڑی چیز میں پرفیکشن ڈھونڈنا سعی لاحاصل اور افسردہ رہنے کی گارنٹی ہے۔

پرفیکشن کا بخار آپ کو ''فرسٹریشن'' سے قریب کر دے گا۔ ہر روز آپ کی امیدیں ٹوٹیں گی۔ خود سے وابستہ توقعات کبھی پوری نہ ہوں گی۔ مان لیجئے کہ آپ کا ہر کام 'پرفیکٹ' کبھی ہو ہی نہیں سکتا۔ آپ انسان ہیں۔ خود کو انسان ہی رہنے دیجئے۔ پرفیکشن کی بیماری آپ کی خود اعتمادی کی بنیادیں ہلا دے گی۔

اپنی چھوٹی موٹی کامیابیوں کو بھی اہمیت دیجئے۔ خود کے کاندھے پر تھپکی دیجئے۔ خود کو شاباش کے انجکشن لگاتے رہئے اور جب توقعات پوری نہ ہو رہی ہوں تو سازشی آوازوں کی بجائے، دوستانہ آوازوں کا والیم اونچا کر کے خود سے کہیے ''اس صورت حال میں بہتری کے لئے میں کیا کرنا چاہتا ہوں؟ اور پھر اُسے کر گزریئے۔

ساتویں دشمن قبیلے کا کام ہے ''الزام تراشی''

''الزام تراشی'' گروہ حالات بگڑنے پر ذمہ داری سے فرار چاہتا ہے۔ ان کی فرار کی خواہش اتنی مضبوط ہوتی ہے کہ وہ کسی پہ بھی ملبہ ڈال سکتے ہیں۔ انہیں تو بس ذمہ داری قبول نہ کرنے کی ریت نبھانی ہوتی ہے۔ اِدھر کام خراب ہوا اُدھر وہ نکل کھڑے ہوئے قربانی کا بکرا ڈھونڈنے۔ کوئی نہ کوئی تو انہیں مل ہی جاتا ہے۔ حالات، موسم، قسمت، حکومت، حتیٰ کہ کوئی بندہ نہ ملے تو وہ خدا کو بھی اپنا حریف ثابت کرنے سے دریغ نہیں کرتے۔

کیا کبھی آپ نے اپنے ذہن کے دریچوں سے ایسی آوازوں کی گونج بلند ہوتی سنی ہے۔

''میرے ساتھ ایسا نہیں ہونا چاہئے تھا''۔

''میں مان ہی نہیں سکتا کہ یہ سب میرے ساتھ ہوا

ہے''۔

''میرے ساتھ ہی ہمیشہ زیادتی کیوں ہوتی ہے؟''

''میری قسمت ہی خراب ہے''۔

''جب تک یہ حکومت ہے، میرا کاروبار نہیں چل سکتا''۔

''سب میرے ہی پیچھے پڑ گئے ہیں''۔

''میرے بس میں کچھ بھی نہیں ہے''۔

''حالات مجھے مسلسل پچھاڑ رہے ہیں''۔

ایسی باتوں پہ کان دھرنے والا شخص خود کو بے بس سمجھتا ہے۔ اُسے لگتا ہے کہ وہ ''نشانہ'' بنایا جا رہا ہے۔ وہ دوسروں کو شکاری اور خود کو ''شکار'' سمجھتا ہے۔ اسے لگتا ہے کہ وہ اپنے حالات کے اس نہج پر پہنچنے کا ذمہ دار نہیں ہے اور نہ ہی اپنی ''مصیبت'' سے چھٹکارے کا اس کے پاس کوئی راستہ موجود ہے بلکہ وہ یہاں تک سمجھتا ہے کہ اب کچھ نہیں ہو سکتا لہٰذا وہ اپنے حالات بدلنے کے لئے ایک کوشش بھی نہیں کرنا چاہتا۔

کیا آپ کا ''الزام تراش'' گروہ سے کوئی تعلق تو نہیں ہے؟ اگر آپ کا اس گروہ سے 'رابطہ' ثابت ہو گیا تو سمجھ جایئے کہ زندگی ڈگر سے ہٹنے والی ہے۔ الزام چھوڑیئے، بہانوں کو خیر باد کہئے...... بس جو بھی ہو، ہر صورت میں اپنے حالات کی ذمہ داری خود قبول کیجئے۔

آٹھویں سازشی قبیلے کے لوگ

''کلر بلائنڈ'' ہوتے ہیں

اگر آپ اس قبیلے کے ساتھ ہیں تو سیاہ اور سفید کے علاوہ آپ کو کوئی اور رنگ دکھائی نہیں دیتا ہوگا۔ زندگی یا سیاہ ہے یا سفید۔ ''یا تو میں انتہائی کامیاب ہوں، یا انتہائی ناکام''۔ یہ شدت پسندی آپ کو کہیں کا نہیں چھوڑے گی۔

''اگر ریس میں میری پہلی پوزیشن آئی میں چمپئن ہوں، دوسری پوزیشن آئی تو میں فضول ہوں، بے کار ہوں۔ میری نظر میں دوسری پوزیشن کا مطلب 'ہار' ہے، چاہے ریس میں بیس ہزار افراد ہی کیوں نہ حصہ لے رہے ہوں''۔

''اگر 100 فیصد نمبر آئے تو میں کامیاب، اس سے ایک نمبر بھی کم آیا تو میرے لئے وہ صفر ہے''۔

''اگر میرا ''A'' گریڈ نہیں آیا تو میں ''فلاپ'' ہوں۔

سچ یہ ہے کہ زندگی میں مکمل کامیابی ناکامی جیسی کسی چیز کا وجود نہیں ہے۔

کامیابی کے 100 اور ناکامی کے صفر نمبر نہیں ہوتے۔

برائے مہربانی سمجھ جایئے کہ ''سیاہ وسفید'' صرف آپ کی سوچ میں ہے حقیقت میں ان دونوں کے درمیان رنگوں کی ایک پوری دنیا ہے۔ رنگوں سے دوستی کیجئے، اُنہیں محسوس کیجئے، خاص طور پر سیاہ اور سفید کے درمیان موجود ''گرے'' رنگ کو نظر انداز مت کیجئے۔ شدت پسندانہ پوزیشن سنبھال کے مت بیٹھے رہئے۔ ان مقصد شکن سوچوں کے خلاف بغاوت کر دیجئے اور خاص طور پر خود کو'' 100 فیصد یا کچھ نہیں'' کی سُولی پر چڑھنے سے بچایئے۔

دشمن سوچوں کے نویں گروہ کا نعرہ ہے

''تاریک سوچ''

کیا آپ چیزوں کے دس فائدوں کو چھوڑ کر ایک معمولی خامی کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کے ماہر ہیں؟ تاریک سوچ ہر معاملے میں منفی پہلوؤں کا ساتھ

دیتی ہے۔ ہر اچھی سے اچھی چیز میں اگر ایک بھی منفی پہلو ہے تو تاریک سوچ کے حامی نہ صرف اُس کو ڈھونڈ نکالیں گے بلکہ اسے اپنے ہی خلاف ڈھال کے طور پر استعمال کریں گے۔

آپ کے من پسند پراجیکٹ میں کہیں ایک آدھ غلطی ہوئی نہیں آپ نے کر دیا سارا پراجیکٹ چوپٹ۔ کوئی لاکھ سمجھائے مگر آپ اس ایک غلطی سے توجہ ہٹا کر آگے بڑھ ہی نہیں پائیں گے۔ کھانے میں سلاد یا رائتہ نہیں ہے تو آپ پورے کھانے کو ہی فارغ قرار دے دیں گے؟

• منفی پہلو سے نظر ہٹا کر فوراً خود سے پوچھیں۔

''ابھی بھی اس صورتِ حال میں کیا اچھائیاں موجود ہیں؟''

''مانا کہ ایک خامی ہے، اس شخص میں اور کتنی خوبیاں ہیں؟''

''اس تجربے کو ابھی بھی میں کیسے انجوائے کر سکتا ہوں؟''

دسویں قبیلے کے زہر کا نام ہے ''مجھے لگتا ہے''

آپ کا ہر احساس سچ نہیں ہوتا۔ آپ کو جو لگتا ہے کیا وہ ہمیشہ درست ہوتا ہے؟ ضروری نہیں ہر بار جو آپ محسوس کریں وہ سچ ہو۔ کیا کبھی آپ نے محسوس کیا کہ کسی شخص نے آپ کی گھڑی چرا لی ہے؟ آپ نے اسے اپنے اس 'احساس' کی بناء پر مجرم ٹھہرا دیا، اس کے ساتھ توہین آمیز رویہ اختیار کیا اور اچانک گھڑی اپنی جیب سے ہی آپ کو مل گئی؟

آپ کا ہر احساس سچ نہیں ہے۔
کتنی بار آپ ''مجھے لگتا ہے'' کے ہاتھوں بچپن سے اب تک جن بھوتوں کے خوف سے ہلکان ہوئے ہیں؟ آپ کو کبھی لگا کہ کمرے میں کوئی ہے؟ آپ کو یقین ہو گیا کہ اندر کوئی چڑیل ہے یا چور تو ضرور ہے مگر آپ کو مایوسی ہوئی ہو گی یہ جان کر کہ وہ تو بلی تھی۔

دوسروں کو اپنے احساسات کی بھینٹ مت چڑھائیں۔ اپنے احساسات کو یقین کا درجہ دینے سے پہلے تصدیق کر لیں۔

''مجھے یہ کمرہ بُرا لگ رہا ہے تو یقیناً یہ بُرا ہی ہے''۔
''مجھے لگتا ہے میں ''لوزر'' ہوں تو پھر میں ''لوزر'' ہی ہوں۔
''میں نروس محسوس کر رہا ہوں، تو میں نروس ہی ہوں''۔

اپنی 'فیلنگ' کو حرفِ آخر مت سمجھئے۔ جذباتی دباؤ پر پریشانی کے عالم میں عموماً ہماری 'فیلنگ' ہمیں دھوکہ دے جاتی ہے۔ اس لئے اپنی ''مجھے لگتا ہے'' یعنی اپنی 'فیلنگ' کے اُوپر یقین کرنے سے پہلے اس پر سوال اٹھائیے اور تسلی کر لینے کے بعد ہی اُسے یقین کا درجہ دیجئے۔

آلودہ سوچوں کا گیارہواں گروہ کہتا ہے ''سب میرا قصور ہے''

دشمن سوچوں کا ایک انتہائی کارگر حربہ خود کو ملامت کرنے پر اُکسانا ہے اور آخری حدوں تک لے جانا ہے۔ یہ الزام تراشی سے بالکل برعکس رویہ ہے۔ آپ اپنی توپوں کا رُخ اپنی ہی طرف پھیر دیتے ہیں اور اپنا سارا گولا بارود خود کو اُڑانے میں استعمال کر دیتے ہیں۔ اس سوچ کو آپ ''ذمہ داری'' لینے والی سوچ نہیں کہہ سکتے۔ ذمہ داری لینا ایک صحت مندانہ رویہ ہے جبکہ ''خود ملامتی'' قابلِ مذمت عمل ہے۔

فرق صرف اتنا ہے کہ ذمہ داری لینے کے بعد آپ تبدیلی کے لئے قدم اٹھاتے ہیں جبکہ خود کو لعن طعن کرنے کے بعد آپ حالات کے سامنے ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔

خود اعتمادی کی جنگ میں پہلے سے ہارے ہوئے شخص کی ''سب میرا قصور ہے'' کی صدائیں اس کے حوصلوں کے پرخچے اُڑا دیتی ہیں۔ اُسے لگتا ہے وہ اب کسی قابل نہیں رہا۔ خود ملامتی بالآخر خود اذیتی میں بدل جاتی ہے۔ آہستہ آہستہ احساسِ ندامت ایک نفسیاتی بیماری کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ آپ سے عمل کی طاقت چھین لیتا ہے آخر میں آپ خود کو نہتا کر کے مار ہی تو دیتے ہیں۔

اگر کسی شخص کے اندر خواب مر جائیں تو میرے نزدیک وہ زندہ لاش ہی ہے۔ ''سب میرا قصور ہے'' کے مرض میں مبتلا لوگ ان نتائج کا ''گناہ'' بھی اپنے سر لے لیتے ہیں جن سے اُن کا سرے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ کیونکہ ان کا ایجنڈا ایک ہی ہوتا ہے، خود کو سر اُٹھا کے جینے کے قابل نہ چھوڑنا۔

بارھویں سازشی گروہ کا شوق ہے ''موازنہ''

کیا کبھی آپ نے کسی اور کے ساتھ اپنا موازنہ کیا ہے؟

''بالکل...... یہ تو روز کا معمول ہے''۔

چاہے وہ آپ کے جسمانی خدوخال ہوں، ہیئر سٹائل، چہرے کی رنگت ہو یا آنکھوں کا رنگ، قد کاٹھ ہو یا چلنے کا انداز، بینک بیلنس ہو یا سوشل سٹیٹس، گاڑی کا ماڈل ہو یا گھر کا سائز...... ہم ہر چیز میں خود کو دوسروں سے موازنے کے لئے تیار رکھتے ہیں۔

اس موازنے میں زیادہ تر ہار کس کی ہوتی ہے؟

ظاہر ہے آپ کی۔ کیونکہ یہ موازنہ ایسی جادوئی عینک پہن کر کیا جاتا ہے جس میں آپ کی اچھائیاں سکڑ کر چھوٹی سی رہ جاتی ہیں اور دوسروں کی خوبیاں پھیل کر پہاڑ کے برابر جا پہنچتی ہیں۔

''مجھے بھلا یہ نوکری کیوں ملے گی؟ میں عمر میں بھی بڑی ہوں اور طلاق یافتہ بھی ہوں۔ مریم نوجوان ہے اور سمارٹ بھی۔ یہ جاب اس کو ہی ملے گی۔ میرا کوئی چانس نہیں ہے''۔

''میرے سپیلنگ اور میتھ بہت خراب ہیں، میں رضوان کی طرح امتحان میں کبھی پوزیشن نہیں لے سکتا''۔

''مجھے بھلا کوئی لڑکی کیوں لفٹ کروائے گی۔ میں مرزا نواز کی طرح سمارٹ تھوڑی ہوں۔ سب لڑکیاں اسی پہ مریں گی۔ میرا کچھ نہیں ہو سکتا''۔

آپ سے گزارش ہے کہ ان سوچوں کا راستہ روکیے۔ ان کے بہاؤ کو کاٹ کے رکھ دیجیے۔ دوسروں سے خود کا موازنہ چھوڑ دیجیے۔ آپ بس آپ ہیں۔ اپنی انفرادیت کو پہچانئے، سمجھئے اور اسے دنیا کو دکھا دیجیے۔

تیرھواں سازشی گروہ کہتا ہے
''میرا زندگی سے نبھاہ نہیں ہو سکتا''

یہ زہر آلودہ آوازیں آپ کے اندر اس وقت سرائیت کرتی ہیں جب آپ ہتھیار ڈالنے کے قریب پہنچ جاتے ہیں۔

''میں اب اس سے زیادہ نہیں سہہ سکتا''۔

''میری بس ہو گئی ہے''۔

''میرے ہاتھ کھڑے ہیں''۔

اس سے بھی زیادہ خطرناک آواز کا نام ہے ''میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا''۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ''میں بہت کمزور ہوں، ناتواں ہوں، لاغر ہوں، مجھ میں زندگی کا سامنا کرنے کا دم ختم نہیں ہے''۔

مانا کہ صورتِ حال گھمبیر ہے، مشکل ہے، دل

خراش ہے۔ آپ کو واقعی زور کا دھچکا لگا ہے لیکن زندگی سے ناراضگی، شکایت اور دُوری اختیار کرنے سے کیا ملے گا؟

یاد کیجئے کئی سال پہلے آپ نے کتنے لوگوں سے کہا ہوگا کہ "میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا" لیکن آج آپ ان کے بغیر بڑے مزے کی زندگی گزار رہے ہیں۔ ہاں کبھی کبھار آپ کو ان یاد کر کے افسردہ ہو جاتے ہوں گے لیکن زندگی رُکی تو نہیں؟

جب بھی آئندہ آپ کو لگے کہ "میں اور نہیں سہہ سکتا"۔ "میری بس ہو گئی ہے" یا "یہ تو حد ہی ہو گئی ہے"۔ تو خود سے پوچھئے کہ کس بنیاد پہ آپ اسے اپنی "بس" اور "حد" قرار دے رہے ہیں؟ اس سے کہیں زیادہ کچھ سہہ کر کتنے لوگ پھر بھی ایک شاندار زندگی جی رہے ہیں؟

آپ کی حد کا آپ کو پتہ ہی نہیں ہے۔ حد تو آپ کو تب پتہ چلے جب آپ حد سے باہر نکلیں! آپ نے تو کبھی اپنی حدوں کو چیلنج کرنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ ایک پتے کی بات جان لیجئے...... "آپ ساری زندگی کبھی اپنی حدوں کو چھو بھی نہیں پائیں گے"۔ جو مرضی کر لیں، اپنی حدوں کا تعین آپ سے کبھی نہیں ہوگا۔ آپ کو کبھی پتہ ہی نہیں چلے گا کہ خدا نے آپ کو کیا کیا طاقتیں عطا کر رکھی ہیں۔

خود کو لتاڑنے والی سوچوں کو آخری وارننگ دے دیجئے۔ ان زہریلی سوچوں کو تلف کیجئے۔ اپنے خوابوں کی فصل میں پلنے والی خطرناک سوچوں کی جڑی بوٹیوں پر خود اعتمادی کا سپرے کیجئے۔ اپنی صلاحیت، استقامت، اعتماد اور کامیابی کی پیداوار بڑھانے کے لئے ان آلودہ سوچوں کی "سپلائی لائن" کاٹ دیجئے۔ زہریلی سوچوں کو اُلٹا لٹکا دیجئے۔ اپنے خوابوں کی سرزمین کو بنجر ہونے سے بچائیے۔

اب کرنا کیا ہے؟ سازشی آوازوں کے خلاف جنگ کیسے کرنی ہے۔ حل بڑا سادہ ہے۔ آئندہ جب کبھی آپ کی زندگی میں کوئی تکلیف دہ یا ناخوشگوار واقعہ پیش آئے تو اس لمحے کی کیفیت کو کوئی نام دیجئے۔ مثلاً غصہ، توہین، نفرت وغیرہ۔ اس کیفیت کی شدت کو جانچنے کے لئے اسے 10 میں سے آپ کتنے نمبر دیں گے؟

اس واقعے کے بعد آپ کے اندر کون سی سازشی آوازوں نے سرگوشیاں کیں؟ معلوم کیجئے کہ ان آوازوں کا تعلق 13 میں سے کس قبیلے سے ہے؟ ہر آواز کے منفی اثر کو آپ 10 میں سے کتنے نمبر دیں گے؟

اب آپ فرض کریں کہ یہ واقعہ آپ کے ساتھ نہیں بلکہ آپ کے ایک دوست کے ساتھ پیش آیا ہے۔ یہ زہریلی آوازیں بھی آپ کے نہیں اسی کے کانوں میں پڑی ہیں۔ اس نے آپ سے مشورہ کی خاطر آپ کو یہ سب بتایا ہے۔ اس آرٹیکل میں اب تک آپ نے جو پڑھا اور سیکھا ہے اس کی بنیاد پہ آپ اپنے دوست کو کیا مشورہ دیں گے؟ ان دشمن آوازوں کے جواب میں آپ کیا کہیں گے؟ ان آوازوں کی توپوں کو چپ کروانے کے لئے آپ انہیں کیا حکمت عملی اختیار کرنے کو کہیں گے؟

وہ سب خود کو کہہ کے دیکھیے۔ اب دوبارہ اس واقعے کو اور اس سے وابستہ کیفیت کو یاد کیجئے۔ اس بار آپ دس میں سے اسے کتنے سکور دیں گے؟ سازشی آوازوں کو دوبارہ جانچئے۔ ان میں سے ہر آواز کو چپ کرانے کے لئے جو جواب آپ نے ڈھونڈا تھا اس کا کتنا اثر ہوا ہے؟ ہر سوچ کو آپ اس بار 10 میں سے کتنے نمبر دیں گے۔ مجھے اُمید ہے (اور میرا ہزاروں لوگوں کے ساتھ اس ٹیکنیک کو استعمال کرنے کا تجربہ بھی ہے) کہ منفی، زہریلی اور آلودہ سوچوں کی شدت کئی گنا کم ہو چکی ہو گی۔ آپ کی ہر زہریلی سوچ لاجواب ہو کے، دُم دبا کے بھاگ چکی ہو گی۔ یا جو ابھی بھاگی نہیں ہو گی وہ یقیناً بھاگنے کی تیاری کر رہی ہو گی۔

اگر ابھی بھی سمجھ نہیں آئی تو ایک مثال پیش کرتا ہوں۔

فرض کریں آپ نے لَو میرج کی، آپ کی اپنی بیوی جس سے آپ بے حد محبت کرتے ہیں کے ساتھ لڑائی ہوگئی (کہانی گھر گھر کی) جھگڑا اتنی شدت اختیار کر گیا کہ بیگم صاحبہ رُوٹھ کے میکے چلی گئیں۔ آپ نے بھی طے کر لیا کہ لینے نہیں جاؤں گا۔ اب میرے بتائے ہوئے ماڈل کو استعمال کرتے ہیں۔

واقعہ (جس نے آپ کی جان نکال لی) کا نام ہے بیگم سے ناراضگی۔ آپ کی جذباتی کیفیت کا نام ہے، ڈپریشن، غصہ اور بے وقعتی۔ آپ نے غصے کو دیئے 10 میں سے 9 نمبر، ڈپریشن کو 7 جبکہ بے وقعتی کو 9۔ چلئے اب مل کر آپ کے کانوں میں سرگوشیاں کرتی سازشی آوازوں کو سنتے ہیں۔

''یہ سب میرا قصور ہے''۔

''وہ مجھ سے پہلی سی محبت نہیں کرتی''۔

''اس کے بغیر میں کچھ بھی نہیں ہوں''۔

''وہ ہمیشہ مجھ سے جھگڑتی رہتی ہے''۔

وغیرہ وغیرہ۔ اب ان میں سے ہر آواز کے منفی اثر کو آپ 10 میں سے کتنے نمبر دیں گے؟

خود کی بات ایک دوست کی طرح سننے کے بعد ہو سکتا ہے آپ سازشی آوازوں کا توڑ خود کو یہ کہہ کر نکالیں۔

''ہم دونوں کا قصور ہے۔ ہم دونوں برابر کے ذمہ دار ہیں، دونوں سے ہی غلطی سرزد ہوئی ہے''۔

''وہ مجھ سے پہلی سی محبت نہیں کرتی کی میرے پاس ایک بھی ٹھوس وجہ نہیں ہے جبکہ ایک ہی دن میں درجنوں باتیں ایسی ہوتی ہیں جس سے اس کی اہمیت جھلکتی ہے جنہیں میں عام طور پر نظر انداز کر دیتا ہوں''۔

''میں اس سے بے حد محبت کرتا ہوں اور اس محبت کو ظاہر کرنے کے لئے میرا مضبوط اور پُراعتماد رہنا ضروری ہے۔ میں اس کے بغیر کچھ نہیں ہوں، کی آواز مجھے کمزور کرے گی۔ بھلا ایک کمزور شخص کسی کا سہارا کیا بن سکتا ہے؟ میرا وجود کسی کی گواہی سے جُڑا ہوا نہیں ہے۔ میں مکمل ہوں، اپنی تکمیل کے لئے مجھے کسی اور کی ضرورت نہیں۔ بھلا ایک نامکمل انسان کسی کو خاک محبت دے سکتا ہے؟''

''کیا وہ واقعی ہمیشہ مجھ سے جھگڑتی ہے؟ سال کے 365 دن؟ دن کے چوبیس گھنٹے؟ بالکل نہیں۔ ہمارا جھگڑا بمشکل دو تین دفعہ ہوا، وہ بھی معمولی نوعیت کا۔ سچ یہ ہے کہ ایک بھی بار جھگڑے کی ابتداء اُس نے نہیں کی''۔

ایمانداری سے بتایئے، خود سے اس طرح کی گفتگو کے بعد آپ کی زہریلی سوچوں کی شدت کم نہیں ہوگئی ہو گی؟ کیا آپ صلح میں پہل کرنے کے بارے میں نہیں سوچ رہے ہوں گے؟ کیا آپ کی عزتِ نفس اور خوداعتمادی میں اضافہ ہوا ہے؟

ڈپریشن، غصہ اور بے وقعتی کی کیفیات کیا ابھی بھی قائم ہیں؟ دوستو! زہریلی سوچیں خوابوں کی آنکھیں نوچ سکتی ہیں۔ آپ سے جینے کا حق چھین سکتی ہیں۔ خودکشی کر لینے والوں کو بھی زہریلی سوچیں ہی اُکساتی ہیں۔ کاش ہر کسی کو ان سازشی آوازوں کے خلاف لڑنا آ جائے تو معاشرے میں افسردگی، ماردھاڑ، ڈپریشن اور اختلافات میں واضح کمی آ جائے۔

تو پھر آپ اپنی زہریلی آوازوں کا والیم بند کرنے اور سُریلی آوازوں کی تھاپ پر اپنے خوابوں کا رقص دیکھنے کے لئے تیار ہیں؟

◆◆◆

یہ مضمون محترم قیصر عباس کی کتاب ''سر اُٹھا کے جیو!'' سے پیش کیا جارہا ہے۔

ڈاکٹر عبدالغنی فاروق

بے شمار واقعات کی روشنی میں راقم کا یہ نقطۂ نظر یقین کی صورت اختیار کر گیا ہے کہ اللہ کی یہ دنیا اندھیر نگری نہیں ہے اور یہاں بھی محدود پیمانے پر جزا اور سزا کا عمل جاری وساری ہے اور شاعر کی اس بات میں کوئی مبالغہ نہیں ہے کہ

عدل وانصاف فقط حشر پہ موقوف نہیں — زندگی خود بھی گناہوں کی سزا دیتی ہے

اور بلاشبہ یہ سزا اللہ کی حکمت اور مصلحت کے تحت ہی ہوتی ہے۔

راقم نے اپنے اس نقطۂ نظر کو ثابت کرنے کے لئے اسی معاشرے کے 245 جیتے جاگتے سچے واقعات اکٹھے کئے اور انہیں مختلف عنوانات کے تحت ''مکافاتِ عمل دید وشنید'' کے نام سے کتابی صورت میں مرتب کر دیا۔ یہ کتاب 2010ء میں شائع ہوئی اور اتنی مقبول ہوئی کہ اس کا چوتھا ایڈیشن پریس میں چلا گیا۔

اس کتاب کے ایک باب کا عنوان ہے ''عشق کی خانہ خرابیاں'' اس میں مَیں نے پانچ سچے واقعات پیش کئے ہیں اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ جو لوگ شادی سے پہلے یا بعد میں عشق وعاشقی کے چکر میں پڑتے ہیں اور فطری اور اخلاقی تقاضوں کی خلاف ورزی کرتے ہیں وہ زندگی میں کبھی سکون آشنا نہیں ہوتے اور ہمیشہ مسائل میں گھرے رہتے ہیں۔

اس ضمن میں پہلا واقعہ میں نے اپنے ایک کلاس فیلو کے بارے میں لکھا تھا جو اپنی ایک ہم جماعت لڑکی پر بُری طرح فریفتہ ہو گیا۔ مگر اس کا عشق ناکام رہا اور اس کی ساری زندگی سراپا الم بن گئی اور اس بڑھاپے میں بھی وہ کئی طرح کے مسائل بلکہ مصائب میں جلا ہے۔ اس سلسلے کا بڑا ہی حسرت انگیز بلکہ لرزا دینے والا پہلو یہ ہے کہ کچھ عرصہ پہلے اس کہانی کے دوسرے فریق یعنی متعلقہ خاتون کے حالات کا مجھے علم ہوا تو وہ بھی ہو بہو ''عاشق صاحب'' کے حالات کا چربہ نظر آئے۔ ایک جیسی المناک صورتِ حال ایک جیسے مسائل، ایک جیسے مصائب صاف نظر آتا ہے کہ کوئی نادیدہ قوت دونوں کے حالات کو یکساں انداز میں کمانڈ کر رہی ہے۔

مَیں ذاتی طور پر مبالغہ آرائی کو گناہ سمجھتا ہوں۔ تاہم قارئین کے اطمینان کی خاطر اللہ کو حاضر ناظر جان کر عرض کر رہا ہوں کہ ان دونوں کہانیوں میں مَیں نے معمولی سی بھی حاشیہ آرائی نہیں کی صرف نام تبدیل کر دیئے ہیں اور یہ مصلحت کا تقاضا تھا۔

اب سنئے دونوں کہانیاں الگ الگ۔

مَیں نے ایم اے اردو کی تعلیم کے لئے ستمبر 1964ء میں پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ 66-1964ء کے اس سیشن میں طلبہ وطالبات کی تعداد ڈھائی سو تک پہنچ گئی۔ ڈیڑھ سو لڑکیاں، ایک سو لڑکے، چنانچہ صدر شعبہ اور پرنسپل کالج ڈاکٹر سیّد عبداللہ نے یہ دیکھ کر کہ کسی بھی کمرے میں اتنی بڑی تعداد اکٹھے نہیں سما سکتی، لڑکوں اور لڑکیوں کی کلاسوں کا انتظام الگ الگ کر دیا اور لڑکوں کے لئے کالج کے لان میں چھولداریاں اور خیمہ نصب کر دیا گیا لیکن اس سے کالج کی

مجموعی فضا پر کوئی مثبت اثر نہ پڑا۔ ہر وقت، ہر مقام پر لڑکوں لڑکیوں کا جمگھٹا رہتا اور جہاں دو چار لڑکے باہم اکٹھے ہوتے، کوئی نہ کوئی لڑکی ہی اُن کی گفتگو کا موضوع ہوتا۔ چنانچہ مَیں نے تشویش کے ساتھ یہ بات محسوس کی ہے کہ مخلوط تعلیم کے ماحول میں جو چیز سب سے زیادہ پروان چڑھتی اور پنپتی ہے، وہ غیر سنجیدگی اور فکر و عمل کی سطحیت ہے۔

راجا فیاض کا قصہ

راجا فیاض میرا کلاس فیلو تھا۔ راولپنڈی کے قریب کسی گاؤں کا رہنے والا تھا۔ لائق اور ذہین و فطین تھا۔ اللہ نے اُسے شخصیت بھی اچھی عطا کی تھی۔ بانکا سجیلا، خوبصورت نوجوان تھا۔ وہ ہماری ایک کلاس فیلو محمودہ پر عاشق ہو گیا اور بہت بُری طرح دل دے بیٹھا۔ محمودہ عجیب و غریب، متضاد خصوصیات کی لڑکی تھی۔ وہ اتنی خوبصورت اور طرحدار تھی کہ کوئی بھی فارغ بے فکرا نوجوان اس پر بڑی آسانی سے عاشق ہو سکتا تھا۔ وہ باوقار تھی، سر پر ہمیشہ دوپٹہ لئے رکھتی لیکن گپ شپ کی بہت شوقین۔ جو لڑکا بھی اُس سے بات کرنا چاہتا، وہ اُسے مایوس نہ کرتی۔ اس سے کتنے ہی لڑکے خوش فہمی میں مبتلا ہو گئے تھے اور راجا فیاض اُن میں پیش پیش تھا۔

راجا فیاض اور مَیں ہم دونوں اورینٹل کالج کے بوائز ہوسٹل میں رہتے تھے۔ راجا ہر دوسرے تیسرے دن شام سے پہلے بن سنور کر پرانی انارکلی کے قریب گرلز ہوسٹل کا جہاں محمودہ مقیم تھی، پابندی سے چکر لگایا کرتا تھا، جانے سے پہلے مجھے اشعار سنا کر جاتا اور واپس آ کر میرے کمرے میں بیٹھا اپنی قسمت پر ناز کرتا رہتا۔ محمودہ اُس کی محبت کی قدر کرتی تھی اور اُس نے اُسے کبھی بھی مایوس نہ کیا تھا۔ وہ دونوں فلمیں دیکھتے، ہوٹلوں میں کھانا کھاتے، بے تکلفی ہو گئی۔

دوسرے سال کے آخری مہینوں کی بات ہے، جب راجا فیاض نے محمودہ سے شادی کی تمنا کی تو وہ سخت برافروختہ ہوئی۔ اُس نے صاف کہہ دیا کہ ہمارا گھرانا ایک قدامت پسند گھرانا ہے اور ہمارے ہاں برادری سے باہر شادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میرے والد اپنے علاقے کے ایک ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹر ہیں اور میں کوئی ایسی حرکت نہیں کر سکتی جس سے اُن کی عزت پر حرف آتا ہو۔

اس حادثے سے راجا فیاض بُری طرح متاثر ہوا۔ اس کا سکون درہم برہم ہو گیا۔ وہ میرے پاس آ کر بیٹھا، آہیں بھرتا رہتا، الم انگیز شعر گنگناتا رہتا۔ ایک بار اُس نے بڑی ہی دل گرفتگی سے کہا۔ اب میں کسی پڑھی لکھی لڑکی سے ہرگز شادی نہیں کروں گا۔ اب میں اپنے گاؤں میں کسی اَن پڑھ لڑکی کو اپنی بیوی بنا لوں گا۔

اور واقعی اس نے ایسا ہی کیا۔ امتحان دے کر وہ گاؤں گیا اور جاتے ہی اپنے رشتہ داروں میں ایک اَن پڑھ لڑکی سے شادی کر لی لیکن چونکہ ایم اے میں اُس کے نمبر باوجود لائق ہونے کے بہت ہی کم آئے تھے اس لئے کوشش کے باوجود اُسے کوئی ڈھنگ کی نوکری نہ ملی۔ پھر وہ بیرونِ ملک چلا گیا۔ کچھ عرصہ جرمنی میں مقیم رہا، وہاں سے انگلینڈ چلا گیا جہاں قسمت نے یاوری کی۔ نوکری بھی مل گئی اور چند سالوں کے بعد اُسے وہاں کی شہریت بھی حاصل ہو گئی۔ اُس نے بیوی کو بھی وہیں انگلینڈ میں بلا لیا تھا۔

ایم اے کا امتحان دینے کے بعد میرا راجا فیاض سے رابطہ منقطع ہو گیا۔ بس اِدھر اُدھر سے یہ پتہ چلتا رہا کہ وہ انگلینڈ سے جدہ آ گیا ہے اور وہاں ایک فرنچ فرم میں کمپیوٹر انجینئر کی حیثیت سے بہت ہی اچھی تنخواہ لے رہا ہے۔ اُس کی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے اور وہ بڑا آسودہ حال ہے۔ اور پھر ایک روز اس خبر نے مجھے ہلا کر رکھ دیا کہ راجا فیاض نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی ہے۔

سچی بات ہے مجھے اس اطلاع سے دلی صدمہ ہوا۔ ظاہر ہے کوئی شخص بھی یہ آخری اقدام شوقیہ کبھی نہیں کیا کرتا اور مدتوں تک شدید کرب کی آگ میں جلنے کے بعد یہ انتہائی قدم اٹھاتا ہے۔ چنانچہ مَیں نے ایک جگہ سے راجا کا ایڈریس حاصل کیا اور اُسے ہمدردی اور افسوس کا خط لکھا اور دریافت کیا کہ اُس کی زندگی میں یہ اندوہناک واقعہ کیوں پیش آیا ہے؟

اُس کا جواب آیا کہ مَیں نے اپنی بیوی کے ساتھ چودہ سال کا عرصہ حالت عذاب میں بسر کیا ہے۔ اُس عورت نے گویا قسم کھا رکھی تھی کہ ہر بات میں وہ میری مخالفت کرے گی۔ پھر شدید غصہ اور چڑچڑاپن اُس کی شناخت بن گئی تھی چنانچہ گھر کا ماحول مستقل طور پر میرے لئے جہنم بن گیا تھا اور اب تو میرے بچوں نے بھی اصرار کیا تھا کہ اُس سے علیحدگی اختیار کرلوں۔

اس مراسلت سے راجا فیاض کے ساتھ میرے رابطے کی ایک صورت پیدا ہوگئی۔ اُس نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ مَیں کسی اچھی عورت کا انتخاب کروں اور اس کی شادی کرادوں۔ مَیں نے اس سلسلے میں کوشش کا آغاز بھی کردیا مگر اُسی اثناء میں پتہ چلا کہ دو دوستوں نے اس کے لئے بیوی تلاش کرلی ہے اور اس کی شادی بھی ہوگئی ہے۔

اللہ نے 1989ء میں مجھے اپنے خاص فضل سے پہلی بار حج کی سعادت عطا فرمادی۔ راجا فیاض اُن دنوں جدہ ہی میں مقیم تھا۔ اس لئے اس سے ملاقاتیں ہوتی رہیں بلکہ اس کے گھر جانے کا اور اس کی بیگم سے ملاقات کا موقع بھی مل گیا۔ بے چاری ذرا بھی خوبصورت نہیں تھی۔ تب اُس نے بڑی بے بسی سے متذکرہ دونوں دوستوں کا گلہ کیا۔ ''مَیں نے تاکید کی تھی کہ کسی خوبصورت خاتون کا انتخاب کرنا لیکن ظالموں نے ایک ایسی عورت میرے سر منڈھ دی جو عمر میں مجھ سے بڑی ہے اور خوبصورت بھی نہیں ہے''۔

راجا فیاض بڑا امیر آدمی ہے۔ اسلام آباد کے ایک مہنگے، پوش سیکٹر میں اُس کی بہت بڑی کوٹھی ہے لیکن سکون اور راحت نام کی کوئی چیز اُسے میسر نہیں۔ بڑی بیٹی کی شادی ایک فوجی افسر سے کی، بہت جہیز دیا، لیکن بیٹی دو ننھے بچے چھوڑ کر ایک حادثے میں ہلاک ہوگئی۔ اکلوتا بیٹا انگلینڈ ہی میں رہتا ہے۔ پندرہ سال پہلے اُس کی شادی ہوئی تھی مگر وہ اولاد سے محروم ہے۔ راجا فیاض کی دوسری بیوی سے بھی کوئی اولاد نہیں ہے۔ اس طرح اس کی زندگی کرب مسلسل کی ایک تکلیف دہ داستان ہے۔

اس داستان میں بہت المناک اضافہ یہ ہوا ہے کہ تقریباً چھ مہینے پہلے اُس کی چھوٹی بیٹی وفات پاگئی ہے۔ وہ انگلینڈ میں مقیم تھی اور اس کے دو بیٹے ہیں۔ بڑے کی عمر چھ سال ہے اور چھوٹا چار سال کا ہے۔ ان دونوں یتیم بچوں کی پرورش و پرداخت بھی اب بوڑھے راجا فیاض اور اس کی بیمار بیگم کو کرنی ہوگی۔ خدا اس صورت حال سے کسی دشمن کو بھی دوچار نہ کرے۔

محمودہ کا انجام

کاشف ملک میرے ایم اے کے کلاس فیلو ہیں۔ بڑے باخبر اور ذہین آدمی ہیں۔ وسیع سماجی مراسم رکھتے ہیں۔ انہوں نے تقریباً ایک سال پہلے ایک روز دوران گفتگو مجھ سے پوچھا۔ آپ محمودہ کو جانتے ہیں؟

''وہ اپنی ایم اے کی کلاس فیلو!'' میں نے جواب دیا۔

''ہاں بالکل وہی۔ دراصل وہ لمبے عرصے سے سخت مسائل اور مشکلات سے دوچار ہے۔ تنہائی کی شکار ہے اور چاہتی ہے کہ کوئی اس سے بات کرے۔ اسے تسلی دے، اُس کی دلجوئی کرے''۔

کاشف ملک کے مشورے بلکہ اصرار کے پیش نظر مَیں نے اُن سے محمودہ کا فون نمبر لے لیا۔ خود مجھے بھی راجا فیاض کے حوالے سے تجسس تھا کہ اُس کے حالات سے

آگاہی حاصل کی جائے اور پھر محمودہ سے میری دو بار خاصی تفصیلی گفتگو ہوئی جو آج کل جنوبی پنجاب کے ایک شہر میں مقیم ہے۔ کاشف صاحب نے بتایا تھا کہ جس طرح وہ کالج میں لڑکوں سے بے تکلف گپ شپ کرتی تھی اور خوش رہتی تھی۔ اسی طرح آج بھی وہ مردوں سے بات کر کے اطمینان محسوس کرتی ہے اور اب تو یہ اس کی ضرورت بھی ہے۔

محمودہ سے تفصیلی گفتگو کے بعد اس کے حالات کی جو ضروری جھلکیاں سامنے آئیں اُس کے مطابق ایم اے میں محمودہ کے بہت ہی کم نمبر آئے تھے اور اُسے ملازمت کے لئے کسی انٹرویو کی کال نہ آئی۔ تب اُس نے فیصل آباد سے بی ایڈ کیا اور اُسے ہائی سکول میں ٹیچر کی جاب مل گئی۔

محمودہ کو شادی کے سلسلے میں بھی خاصی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ کوئی ڈھنگ کا رشتہ آتا ہی نہیں تھا۔ خاصی تگ ودو کے بعد تیس سال کی عمر کے بعد 1974ء میں اس کی شادی ہوئی حالانکہ 1966ء میں اس نے ایم اے کا امتحان دے دیا تھا۔ تاہم اُسے خاوند اچھا مل گیا۔

''جاوید بڑی اچھی شخصیت کا حامل تھا، بہت خوش اخلاق تھا اور میری بڑی قدر کرتا تھا۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اُسے میرے لائف سٹائل پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ میں اپنے کلاس فیلوز سے ملتی تھی اور اُن سے خوب گپ شپ کرتی تھی لیکن وہ بُرا نہ مانتا تھا۔

''شادی کے بعد اللہ نے مجھے یکے بعد دیگرے دو بیٹے عطا فرمائے۔ بہت ہی پیارے بچے تھے وہ لیکن بدقسمتی سے دونوں دو ڈھائی سال کی عمر میں فوت ہو گئے اور میری دنیا اندھیر ہو گئی۔ میری روح کا یہ وہ زخم ہے جو آج تک مندمل نہیں ہوا۔

اللہ نے فضل فرمایا اور اس کے بعد ایک بیٹی اور دو بیٹوں کی نعمت مجھے حاصل ہو گئی لیکن 2001ء میں میرے گھر پر قیامت ٹوٹ پڑی اور میرا خاوند 58 سال کی عمر میں کامل صحت کی حالت میں برین ہیمرج سے وفات پا گیا اور اس کے بعد تو مجھے سکون کا سانس لینا نصیب ہی نہ ہوا۔ اسی سال مجھے شوگر نے آ لیا اور اُس نے مجھے نچوڑ کے رکھ دیا۔ شوگر کی شدت کا یہ عالم تھا کہ دن میں دو بار انسولین لگنے لگی۔ ساتھ ہی بلڈ پریشر نے یورش کر دی اور بے خوابی میرا مستقل روگ بن گئی۔

اب عالم یہ ہے کہ رات کو شوگر بہت لو ہو جاتی ہے۔ سارے جسم میں دردیں ہوتی ہیں جنہوں نے میری زندگی کو ہلکان کر دیا ہے۔

محمودہ نے بڑے دُکھ بھرے لہجے میں بھرائی ہوئی آواز کے ساتھ بتایا۔ فاروق صاحب میں نے چھ سال پہلے بیٹی کی شادی کی۔ اس کا خاوند اُسے انگلینڈ لے گیا لیکن وہ اب تک اولاد کی نعمت سے محروم ہے اور اُس کا غم مجھے ہمہ وقت پریشان رکھتا ہے۔

بڑے بیٹے کی شادی چار سال پہلے کی تھی لیکن شومئی قسمت کہ خدا نے اُسے بھی کوئی بچہ عطا نہیں کیا۔ میرا بڑا بیٹا گھر سے بہت دور لاہور کے ایک پرائیویٹ ادارے میں ملازمت کرتا ہے اور بمشکل ایک مہینے کے بعد گھر آتا ہے۔ چھوٹا بیٹا بھی لاہور میں زیر تعلیم ہے اور وہیں ہوسٹل میں رہتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ گھر میں مَیں اور میری بہو اداسیوں سے نبرد آزما رہتی ہیں اور وقت گزارنا محال ہو جاتا ہے۔

چونکہ ہم دو بہنیں ہیں، بھائی کوئی نہ تھا اور بڑی بہن کی شادی دور فیصل آباد میں ہوئی ہے۔ اس لئے ہماری باہمی ملاقاتوں کا وقفہ بہت طویل ہوتا ہے اور ہم ساس بہو تنہائی کے احساس سے دوچار رہتی ہیں۔

قارئین کرام! ملاحظہ کر لیجئے، یہ ہے ''مکافاتِ عمل'' گندم از گندم بروید جو ز جو کون کہتا ہے خدا نہیں ہے اور سب کچھ اتفاق سے ہوتا ہے۔ راجا فیاض اور محمودہ کے حالات میں جو دردناک اور حیرت انگیز مطابقت ہے وہ اس امر کی واضح دلیل ہے کہ گناہ بہرحال اپنے نتائج دکھا کے رہتا ہے۔

***

ایک سیدھے سادے شہری نوجوان کا ماجرا۔ وہ ایک بھولی بھالی دیہاتی لڑکی کے حُسنِ بلاخیز کا اسیر ہو گیا تھا...... اس کے لئے مشکلات اور مصیبتوں کے دروازے کھل گئے تھے۔

☆ ----------------------------------0345-5883954------------------- ریاض عاقب کوہلر

اس کا نام تابش تھا۔ گھٹا ٹوپ اندھیرے میں وہ اندھا دھند بھاگا جا رہا تھا۔ زندگی بچانے کی فطری جبلت اسے تحریک دیے ہوئے تھی، ورنہ تو اس کی ہمت جانے کب کی جواب دے چکی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ دشمن شکاری کتوں کی طرح اس کے تعاقب میں ہیں۔ اور رکنے یا آرام کرنے کا مطلب دردناک موت کے سوا کچھ نہیں۔ تعاقب کرنے والوں کے پاؤں کے نیچے آنے والے سرکنڈوں کی سرسراہٹ اور ''پکڑو جانے نہ پائے'' کی آوازیں اسے دوڑانے کے لیے ٹانک کا کام دے رہی تھیں۔

اچانک ٹھوکر لگنے سے وہ گرا اور پھر کوشش کے باوجود اٹھ نہ سکا۔ اس کا سانس دھونکنی کے مانند چل رہا تھا۔ تعاقب کرنے والوں کو اس تک پہنچنے میں چند منٹ سے زیادہ نہ لگتے۔ وہ چاروں پھیل کر بڑھے چلے آ رہے تھے۔ آپس میں ان کا رابطہ وہ آوازیں تھیں جو بطور مشورہ یا حکم ایک دوسرے کو دیتے آ رہے تھے۔

تعاقب کرنے والے سارے مسلح تھے جبکہ وہ ہتھیار سے بھی تہی دست تھا۔ وہ سانس پہ قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔ مزید احتیاط اس نے یہ کی کہ سرکنڈوں کی جس جھاڑی کے ساتھ گرا تھا رینگ کر اس کے اندر گھس گیا۔ اس وقت سانپ بچھو کا خوف اس کے دماغ کے کسی کونے میں بھی موجود نہیں تھا۔ تھوڑی دیر آرام کیے بغیر اس کا آگے سفر کرنا ممکن نہیں تھا۔ آخر انسانی بدن ایک حد تک ہی برداشت کی صلاحیت رکھتا ہے۔ دائیں طرف پسلیوں میں اسے شدید درد محسوس ہونے لگا۔ اس کا جی کراہنے کو چاہا مگر اس نے بڑی سختی سے منہ پر ہاتھ رکھ کر اپنے ہونٹ دبا لیے۔

تعاقب کرنے والوں کے نزدیک پہنچنے پر بھی اس کی سانس ہموار نہیں ہو سکی تھی مگر سرکنڈوں کے شور میں اس کا ہانپنا دب گیا تھا۔ چاروں اس کے قریب سے گزرتے چلے گئے۔ لیکن چند ہی گز آگے جا کر رک گئے۔

''اوئے منظورے!...... کوئی آواز آ رہی ہے خبیث کی؟'' ایک کرخت آواز اس کے کانوں میں گونجی۔

''نہیں بھیا......'' منظور کی جوابی آواز اسے آگے اور دائیں جانب سنائی دی تھی۔

''سرکنڈوں کی سرسراہٹ بھی سنائی نہیں دے رہی...... گویا یہیں کہیں ہے؟''

''منظورے! شاہ جہان کو ساتھ لے کے آگے بڑھو...... میں اور سراج پچھلا پچاس گز کا علاقہ کھنگالتے ہیں...... بچ کر نہ جانے پائے؟''

''ٹھیک ہے بھیا۔''

اچانک تڑتڑاہٹ کی آواز گونجی وہ لرز کر رہ گیا تھا۔

''کیا ہوا جہانے!...... کچھ نظر آیا؟''۔

''نہیں بھیا!...... کوئی جانور تھا۔''

''بیوقوف!...... یونہی فائر مت کرو...... ہمیں نہ ٹھک جائے۔''

''ٹھیک ہے ظہور بھائی۔'' شاہ جہان کا فرمان بردار لہجہ اس بات کا مظہر تھا کہ ان کا سرغنہ یا کرتا دھرتا ظہور ہی ہے۔

وہ چاروں بھائی، پرلے درجے کے جھگڑالو، شرپسند اور فسادی تھے۔ تابش کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ ان کے چنگل میں پھنس جائے گا۔ وہ اپنے ملازم، چچا سلطان کو کوسنے لگا جس کے مشورے پر اس کے دل میں سورج نگر کی سیر کا شوق پیدا ہوا تھا۔

سورج نگر سلطان کا آبائی گاؤں تھا۔ شہر سے دور ہونے کی وجہ سے وہ ان بنیادی سہولتوں سے محروم تھا۔ جو شہر کے قریب اس سے کم آبادی والے دیہاتوں میں بھی با آسانی میسر ہوتی ہیں۔ سال بھر سے اٹھتے بیٹھتے سورج نگر کی تعریف سن سن کر اس کے دل میں بھی وہاں کی سیر کا شوق سمایا اور یہ سیر اسے اس مقام تک لے آئی

تھی۔

''اوئے جہانے!......کوئی پتا چلا؟'' ظہور کی آواز اسے بہت قریب سنائی دی تھی۔

''نہیں بھیا!......شاید وہ یہاں سے نکل گیا ہے۔''

''اچھا سارے ادھر آجاؤ'' ظہور نے تمام کو قریب بلایا۔ ایک لمحے کے لیے تابش کو محسوس ہوا کہ شاید وہ دیکھ لیا گیا ہے۔ اور یہ سوچ اسے لرزانے کے لیے کافی تھی۔ اسی وقت اسے یہ خیال آیا، کہ اگر ظہور نے اسے دیکھ لیا ہوتا تو وہ اپنے بھائیوں سے اس کی بابت دریافت نہ کرتا۔ یہ حوصلہ افزا خیال اسے تقویت دے گیا۔ مگر وہ ابھی تک خطرے کی حدود سے نہیں نکلا تھا۔ چاروں موذی وہیں موجود تھے۔ اس کی ذرا سی لغزش اسے موت سے ہم کنار کرسکتی تھی۔ اب وہ وہاں سے ہلنے کے قابل بھی نہیں رہا تھا۔ سرکنڈوں کی سرسراہٹ اس کی موجودگی کا راز افشا کرسکتی تھی۔

اس کا دھونکنی کے مانند چلتا سانس اب اعتدال پذیر ہوگیا تھا لیکن پسلیوں میں ہونے والے درد میں نمایاں کمی نہیں ہوئی تھی۔ وہ چاروں سے چند گز کے فاصلے پر جمع ہوکر اسے ڈھونڈنے کا پلان بنانے لگے۔

''اب کیا کریں؟'' سوال کرنے والا ظہور تھا۔

''سلطان سے اگلواتے ہیں...... اسی کا مہمان تھا'' شاہ جہان نے مشورہ دیا۔ اس کی بات سن کر تابش نے اطمینان کی سانس لی کہ چچا سلطان ابھی تک زندہ تھا۔ مگر اس کے ساتھ ہی اس سوچ نے اسے لرزا دیا کہ چچا سلطان سے وہ اس کے گھر کا ایڈریس آسانی سے اگلوا لیتے۔ گو سلطان نے اسے پہلے ہی دن سے ان چاروں کے بارے تفصیل سے بتلا دیا تھا۔ اور یہ بھی کہ وہ چاندی لڑکی امیمہ ان غنڈوں کی بہن ہے لیکن امیمہ نے اس کے سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیتیں گویا سلب کرلی تھیں کہ وہ ہر سود و زیاں بھول گیا تھا۔

منظور نے کہا۔ ''بھیا پہلے تو ہمیں گاؤں کے قریب سے گزرنے والی روڈ کی دونوں جانب سے نگرانی کرنی پڑے گی اور ہر گاڑی کو روک کر چیکنگ کرنا ہوگی تاکہ وہ کسی طرف نہ جاسکے۔ اور پیدل یوں بھی وہ شہر تک نہیں جاسکے گا؟''

''ٹھیک ہے۔'' ظہور نے کہا۔ ''دائیں روڈ پر دس کلومیٹر دور جو لیزان پٹرول پمپ ہے وہاں تم چیکنگ کرو گے، اپنے ساتھ دو تین گرگے بھی رکھ لینا اس کے علاوہ کسی سے تعرض نہ کرنا۔ اور شاہ جہان!...... تمہیں بائیں طرف سہراب نگر موڑ پر یہی کارروائی سرانجام دینا ہوگی۔''

دونوں نے باآواز بلند۔ ''جی بھیا۔'' کہا۔

ظہور دوبارہ بولا۔ ''میں اور سراج، سلطان سے اس کمینے کے گھر کا ایڈریس معلوم کرکے شہر چلے جائیں گے۔ اور چھپ کر اس کے گھر کی نگرانی کرتے رہیں گے، اگر تم سے بچ کر وہاں پہنچ گیا تو اس کا حساب کتاب برابر کردیں گے۔''

سراج نے کہا۔ ''ایسا نہ ہو کہ وہ اپنی کار کا پنکچر نہ لگوا لے؟''

''بیوقوف!......سورج نگر میں پنکچر کی دکان کہاں ہے؟'' ظہور نے اسے جھڑکا۔

سراج نے ایک اور نکتہ اٹھایا۔ ''لوگ کار میں فالتو ٹائر بھی تو رکھتے ہیں۔''

منظور نے فخریہ لہجے میں کہا ''میں کار کے پیچھے والے دونوں ٹائروں پر ایک ایک گولی ضائع کرچکا ہوں۔''

شاہ جہان نے مشورہ دیا۔ ''بھیا!......ابن سلطانے کا بھی کریا کرم نہ کردیں۔ وہ ایسا مہمان لایا کیوں جس نے ہماری عزت خراب کرنے کی کوشش کی؟''

''نہیں...... وہ بے قصور ہے۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ شہری بابو اس طرح کی گھٹیا حرکت بھی کرسکتا ہے۔''

''اسیمہ کی تو میں خوب خبر لوں گا؟'' سراج نے دانت پیسے۔

''بکومت۔'' ظہور نے اسے ڈانٹا۔ ''وہ معصوم بچی کیا جانے ان شہری لوگوں کی چالاکیاں۔ اس بے غیرت نے اسے ورغلایا ہوگا؟...... باقی اب میں یوں بھی جلد از جلد اس کی شادی کرنے کی کوشش کروں گا تاکہ دوبارہ کوئی خبیث میری ننھی گڑیا کو نہ ورغلا سکے؟''

''معصوم گڑیا؟'' تابش کی طنزیہ ہنسی ہونٹوں تک رسائی نہ پا سکی۔ وہ معصوم گڑیا ہی اسے موت کے دہانے تک لائی تھی۔ تابش کبھی بھی اس حد تک جانے کو تیار نہ ہوتا مگر اسے تو کسی چیز کی پروا ہی نہیں تھی بس ہر وقت محبت کا بھوت اس پر سوار رہتا۔

''بھیا!...... وہ خبیث جب بھی ہتھے چڑھا اسے عبرت کا ایسا نمونہ بنانا ہے کہ وہ یاد رکھے۔ اس نے ہماری معصوم بہن کو ورغلایا ہے، ہماری عزت پر ہاتھ ڈالا ہے۔ جب تک اس کے ٹکڑے کر کے چیل کوؤں کو نہیں کھلائیں گے چین سے نہیں بیٹھیں گے۔'' اس مرتبہ سراج کی نفرت کا ہدف تابش تھا۔

''ہاں!......'' ظہور نے اس کی تصدیق کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ بات قابلِ تسلیم ہے۔ اس کا انجام بہت عبرت ناک ہوگا۔''

''بھیا!...... آپ اور سراج بھائی واپس جا کر سلطان سے اس کمینے کا اتا پتا اگلوائیں ہم اپنی جگہ پر پہنچتے ہیں۔ باقی اپنے چند آدمی گاؤں کے مضافات میں بھی بھیج دینا وہ اسی علاقے میں ہے۔ ہو سکتا ہے ابھی تک سرکنڈوں کے اس جنگل سے ہی نہ نکلا ہو؟''

سراج زہریلے لہجے میں بولا۔ ''اگلوانے کی کیا ضرورت ہے؟...... اسے ڈرانے کے لیے ہمارا نام ہی کافی ہے، وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ ہم سے کچھ چھپانے کا مطلب، صرف اس کی نہیں اس کے پورے خاندان کی موت ہے۔''

منظور نے کہا۔ ''بھائی!...... ایک اور مشورہ بھی تھا؟''

''ہاں بولو۔'' باقی دو بھی اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

''ایسا کرتے ہیں کہ اس جنگل کو چاروں طرف سے گھیر کر آگ لگا دیتے ہیں۔ یا تو باہر نکل کر پکڑا جائے گا یا اندر ہی جل مرے گا۔ ہر دو صورت ہمارا مقصد حل ہو جائے گا۔''

اس کی بھیانک تجویز سن کر تابش کے پسینے چھوٹ گئے تھے۔

ظہور چند لمحے خاموش رہا اور یہ لمحے تابش پر بہت بھاری گزرے۔ جب وہ بولا تو تابش کی جان میں جان آئی۔

''نہیں یہ مناسب نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے وہ یہاں سے نکل گیا ہو۔ بہرحال زیادہ دور نہیں جا سکتا۔ رات کے ٹائم یوں بھی روڈ پر گاڑی نہیں ملتی۔ بالفرض وہ کوئی دوسرا ذریعہ اپنا کر یہاں سے بچ نکلتا ہے تب بھی ہم سے نہیں بچ سکتا۔''

شاہ جہان نے کہا۔ ''بھیا!...... اس کا بھی بندوبست کرنا پڑے گا کہ سلطانا، شہر جا کر اس کے والدین کو اطلاع نہ دے سکے۔''

ظہور نخوت سے بولا۔ ''بندوبست کیا......؟ اسے منع کر دو کہ گوٹھ چھوڑ کر کہیں نہیں جائے گا...... خلاف ورزی کی صورت میں اس کے کنبے سے جینے کا حق چھین لیا جائے گا...... اللہ اللہ خیر سلا۔''

''وہ ساتھ والے گاؤں میں جا کر، وہاں سے فون پر بھی تو اس خبیث کے والدین کو یہ اطلاع دے سکتا ہے...... وہاں تو موبائل فون کے سگنل بھی کام کرتے ہیں؟'' شاہ جہان نے ایک اور نکتہ اٹھایا۔

''سلطانے کو کہہ دو کہ جب تک ہمارا مطلوبہ آدمی ہمیں نہیں مل جاتا، وہ گاؤں چھوڑ کر کہیں نہیں جائے گا اور نہ کسی دوسرے آدمی کے ذریعے ہی یہ اطلاع شہر تک پہنچانے کا انتظام کرے گا۔'' جواب ظہور نے ہی دیا تھا۔

''فرض کرو بھیا!...... اتنی تگ و دو کے بعد بھی وہ کہیں غائب ہوگیا پھر کیا کریں گے؟...... کیا اس زیادتی کا بدلہ اس کے والدین سے لیں گے؟'' پوچھنے والا سراج تھا۔

چند لمحے سوچنے کے بعد ظہور نے جواب دیا۔

''پہلے تو ہم مجرم ہی کو تلاش کرنے کی کوشش کریں گے، کہ اسے قرار واقعی سزا دی جا سکے۔ اس کے ہمیشہ کے لیے روپوش ہو جانے کی صورت میں، اس کے والدین سے بدلہ لینا ہماری مجبوری بن جائے گی، ورنہ تو ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل ہی نہیں رہیں گے۔''

''میں تو کہتا ہوں چھوڑو اس ڈھونڈنے کو...... نمٹنا مکاؤ اس کے والدین کا ان کی میت کو کاندھا دینے تو آئے گا نا......؟ وہیں اسے بھی سارے غموں سے نجات دلا دیں گے۔'' شاہ جہان نے دانت پیستے ہوئے تابش کی سماعتوں میں زہر انڈیلا...... اس لمحے تابش کو اپنی ذات سے بہت زیادہ نفرت محسوس ہوئی، اس نے اپنی بے راہ روی سے ماں باپ کی جان خطرے میں ڈال دی تھی۔ وہ والدین جن کی وہ کوئی بات نہیں ٹالتا تھا۔

ظہور تحمل مزاجی سے بولا۔ ''میں تم لوگوں سے بھی زیادہ تپا ہوا ہوں...... مگر پہلے اسی موذی کو تلاش کرنے کی کوشش کریں گے...... یہ آخری حل ہے۔ یہ بھی تو سوچو کہ اس معاملے میں اس کے والدین بے قصور ہیں...... البتہ وہ ہمیشہ کے لیے کہیں روپوش ہو گیا، تو پھر دوسری بات ہے، اس وقت اپنے انتقام کو کسی منطقی رخ تک پہنچانا ہماری مجبوری ہوگی۔''

''میرا خیال ہے اب چلنا چاہیے......؟'' منظور نے مشورہ دیا۔ اور اس بات کی خاموش تائید کرتے ہوئے تمام وہاں سے کھسک لیے تھے۔

وہ دم سادھے وہیں پہ پڑا رہا۔ وہ تھکن سے نڈھال تھا اور کچھ سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں بھی جیسے مفلوج ہو کر رہ گئی تھیں، زندگی کی پہلی خطا آخری ثابت ہونے والی تھی۔ اپنے بازوؤں پر سر ٹیکتے ہوئے وہ اپنا محاسبہ کرنے لگا۔

☆☆☆

تابش کا والد محمود خان ایک بہت بڑا بزنس مین تھا۔ وہ منہ میں سونے کا چمچ لے کے پیدا ہوا تھا۔ والدین کا اکلوتا بیٹا ہونے کی وجہ سے بچپن ہی سے اس کی ہر جائز، ناجائز خواہش پوری کی جاتی، لیکن اس لاڈ پیار اور اکلوتے پن کی خصوصیت کے باوجود وہ بہت فرماں بردار اور اطاعت گزار بیٹا ثابت ہوا تھا کہ بچپن سے لڑکپن میں قدم رکھتے ہی اس کے والدین کو اپنی خوش بختی پر ناز ہونے لگا...... ایسا بیٹا قسمت والوں ہی کو ملا کرتا ہے۔

سلطان ان کا پرانا ملازم تھا۔ تابش بمشکل چند سال کا تھا جب اس کے والد محمود خان نے سلطان کو کام پر رکھا، وہ محمود خان صاحب کے اخلاق کا ایسا دیوانہ ہوا کہ وہیں کا ہو رہا...... تابش بچپن ہی سے اس مانوس ہو گیا تھا، سلطان کی حیثیت بھی ملازم سے زیادہ گھریلو فرد کی سی تھی۔ پچھلے سال تابش نے یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور انھی دنوں سلطان اس کے سامنے اپنے گاؤں سورج نگر کی تعریف میں رطب اللسان ہوگیا۔ گو پہلے بھی تابش کئی بار سلطان سے سورج نگر کا تذکرہ سن چکا تھا مگر گزشتہ سال سے تو ہر ٹائم وہ یہی راگ الاپا رہتا......

''چھوٹے صاحب!...... سورج نگر کی کیا بات ہے قسم سے زمین پر، جنت ہے جنت...... چھوٹے صاحب کوہ قاف اصل میں سورج نگر ہی کو کہتے ہیں...... لوگ

مری کاغان کی بات اس لیے کرتے ہیں کہ انھوں نے سورج نگر نہیں دیکھا...... یہ سورج نگر وہ سورج نگر، یہاں تک کہ تابش کے دل میں سورج نگر دیکھنے کا شوق جڑ پکڑ گیا۔ اور ایک دن اس نے ڈرتے ڈرتے والد صاحب سے سورج نگر دیکھنے کی بابت اجازت طلب کی۔ پہلے تو محمود خان صاحب نے اسے سختی سے جھڑک دیا۔

''ہوش میں تو ہو میاں!...... پتا بھی ہے کہ سورج نگر یہاں سے کتنی دور ہے؟''

اور تابش نے حسب عادت چپ سادھ لی ...... اسے خاموش دیکھ کر محمود خان صاحب نے تھوڑی دیر سوچا اور پھر پوچھنے لگا۔

''اچھا کتنے دنوں کے لیے جانا چاہتے ہو؟''

وہ خوشی سے بولا۔ ''بس چھ سات دن۔''

''او کے! ...... ایک ہفتے سے زیادہ نہیں ٹھہرنا وہاں۔''

''تھینک یو پاپا۔'' وہ ممنونیت سے بولا۔

اگلے دن وہ یہ خوش خبری سلطان چچا کو سنا رہا تھا۔

''چچا!...... اس بار جب چھٹی جاؤ گے تو میں بھی تمھارے ساتھ چلوں گا...... سورج نگر۔''

''سچ چھوٹے صاحب!......'' چچا سلطان خوشی سے اچھل پڑا تھا۔

''ہاں ......'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''پاپا سے بھی اجازت لے لی ہے۔''

''ہمیں چند دن تو میزبانی کا موقع دو گے نا؟''

وہ خوشی سے چہکا۔ ''ایک ہفتے کی اجازت ملی ہے۔''

''واہ چھوٹے صاحب!...... کمال کر دیا۔'' سلطان کی خوشی دیدنی تھی۔ اگلے ہفتے ہی اس نے چھٹی کا پروگرام بنا لیا۔ شہر سے اس کے گوٹھ تک بس پر سات آٹھ گھنٹے لگتے تھے، مگر تابش کے پاس اپنی خوبصورت ٹویوٹا کار موجود تھی اس نے والد صاحب سے کار لے جانے کی اجازت بھی لے لی تھی۔ صبح کا ناشتا کر کے وہ گھر سے نکلے۔ دن کے بارہ بجے وہ سورج نگر پہنچ چکے تھے۔ گوٹھ کے مضافات میں تابش کو کوئی ایسے مناظر دیکھنے کو نہ ملے جن کی وہ توقع کر رہا تھا۔ گو ایک بڑے شہر کی پُرشور فضا کی نسبت، گاؤں، دیہات کی زندگی بہت پُرسکون ہوتی ہے، گھروں کے وسیع صحن، کھلی گلیاں، لہلاتی فصلیں اور سب سے بڑھ کر سادہ دل لوگ ایک شہری پر مثبت اثرات ڈالتے ہیں۔ مگر جو کچھ وہ چچا سلطان سے سن چکا تھا اس کے عشر عشیر بھی اسے نظر نہیں آیا، اس کا موڈ سخت آف ہو گیا تھا۔

چچا سلطان کے گھر کے سامنے کار روک کر وہ باہر نکلے گاؤں بھر کے بچے و بچیاں وہاں جمع ہو گئے تھے۔ ان میں وہ بھی کھڑی تھی، جو بچیوں میں بڑی دکھ رہی تھی مگر بڑوں میں لازماً بچی لگتی۔ وہ پہلی نظر میں تابش کو بہت پسند آئی اور پھر جانے کیوں سورج نگر کے بارے سلطان چچا کی بتائی ہوئی ساری باتیں اسے سچ لگنے لگیں۔ ان کے سامان اتارنے تک وہاں کافی رش ہو گیا تھا۔ چھوٹے بچوں کے ساتھ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں بھی اکھٹے ہو گئے تھے۔

سلطان یوں تابش کو پکڑ کر گھر کے اندر لے گیا جیسے وہ کوئی خزانہ ہو اور گاؤں والے اسے لوٹ کر لے جائیں گے۔ مگر بچے، بچیاں، تابش کی کار کو گھیرے کھڑے رہے۔

چچا سلطان کے دو بیٹے تھے۔ بڑا بیٹا دس سال کا اور چھوٹا آٹھ سال کا تھا۔ اس کی بیوی ایک سادہ عورت تھی، وہ بڑے تپاک سے تابش سے ملی تھی۔ دوپہر کے کھانے میں اسے دیسی گھی میں بنا ساگ کھانے کو ملا۔ کھانے کے بعد سلطان چچا تو اسے سورج نگر کی سیر کرانے پر تلا تھا مگر اس کی بیوی شہناز آڑے آ گئی......

''کرامت کے ابا!...... بچے کو تھوڑا آرام کرنے دو ...... تھکا ہوگا...... سورج نگر کہیں بھاگا تو نہیں جارہا کل، پرسوں دیکھ لے گا۔'' اور سلطان نے اس کی جان بخشی کر دی، مگر اس کے باوجود وہ آرام نہیں کر پایا تھا کیوں کہ اسی وقت وہ دشمن جاں گھر میں داخل ہوئی۔

''سلام چچا!......'' کہہ کر اس نے شوخی سے تابش کی طرف دیکھا۔

''وعلیکم السلام!...... امیمہ بیٹی کیسی ہو؟''

''ٹھیک ٹھاک ہوں چچا!......'' وہ سلطان چچا سے محوِ گفتگو تھی مگر اس کی نظریں تابش پر ٹکی تھیں۔

سلطان چچا نے مسکرا کر پوچھا۔ ''آج رستا کیسے بھول پڑیں؟''

وہ ترکی بہ ترکی بولی۔ ''میں تو روزانہ چچی جان کے پاس آتی ہوں...... رستا تو آپ بھول پڑے ہیں۔''

شہناز نے لقمہ دیا۔ ''ہاں جی!...... امیمہ تو میری پکی سہیلی ہے۔''

''دیکھا چچا!......'' اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں گھمائیں۔

''ٹھیک کہا!...... ہم پردیسی جو ٹھہرے...... رزق حلال کمانے کے لیے گھر ہی میں اجنبی بن گئے ہیں۔''

''آپ تو خیر اجنبی نہیں ہیں...... البتہ یہ بابو ضرور اجنبی ہے۔''

''یہ تو میرے چھوٹے صاحب ہیں جی!......''

وہ شوخی سے بولی۔ ''چھوٹے صاحب تو آپ کے ہیں...... مجھے تو نام ہی بتا دیں محترم کا؟''

سلطان سے پہلے وہ خود بولا۔ ''تابش محمود...... امیمہ صاحبہ!...... یونیورسٹی کا طالب علم ہوں ...... فٹ بال کا کھلاڑی ہوں...... غیر شادی شدہ ہوں اور والدین کا اکلوتا بیٹا ہوں اور...... اور...... میرا خیال ہے اتنا ہی کافی ہے......؟''

وہ یونیورسٹی کا طالب علم تھا اور اتنا جوان نہیں تھا کہ شرماتا رہتا، البتہ یہ حقیقت تھی کہ امیر خاندان سے تعلق رکھنے کے باوجود وہ لڑکیوں سے دوستی رکھنے کا قائل نہیں تھا۔ یونیورسٹی میں چند ایک لڑکیوں نے اس سے دوستی کرنے کی کوشش کی تھی مگر اس کی لاتعلقی دیکھ کر پیچھے ہٹ گئی تھیں۔ مگر امیمہ میں ضرور کوئی ایسی بات موجود تھی کہ اسے دیکھتے رہنا تابش کو اچھا لگ رہا تھا۔

''ہائے اللہ جی!......'' وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر شہناز کی طرف بڑھ گئی۔

اس کے انداز پر سلطان کھل کھلا کر ہنس پڑا، جبکہ تابش دل پکڑ کر رہ گیا تھا۔ اگر اس کے بس میں ہوتا تو وہ اسی وقت والدین کو فون کر کے بتا دیتا کہ انھیں بہو ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں، یہ کام ان کے بیٹے نے کر لیا ہے۔ مگر وہ ایسا صرف سوچ سکتا تھا، کرنے کے لیے ہمت درکار تھی جو اس کے اندر مفقود تھی۔

''بڑی شوخ ہو رہی تھیں ...... اب میری طرف کیوں بھاگ رہی ہو؟'' شہناز نے امیمہ کو چھیڑا۔

''میں کب شوخ ہوئی ہوں ......؟'' اس نے منہ بنایا۔ ''میں نے تو بس نام پوچھا تھا ...... مجھے کیا پتا تھا ...... یہ شہری بابو تو بس بہانے ہی ڈھونڈتے رہتے ہیں۔''

''چچا سلطان!...... یہ ہے کون؟......'' تابش نے جان پوچھ کر بات بڑھانی چاہی۔

سلطان سے پہلے وہ تنک کر بولی۔ ''میرا نام امیمہ ہے، آٹھ جماعت پاس ہوں، والدین کی ایک ہی بیٹی ہوں، منگنی وغیرہ نہیں ہوئی ...... اور ...... اور ہاں، تم کسی غلط فہمی میں بھی نہ رہنا......؟''

''ہا...... ہا...... ہا......'' سلطان اور شہناز بے ساختہ ہنس پڑے تھے۔

''مجھے بھلا کیا غلط فہمی ہو سکتی ہے......؟ اتنی حور پری تو ہو نہیں ...... ورنہ اب تک تمھاری منگنی ہو جاتی۔'' تابش

بھی کب خاموش رہنے والا تھا۔

وہ بپھرتے ہوئے بولی۔ ”اے منگنی نہ ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ رشتا بھی نہیں آیا...... اس طرح سے تو تمھاری بھی منگنی نہیں ہوئی، تو کیا تم بھی گئے گزرے ہو ؟“

”یہ کس نے کہا کہ میری منگنی نہیں ہوئی ؟...... میں نے کہا شادی نہیں ہوئی۔“ تابش نے جان بوجھ کر جھوٹ بولا۔

”آپ لوگ تو تکرار میں پڑ گئے ہو؟......“ شہناز گھبرا کے بولی۔ ”امیمہ! ...... تم ہی کچھ خیال کرلو مہمان ہے۔“

”میں کب اس کے منہ لگی ہوں......؟“ وہ مصنوعی ناگواری سے بولی۔ ”یہ خود گلے پڑ رہا ہے۔“

”سلطان چچا! ...... میرا خیال ہے مجھے واپس چلے جانا چاہیے......؟“

سلطان سرعت سے بولا۔ ”کیوں چھوٹے صاحب! ......؟“

تابش نے اپنے لہجے میں دکھ سموتے ہوئے کہا۔ ”جہاں مہمانوں کی عزت ہی کوئی نہ ہو وہاں رہ کر کیا کرتا ؟“

”چھوٹے صاحب! ...... بچوں کی بات کا برا نہیں مناتے۔“ سلطان جیسے جہاندیدہ کو اس کے لہجے میں شامل مصنوعی دکھ پہچاننے میں کوئی دقت نہیں ہوئی تھی۔

امیمہ چھاتی نکال کر بولی۔ ”میں بچی نہیں ہوں۔“

”ساری بچیاں ہی یہی کہتی ہیں ......“ تابش کو چوٹ کرنے کا موقع ہاتھ آ گیا تھا۔ ”جب بڑی ہو جاتی ہیں، پھر کہتی پھرتی ہیں، ہماری عمر ہی کیا ہے؟“

امیمہ چڑچڑے پن سے بولی۔ ”بچے ہو گے تم خود......“

”آؤ چھوٹے صاحب! ...... بچوں سے کیا بحث کرنا ؟“ سلطان اسے کمرے کے اندر لے آیا اور وہ پاؤں پٹختی وہاں سے واک آؤٹ کر گئی۔

”چچا سلطان! ...... یہ کون ہے؟...... اس کا کوئی اتا پتا؟“ کمرے داخل ہوتے ہی، امیمہ کے بارے دل میں مچلتے سوالات کو گویائی ملی۔

”نہ پوچھیں تو بہتر ہوگا چھوٹے صاحب۔“ چچا سلطان کا لہجہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا تھا۔ ”البتہ یہ بتاؤ کہ تمھاری منگنی کب ہوئی۔“

”وہ میں نے یونہی جھوٹ بولا تھا۔ اور نہ پوچھنے کا...... کیا مطلب؟“ وہ حیران ہی تو رہ گیا تھا۔

چچا سلطان نے دکھی لہجے میں کہا۔ ”چھوٹے صاحب ہمارے گوٹھ میں چار موذی بستے ہیں...... چاروں بھائی ہیں، اول درجے کے چھٹے ہوئے بدمعاش، سارا گوٹھ ان سے ناک تک آیا ہوا ہے مگر کسی میں اتنی جرأت نہیں کہ انھیں روک ٹوک سکے۔ وڈیرا بھی ان سے دب کر بات کرتا ہے۔ اور یہ معصوم لڑکی انھی بدبختوں کی بد نصیب بہن ہے۔“

”بدنصیب کیوں چچا! ......؟“

”بدنصیب ہی تو ہے چھوٹے صاحب! ...... جس لڑکی نے ساری زندگی گھر میں بیٹھنا ہو وہ بدنصیب ہی تو ہوتی ہے؟“

”کیا......؟ اتنی خوبصورت لڑکی کے لیے کوئی رشتا نہیں آئے گا؟“ وہ ششدر رہ گیا تھا۔

”اگر یہ ان موذیوں کی بہن نہ ہوتی تو اب تک اس کے کئی رشتے آ گئے ہوتے ...... یوں بھی ہمارے علاقے میں بالغ ہوتے ہی بچیوں کی شادی کر دی جاتی ہے۔“

”دس نمبری تو اس کے بھائی ہیں...... اس بچاری کا کیا قصور؟“

”کاش ہمارے معاشرے میں رشتا کرتے وقت صرف لڑکی کو دیکھا جاتا...... اس کا جہیز، مالی حالت اور

اس کے رشتاداروں کوزیر بحث نہ لایا جاتا۔"

"آپ کا مطلب ہے اپنے بھائیوں کی وجہ سے بہ اس کی شادی نہیں ہو سکے گی؟"

"آپ بالکل ٹھیک سمجھے......ان چاروں کی بہن کو گھر میں رکھنا بڑا دل گردے کا کام ہے......کیونکہ خانگی زندگی میں......تُو تُو، میں میں ہونا، روز مرہ کی بات ہے، مگر جب لڑکی کی پشت پر اس قسم کے لٹھ مار بھائی موجود ہوں اور وہ بھی ایک دو نہیں، پورے چار......وہاں تو شوہر غریب ڈر ڈر کر ہی مر جائے گا۔"

"ضروری نہیں کہ لڑکی بھی اپنے بھائیوں کی طرح ہی ہو؟"

"صحیح کہا......مگر رسک کون لیتا ہے؟......کیا آپ یہ رسک لے سکتے ہیں؟"

سلطان کے سوال پر اس نے چونک کر اسے دیکھا ......اور پھر چند لمحے سوچنے کے بعد بولا۔"اگر ممی، پاپا راضی ہو جاتے ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

"اور آپ کا کیا خیال ہے......؟ وہ راضی ہو جائیں گے؟"

"شاید نہیں......" تابش نے خفیف ہو کر سر نیچے جھکا لیا۔

"شاید نہیں، یقیناً کہیں چھوٹے صاحب......ایک تو لڑکی خاندانی لحاظ سے آپ کے ہم پلہ نہیں ہے دوسرا اس کے بھائیوں کی بری شہرت بھی اس راہ میں رکاوٹ ہوگی اور سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ آپ میں اتنی جرأت ہی نہیں ہے کہ اپنے والدین کی مخالفت میں کوئی کام کر سکیں۔"

"غالباً آپ مجھ پر طنز کر رہے ہیں......مگر حقیقت یہی ہے کہ میں امی ابو کی اجازت کے بغیر شادی جیسا اہم قدم نہیں اٹھا سکتا۔" تابش نے اس بات کی تردید کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"چھوٹے صاحب!......آپ جیسی سعادت مند اور فرماں بردار اولاد قسمت والوں ہی کے نصیب میں ہوتی ہے۔"

"مگر چچا!......سورج نگر کے آس پاس بھی کئی گوٹھ موجود ہیں؟......اگر اس کے بھائی چاہیں تو کسی اور گوٹھ میں بھی اپنی بہن کا رشتا طے کر سکتے ہیں۔"

"چھوٹے صاحب!......ایک تو یہ چاروں سورج نگر ہی نہیں پورے علاقے میں بدنام ہیں......دوسرا ہمیشہ لڑکے والے رشتا مانگتے ہیں، لڑکی والے منہ اٹھا کے نہیں بھاگتے رہتے۔"

"چچا!......کئی ایسے لڑکے ہوتے ہیں جن کو کہیں رشتا نہیں ملتا......کیا وہ بھی امیمہ ایسی لڑکی کو قبول نہیں کریں گے؟"

"اتنے گئے گزرے تو اس کے بھائی بھی نہیں کہ یونہی اٹھا کر پھینک دیں......وہ بھی تو اچھے خاندان میں بہن کا رشتا کرنا چاہیں گے۔"

"میرا خیال ہے......آپ نے چائے کا بتا دیا ہے؟" تابش نے اس موضوع سے جان چھڑائی......اس کی بلا سے امیمہ کا رشتا کہیں بھی نہ ہوتا۔

"ابھی کہے دیتا ہوں چھوٹے صاحب! ......بہر حال اس لڑکی کے بارے نہ تو اتنی چھان بین کی ضرورت ہے، اور نہ ایسی لڑکی کو زیادہ منہ لگانا بہتر ہے۔"

"وہ کیوں چچا!......؟"

"بس یونہی، اچھا میں چائے کا کہہ دوں؟" سلطان نے اس موضوع پر مزید روشنی ڈالنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

تابش کو بھی سمجھ نہیں آئی کہ چچا سلطان یہ بات طنزیہ کہہ رہا تھا یا سچ وہ اسے امیمہ سے دور رہنے کا مشورہ دے رہا تھا۔

☆☆☆

مگر چچا سلطان کی نصیحت یا مشورے پر وہ ایک فیصد بھی عمل نہیں کر سکا تھا، کیونکہ عصر کے ٹائم جب وہ اپنے کمرے سے نکلا تو امیمہ اسے شہناز کے ساتھ ہی رسوئی میں بیٹھی نظر آئی۔ تابش پر نظر پڑتے ہی وہ شوخ لہجے میں بولی۔

''واہ بابو!..... سورج نگر دیکھنے آئے ہو یا نیند پوری کرنے؟''

''یہاں دیکھنے کے لیے ہے ہی کیا؟'' تابش نے اس کے سراپے پر بھرپور نگاہ ڈال کر نظریں پھیر لیں۔ حالانکہ کہ اس کا دل کہہ رہا تھا.....

ع ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ

امیمہ نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔ ''کہیں تمہیں کم دکھائی تو نہیں دیتا؟''

''ویسے میں آپ کی آمد کا مقصد جان سکتا ہوں؟'' تابش کو اسے چھیڑنے میں مزہ آنے لگا۔

''میں تو بس یونہی .....'' اس کے چہرے پر گھبراہٹ بھرے آثار نمودار ہوئے۔

''آپ تو گھبرا گئیں؟'' تابش نے خفیف سا ہو کر اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔ اس کے دل کو کچھ ہونے لگا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اسے چچا سلطان کی باتیں یاد آئیں اور اسے امیمہ سے شدید ہمدردی محسوس ہوئی، اتنی پیاری لڑکی کتنا برا نصیب ساتھ لے آئی تھی۔

''اچھا آنٹی میں چلتی ہوں۔'' شہناز کو دھیرے سے کہتے ہوئے وہ آہستہ روی سے باہر کی جانب چل دی۔

''ہیلو!..... بات سنو؟'' تابش نے اسے آواز دی ..... اس کا اس طرح خفا ہو کر چل دینا اسے بری طرح کھل رہا تھا۔

''جی!.....'' وہ پیچھے مڑ کر مضطرب انداز میں ہاتھ مروڑنے لگی۔

''کیا آپ مجھے سورج نگر کی سیر کرا سکتی ہیں؟''

''مم ..... میں؟ میں کیسے سیر کرا سکتی ہوں؟..... میں کوئی لڑکا تو نہیں ہوں کہ آپ کے ساتھ گھوم پھر سکوں۔ بھائی لوگوں نے دیکھ لیا تو زندہ دفنا دیں گے مجھے۔''

''گویا یہ احتیاط صرف بھائیوں کے لیے ہے..... محترمہ کو کوئی اعتراض نہیں۔'' تابش کے دل میں مچلا سوال لبوں تک رسائی نہ پا سکا۔ اسی وقت سلطان کی بیوی بولی۔

''چھوٹے صاحب! یہ شہر تو نہیں ہے نا جہاں لڑکے لڑکیاں اکٹھے گھومتے ہیں۔'' وہ بھی سلطان کی دیکھا دیکھی اسے چھوٹے صاحب کہہ کر پکارنے لگی تھی۔

''اچھا یہیں بیٹھ کر مجھے سورج نگر کی اہم جگہوں کے بارے بتاؤ..... جو میں بعد میں چچا سلطان کے ساتھ جا کر دیکھ آؤں؟'' تابش کا مقصد اس کے دل سے اس توہین کا اثر زائل کرنا تھا۔

امیمہ کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ واپس لوٹ آئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ بڑے زور و شور سے اسے سورج نگر کے متعلق معلومات فراہم کر رہی تھی۔ مگر تابش کو یوں محسوس ہو رہا تھا کہ وہ سورج نگر سے زیادہ اپنے بارے میں تفصیل بتلا رہی ہے۔ وہ دل چسپی سے اس کی طرف متوجہ رہا گاہے گاہے وہ کوئی نہ کوئی سوال بھی پوچھ لیتا۔ شہناز غیر محسوس انداز میں وہاں سے ہٹ گئی تھی۔ اور پھر کسی کام کے بہانے گھر ہی سے نکل گئی۔ سلطان بھی پتا نہیں کہاں غائب تھا۔ وہ دونوں اکیلے محو گفتگو رہے۔ اور پھر جانے وہ کون سی کیفیت تھی جس کے زیر اثر تابش نے پوچھا.....

''امیمہ! کبھی کسی لڑکے سے بھی دوستی کی ہے؟''

پٹر پٹر باتیں کرتی امیمہ کی زبان کو بریک لگی اور سر جھکاتے ہوئے اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''کیوں ؟'' تابش کا دل خوش گوار انداز میں دھڑکنے لگا تھا۔

وہ معصومیت سے بولی۔ ''پتا نہیں ؟''

''پتا نہیں ...... یا بتانا نہیں چاہتی ہو؟'' تابش نے اسے کریدا۔

''بابو!...... سچ تو یہ ہے کہ کسی میں اتنی جرأت ہی نہیں کہ مجھ سے دوستی کا سوچ سکے اور مجھے کوئی اچھا ہی نہیں لگا کہ میں کوشش کرتی سوائے ....؟''

''بولو بولو...... چپ کیوں ہوگئیں ؟...... سوائے کس کے......؟''

''کچھ نہیں بابو!...... مجھے چلنا چاہیے۔ شام کی اذان ہونے والی ہے، یہ نہ ہو بھائی لوگ مجھے ڈھونڈنے نکل پڑیں۔''

''اچھا کل بتا دینا...... اور ابھی چاہو تو، میں تمھیں کار میں چھوڑ آؤں؟''

وہ رسان سے بولی۔ ''مجھے مروانے کا ارادہ ہے تو چلو۔''

''یہ مرنے مروانے کی باتیں کیوں ہو رہی ہیں بھئی؟'' سلطان جمائی لیتا خواب گاہ سے برآمد ہوا۔

تابش اسے دیکھ کر حیران ہو گیا تھا، اس کے تئیں ان دونوں کے علاوہ گھر میں کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکا......

''چچا سلطان !...... آپ اب تک سوئے ہوئے تھے؟''

''ہاں چھوٹے صاحب! پتا ہی نہ چلا ٹائم کا...... اور یہ کرامت کی ماں کہاں چلی گئی؟''

''یہیں پھر رہی تھی بھب ...... چچا؟''

امیمہ اپنی رو میں اسے بھیا کہہ رہی تھی...... مگر پھر خیال آنے پر وہ تخاطب بدل گئی۔

تابش کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھری۔ اس نے سوچا۔ ''بے چاری کے چار بھائی ہیں ...... انھیں بھائی، بھائی کہتے اب ہر مرد کے لیے اس کے منہ سے بھیا ہی نکلے گا؟''

''اچھا کوئی مرنے مروانے کی باتیں ہو رہی تھیں؟'' سلطان نے اپنی بات دہرائی۔

''چچا!...... بابو پوچھ رہا تھا تجھے کار پر چھوڑ آؤں ...... تو مجھے جواباً کہنا پڑا کہ کیا بھائیوں سے مروانے کا ارادہ ہے۔''

سلطان ہنسا۔ ''دیوار کے دوسری طرف تو اس کا گھر ہے......؟''

''مجھے کیا پتا اس کا گھر کہاں ہے؟...... اس نے خود بھی تو نہیں بتایا نا چچا؟''

وہ شوخی سے بولی۔ ''مجھے کیا ضرورت ہے غیر مرد کو اپنے گھر کا پتا بتانے کی ؟''

''واہ ...... اتنی دیر سے گپ کر رہی ہو ...... کیا غیر مردوں سے اس طرح گپیں ہانکی جاتی ہیں؟''

وہ شوخی سے بولی۔ ''اب تم بار بار پوچھ رہے تھے، جواب نہ دیتی تو بد اخلاق کہتے۔ دو باتیں کر لیں تو پتا پوچھنے پہ آ گئے، توبہ ہے ...... یہ شہری لڑکے بھی کتنے چالاک ہوتے ہیں؟''

تابش کے ہونٹوں پہ بھی مسکراہٹ رینگ گئی۔ اس نے سوچا۔ ''ناز و ادا کسی سکول یونیورسٹی میں سکھائی جاتیں تو گاؤں کی لڑکیاں اس بارے صفر ہوتیں۔ یقیناً مردوں کو متوجہ کرنے کے لیے کسی عورت کو سکول یونیورسٹی کی ضرورت نہیں ہوتی۔''

''اچھا سادہ اور بھولی بھالی بی بی!...... اب آپ گھر جائیں۔''

اور وہ ''ہونہہ!......'' کرتے باہر نکل گئی۔

''چچا سلطان!...... آج تو سورج نگر کی سیر کو نہیں جا سکے ہیں ...... صبح ان شاء اللہ ضرور جائیں گے۔''

''ضرور چھوٹے صاحب! ......'' سلطان نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''ویسے چچا! ......اسے بھائی اس طرح آوارہ پھرنے پر کچھ نہیں کہتے؟'' تابش کے ذہن میں امیمہ کے بارے خوب تجسس بھرا تھا۔

''آوارہ کہاں پھرتی ہے بے چاری؟'' سلطان نے امیمہ کی طرف داری کی۔

''آوارہ ہی تو ہوئی نا چچا! ......شام ہونے کو ہے، اور ابھی گھر لوٹے گی بھائی پوچھیں گے نہیں کہاں رہی اتنی دیر؟''

''نہیں چھوٹے صاحب! ...... یہ صرف ہمارے گھر تک آ جاتی ہے کرامت کی ماں کے پاس، اس کے علاوہ دائیں بائیں نہیں جاتی ...... البتہ اس کے بھائی اس لیے نہیں منع کرتے کہ وہ جانتے ہیں، ان کی بہن کو وہی چھیڑے گا جس نے خودکشی کرنی ہوگی۔''

''ویسے اس کے بھائیوں کو آپ کچھ زیادہ ہی خون خوار اور ڈراؤنا بنا کر پیش نہیں کر رہے؟''

''نہیں چھوٹے صاحب! کچھ کم ہی بتایا ہوگا۔''

اس وقت شام کی اذان شروع ہوگئی تھی تابش مزید کوئی سوال کیے بغیر وضو کے لیے باتھ روم کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

اگلے دن امیمہ صبح سویرے وہاں پہنچ گئی تھی ......اور پھر تابش کی ایما پر سلطان نے اسے بھی ساتھ چلنے کی دعوت دے دی، اس مقصد کے لیے اس نے اپنی بیوی شہناز کو بھی ساتھ لینا ضروری سمجھا تھا۔

''چچا سلطان! اس کے بھائی برا تو نہیں منائیں گے؟'' امیمہ کے بے تکلف کار میں بیٹھ جانے پر اس نے سلطان سے پوچھنا ضروری سمجھا تھا۔

سلطان اسے تسلی دیتا ہوا بولا۔

''نہیں ہم دونوں میاں بیوی کی موجودگی میں وہ یقیناً برا نہیں منائیں گے۔'' اور تابش فقط سر ہلا کر رہ گیا تھا۔

امیمہ کو کار کی سواری کا بہت شوق تھا۔ ان دونوں عورتوں کی مسرت اور اردگرد مناظر کے بارے بے ساختہ استفسارنہ گفتگو سے تابش خود کو مہمان کے بجائے میزبان سمجھنے لگا تھا۔ دوپہر کے کھانے تک وہ واپس لوٹ آئے تھے۔ سورج نگر عام سے دیہاتوں کی طرح کا ایک دیہات ہی تھا، فرق صرف اتنا تھا کہ باقی دیہاتوں میں امیمہ نہیں تھی اور صرف اس کی وجہ وہ عام سا دیہات بھی شاید بہت خاص ہوگیا تھا۔

کبھی کبھی تابش اسے سچ مچ اپنانے کی بابت سوچنے لگتا مگر جب والدین کی سوالیہ صورت سامنے آتی تو اس کی ہمت جواب دے جاتی۔ اس نے لڑکپن سے ابھی تک والد کی کسی بات سے اختلاف نہیں کیا تھا۔ زندگی کے جس موڑ پر بھی والدین نے اسے کوئی مشورہ دیا اس نے حکم سمجھتے ہوئے بے چوں و چراں قبول کر لیا تھا۔ اپنی خواہش کا اظہار وہ اتنے نارمل انداز میں والدین کے سامنے کرتا کہ وہ اس کی بات کو کوئی اہمیت ہی نہیں دے پاتے تھے۔ اپنی بات منوانا اس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ کپڑوں، جوتوں سے سواری تک اور موبائل فون سے وڈیو گیم اور لیپ ٹاپ تک سب میں اس کے والدین کی مرضی اور پسند شامل تھی۔ اسے یاد تھا کہ ایک بار اس نے غلطی سے اپنے لیے ایک سپورٹس شرٹ خریدی تھی۔ مگر اسے پہننے کی نوبت نہیں آسکی تھی کہ اس کے والد نے دیکھتے ہی اسے ناقابلِ استعمال قرار دے دیا تھا۔

''ایسا واہیات رنگ شریف آدمی نہیں پہنا کرتے۔ یہ مالی کو دے دو اس کا بیٹا تیرا ہم عمر ہی ہے۔''

اور تابش نے بغیر کسی لیت و لعل کے وہ شرٹ مالی کے بیٹے کے حوالے کر دی تھی۔

اگلے دن وہ خود بیٹے کے لیے درجن بھر سپورٹس شرٹس خرید لایا تھا۔ اس نے کبھی تابش کو کسی چیز کی کمی محسوس نہیں ہونے دی تھی، بس اصول یہی تھا کہ ہر چیز میں اس کی مرضی کا شامل ہونا لازم تھا اور اب ناممکن تھا کہ تابش کی زندگی کے سب سے بڑے فیصلے پر وہ بے چوں و چراں سر جھکا لیتے۔ پھر امیمہ کا سٹیٹس بھی تھا۔ اپنے والدین کو اعلیٰ ظرف سمجھنے کے باوجود وہ یہ یقین کرنے پر تیار نہیں تھا کہ وہ امیمہ کو بطور بہو خوش آمدید کہتے۔

شہناز کے اصرار پر امیمہ نے دوپہر کا کھانا وہیں کھا لیا تھا، اس کا بے جھجک انداز اس بات کا مظہر تھا، کہ وہ پہلی مرتبہ وہاں کھانا نہیں کھا رہی تھی۔

''چچا سلطان! ...... کیا آپ یقین کریں گے کہ دیسی مرغ میں زندگی میں پہلی مرتبہ کھا رہا ہوں۔'' مرغ کی ران کے ساتھ زور آزمائی کرتے تابش نے انکشاف کیا۔

''اس میں نہ ماننے والی کون سی بات ہے جناب؟'' کھلے کچن میں بیٹھی امیمہ بغیر کسی حیرانی کے بولی۔ ''پاکستان میں ایسے لاکھوں کنجوس سیٹھ موجود ہوں گے جنھوں نے زندگی میں کبھی دیسی مرغ کھانے کی ہمت نہیں کی ہوگی۔''

''میرے کس عمل سے تمھیں محسوس ہوا کہ میں کنجوس ہوں؟'' تابش نے چڑتے ہوئے پوچھا۔

''اتنی دور سے آتے ہوئے بھی اپنے نوکر کے بچوں کے لیے کوئی تحفہ نہیں لائے، مجھے بھی ابھی تک کوئی تحفہ نہیں دیا، حالانکہ گاؤں بھر میں مجھ سے زیادہ خوب صورت لڑکی موجود نہیں ہے اور کیا ہوتی ہے کنجوسی؟...... کنجوسوں کے اگر سینگ ہوتے تو آپ لازماً بارہ سنگھا ہوتے۔''

تابش کو اس کی بچوں والی بات میں سو فیصد حقیقت نظر آئی...... اسے یقیناً سلطان کے بچوں کے لیے کچھ لانا چاہیے تھا۔

''امیمہ! ...... چپ رہو ...... ایسی باتیں نہیں کیا کرتے۔'' سلطان نے اسے ڈانٹا۔

''تمھیں کیا پتا میں بچوں کے لیے کچھ لایا ہوں یا نہیں؟...... باقی اگر تم سورج نگر کی خوب صورت لڑکی ہو تو پتا نہیں بدصورت کیسی ہوں گی......؟ مجھے تو تمھاری شکل ہی سے خوف آتا ہے۔'' تابش نے جھوٹ بول کر اپنی عزت بچائی اور ساتھ ہی اسے بھی شرمندہ کرنا مناسب سمجھا۔

''یوسف ثانی تو آپ ہیں نا؟'' اس نے زبان نکال کر تابش کو چڑایا۔

''تمھیں شک ہے کیا؟''

''امیمہ! ...... مہمان کے ساتھ لڑتے شرم نہیں آتی......؟'' سلطان نے ایک بار پھر امیمہ پر آنکھیں نکالیں۔

وہ خفا ہوئے بغیر جھٹ سے بولی...... ''مہمان کو بھی تو شرم نہیں آ رہی۔'' اس کے بے ساختہ انداز پر تابش کی ہنسی نکل گئی تھی۔ جبکہ سلطان افسوس بھرے انداز میں سر ہلاتا گھر سے باہر نکل گیا۔

ان کی نوک جھوک جاری رہی اور پھر کسی کام کی وجہ سے شہناز وہاں سے دائیں بائیں ہوئی اور امیمہ کی قینچی کی طرح چلتی زبان کو بریک لگ گئی۔

''چپ کیوں ہو گئی ہو؟'' تابش کے لہجے میں پہلے والا بیگانہ پن اور ترشی غائب تھی۔

''کچھ نہیں۔'' وہ پاؤں کے انگوٹھے سے زمین کریدنے لگی۔

''کل تم نے جواب ادھورا چھوڑ دیا تھا...... قواعد کی رو سے 'سوائے' کے بعد بھی شاید کچھ لگنا چاہیے تھا؟''

''کیا فائدہ بابو!......'' اس کے لہجے میں مایوسی بھر

گئی تھی۔

"کیا مطلب......؟"

"مطلب یہ، کہ......ضروری نہیں جو مانگا جائے وہی مل بھی جائے۔"

"بجھارتیں ڈالنے کے بجائے اگر اصل بات بتادو تو احسان ہوگا۔" اسے بے چینی ہو رہی تھی۔

"اگر میں چاہوں کہ کوئی امیر کبیر اور خوب صورت شہری بابو مجھے اپنا لے تو یہ سپنا ہی ہوگا نا؟......ایسا سپنا جس کی تعبیر نہیں ہوا کرتی۔"

"پہلے کوئی خوب صورت بابو تو ڈھونڈ لو۔"

"ڈھونڈ تو لیا ہے......" وہ اس کے چہرے پہ نظریں گاڑتے ہوئے بے باک لہجے میں بولی۔ "بہت پیارا، بہت خوب صورت اور بہت امیر۔"

"مجھے بھی دکھاؤ دو؟"

"اس وقت آئینہ نہیں ہے میرے پاس۔" اس نے سر جھکاتے ہوئے شرمیلے لہجے میں کہا۔

اس کے خوب صورت جواب پر تابش حیران رہ گیا تھا، لیکن اس کے ساتھ ہی اسے یہ محسوس ہوا کہ امیمہ اسے ایک ایسے رستے پر کھینچ کر لے جانا چاہتی ہے، جس پر وہ اس کا ساتھ نہیں دے سکتا تھا۔ وہ بے بسی سے بولا۔

"امیمہ!......کاش میں تمھیں کوئی تسلی دے سکتا؟"

اب حیران ہونے کی باری امیمہ کی تھی......"آپ کو کیا مجبوری ہے؟......کیا وہ منگنی کی بات سچ تھی؟" وہ تم سے آپ پر آگئی تھی۔

"نہیں......لیکن والدین کی اجازت کے بغیر میں اتنا بڑا قدم نہیں اٹھا سکتا......کیونکہ یہ یقینی بات ہے کہ وہ اس رشتے کو کبھی قبول نہیں کریں گے۔"

وہ نم آنکھوں سے بولی۔ "بابو!......میں بہت آگے آ چکی ہوں، اتنی کہ شاید زندہ واپس نہ مڑ سکوں؟"

تابش دو ٹوک لہجے میں بولا۔ "مگر میں نے تو تمھیں ایسی کوئی امید نہیں دکھائی تھی؟"

"خواب پوچھ کر تو نہیں آتے بابو!......" کہہ کر وہ تیز قدموں سے باہر نکل گئی۔ تابش سوچوں میں کھو گیا، امیمہ خوب صورت تھی، اسے پسند تھی اور اس کے بھائیوں کی وجہ سے اسے امیمہ سے ہمدردی بھی تھی لیکن اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت تھی کہ وہ والدین کی اجازت کے بغیر اسے نہیں اپنا سکتا تھا۔ رات بھر وہ اسی کے خیالوں میں کھویا رہا تھا۔ وہ خوب صورت تھا یا نہیں......لیکن یہ حقیقت تھی کہ اس سے محبت کا اظہار کرنے والی پہلی لڑکی امیمہ ہی تھی۔

☆☆☆

اگلے دن امیمہ ان کے گھر نہیں آئی تھی۔ وہ بھی سلطان سے کچھ پوچھے بغیر اس کے ساتھ سورج نگر کی سیر کو نکل گیا۔ آج وہ پیدل ہی گھومتے رہے اور دوپہر کے کھانے تک وہ گھر لوٹ آئے تھے۔ واپسی پر امیمہ اسے شہباز کے ساتھ باتیں کرتی ملی۔ اس کے چہرے پر کل والی گفتگو کا کوئی تاثر موجود نہیں تھا۔ کھانا کھا کر وہ اپنے کمرے میں چلا آیا تھا، پر اس وقت اس کی حیرانی کی انتہا نہ رہی جب چند لمحوں بعد وہ بھی اس کے کمرے میں گھس آئی۔ اور اس سے پوچھے بغیر بید کے موڑھے پر براجمان ہوگئی۔

"تو پھر کیا سوچا؟"

"میرا خیال ہے میں نے سوچنے کی مہلت نہیں مانگی تھی؟" تابش مزید آگے جانے کے لیے تیار نہیں تھا۔

"کیا میں تمھیں اچھی نہیں لگتی؟"

"لگتی ہو......مگر میں اپنی مجبوری تمھیں بتا چکا ہی ہوں؟"

"تو میں کیا کروں؟" وہ موڑھے سے اٹھ کر اس کی چارپائی پر آ بیٹھی تھی۔

وہ گھبرا کر بولا۔ "کیا کر رہی ہو......؟ چچا سلطان آ

گیا تو بے عزتی ہو جائے گی۔"
"کوئی نہیں ہوتی بے عزتی ..... میں لڑکی ہو کر نہیں ڈر رہی، مرد بنو۔"
وہ اپنی جگہ پہ سکڑتا ہوا بولا۔ "مرد تو میں ہوں ..... لیکن جان بھی پیاری ہے اور عزت بھی۔"
"اچھا عصر کی اذان کے بعد میں تمہارا بڑے ٹیلے کے پاس انتظار کروں گی، وہی ٹیلہ جس کی چوٹی پر کیکر کا بڑا سا درخت ہے۔"
"پاگل تو نہیں ہوگئی ہو؟" تابش کے ذہن میں اس کے بھائیوں کی خوف ناک خیالی شکلیں گھومیں۔
وہ بے باکی سے بولی۔ "پاگل تو مجھے تُو نے کر دیا ہے۔ میں کچھ نہیں جانتی تمہیں آنا پڑے گا۔"
"امیمہ! ..... یہ ٹھیک نہیں ہے۔" اس نے اسے سمجھانا چاہا۔
وہ نم آنکھیں لیے پوچھنے لگی۔ "دیکھو بابو! ..... میں جانتی ہوں تمہیں پا نہیں سکتی ..... لیکن کیا تم چند ملاقاتوں کی خیرات بھی میری جھولی میں نہیں ڈالو گے جن کے سہارے میں اپنی بقیہ زندگی گزار سکوں؟"
"امیمہ! ..... تم نہیں جانتی عورت کی عزت کتنی نازک ہوتی ہے ..... باقی ہم دونوں جوان ہیں، تنہائی میں بہکنے میں دیر نہیں لگتی؟"
"مجھے نصیحتوں کی ضرورت ہوتی تو کسی بوڑھے سے مشورہ کر لیتی ..... میں انتظار کروں گی۔" وہ اس کا جواب سنے بغیر باہر نکل گئی۔
اور پھر عصر کی اذان کے وقت اس کے قدم غیر ارادی طور پر اس بڑے ٹیلے کی طرف بڑھنے لگے۔ اس کا ارادہ امیمہ کو سمجھانے کا تھا۔
امیمہ اسے منتظر ملی تھی۔
وہ اعتماد سے بولی۔ "میں جانتی تھی آپ آئیں گے۔"
"میں تمہیں سمجھانے آیا ہوں۔"
ہونہہ! ..... سمجھانے۔" وہ اسے بازو سے پکڑ کر جھاڑیوں کے گھنے جھنڈ میں لے گئی۔
"یہاں بیٹھ کر سمجھاؤ۔" جھاڑیوں کے درمیان نسبتاً ایک صاف جگہ دیکھ کر وہ زمین پر بیٹھتے ہوئے بولی۔
"امیمہ کسی نے ہمیں یہاں دیکھ لیا تو بات کا بتنگڑ بن جائے گا؟" ایک نوجوان لڑکی کے ساتھ یوں چھپ کر تنہائی میں بیٹھنا ایک عجیب تجربہ تھا۔
"تو دیکھ لے ..... ہم کون سا گناہ کا کام کر رہے ہیں؟"
"تو اور گناہ کے سینگ ہوتے ہیں ..... جوان لڑکے اور لڑکی کا تنہائی میں مل بیٹھنا گناہ ہی کہلاتا ہے بس امیمہ صاحبہ! ....."
"اچھا سچ بتاؤ میں کیسی لگتی ہوں؟" اس نے تابش کا داہنا ہاتھ اپنے ملائم ہاتھوں کے بیچ میں لے کر دبایا۔
اس کی بات کا جواب وہ گول کر گئی تھی۔
"بات میری پسند، ناپسند کی نہیں ہے"۔ تابش اسے سمجھانے کی تگ و دو میں تھا۔
"لگتا ہے لڑکا میں ہوں ......؟" امیمہ نے طنزیہ انداز میں اس کی غیرت کو للکارا۔
"مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے؟" وہ صاف گوئی سے بولا۔
"ڈرپوک ......؟" کہہ کر وہ مزید اس کے نزدیک ہوگئی۔
"چلو نا! ......شام ہونے والی ہے۔ یہ نا ہو تمہارے بھائی تجھے ڈھونڈنے نکل پڑیں؟" تابش کے الفاظ میں اس سے جان چھڑانے کا عندیہ تھا مگر جسمانی حرکات ان الفاظ کا ساتھ نہیں دے پا رہی تھیں۔ آخر کو وہ ایک مرد ہی تھا، امیمہ کے جوان بدن کا گداز اور حدت ایسی نہیں تھی کہ وہ اسے دور جھٹک سکتا۔

''تابش! ......تم مجھے بہت اچھے لگتے ہو...... بہت زیادہ، بہت ہی زیادہ۔'' اس نے تابش کے کندھے پر سر رکھ دیا۔

''امیمہ! ......پلیز خود کو سنبھالو......یقین مانو اگر میں مرضی سے شادی کر سکتا تو تمھیں ضرور اپنا لیتا۔''

''تو چلیں ......'' بوجھل انداز میں کہتے ہوئے وہ بدقت تمام اس سے علیحدہ ہوتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

تابش نے مشورہ دیا۔ ''میرا خیال ہے ......ہمارا یہیں سے علیحدہ ہو جانا بہتر رہے گا؟''

''صحیح ہے۔'' افسردہ انداز میں سر ہلاتے ہوئے اس نے تابش کے چہرے پر الوداعی نگاہ ڈالی اور بجھے بجھے قدموں سے چل دی۔ تابش دوبارہ بیٹھ گیا تھا۔ اس کے وہاں سے دور ہٹنے تک اس نے وہیں بیٹھنا مناسب سمجھا۔ اس نے ارادہ کر لیا تھا کہ وہ دوبارہ امیمہ کے ساتھ وہاں نہیں آئے گا۔

☆☆☆

مگر پختہ ارادے کے باوجود وہ اگلے دن امیمہ کے ہمراہ اسی جگہ موجود تھا۔ امیمہ کی وارفتگی اور پیش قدمی کے سامنے بند باندھنے کی، اس کی ساری کوششیں ناکام گئی تھیں۔ گو ابھی تک انھوں نے ساری حدود نہیں پھلانگی تھیں مگر تابش کو محسوس ہونے لگا کہ اگر وہ اسی طرح ملتے رہے تو جلد ہی انھوں نے ہر حد عبور کر لینی تھی۔ اور پھر اس سے پہلے کہ تابش کے اندیشے حقیقت کا روپ دھارتے ان کی رسی کھینچ لی گئی۔

اس دن انھیں سورج غروب ہونے کا بھی پتا نہیں چلا تھا۔ اندھیرا چھانے لگا تو وہ گھبرا کر بولا۔

میم صاحب! ......چلو اندھیرا چھانے لگا ہے؟'' وہ اسے امیمہ کے بجائے میم کہنے لگا تھا۔

''تو کیا......؟'' اس نے حسب عادت منہ بنایا۔

''دو تین دن بعد تم چلے جاؤ گے، اب جی بھر کے باتیں بھی نہ کروں؟''

''کہیں یہ نہ ہو تیرے بھائی یہاں آ جائیں؟''

''میں کسی سے نہیں ڈرتی ......'' اس نے قریب ہو کر تابش کے کندھے پر سر رکھ دیا۔ اور اسی وقت جیسے کہ بھونچال آ گیا۔

''کیا ہو رہا ہے یہاں؟'' وہ خوفناک شکل کا آدمی وہاں اچانک ہی نمودار ہوا تھا۔

''بب...... بھیا......؟'' امیمہ کی سراسیمہ سی آواز نے تابش کو شل کر دیا تھا، اس نے آج تک صرف اس کے بھائیوں کا ذکر سنا تھا آج پہلی مرتبہ ان میں سے ایک کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہا تھا اور وہ بھی اس حال میں کہ وہ ان کی بہن کو بانہوں میں لیے بیٹھا تھا۔

''امیمہ......آآآآآ......'' اس کے بھائی کی بلند بانگ دھاڑ گونجی......

تھوڑے فاصلے سے ایک استفہامیہ آواز آئی ......''کیا ہوا......؟ جہانے!''

''بھیا!......امیمہ مل گئی ...... یہاں منہ کالا کر رہی تھی، اس پردیسی بابو کے ساتھ۔''

''گولی مار دو کتے کو......'' تابش کو وہ آواز پہلے سے قریب سنائی دی تھی۔ یقیناً وہ اسی طرف آ رہا تھا۔

''بھیا!......رائفل ساتھ نہیں لا سکا ہوں۔'' جہانے کی آواز میں مایوسی تھی۔

''تو اسے روکو ......میرے پاس رائفل ہے۔'' آواز تیزی سے قریب آنے لگی۔

''بابو! ......بھاگو......؟'' امیمہ خوفزدہ انداز میں چیخی۔ اور ہکا بکا کھڑے تابش کے جسم میں جیسے کرنٹ دوڑ گیا۔ وہ اچھل کر پیچھے مڑا اور تیز قدموں سے دوڑتا چلا گیا۔

''بھیا!...... جلدی آؤ، خبیث بھاگ پڑا ہے۔'' جہان چیخا۔

''پہنچ گیا......'' نووارد کی آواز اسے اسی مقام سے سنائی دی، جہاں وہ لمحہ بھر پہلے موجود تھا۔ ''تم! اس بے غیرت کو سنبھالو، اس کا کام میں تمام کرتا ہوں۔''

اچانک فضا دھماکے کی آواز سے گونج اٹھی۔ تابش کے پاؤں میں جیسے بجلی بھر گئی تھی...... جان بچانے کی فطری جبلت نے ساری سوچوں کو منجمد کر دیا تھا۔ اسے بس وہاں سے کہیں دور جانا تھا۔ جھاڑیوں کے جھنڈ سے نکل کر وہ سلطان چچا کے گھر کی طرف بھاگا۔

وہ اسی کے انتظار میں صحن میں ٹہل رہا تھا۔ اسے یوں بھاگتے دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔ اس نے جلدی سے دروازہ کنڈی کیا اور سلطان کی طرف بڑھا۔

''کیا ہوا؟'' سلطان نے حیرت سے پوچھا

''چچ...... چچا...... چچا...... وہ...... میرے پیچھے پڑا ہے؟'' اس نے پھولتی سانسوں سے فقرہ مکمل کیا۔

''کون؟'' سلطان کی حیرت برقرار تھی۔

''وہ...... وہ امیمہ کا بھائی......''

''سلطانے! ...... دروازہ کھولو؟'' اس پہلے کہ سلطان مزید استفسار کرتا امیمہ کا بھائی وہاں پہنچ گیا تھا۔

اسے جواب دیئے بغیر سلطان، تابش کا بازو سے پکڑ کر گھر کے پچھواڑے کی طرف بڑھا۔

''سلطانے دروازہ کھولو ورنہ ہم دروازہ توڑ دیں گے؟'' ایک مرتبہ پھر سلطان کو پکارا گیا۔

تابش خوف سے لرز گیا تھا...... اس نے سوچا ''ہم'' کا مطلب، گویا امیمہ کا بھائی اکیلا نہیں تھا۔ اور پھر اس کی سوچ کی تصدیق ایک نئی اور بھیانک پکار نے کر دی۔

''بھیا!...... دروازہ توڑ دو، یہ ایسے نہیں کھولے گا؟''

''کیا کیا ہے...... تُو نے بیوقوف؟'' سلطان خوف سے لرزتے ہوئے اس سے پوچھ رہا تھا۔ اس وقت اسے مالک اور نوکر کا رشتا بھی بھول چکا تھا۔

''چچ...... چچا میں اور امیمہ وہاں بیٹھے تھے کہ اس کا بھائی وہاں آ گیا۔''

اسی وقت دروازہ کو زور سے دھڑ دھڑایا گیا۔ اور پھر شاید وہ اپنے کندھے کی ضربوں سے دروازہ توڑنے کی کوشش میں مصروف ہو گئے۔

اس ناگفتہ بہ حالت میں بھی تابش کو ان کی بیوقوفی پہ حیرانی ہوئی، اس نے سوچا۔ ''شکر ہے یہ دیوار کے اوپر سے اندر نہیں آ رہے؟''

چچا سلطان کہہ رہا تھا۔ ''اچھا یہ وقت تفصیل بتانے کا نہیں ہے۔ تم عقبی دیوار پھلانگو، اسی گلی میں سیدھے دوڑتے جانا، گلی کے خاتمے پر ایک بڑا میدان آئے گا ......اور پھر میدان کے بعد سرکنڈوں کا ایک بڑا جنگل ہے ......اس دن تم نے دور سے دیکھا بھی تھا۔ اگر تم وہاں تک پہنچ گئے تو شاید ان ظالموں سے بچ جاؤ۔''

''وہ میری کار......؟''

''گولی مارو کار کو بیوقوف پہلے جان بچاؤ اپنی ......اور کار سامنے گلی میں کھڑی ہے، وہیں وہ درندے بھی موجود ہیں۔''

اسی وقت دھماکا ہوا اور پھر اسے کار کا ٹائر پھٹنے کی آواز آئی، اس کے ساتھ ہی دوسرا فائر ہوا اور دوسرا ٹائر بھی پھٹ گیا۔

''لو...... کار سے تو خلاصی ہو گئی۔'' یہ بات سلطان کے ہونٹوں پر تھی کہ دروازے کی کنڈی ٹوٹنے کی آواز آئی۔ سلطان نے سہارا دے کر اسے دیوار سے اوپر کیا۔ وہ دوسری جانب لٹک کر کودا مگر توازن برقرار نہ رکھ سکا اور کولہوں کے بل نیچے گرا۔ اس نے اٹھنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ اٹھ کر وہ ناک کی سیدھ میں دوڑ پڑا۔

''بتاؤ کہاں ہے وہ؟'' اس کے کانوں میں ایک بلند بانگ دھاڑ گونجی۔ اور پھر ایک فائر کی آواز، اس کا دل جیسے مٹھی میں آ گیا تھا۔

’’شاید چچا سلطان میری ہوس کی بھینٹ چڑھ گیا ہے......؟‘‘ اس نے ڈوبتے دل سے سوچا۔

’’بھیا! ......یہ گلی میں جا رہا ہے......‘‘ اس مرتبہ اسے دیوار سے اوپر سے اسی آدمی کی آواز سنائی دی جس نے اسے اور امیمہ کو رنگے ہاتھوں پکڑا تھا۔

’’یہ اتنی جلدی امیمہ کو گھر تک لے بھی آیا ہے ......پتا نہیں انسان ہے کہ جن؟‘‘ تابش حیران ہوا، مگر اس حیرانی پر جان بچانے کی جبلت غالب تھی، اس کے قدم اسی تیزی سے بڑھتے رہے۔ ملگجا اندھیرا تاریکی میں ڈھل گیا تھا۔ رات کے سناٹے میں اسے اپنے قدموں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اچانک ایک اور فائر ہوا، خوف کے مارے اسے ٹھوکر لگی اور وہ منہ کے بل نیچے گرا تھا، ہاتھ چہرے کے سامنے رکھ کر اس نے منہ کو زخمی ہونے سے بچایا، اس کی سماعتوں میں دوڑتے قدموں کی آواز اور...... ’’پکڑو جانے نہ پائے؟‘‘ کی آوازوں کا ملا جلا شور گونجا، وہ ایک مرتبہ پھر اٹھ کر بھاگ پڑا۔ گلی عبور کرتے ہی وہ اس وسیع میدان میں پہنچ گیا جسے پہلی مرتبہ دیکھ کر اس کے دماغ میں خیال آیا تھا کہ ’’وہاں بہت اچھا سٹیڈیم بن سکتا ہے۔‘‘

اس ہموار میدان میں اس کے قدم سرعت سے اٹھنے لگے، مگر تعاقب کرنے والے بھی کچھ کم تیز نہیں تھے۔

آج تم بچ نہیں سکتے خبیث انسان! ......‘‘ ان درندوں کی آواز اسے بہت قریب سنائی دے رہی تھی، اپنی ساری کوشش کے باوجود وہ اپنے اور ان کے درمیان فاصلہ پیدا کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکا تھا۔

میدان کے اختتام پر اسے سرکنڈوں کے ہیولے زندگی کی نوید کی شکل میں دکھائی دینے لگے۔ ان گھنے سرکنڈوں میں شاید وہ ان سے چھپ جاتا......اور پھر وہ سرکنڈوں میں گھستا چلا گیا۔

☆☆☆

وہ رات اس کی زندگی کی طویل ترین رات تھی۔ امیمہ کے غنڈے بھائی واپس جا چکے تھے، مگر اسے خطرے کی تلوار اسی طرح اپنے سر پر لٹکتی نظر آ رہی تھی۔ امیمہ اسے پسند تھی، اسے اچھی لگی تھی مگر یہ محبت اس نہج کی نہیں تھی کہ وہ اس کے لیے اپنا گھر بار لٹانے پر تیار ہو جاتا، اور اب تو بات بہت بڑھ چکی تھی، اگر وہ اپنا آپ ان کے حوالے کر دیتا تو وہ درندے اسے اذیت ناک موت سے دوچار کرتے اور اگر وہ روپوش رہتا تو وہ اس کے معصوم والدین کو اپنے انتقام کا نشانہ بناتے۔ تیسری صورت یہی تھی کہ اس کے والدین بھی اسی کی طرح رُوپوش ہو جاتے لیکن اس میں کئی قباحتیں تھیں، ایک تو وہ والدین کو فون پر کس طرح اس ساری سچویشن سے آگاہ کرتا، اور اس کی بات مان لینے کی صورت میں انھیں اپنا سب کچھ داؤ پہ لگانا پڑتا۔ پھر یہ بھی ضروری نہیں تھا کہ ان کی رُوپوشی کی وجہ سے وہ چاروں غنڈے ان کا پیچھا چھوڑ دیتے، وہ لازماً اپنا انتقام لیے بغیر چین سے بیٹھنے والے نہیں تھے اور ایسے جنونیوں سے کچھ بعید نہیں تھا کہ وہ کب انھیں تلاش کر لیتے۔

اور پھر وہ بے آواز آنسو بہانے لگا، یہ بے بسی کی انتہا تھی۔ اس نے سوچا۔ ''اسی کو کہتے ہیں......

''نہ جائے رفتن، نہ پائے ماندن۔''

اچانک اس کے ہاتھ پر کوئی کیڑا رینگا اور وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ سانپ بچھو کا خوف ایک دم عود آیا۔ ظہور برادرز کافی دیر ہوئی وہاں سے چلے گئے تھے، وہ پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہوا سرکنڈوں کے جنگل سے باہر نکلنے لگا۔ سمت کا تعین اس نے نہیں کیا تھا اور نہ اسے کچھ سوجھ ہی رہا تھا کہ وہ سفر کی سمت متعین کرتا۔ وہ سمتوں کی پہچان بھو بیٹا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ سرکنڈوں سے نکل آیا۔ دور چمکتی روشنیاں دیکھ کر اسے اندازہ ہوا کہ وہ دوبارہ گاؤں کی سمت نکل آیا ہے۔

چند لمحے وہ وہیں کھڑا سوچتا رہا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ جب کچھ نہ سوجھا تو وہ ان بھائیوں کی گفتگو یاد کرنے لگا۔ وہ سلطان سے اس کے بارے اگلوانے کی بات کر رہے تھے......اور انھیں وہاں سے گئے کافی دیر ہو چکی تھی اس کا مطلب یہی تھا کہ اب تک وہ سلطان سے سب کچھ اگلوا چکے ہوں گے۔ ان کی گفتگو سے بھی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اسے یعنی سلطان کو جانی نقصان پہنچانے کا ارادہ نہیں رکھتے تھے۔ صبح سویرے انھوں نے لازماً اپنے اپنے ٹاسک کے لیے روانہ ہونا تھا۔ ابھی اگر وہ سلطان کے گھر چلا جاتا تو انھیں یقیناً اس بارے معلوم نہ ہوتا۔

''یہ بھی ہو سکتا ہے وہ سلطان کے گھر کی نگرانی کر رہے ہوں؟'' یہ سوچ کافی خوفزدہ کرنے والی تھی، اس کی ہمت نہ ہو سکی کہ وہ سلطان کے گھر کا رخ کرتا۔ تنگ آ کر وہ وہیں بیٹھ گیا۔

اسے بیٹھے ہوئے بمشکل چند منٹ ہوئے ہوں گے کہ اسے گاؤں کی طرف ایک ٹارچ کی روشن دکھائی دی، روشنی کا رخ سرکنڈوں کے جنگل کی جانب ہی تھا۔

''گویا اب وہ پوری تیاری سے مجھے ڈھونڈنے آ رہے ہیں؟'' وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ پہلے تو اس نے سرکنڈوں سے دائیں بائیں جانے کا سوچا مگر پھر اسے خیال آیا کہ اس جنگل جیسی چھپنے کی جگہ اسے کہیں نہیں مل سکتی تھی۔ ایک بڑی سے سرکنڈے کی جھاڑی کا انتخاب کر کے وہ جلدی سے اس میں گھس گیا، سانپ، بچھو کا خوف ایک مرتبہ پھر کہیں پس منظر میں چلا گیا تھا۔

(اس سنسنی خیز کہانی کے بقیہ واقعات دوسرے اور آخری حصے میں پڑھیں)

شہ مات

پولیس آفیسر اگر ذہین اور ہو تو مجرم کو بچ نکلنے کا راستہ نہیں ملتا چاہے اس کی پشت پر کتنا ہی بارسوخ ہاتھ کیوں نہ ہو۔

احمد عدنان طارق ---------- 0300-7232272 ----------

میں نے 1985ء میں جب بطور ASI محکمہ پولیس جوائن کیا تو یہ بات ظاہر تھی کہ میری تعیناتی پنجاب میں جدھر بھی ہوئی میرا واسطہ ملزمان کے علاوہ سیاسی شخصیات سے بھی پڑنے والا ہے جن میں ایم پی اے اور ایم این اے لیول کے لوگ شامل ہوں گے۔ اب محکمہ میں مجھے تیس سال ہونے کو آئے ہیں تو میں اگر اپنی پچھلی پولیس کی نوکری پر نظر دوڑاؤں تو جس ایم این اے کے ساتھ کام کرتے ہوئے مجھے سب سے زیادہ مشکل پیش آئی وہ تھا ناندلیانوالہ سے کئی دفعہ ایم این اے منتخب ہو چکا تھا۔ یہ ایم این اے نہ صرف چٹا اَن پڑھ تھا بلکہ بدتمیز ترین شخص تھا۔ یہ اپنے پڑھے لکھے نہ ہونے پر فخر کرتا تھا۔ پیپلز پارٹی کے دور حکومت میں اس کی ڈپٹی کمشنر لیول کے لوگوں سے بدتمیزی کے کئی قصے مشہور ہوئے۔ وہ ایک ایسا شخص تھا جس کے نزدیک کرپشن بہت ہی خوبصورت عمل تھا۔ اخلاقی کردار کی گراوٹ کا آپ اندازہ ہی نہیں کر سکتے۔

بہر کیف میں کسی کی ذاتی زندگی پر تبصرہ کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔ انہی ایم این اے کے دور میں

موصوف کی بیوی ان کے اپنے ڈرائنگ روم میں قتل کر دی گئی۔ پھر داماد شراب پی کر مرا تو بیٹی ہمدردی کے ووٹ لے کر ایم این اے بن گئی۔ ٹانڈلیانوالہ سے ماموں کانجن کے نواحی دیہات میں بلوچ قوم کی اکثریت آباد ہے۔ جس کی وجہ سے ٹانڈلیانوالہ کے نواح میں سیاست میں ہمیشہ بلوچ چھائے رہے ہیں۔ گندی زبان اور سلطان راہی جیسی بود و باش ہونے کی وجہ سے موصوف تین دفعہ ایم این اے بنا اور پھر جنہوں نے ووٹ دے کر اسے منتخب کیا اس عوام کو میں کیا کہوں۔ لیکن ایک بات تو واضح ہے کہ اس کے ووٹر پڑھے لکھے لوگ اور باشعور انسان نہیں ہو سکتے۔

اس بدتمیز ایم این اے کی آنکھوں میں میری وجہ سے ایک دفعہ بے بسی چھا گئی تھی وہ لمحہ میں نے بہت Enjoy کیا تھا۔ میں آپ کو ساری کہانی سناتا ہوں۔ امید ہے آپ کو بھی پسند آئے گی۔ میں 1996ء میں پہلی بار ماموں کانجن تھانہ میں ایس ایچ او تعینات ہوا۔ میں ایس ایچ او کی کرسی پر بیٹھا تو سامنے بورڈ پر میرے سے پہلے تعینات شدہ ایس ایچ اوز کے نام میری آنکھوں کے سامنے تھے۔ وہ بڑے جغادری ناموں والے ایس ایچ او تھے۔ یعنی اٹھارہ سال پہلے جب میں بھرپور جوان تھا تو وہ لوگ تو مجھ سے بھی پہلے کے تھے۔ اور پرانے ایسے ایس ایچ او جن کے ناموں سے ملزمان خائف ہوتے تھے۔ میں نے تھانہ میں بھی ملازمین کی میٹنگ کال کی اور اس میٹنگ میں علاقے کے جرائم کے متعلق تفصیلی گفتگو ہوئی۔

ان دنوں ماموں کانجن بہت خاموش تھانہ تھا۔ اور ڈکیتی وغیرہ جرائم نہ ہونے کے برابر تھے مگر مجھے یہ سن کر حیرت ہوئی کہ ماموں کانجن کے دو گاؤں جہاں نوے فیصد کورائی بلوچ بستے ہیں اور جن کے نمبر 511 گ ب اور 510 گ ب ہیں پورے دونوں گاؤں ایک ہی جرم میں ملوث ہیں اور وہ جرم ہے منشیات فروشی۔ ایک گاؤں میں سب سے بڑے منشیات فروش کا نام نثار کورائی اور دوسرے گاؤں کے منشیات فروش کا نام نوشی کورائی تھا۔ اور دونوں گاؤں اس کاروبار میں ایک دوسرے سے بڑھ کر شامل تھے۔ میں نے دوبارہ ایک نظر سامنے لگے بورڈ پر ڈالی تو مجھے اپنی نظروں پر یقین نہ آیا کہ ان ایس ایچ اوز کے لگے رہنے کے باوجود ایک ہی طرح کا جرم یہاں کیسے ہوتا رہا ہے یا ہوتا ہے؟

میں نے یہ سوال وہاں میٹنگ میں شامل ملازمان سے کیا تو سب کا ایک ہی جواب تھا وہ یہ کہ جب بھی پولیس ان دیہات میں ریڈ کرنے آتی ہے تو یہ دونوں گاؤں مل کر مزاحمت کرتے ہیں اور سینکڑوں کی تعداد میں دیہاتی پولیس پر پل پڑتے ہیں۔ اور اگر SHO زیادہ نفری کا پہلے سے تحرک کر کے چلا جائے اور بعد میں مال برآمد نہ ہو تو یہ لوگ ہائیکورٹ کے ایک آدھ جج کے ساتھ ہاتھ ملائے رکھتے ہیں۔ میں نے یہ قصہ سن کر میٹنگ کم کی اور اس مسئلے کا حل زیادہ سوچا۔ اور کچھ ہی لمحوں میں میرے ذہن میں ایک پلان بن چکا تھا۔ پلان یہ تھا کہ گاؤں کے اندر یہ لوگ مضبوط ہیں۔ یہ اتنے مضبوط ہیں کہ مجھ سے پہلے لگنے والے ایس ایچ او ان کا کچھ نہیں کر سکے۔ لہٰذا بہتر ہے میں ان سے لڑائی ایسی جگہ پر کروں جہاں میں مضبوط ہوں۔ اور وہ جگہ تھی ان کے گاؤں سے باہر ہر وہ جگہ جہاں میرے تھانے کی حدود تھی۔

میرے ذہن میں تھا کہ اگر میں ان دونوں گاؤں کی سپلائی باہر سے ہی بند کرا دوں یعنی میں گاؤں میں کوئی گاہک ہی نہ جانے دوں تو یہ منشیات کیسے بیچ لیں گے۔ اگلے ہی دن سے میں نے ان دونوں گاؤں کی ناکہ بندی شروع کر دی۔ گاؤں سے آنے جانے والے راستوں پر پولیس تعینات کر دی۔ ایک ٹرین ان گاؤں کے نزدیک سے گذرتی تھی۔ جو ان منشیات فروشوں کے لئے گاہک لاتی تھی۔ خریدار ٹرین سے اترتے۔ 510 اور 511 گ

ب جاتے۔ وہاں سے خریداری کرتے اور کسی دوسری ٹرین میں بیٹھ کر اپنی منزلوں کو روانہ ہو جاتے۔ میں نے ٹرین کے آنے جانے والے وقت پر کڑی نگرانی شروع کر دی۔ اب جو خریدار پہلے مال کی خریداری کے لئے کشاں کشاں آتے تھے وہ راستے میں پولیس کو دیکھ کر ہراساں ہونے لگے۔ انہیں ہچکچاہٹ ہونے لگی۔ مال کی ترسیل ان کے لئے آسان نہیں رہی۔ کچھ نے نظریں بچا کر آنے کی کوشش کی تو وہ پکڑے گئے۔ ان دونوں گاؤں اور باقی دنیا کے درمیان ایک لائن سی کھنچ گئی۔ جو لوگ ادھر رہ گئے تھے وہ نشئی تھے اور واضح نظر آتے تھے۔ وہ میری کھینچی ہوئی حد تک پہنچتے اور اپنی حد سے بڑھی ہوئی نشے کی عادت پورا کرنے کے لئے میری حد عبور کرتے اور پکڑے جاتے۔ پانچ دس گرام ہیروئن کے مقدمے درج ہونے لگے۔ ہر مقدمے کے درج ہونے پر ہم FIR میں اس بندے کا نام لکھتے جس سے اس بندے نے ہیروئین خریدی ہوتی۔

جب ان چھوٹے لیول پر بیچنے والوں کے نام ایف آئی آرز میں آنے لگے تو تھوڑی سی کھلبلی مچی۔ یہ وہ لوگ تھے جو سائیکلوں پر سوار ہو کر ماموں کانجن کی گلیوں میں منشیات سبزیوں کی طرح بیچتے پھر رہے تھے۔ ہم نے بڑی آسانی سے دو چار دنوں میں ان پر قابو پایا اور ان کے خلاف مقدمات درج کئے اور پھر ان لوگوں کے خلاف درج ہونے والے مقدمات کی ایف آئی آر میں ان لوگوں کے نام دیے جن کا مال یہ لوگ گھوم پھر کر بیچتے تھے۔ جب کچھ دنوں کے بعد یہ لوگ پکڑے گئے تو پھر وہ لوگ گاؤں سے باہر نکلے جن کا مال یہ لوگ بیچتے تھے۔ اگلے دن ان لوگوں کو تاڑنے اور پکڑنے میں صرف ہوئے۔ یہ نوشی کورائی اور نثار کورائی کا دایاں ہاتھ تھے۔ یہ وہی لوگ تھے جو ان کے ساتھ مل کر اپنے رشتہ داروں کی مدد سے پولیس کے خلاف مزاحمت کرتے تھے۔ اب ہیں پچیس دنوں کی محنت سے ان میں سے بیشتر پولیس کے ہتھے چڑھ گئے۔ اس پورے عرصہ میں ان دونوں گاؤں کے اندر کوئی گاہک نہیں گیا۔ گاؤں کے اندر سارے بیچنے والے تھے۔ لہٰذا ان کی سپلائی کا کوئی فائدہ گاؤں میں نہیں تھا۔ اس دفعہ جب یہ لوگ پکڑے گئے تو سب کی ایف آئی آرز میں نوشی اور نثار کا نام آیا۔ اور ان دونوں پر گھر بیٹھے بٹھائے چھ چھ سات سات مقدمات درج ہو گئے۔ تجربہ کار منشیات فروش کبھی یہ نہیں چاہتے کہ ان کا ریکارڈ بنے کیونکہ عدالتوں میں اچھے ججوں کے آگے ان کا معصوم بننا کارآمد ثابت نہیں ہوگا۔

میں ایک چھٹی لے کر گھر فیصل آباد گیا تو والد مرحوم شیخ طارق صاحب جو خود ریٹائرڈ ڈاک ٹرائینڈ ٹیکیشن آفیسر تھے اور ساری زندگی منشیات کے خلاف جنگ کرتے رہے تھے وہ بھی لاہور سے فیصل آباد آئے ہوئے تھے۔ ان دنوں پلس کو بل والوں کی انگلش ویڈیوز بہت پسند کی جاتی تھیں اور شاندار پرنٹ والی یہ کیسٹیں بہت خوبصورت پیک کی ہوتی تھیں جنہیں لائبریری میں کتابوں کی طرح رکھا جا سکتا تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ یہ اردو ترجمے کے ساتھ ہوتی۔ میرے والد کو اپنی جوانی کی ایک فلم "بن حر" بہت پسند تھی۔ جس میں ان کے زمانے کے دو مشہور ہیرو چارلسن ہیسٹن اور ریل برائنز کام کر چکے تھے۔ میں نے اس دن اپنے والد کے ساتھ وہ فلم اپنے بڑے ٹیلی ویژن پر دیکھنے کا پروگرام بنایا تھا۔

اس وقت ہم دونوں باپ بیٹا اپنے ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں بیٹھے بڑے انہماک سے وہ فلم دیکھ رہے تھے اور میرے گھر کا باورچی بابا ناظر ہمارے لئے کھانا تیار کر رہا تھا کہ اچانک باہر سے دروازہ کھٹکنے کی آواز آئی۔ بابا ناظر باہر یہ دیکھ کر کہ کون آیا ہے دروازہ کھول کر ہمارے پاس آیا اور اس نے ہمیں بتایا کہ میرا دنیا میں سب سے عزیز دوست الیاس مجھے ملنے آیا ہے میں نے بابے کو کہا

کہ وہ اسے اندر لے آئے۔ مجھے خوشی تھی کہ چلیں وقت اچھا گذر جائے گا۔ لیکن جب الیاس اندر آیا تو اس کے ساتھ دو مہمان اور بھی تھے۔ جنہیں دیکھ کر سچ پوچھیں تو مجھے کوفت ہوئی۔ میں نے قلم بند کی اور الیاس سے خیر خیریت دریافت کی۔ تو اس نے مجھے بتایا کہ اس کے ساتھ آنے والوں میں سے ایک اس کا دوست کھرل قوم کا تھا اور دوسرا اس کے ساتھ آنے والا کورائی تھا مجھے ان کے آنے کی فوراً سمجھ آ گئی کہ یہ کورائی نوشی یا نثار کا کوئی رشتہ دار ہے اور الیاس کا دوست اس کا سفارشی ہے جو الیاس کو لے کر میرے پاس آیا ہے۔ میں نے کھرل کا شکریہ ادا کیا کہ وہ میرے دوست کو لے کر آیا ہے اور ساتھ انجان سا بن کر اس سے آنے کا مدعا پوچھا۔ تو کھرل نے بتایا کہ وہ ادھیڑ عمر شخص نثار کورائی کا چچا ہے اور نثار کورائی کے لئے معافی لینے آیا ہے۔

بعد ازاں عقدہ یہ کھلا کہ وہ دراصل نثار کورائی کا والد تھا۔ جو اس کا چچا بن کر میرے گھر آیا تھا۔ میں نے وقت ضائع کرنا مناسب نہیں سمجھا اور ان کی جھجک خود ہی دور کر دی۔ جو وہ مجھ سے برت رہے تھے۔ مجھے پتا تھا کہ وہ کس لئے آئے ہیں۔ میں نے اپنے والد کی موجودگی میں ہی ان سے پوچھا کہ کیا وہ مجھے رشوت دینے آئے ہیں؟ یا مجھ سے ماہانہ طے کرنے آئے ہیں یا پھر مجھ سے معافی مانگنے آئے ہیں؟ انہوں نے کہا کہ مجھ سے معافی مانگنے آئے ہیں۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا کہ وہ میرے دوست کو مجھ سے ملانے لے کر آئے ہیں۔ اس کے بدلے میں ان کی معافی قبول کرتا ہوں اگر وہ آئندہ کبھی بھی ہیروئین نہیں بیچیں گے۔ لیکن اگر میں نے انہیں دوبارہ ہیروئین بیچتے ہوئے پکڑ لیا تو پھر مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا انہوں نے شکریہ ادا کیا۔

الیاس انہیں گھر سے باہر چھوڑنے گیا اور جب واپس آیا تو اس کے پاس میرے لئے بیس ہزار روپیہ تھا۔ جو وہ لوگ اس لئے دے گئے تھے کہ پہلی دفعہ میرے گھر آئے ہیں لہٰذا خالی ہاتھ آنا مناسب نہیں تھا اس کے علاوہ ان روپوں کے دینے سے ان کا خیال ہوگا کہ ہو سکتا ہے میرے ساتھ ان کے تعلقات اس حد تک ٹھیک ہو جائیں گے کہ شاید میں انہیں ہیروئین کسی معاہدے کے تحت بیچنے کی اجازت دے دوں گا۔ میں نے الیاس کے ہاتھ میں روپے دیکھے تو فوراً اسے ان بندوں کے پیچھے بھیجا اور انہیں واپس لانے کو کہا۔ وہ واپس آئے تو میں نے انہیں ان کی رقم واپس کرتے ہوئے انہیں دوبارہ تنبیہ کی کہ اگر وہ ہیروئین بیچیں گے تو میں ان کا پیچھا نہیں چھوڑوں گا۔ انہوں نے بجھے دل سے میرے ساتھ ہیروئین نہ بیچنے کا وعدہ کیا میں نے ہیروئین نہ بیچنے کے بدلے میں ان کی ایف۔ آئی۔ آرز ختم کرنے کا وعدہ کیا لیکن انہیں بتایا کہ یہ میں اس وقت کروں گا جب میرا تبادلہ اس تھانہ سے ہوگا تو میں جاتے وقت یہ مقدمات ختم کر جاؤں گا۔ انہوں نے روپے واپس لئے اور میرے گھر سے روانہ ہو گئے۔

میری جب چھٹی ختم ہوئی اور میں واپس تھانہ لوٹا تو اتنے دن کی محنت کے بعد مجھے علم تھا کہ اب منشیات فروش گاؤں کے اندر بھی کمزور ہیں۔ میں نے خاصی نفری لی اور ایک دن نثار کورائی کے گھر پر ریڈ کر دیا۔ نفری زیادہ ہونے کی وجہ سے اور بہت سے ملزمان پکڑے جانے کی وجہ سے کوئی مزاحمت نہیں ہوئی۔ بدقسمتی سے نثار کورائی موجود نہیں تھا لیکن اس کا باپ پکڑا گیا۔ وہی باپ جو میرے گھر نثار کورائی کا چچا بن کر آیا تھا اور مجھے بیس ہزار روپے دینے کی آفر کی تھی۔ اس دن وہ صرف نثار کورائی کا غم گسار تھا۔ آج جب میں نے اسے گرفتار کیا تو وہ ترازو لے کر بیٹھا ہوا ہیروئین بیچ رہا تھا۔ اس طرح کھلے عام ہیروئین بکتی تو کبھی میں نے بھی نہیں دیکھی تھی۔ میں نے موصوف کو بالکل اسی طرح اٹھایا جیسے کچرا اٹھایا جاتا ہے۔ تھانے لا کر میں نے نثار کورائی کے ابا پر آدھ کلو ہیروئین کا مقدمہ درج

کیا۔ اس کے پاس اتنا مال تو تھا ہی۔ پھر میں نے اس کا منہ کالا کیا اور اس کی قمیص کے پیچھے ایک پوسٹر لگا دیا جس پر لکھا ہوا تھا کہ "میں ایک منشیات فروش ہوں" اور پھر اسے اپنے دفتر کی سیڑھیوں پر بٹھا دیا اور اسے حکم دیا کہ جو شخص بھی تھانہ میں داخل ہو اسے روک کر بتانا ہے کہ میں منشیات فروش ہوں۔

ابھی اس خبیث انسان نے یہ عمل شروع ہی کیا تھا کہ مجھے میرے تعلق والوں نے بتایا کہ یہ صرف نثار کورائی کا باپ ہی نہیں بلکہ ایم این اے کا رشتے میں ماموں بھی لگتا ہے اور اس کے رشتہ دار اس عرصہ میں اس تک پہنچ بھی گئے ہیں اور وہ تھانہ کی طرف آ رہا ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ کیوں آ رہا ہے؟ اور کچھ اس بات کا اندازہ بھی ہو گیا تھا کہ پہلے نثار اور نوشی کورائی جیسے لوگ کیوں دندناتے پھرتے رہے ہیں۔ اب فیصلہ کرنے کی ضرورت تھی کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ ویسے میں یہ فیصلہ پہلے ہی کر چکا تھا۔

یہ دور پرنٹ میڈیا کا دور تھا۔ الیکٹرونک میڈیا ابھی میدان میں نہیں آیا تھا میرے پڑھے لکھے ہونے کا فائدہ یہ تھا کہ تمام صحافی حضرات جو ماموں کانجن کے رہائشی تھے کے ساتھ میرے ذاتی تعلقات تھے، ان دنوں پولیس والوں کے لئے یہ ضروری نہیں تھا کہ وہ صحافیوں کے ساتھ بنا کر رکھیں۔ بلکہ جو پولیس آفیسر صحافیوں کو پاس بٹھاتا تھا اسے بزدل تصور کیا جاتا تھا۔ میں نے اسی وقت تھانہ کے ٹیلیفون سے شیخ زبیر صاحب کو فون کیا۔ شیخ زبیر کو میں نے ٹیلی فون پر کھانے کی دعوت دی تو انہیں یقین نہیں آیا کہ تھانہ کا SHO کھانے کی دعوت دے رہا ہے۔ لیکن وہ میرے دوست تھے ایک دو جگتیں مار کر وہ کھانے کے لئے میرے پاس آنے کو تیار ہو گئے۔ تب میں نے انہیں ساری صورت حال سمجھائی تو وہ ذہنی طور پر میرا ساتھ دینے کو تیار ہو گئے میں نے انہیں درخواست کی کہ وہ لوڈ ہو کر آئیں۔ مطلب یہ تھا کہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ آئیں اور کیمرے ساتھ لے کر آئیں۔ تھوڑی دیر میں وہ اپنے احباب کے ساتھ تھانے میں آ گئے۔ وہ دروازے سے گذرنے لگے تو نثار کورائی کے والد نے انہیں حسب سابق اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہا" کہ میں منشیات فروش ہوں" اس تعارف کے بعد وہ میرے پاس کرسیوں پر تشریف فرما ہو گئے اور ہم روٹین کی گپ شپ میں مصروف ہو گئے۔

ابھی کچھ ہی دیر گذری تھی کہ وہ شاہکار آ گیا جس کا انتظار تھا۔ ایم این اے صاحب اپنے لاؤ لشکر سمیت آئے تھے ظاہر ہے ان کا پروگرام یہی تھا کہ شاید وہ تھانہ نیست و نابود کر دیں گے اور اپنے قابل عزت ماموں کو ساتھ لے جائیں گے۔ لیکن قدرت کی طرف سے یہ منظور نہیں تھا۔ وہ جیسے ہی میرے دفتر میں داخل ہونے لگے ان کے ماموں نے بڑے دکھ سے انہیں اپنا تعارف کروایا "میں منشیات فروش ہوں"۔ لیکن لہجے سے یوں لگتا تھا جیسے کہہ رہے ہوں کہ لکھ لعنت تم جیسے بھانجے کے ایم این اے ہونے پر۔ جس کی موجودگی میں مَیں تھانہ میں قید ہوں۔ ایم این اے نے فرط جذبات سے بھرپور چہرہ میری طرف موڑا تو ان کی نظر بیٹھے صحافیوں پر پڑی۔ روزنامہ جنگ، نوائے وقت، خبریں اور پاکستان سبھی کے نمائندے وہاں بیٹھے تھے۔ وہ کچھ بولنے ہی والا تھا کہ صحافیوں نے نعرے لگانے شروع کر دیے۔ ایم این اے صاحب زندہ باد۔ ایس ایچ او زندہ باد۔ شیخ زبیر کے نعروں کی آواز سب سے بلند تھی۔ ایم این اے اس اچانک یلغار سے گھبرا گیا۔ بجائے اس کے کہ وہ ہم سے کوئی سوال کرتا پوچھنے لگا کہ سارے صحافی یہاں اکٹھے کیوں ہیں؟ سب نے یک طرفہ زبان میں اس سے کہا کہ آپ کا شکریہ ادا کرنے کہ آپ کا اتنا اچھا SHO جس نے وہ کام یعنی نثاری کے والد کو پکڑنے کا کام کیا ہے۔ جو ابھی تک کوئی نہیں کر سکا تھا۔ لہٰذا ہم

چاہتے ہیں کہ آپ آ گئے ہیں تو ایس ایچ او کو کوئی انعام بھی دے کر جائیں۔ ایم این اے اب بخوبی جانتا تھا کہ اگر اس نے اپنے ماموں کی حمایت کی تو دور کی بات اسے بچانے کی کوشش بھی کی تو اخباروں میں اس کی عزت کا جنازہ نکل جائے گا۔ وہ خاموشی سے اپنے ماموں کو دیکھتا ہوا جو حسرت و یاس کی تصویر بنا اسے جاتے دیکھ رہا تھا۔ تھانہ سے اپنے لاؤ لشکر سمیت روانہ ہو گیا۔ میں نے اپنے صحافی دوستوں کا شکریہ ادا کیا، انہیں کھانا کھلایا۔

وہ بے بسی جو میں نے اس دن شہادت خان کی آنکھوں میں دیکھی وہ میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ اس دن صاف اس کی نظروں میں اس کے غرور کی ہار عیاں تھیں۔ میرے صحافی دوست تو تھانہ سے روانہ ہو گئے۔ میں نے نثار کورائی کے والد کو تھانہ کی حوالات میں بند کروایا اور اپنی رہائش کی طرف سرکاری گاڑی میں روانہ ہو گیا۔ لیکن رات کورائیوں نے میرا سونا حرام کر دیا۔ میرے تعلق والے آئے انہوں نے مجھے دوبارہ رقم آفر کرنا شروع کر دی۔ میں نے ان سے پوچھا کہ کس بات کے پیسے آپ مجھے دیتے ہو اس پر مقدمہ تو درج ہو چکا ہے۔ انہوں نے کہا کہ اس بات کے بیس ہزار آپ کو دیتے ہیں کہ ریمانڈ جسمانی لے کر اس سے مزید ہیروئین برآمد نہ کرو۔ اور اسے جیل بھیج دو تا کہ اس کی ضمانت ہو سکے۔ لیکن مجھے معلوم تھا کہ دراصل وہ مجھے میرے تعلق والے لوگوں سے پیسے دلوا کہ پھنسانا چاہتے تھے کہ کل کلاں انٹی کرپشن میں مجھے اسی طرح ذلیل کر سکیں جس طرح میں نے انہیں تھانہ میں کیا تھا۔

میں نے ان کا چیلنج قبول کر لیا اور ان کی بچھائی ہوئی شطرنج کی بازی شہ مات دینے کا فیصلہ کر لیا۔ انہوں نے مجھے جو رقم دی میں اسے لے کر اگلے ہی دن ڈی ایس پی کے دفتر روانہ ہو گیا۔ کورائی کو تھانہ سے ایک صاحب کے حوالے کر دیا گیا تھا تا کہ اسے جیل چھوڑ آئے۔ ڈی ایس پی صاحب کو میں نے اس کا حصہ دیا اور بتایا کہ میرے خلاف کورائی درخواست دینے کو تیار ہیں۔ ایک حصہ اسی دن میں نے انٹی کرپشن میں اپنے دوست جو سپرنٹنڈنٹ ہیں کو دیا اور انہیں بھی بتایا کہ میرے خلاف درخواست آنے والی ہے۔ دونوں طرف درخواستیں میری توقع کے مطابق پہنچ گئیں۔ جن میں سے ایک درخواست ڈی ایس پی صاحب نے فائل کر دی۔ کورائیوں کو وہاں سے اتنی امید بھی نہیں تھی۔ ایک دو تاریخوں پر میری ان سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ انٹی کرپشن ڈیپارٹمنٹ کی وجہ سے میں نے پیسے تو واپس کرنے ہی ہیں تو کیوں نا باہر ہی ڈیل کر لیں۔ وہ اس پریشر سے نکلنے کے لئے میری کچھ مدد چاہتے تھے۔ میں نے انہیں کہا کہ تم نے تو اپنے روپے لے ہی لینے ہیں۔ مجھے کچھ اور دو اور پھر اکٹھے لے لینا۔

وہ ڈائریکٹر صاحب کے پیش ہو گئے اور انہیں بتایا کہ تھانیدار اتنا بدمعاش ہے آپ کے دروازے کے باہر ہم سے روپے مانگ رہا ہے۔ انہوں نے مجھے بلا کر جھڑکا۔ جھڑکیاں تو مجھے تمام انٹی کرپشن دفتر ہی دیتا رہا۔ لیکن انکوائری میں انہوں نے مجھے اس وجہ سے بے گناہ کر دیا کہ کوئی پولیس آفیسر لوگوں سے پیسے لے کر ناجائز لوگوں کو ہیروئین کے کیس میں نہیں الجھاتا۔ اور لوگوں کو کیا ضرورت ہے کہ وہ خود پیسے دے کر ہیروئین کے مقدمے میں چالان ہوں۔ وہ مجھے جھڑکیاں دیتے رہے اور ساتھ میری انکوائری میں مجھے بے گناہ کر کے بڑے افسران سے اس کی تصدیق کراتے رہے حتیٰ کہ لاہور کے سب سے بڑے افسر سے بھی۔ اب میرے خلاف مدعی کہیں اور شکایت نہیں کر سکتے تھے۔ وہ چپ ہو گئے اور نثار کورائی کا باپ تین سال چپ چاپ جیل میں سڑتا رہا اور پھر وہاں ہی چپ ہو گیا ہمیشہ کے لئے۔

◆●◆

کے ایچ مجاہد

سربراہی اور اس کا معیار

بہتر یہی ہے کہ سربراہی بڑے کو ہی ملے۔ عربوں میں بھی یہی دستور تھا
کہ باپ کی وفات کے بعد سربراہی بڑے کو ملتی تھی اور اس کے بعد ترتیب وار
چھوٹوں کو اور یوں خاندانی معاملات احسن طریقے سے چلتے رہتے تھے۔

☆-- کے ایچ مجاہد

منطقی:۔ خاندان میں عموماً بڑے کو ہی سربراہی کیوں دی جاتی ہے؟

فلسفی:۔ دیکھو حکومت اقتدار اور اختیار دنیا کی ہر برائی کی جڑ ہے اور اس کی وجہ سے اتنی قتل و غارت ہوئی ہے کہ معاشرے کی مجموعی دانش کو قتل و غارت سے بچنے کے لئے یہ فیصلہ کرنا پڑا۔ اس مسئلے کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی کہ خود انسان کی۔ ہابیل اور قابیل کے درمیان کوئی عورت کی رنجش نہ تھی۔ جیسا کہ اسرائیلی روایات میں ہے، قرآن میں ان کے اختلاف کی وجہ قربانی کی قبولیت اور نامقبولیت لکھی ہے۔ ظاہر ہے جس کی قربانی قبول ہوئی مرتبہ اور عزت اسی کی تھی جس سے حسد کا شکار ہو کر دوسرے نے اسے قتل کر دیا۔ پھر تاریخ کے ہر دور میں ہم دیکھتے ہیں وجہ فساد اقتدار ہی تھا۔ زن، زر، زمین تو اس کے تحت آتے ہیں۔

خود ہماری اسلامی تاریخ بھی اقتدار کے زخموں سے خونچکاں ہے اور مغلوں میں تو کوئی اس وقت تک بادشاہ بن ہی نہ سکتا تھا جب تک باپ بھائیوں کو تہ تیغ یا معذور نہ کر دیتا۔ حتیٰ کہ کئی نیک لوگوں کو بھی حکومت تک پہنچنے کے لئے اس مرحلے سے گزرنا پڑا۔ اقتدار کی ہوس کی اس سفا کی کو دیکھتے ہوئے انگریزوں نے ہندوستان میں سربراہی اور اختیار بڑے کو دینے کا فیصلہ کر کے ایک بہت بڑے جھگڑے کو ختم کیا۔ نمبرداری سسٹم کی بنیاد انگریزوں نے اسی اصول پر رکھی جو آج تک کامیابی سے چل رہا ہے۔ اس کی افادیت کو دیکھتے ہوئے عوام الناس نے اسے عمومی معاملات میں اختیار کر لیا اور بہت سے مسائل حل ہو گئے۔ یہ حل اسلام کے قریب بھی ہے کیونکہ بڑوں کا احترام بھی اسلام کو مطلوب ہے پھر جو بڑا ہوتا ہے اس کا تجربہ زیادہ ہوتا ہے جو عموماً سربراہی کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ پھر اس کا دل اور ظرف بھی بڑا ہوتا ہے چھوٹے عموماً اس سے محروم ہوتے ہیں اور جتنی قربانی بطور سربراہ بڑا دیتا ہے چھوٹے عموماً نہیں دے سکتے اور ویسے بھی یہ بڑے بھائی کی عزتِ نفس کے خلاف ہوتا ہے کہ سربراہی چھوٹے کو دی جائے۔ اس سے فساد پیدا ہوتا ہے اور علیحدگی اور تفریق کی بنیاد پڑتی ہے۔

منطقی:۔ لیکن یوں بھی تو ہوتا ہے کہ بڑا بھائی سربراہی کا اہل نہیں ہوتا یا اس میں عقل کی کمی ہوتی ہے، ویسے بھی دیکھا گیا ہے کہ نئی نسل پرانی سے زیادہ ذہین ہوشیار اور تعلیم یافتہ ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں کیا یہ چھوٹوں کا حق نہیں؟

فلسفی:۔ اگر بڑا بھائی اہل نہ ہو یا معذور وغیرہ ہو تو سربراہی اس سے چھوٹے کو دی جا سکتی ہے لیکن علم یا ہوشیاری کی بنیاد پر سرداری دینے سے بڑے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں کیونکہ اس طرح تو سب سے چھوٹا سرداری کا اہل قرار پائے گا جبکہ اس سے بڑے اس کی سربراہی کو

قبول نہیں کریں گے اور انتشار پیدا ہو گا۔ تجربہ بھی اصل اہلیت ہے جو ظاہر ہے بڑے میں زیادہ ہو گا۔ وہ زیادہ میچور ہو گا اور حکمت سے مشکل حالات کو ہینڈل کرلے گا جبکہ چھوٹے تعلیم اور ذہانت کے باوجود مسائل حل کرنے میں جتنی تیزی دکھائیں گے اتنے ہی حالات خراب ہوں گے کیونکہ مسائل تیزی سے نہیں حکمت سے حل ہوتے ہیں پھر عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ چھوٹے بھائی خودغرضی سے کام لیتے ہیں جبکہ بڑا سب کے لئے سوچتا ہے اور سب کے لئے قربانی دیتا ہے جبکہ چھوٹے حسد بھی کرتے ہیں اور کسی قسم کی قربانی دینے سے بھی پہلوتہی کرتے ہیں۔ ساری ذمہ داریاں تو بڑا ادا کرتا ہے لیکن اس کے ثمرات زیادہ تر چھوٹوں کو ہی ملتے ہیں۔ پھر چھوٹے عموماً جذباتی ہوتے ہیں اور ہر چیز کو جذبات کی عینک سے دیکھتے ہیں اور عقل سے کام کم لیتے ہیں جبکہ اجتماعی معاملات چلانے کے لئے عقل فہم برداشت تدبر اور حکمت کے ساتھ ساتھ تجربہ بھی ضروری ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ سب چیزیں تو بڑے کے پاس ہی ہوتی ہیں۔ جذبات سے معاملات حل ہونے کی بجائے بگڑ جاتے ہیں۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ سربراہی بڑے کو ہی ملے۔ عربوں میں بھی یہی دستور تھا کہ باپ کی وفات کے بعد سربراہی بڑے کو ملتی تھی اور اس کے بعد ترتیب دار چھوٹوں کو اور یوں خاندانی معاملات احسن طریقے سے چلتے رہتے تھے۔

منطقی:۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ گھر میں تیسرا بھائی زیادہ خوش حال عیاش اور غیر ذمہ دار ہوتا ہے اس کی کیا وجہ ہے؟

فلسفی:۔ ہمیشہ تو نہیں لیکن عموماً ایسا ہی ہوتا ہے لیکن یہ کوئی ایسی غیر معمولی بات نہیں، تیسرے بھائی سے اور تین بندے ہوتے ہیں یعنی باپ اور دو بڑے بھائی وہ ہر ذمہ داری قبول کر لیتے ہیں اور ایک کے بعد دوسرا ذمہ دار بنتا چلا جاتا ہے اور باپ زیادہ محنت کرتا ہے بڑا بھائی اس سے کم اور منجھلا اس سے بھی تیسرے تک آتے آتے محنت کی ضرورت ہی نہیں رہتی اور وہ خوش حال ہو چکے ہوتے ہیں اس لئے تیسرے کو نہ تو کوئی خاص محنت کرنا پڑتی ہے۔ نہ اس پر کوئی خاص ذمہ داری ہوتی ہے اور معمولی چھوٹا ہونے کے باعث اس کو لاڈ پیار میں بگاڑ دیا جاتا ہے پھر وہ لاپروا اور عیاش ہی نہیں بلکہ بدمعاش بھی بن جاتا ہے اور اس کی بدمعاشی کا پہلا شکار اس کے گھر والے ہی ہوتے ہیں جن کے بل پر اسے تمام آسائشیں مل رہی ہوتی ہیں۔ وہ حصہ تو اپنا پورا طلب کرتا ہے مگر ذمہ داریاں آدھی بھی ادا نہیں کرتا لیکن ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا کبھی بڑا بھائی ذمہ داریوں سے جان چھڑا کر الگ ہو جاتا ہے تو چھوٹے بھائیوں کو دن میں تارے نظر آ جاتے ہیں۔ بڑے کو عموماً ہر چیز پر سب سے زیادہ اختیار ہوتا ہے اور اگر وہ انصاف پسند نہ ہو تو چھوٹوں کی زندگی اجیرن ہو جاتی ہے۔ بڑے کے اختیارات ہی نہیں ذمہ داریاں بھی بڑی ہوتی ہیں اور قربانیاں بھی سب سے زیادہ اسی کو دینا پڑتی ہیں اگر وہ ایسا کر لے تو وہ واقعی بڑا ہے لیکن عام طور پر چھوٹے اس کی قربانیوں کو نہیں دیکھتے بلکہ اس کے اختیار سے حسد میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور ان کو حقیقت کا پتا تب چلتا ہے جب ذمہ داری ان کے سر پر آ جاتی ہے۔ مجموعی طور پر بڑے کو بھی کافی فوائد حاصل ہوتے ہیں کیونکہ اصل حکم تو اسی کا چلتا ہے۔ چھوٹا بھی لاڈ پیار میں بہت کچھ حاصل کر لیتا ہے اس لئے منجھلا بھائی خاندان میں زیادہ مار کھاتا ہے۔ اسے ذمہ داریاں تو کسی نہ کسی حد تک ادا کرنا پڑتی ہیں لیکن عموماً اسے اتنے اختیارات نہیں ملتے جب تک کہ سربراہی اسے نہیں ملتی۔

منطقی:۔ ماضی میں عموماً اجتماعی معاملات کی سربراہی وراثتاً منتقل ہوتی تھی جیسے کہ بادشاہت میں جبکہ جمہوریت میں ایسا نہیں ان میں سے کون سا طریقہ زیادہ

بہتر ہے؟

فلسفی:۔ اگر تو ایک سربراہ کی اولاد اہلیت رکھتی ہو تو وہ آئندہ سربراہ بننے کی زیادہ حقدار ہے کیونکہ بطور سربراہ ان کے باپ یا بھائی نے جو جدوجہد کی ہوگی اس کے صلے کے زیادہ اہل اس کے وارث ہی ہوں گے اور ان کو ذمہ داری کا زیادہ احساس ہوگا اور خاندانی طور پر بھی وراثت میں ان کو جو خوبیاں ملی ہوں گی وہ سربراہی میں ان کی معاون ہوں گی لیکن اگر وہ اہل نہ ہوں تو محض وراثت کی بنیاد پر ان کو سربراہی دینا غلط ہوگا جیسے اکثر گدی نشینوں کا یہ حال ہے کہ وہ نااہل ہونے کے باوجود محض وراثت کی بنیاد پر سجادہ نشین بن جاتے ہیں۔

اسی طرح جمہوریت بھی نہ تو کلی طور پر درست ہے اور نہ ہی مکمل طور پر غلط۔ اگر تو معاشرہ باشعور، تعلیم یافتہ اور سمجھدار ہوگا تو جمہوری طریقے سے ان کا منتخب کردہ سربراہ یقیناً اہل ہوگا جیسے کہ ترکی مصر ایران اور الجزائر میں لوگوں نے جمہوری طریقوں سے اعلیٰ ترین اور اہل ترین قیادت منتخب کی یہ الگ بات کہ اکثر جگہ مغرب نے ان کو اسلام پسندی کی بناء پر ان کی چلنے نہیں دیا۔

جہاں تک ہمارا یا پڑوسی ملک کا تعلق ہے تو یہاں تعلیم، شعور اور فہم کی وہ سطح ابھی تک حاصل نہیں ہو سکی جو اہل قیادت کو منتخب کر سکے اس لئے یہاں جمہوری طریقے سے بھی وراثتی قیادت ہی سامنے آ رہی ہے حکومت چند خاندانوں تک ہی محدود ہے۔ باپ کے بعد ماں بیٹا بھائی بہن یا داماد ہی حکومت میں آتے ہیں جو کہ کھلے عام کرپشن بھی کرتے ہیں اور پھر منتخب بھی ہو جاتے ہیں کیونکہ ووٹ دینے والوں کی اکثریت جاگیرداروں، وڈیروں، سرمایہ داروں یا پتھارے داروں کے چنگل میں پھنسی ہوئی ہے اور اپنی ذاتی رائے اوّل تو رکھتی ہی نہیں اور اگر رکھتی بھی ہے تو اپنی مرضی سے ووٹ نہیں دے سکتی۔

❀❀❀

طب و صحت

مریض دوائی منگوانے کے لئے اپنا حوالہ نمبر ضرور لکھا کریں
رپورٹس اور خطوط پر اپنا موبائل نمبر لازماً لکھیں

دستِ شفاء

صرف 15 گھنٹوں میں مکمل علاج!

ڈاکٹر رانا محمد اقبال (گولڈ میڈلسٹ)
0321-7612717
ڈی۔ایچ۔ایم ایس (DH.Ms)
ممبر پیرا میڈیکس ایسوسی ایشن پنجاب
ممبر پنجاب ہومیو پیتھک ایسوسی ایشن
شعبۂ طب و نفسیات

اگر کوئی ڈاکٹر کبھی کسی غلطی یا بھولے سے بیمار ہو جائے تو ہمارے لوگ اکثر کہتے ہیں کہ اجی آپ تو ڈاکٹر ہیں پھر بیمار کیسے ہو گئے؟ تو اس کا ایک جواب تو بھائی یہ ہے کہ ڈاکٹر بھی انسان ہی ہوتے ہیں اور کبھی کبھی تو عام انسانوں کی طرح اُن سے بھی لاپرواہی ہو جاتی ہے اور اس کے علاوہ دوسری دو وجوہات بھی ہیں۔

1- لوگ انہیں مسیحا سمجھتے ہوئے وقت بے وقت پریشان کرتے رہتے ہیں اور اس طرح ان کے معمولات میں فرق آجاتا ہے۔ بے آرامی اور ٹینشن کی وجہ سے بندہ بیمار ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی کئی معاملات ایسے ہیں جو بندہ کے بس سے باہر ہیں۔

2- اگر ڈاکٹر حضرات خود بیمار نہ ہوں تو وہ امراض کے بارے میں تندہی سے ریسرچ ہی نہ کریں کیونکہ ادویاتی کمپنیاں تو صرف مالیاتی نگاہ سے ہی کام کرتی ہیں جبکہ معالج انسانی ہمدردی کے زاویہ سے سوچتا ہے۔

میں نے جہاں تک غور کیا ہے پاکستان میں اکثر کیس گلے یا پیٹ (امراضِ معدہ) کے ہیں کیونکہ کھانے پینے کی اشیاء کے بارے میں حفظانِ صحت کے اصولوں پر شاید ہی کہیں عمل ہوتا ہو۔ ورنہ پاکستان میں محکمہ ہیلتھ سے لے کر عام دُکاندار اور ہوٹل والے تمام حضرات کا ایک ہی نقطۂ نظر ہے، وہ یہ کہ خرچہ بالکل نہ ہو اور آمدنی زیادہ سے زیادہ ہو۔

جب بچپن میں مَیں فیصل آباد اپنے آبائی گھر میں رہتا تھا اور گھر سے ہی کھانا کھاتا تھا تو اکثر باہر کے رہائشی لوگوں کو ہوٹلوں پر کھانا کھاتے دیکھتا تو سوچتا کہ کتنے

خوش نصیب لوگ ہیں جو ہوٹلوں میں کھانا کھاتے ہیں۔ مثلاً حلوہ پوری، لسی، نان، سری پائے، چنے وغیرہ اور دیگر مرغن کھانے۔ مگر اصل حقیقت کا پتہ نہ تھا۔ جب معلوم ہوا تو اب سوچتا ہوں کہ وہ بے چارے کتنے مجبور ہیں اور بے بس بھی کہ نہ تو ان دکانداروں کا کچھ بگاڑ سکتے ہیں اور نہ ہی احتجاج کر سکتے ہیں۔ بس وقت گزار رہے ہیں، پیسے دے رہے ہیں اور صحت کا کباڑہ کروا رہے ہیں۔

مجھے آج سے بہت عرصہ قبل کا ایک کارٹون یاد آیا جو کہ جنگ اخبار میں شائع ہوا تھا۔ وہ کچھ اس طرح ہے کہ ایک شخص خودکشی کرنے کے لئے زہر کھاتا ہے مگر نہیں مرتا۔ پھر رسے سے لٹکتا ہے تو رسہ ٹوٹ جاتا ہے۔ ایسے کئی طریقے کرتا ہے مگر ہر بار بچ جاتا ہے۔ آخر کار وہ سوچتا ہے کہ موت قسمت میں نہیں تو زندگی انجوائے کی جائے۔ خوشی خوشی ایک ہوٹل میں جاتا ہے اور مرغے، زردہ پلاؤ وغیرہ کھاتا ہے اور تھوڑی ہی دیر کے بعد فوت ہو جاتا ہے۔

شاید آپ میری بات کا یقین نہ کریں مگر یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ ہوٹلوں میں جو اشیاء کھانا پکانے کے لئے استعمال ہوتی ہیں مثلاً آئل، ٹماٹر، پیاز اور دیگر Raw Material اس کے بارے اگر آپ جان جائیں تو کبھی ان ہوٹلوں کے پاس سے بھی نہ گزریں اور گھر کی سادہ روٹی اور سالن کو ترجیح دیں بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ اکثر امراض مثلاً کینسر، شوگر، ہارٹ اٹیک کی بنیادی وجہ یہ غیر معیاری کھانے ہی ہیں بلکہ بڑے شہروں کے ہوٹلوں میں ایک نئی بدعت شروع ہوگئی ہے وہ یہ کہ کئی شادیوں کا بچا ہوا کھانا پھر گرم کر کے باراتیوں کو دے دیتے ہیں مگر وہ شرم کے مارے بولتے نہیں کہ اپنی ہی بے عزتی ہوگی اور نہ ہی سرکاری محکموں والے کچھ کرتے ہیں۔ علم ہونے کے باوجود جو ہوتا ہے ہوتا رہے، ان کی بلا سے کیونکہ ان کی تو جیبیں گرم ہوتی رہتی ہیں۔

لاہور واپڈا ٹاؤن کا ایک مشہور ہوٹل یہ مکروہ کام کرتا رہتا ہے۔ یہ واقعہ میرے عزیزوں کے ساتھ بھی ہوا تھا۔

پہلے میں اکثر سوچتا تھا کہ آدمی باہر جائے تو فلاں چیز کھا لے، فلاں نہ ہو تو ایسا کر لے مگر اب تو میری عقل بھی جواب دے رہی ہے کیونکہ ان اشیاء میں سے شاید ہی اب کوئی چیز کھانے کے قابل ہو۔

بہرحال پہلے کتابوں میں پڑھا کرتا تھا کہ علم ہزار نعمت ہے مگر اب سوچتا ہوں کہ کئی موقعوں پر لاعلمی بھی بہتر ہے کیونکہ اگر آپ کو علم ہو جائے کہ کھانے کی اشیاء (پھلوں سمیت) کے ساتھ کیا ہو رہا ہے تو شاید آپ بھی کچھ نہ کھا سکیں۔

ہوٹلوں میں صفائی اور گندے برتنوں کے بارے میں تو آپ مجھ سے زیادہ ہی جانتے ہوں گے۔ بہرحال یہ ایک ایسا موضوع ہے جس پر کئی کتابیں لکھی جا سکتی ہیں اور شاید پھر بھی ختم نہ ہو۔

اس تمہید کے بعد میں اصل واقعات کی طرف آتا ہوں۔ تو جناب واقعہ یہ ہے کہ یکم دسمبر 2014ء بروز جمعرات مجھے چند سرکاری کاموں کے سلسلے میں فیصل آباد جانا پڑا۔ سفر پر جانے سے پہلے میں نے صرف رس اور دودھ کا استعمال کیا تا کہ دورانِ سفر بار بار واش روم کی ضرورت پیش نہ آئے۔ جاتے وقت تو معاملہ ٹھیک ہی رہا پھر وہاں جا کر کئی دفتروں کے چکر لگائے اور تقریباً 2 بجے جب بہت بھوک لگی تو مجبوراً ایک قدرے صاف سے ہوٹل میں تھوڑا سا لنچ کیا اور پھر باقی ماندہ کاموں میں معروف ہوگیا۔

آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ سفر میں اور سرکاری کاموں میں دیر ہو ہی جاتی ہے۔ بہرحال 3 بجے سہ پہر کے قریب فارغ ہو کر کھرڑیانوالہ تھانہ کے قریب پٹرولنگ پولیس کی چوکی میں ایک دوست سے ملنے گیا۔

وہیں پر اچانک پیٹ میں گڑبڑ شروع ہو گئی۔ دو تین بار واش روم گیا، وہاں نزدیک کوئی ہومیو پیتھک سٹور نہ تھا۔

دوسری بات یہ ہے کہ اکثر ایسے کیسوں میں جلد بازی کی وجہ سے کوئی ہومیو پیتھک دوا جلدی سلیکٹ بھی نہیں ہوتی۔ لہٰذا میں نے فوری آرام کے لئے Entamizol Tabs خرید کر کھالیں۔ ساتھ ہی دعا بھی کی کہ یا اللہ کوئی اچھی کوچ مل جائے جو کہ دوران سفر بے جا پریشان اور لیٹ نہ کرے تا کہ بخیریت گھر آ جاؤں۔ جلدی ہی فیصل آباد سے لاہور جانے والی ایک اے سی کوچ مل گئی اور اس نے حسب توقع ڈیڑھ گھنٹے میں شیخوپورہ اتار دیا۔ راستے میں کئی چیزیں بکنے آئیں مگر میں نے بالکل توجہ نہ دی۔ خدا کا شکر ادا کیا کہ سفر خیریت سے کٹ گیا مگر جلد ہی پھر پیٹ میں گڑبڑ ہونے لگی، ساتھ بخار بھی ہو گیا اور رات خاصی مشکل سے گزاری۔

اگلے روز بھی طبیعت نڈھال رہی۔ صرف تھوڑے سے سادہ ابلے چاول کھا کر گزارا کیا۔ قے محسوس ہوتی رہی، طبیعت میں بیزاری، کچھ کھانے کو دل نہ چاہتا تھا۔ جسم بھی گرم رہا۔ جمعہ کا دن تھا۔ اٹھنے کو دل نہ کرتا تھا۔ ایسے لگتا تھا کہ ابھی گر پڑوں گا تاہم بڑی ہمت کر کے ارادہ کیا کہ جیسے بھی ہو جمعہ کی نماز ضرور ادا کروں گا۔ سردی بھی شدید تھی۔ گرم پانی منگوا کر وضو کے لئے اس میں ہاتھ ڈالا تو قدرے سکون محسوس ہوا۔ پھر وضو کرتا گیا اور خدا کی قدرت کہ اپنے مسئلے کی دوا سمجھ میں آ گئی۔ نماز کی ادائیگی کے بعد مطلوبہ دوا کی ایک خوراک لے لی۔ پھر ایک گھنٹے کے بعد اور پھر رات کو ایک خوراک لی۔ رات بھر پسینے آتے رہے تاہم صبح تک حالات بہت بہتر ہو گئے۔ کپڑے اتار کر دوسرے کپڑے تبدیل کر کے نماز فجر ادا کی اور پھر 8 بجے دفتر چلا آیا اور پھر خدا کے کرم سے طبیعت ٹھیک ہی رہی اور پھر کسی اور دوا کی ضرورت نہیں پڑی۔

اب آپ سب یقیناً حیران بھی ہوں گے اور منتظر بھی کہ دوا کون سی تھی۔ تو میں اب تفصیل بھی بتا دیتا ہوں۔ اگرچہ میں نے کئی بار لکھا ہے کہ معالجین کو اگر کسی کیس کی سمجھ نہ آئے تو رابطہ کر سکتے ہیں مگر وہ بھی اپنی "انا" کے ایسے مارے ہوئے ہیں کہ خود کو شاید عقلِ کل سمجھتے ہیں۔ لہٰذا میں خود ہی ایسی باتیں بتا دیتا ہوں۔ جب میں نے پانی میں ہاتھ ڈالا تو سکون ہوا اور گرم پانی پیا تو آرام۔ گویا کہ "گرمی سے آرام"۔ تو یہ علامت تین ادویات کی لیڈنگ علامت ہے۔

(1)Cal Carb

(2) Rhus-Tox

(3)ARS ALB

ان تینوں میں یہ بات بہت حد تک یکساں ہے مگر دوا صرف نمبر 3 والی بنتی ہے کیونکہ اس دوا کا پیٹ کے امراض سے گہرا تعلق ہے اور یہ واحد دوا ہے جو ان میں Anti Biotic (دافع تعفن) بھی ہے اور اس میں مخصوص کمزوری بھی پائی جاتی ہے باقی علامات کے ہمراہ۔ تو جناب جیسا کہ آپ نے پہلے پڑھا کہ اکیلی دوا یعنی سنگل میڈیسن نے ایسا کام کیا جس کے لئے ایلو پیتھک علاج میں کئی ادویات کئی دن تک دینی پڑتی ہیں اور یہاں اس کیس میں بغیر کوئی دوا تبدیل کئے صرف 15 گھنٹوں میں سارا کیس کلیئر ہو گیا۔ شکر ہے خدا کا کہ جس نے وضو اور نماز کے طفیل صحت یابی کی کلید عطا فرمائی اور دیگر بے شمار معالجوں اور مریضوں کا بھی بھلا کر دیا۔

بعد میں بھی چند کیسوں میں اسی علامت کی بناء پر یہ دوا بہت کامیابی سے استعمال کی گئی ہے۔

***

جرم و سزا

تجوری سونے چاندی کے زیورات اور نقدی سے منہ تک بھری ہوئی تھی۔ بلے نے ساہوکار کو زوردار تھپڑ رسید کیا اور کہا کہ سارا مال نکالو۔

محمد نذیر ملک

گرمیوں کی مختصر رات آدھے سے زیادہ سفر کر چکی تھی۔ پورا چاند نکل آیا تھا۔ کائنات چمک اٹھی تھی۔ ہر شے چاند کی میٹھی چاندنی میں نہا گئی تھی۔ نرم رو ہوا سرگوشیاں کرتے گزر رہی تھی۔ قریب کی جھاڑیوں میں جھینگر اونچے سُروں میں بول رہے تھے۔ دور کہیں کتوں کے بھونکنے کی ہلکی ہلکی آوازیں آ رہی تھیں جن سے لگتا تھا کہ آبادی قریب آنے والی ہے۔ وہ سُرلہ (Surla) کے پہاڑوں سے نکل آئے تھے اور اب ”دمن“ کے زیریں علاقہ میں پہاڑی علاقہ عبور کرتے وقت ان کی گھوڑیاں کافی تھکی تھیں۔ سرلہ کے پہاڑوں والا راستہ نہایت دشوار گزار اور تھکا دینے والا تھا۔

کہنہ مشق سوار یہ بخوبی جانتے ہیں کہ ان کی سواری کی کیا کیفیت ہے اور کس موقع پر اسے کیسی چال میں ڈالنا ہے۔ گھوڑے کے لئے پہاڑی راستہ عبور کرنا ہموار زمین

پر سرپٹ بھاگنے سے کہیں زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ چڑھائی میں وہ زیادہ تھکتا ہے۔ اسے آرام دینے کے لئے سوار اسے ہموار زمین پر عموماً ڈلکی چال میں ڈال دیتے ہیں تاکہ وہ ساتھ دم بھی لیتا رہے۔ ایسے میں گھوڑا تھکتا کم ہے۔ ڈلکی چال میں گھوڑے کے تین پاؤں ایک ساتھ اٹھتے ہیں اور یہ تینوں پاؤں بیک وقت زمین سے اٹھتے وقت حالت آرام میں ہوتے ہیں۔ یوں اس کی تھکاوٹ چلتے چلتے دور ہوتی رہتی ہے۔ جبکہ سوختہ پا (تیز قدم) چال میں بھی گھوڑا کافی تھکتا ہے۔

آبادی اب قریب آ چکی تھی۔ بلے نے سب کو رکنے کے لئے کہا تاکہ وہ اپنی اپنی چھویوں (چھوٹی کلہاڑیوں) کے پھل اپنے کندھوں پر ٹکائی لاٹھیوں کے سروں پر دوبارہ کس لیں جنہیں گھر سے چلتے وقت انہوں نے تھیلے میں رکھ لیا تھا۔

چاند کی چاندنی میں سامنے دھندلا سا گاؤں دکھائی دے رہا تھا۔ یہی گاؤں ان کی منزل تھا۔ سوار گھوڑیوں سے نیچے اتر آئے۔ سب نے اپنی اپنی چھوی سنبھال لی۔ بلے نے فیصلہ کیا کہ گھوڑیاں اسی جگہ رکی رہیں گی اور شیرا ان کی نگرانی کرے گا۔ بلے نے دیگر دونوں ساتھیوں حاضر اور نورے کو ساتھ رکھ لیا اور اپنے ساتھ ان کو بھی منقی کے پانچ پانچ دانے کھلائے تاکہ اگر بھاگنا پڑے تو سانس نہ پھولے۔

گاؤں سویا ہوا تھا اور کوئی ہلچل نہیں تھی۔ جلد ہی وہ گاؤں کی پہلی گلی میں داخل ہو گئے۔ محلہ کے آوارہ کتوں کو خبر ہو گئی۔ انہوں نے ان تینوں کا "والہانہ استقبال" کیا۔ وہ ذرا فاصلہ رکھ کر بے طرح بھونکنے لگے۔ بلے کی جانب سے یہ واضح ہدایات تھیں کہ کتوں کو کسی صورت بھی اشتعال نہ دلایا جائے نہ ہی انہیں ڈرایا دھمکایا جائے بلکہ جہاں تک ہو سکے ان سے دوستی گانٹھی جائے۔ ان کی جانب ماسوائے روٹی، کوئی چیز نہ پھینکی جائے۔ چھوی یا لاٹھی کو تو بھول کر بھی نہ ہلایا جائے بلکہ اسے ان سے چھپایا جائے کیونکہ لاٹھی اور کتے کا ازلی بیر ہے۔ آدمی کے پاس لاٹھی دیکھ کر اپنی جان کے خوف کی وجہ سے کتا خواہ مخواہ بھونکتا ہے۔

ادھر گاؤں والے بھی سوتے جاگتے کتے کے بھونکنے کے انداز سے کئی باتوں کا پتہ چلا لیتے ہیں۔ مثلاً کیا کتے محض آپس میں بے کار کی سرپھٹول کر رہے ہیں یا فی الواقع ان کی کسی اجنبی یا نووارد سے مڈبھیڑ ہو رہی ہے اور یہ کہ نووارد کا کتوں کے ساتھ رویہ کیسا ہے۔ آیا نووارد پیشہ ور چور یا ڈاکو ہے یا ویسے ہی کتے کسی کے راہ چلتے میں گلے پڑ گئے ہیں۔ یہ آوارہ کتے گاؤں والوں کے مخبر ہوتے ہیں۔ وہ کتوں کی آواز کے زیر و بم سے کافی کچھ سمجھ لیتے ہیں۔ اگر کوئی خطرے والی بات ہو تو اس کے مطابق پھر اگلا قدم اٹھایا جاتا ہے، نہیں تو جانے دیا جاتا ہے۔

ادھر آوارہ کتوں کا یہ رواج ہے کہ جو کوئی بھی ان کے سامنے روٹی یا کھانے کی کوئی اور چیز پھینکے، وہ اپنی دُمیں ہلاتے اسی کے ہو لیتے ہیں۔ بس یہی ان کی اوقات ہوتی ہے۔ ایسے کتوں کی پہچان بھی خوب ہوتی ہے۔ وہ جہاں کہیں بھی اپنے کسی کھلانے والے کو دیکھتے ہیں اپنی دُم ہلا کر اس سے دوستی جتلاتے ہیں جبکہ حفاظت پر مامور رکھوالی والے پالتو کتوں کا وطیرہ ذرا مختلف ہوتا ہے۔ وہ خالی سوکھی روٹی پر دوستی نہیں لگاتے نہ ہی اسے خاطر میں لاتے ہیں۔ بکنے کے لئے ان کا بھاؤ تیز ہوتا ہے۔ وہ قیمہ بھرے پراٹھوں سے کم پر راضی نہیں ہوتے۔ قیمہ کتے کی اولین ترجیح اور کمزوری ہے یہ اس کی من بھاتا غذا میں شامل ہے۔ یار لوگوں نے بھی اس کی اس کمزوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے قیمہ بھرے سینگ کی مار دے دی ہے۔ گلی محلے کے آوارہ مفلس کتوں کے ساتھ ان کی اوقات کے مطابق سلوک کرتے ہوئے اور ان سے یارانہ

گانٹھتے، تینوں ساتھی گلی کا موڑ مڑ گئے۔ بعض لوگ اپنے مکانوں کی چھتوں پر سوئے ہوئے تھے۔ تھوڑی دیر پہلے کتوں کے بے طرح بھونکنے پر وہ سوتے میں چونکے ضرور تھے لیکن جلد ہی کتوں کی جانب سے خاموشی چھا جانے پر پہلو بدل کر دوبارہ اطمینان سے سو گئے۔

محلہ کا چوکیدار ''جاگتے رہنا'' کی صدا لگاتا ان تینوں کا سامنے سے راستہ کاٹ گیا۔ یوں لگتا تھا وہ لوگوں کو جگاتے جگاتے خود سوتے میں چل رہا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ تینوں بھی اس کے گزرتے وقت مکمل طور پر دیوار کے ساتھ چپکے ہوئے تھے۔

بلا چلتے چلتے ایک دو منزلہ مکان کے سامنے آ کر رک گیا اور اس نے اس کے بند دروازے پر دستک دے ڈالی۔ کچھ دیر تک جب اندر سے کوئی جواب نہ آیا اور نہ ہی کوئی باہر نکلا تو بلے نے دوبارہ دروازے پر دستک دی۔ اس بار دستک کے جواب میں کسی نے اوپر سے جھانکتے ہوئے پوچھا کون ہے؟ بلے نے اوپر دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''شریفے! یہ میں بلا اور میرے ساتھی ہیں، دروازہ کھولو''۔

کچھ ہی دیر میں دروازہ کھل گیا اور شریفے نے باہر آ کر تینوں سے مصافحہ کیا اور انہیں اندر لے گیا۔ صحن میں چار چارپائیاں بچھی تھیں۔ شریفے نے پوچھا۔ چوتھا آدمی کہاں ہے، کیا وہ گھوڑیوں کے پاس ہے، گھوڑیاں گاؤں کے باہر کھڑی کی ہیں؟

بلے نے کہا۔ ''جو بھی کرنا ہے جلدی کر لیں۔ ہمیں اذانوں سے پہلے یہ گاؤں چھوڑنا ہے''۔

ہو جائے گا، گھبراتے کیوں ہو''۔ شریفے نے آسان سے لہجے میں کہا۔ شریفا گاؤں کا نامانا ہوا لٹھ باز تھا۔ وہ جب لاٹھی چلاتا تو اس کے سامنے بڑے بڑے سورما ٹھہر نہیں سکتے تھے۔ چار پانچ آدمیوں کو تو وہ یوں چٹکی بجاتے کنارے لگا دیتا تھا۔ وہ بلے کا دوست تھا۔ بلا اس کے گھر میں پہلے بھی آتا جاتا رہا تھا۔

''اچھا بھئی جو اللہ کرے گا''۔ شریفے نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''وہ تینوں شریفے کے پیچھے ہو لئے۔ شریفے نے کہا۔ ٹھہرو میں ذرا حقہ لے لوں۔ گاؤں کی گلیوں میں حقہ گڑگڑاتے جائیں گے تو لوگوں کو شک نہیں ہو گا۔ چھویاں بے شک کھلی ہی رہیں لاٹھی چھوی ایک ہوتے۔

شریفے نے صافے میں منہ لپیٹ لیا۔ وہ چاروں باہر نکل پڑے۔ شریفا حقہ گڑگڑاتا چمٹا جھلاتا آگے آگے چل رہا تھا۔ چاروں کچھ ہی دیر میں ہندو ساہوکاروں کے جڑواں مکانوں تک جا پہنچے۔ بھرے گاؤں میں کیا تمام علاقہ میں ان ساہوکاروں نے اپنی حفاظت کے لئے دو خطرناک قسم کے نسلی کتے پال رکھے تھے۔ وہ رات کو انہیں گھر میں کھلا چھوڑ دیتے تھے۔ رات کو کسی کو ان کے گھروں کے قریب جانے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ وہ چیر پھاڑ دیتے تھے۔ بلے کے گروہ کے مکانوں کے قریب پہنچتے ہی دونوں کتوں نے اجنبی آدمیوں کی بو پا لی وہ گھر کی دیوار پھلانگ کر باہر آ گئے اور آنے والوں پر حملہ آور ہونے کے لئے اچھل کر آگے بڑھے۔ پہلے پہنچنے والے کتے کو بلے نے سنبھالا۔ بلا اپنے ساتھ پٹ سن کی ایک بڑی سی بوری لایا تھا۔ جونہی کتا نزدیک ہوا بلے نے آگے ہو کر اچانک اس کے سامنے بوری کا منہ کھول دیا اور خود بوری کے پیچھے ہو لیا۔ کتا جس زور سے آیا تھا اسی زور سے بوری کے اندر چلا گیا۔ بلے نے جلدی جلدی بوری کا منہ مضبوط رسی سے جو وہ ساتھ لایا تھا پکا کر کے باندھ دیا۔ کتا بوری کے اندر کلابازیاں کھانے لگا۔ وہ کافی طاقتور تھا لیکن بلا بھی کچھ کم نہ تھا اس نے بوری کے بندھے ہوئے منہ کو دونوں ہاتھوں سے مضبوطی سے پکڑ بھی رکھا تھا۔ کتے کے جھٹکوں سے بلا بھی جھٹکے کھانے لگا۔ اسی دوران حاضر اور نورے نے چھوی چلا کر کتے کا کام تمام کر دیا۔ کچھ ہی دیر میں کتا گھٹی گھٹی آوازوں کے ساتھ خاموش ہو گیا۔

ادھر پیچھے آنے والے دوسرے کتے کو آتے ہی شریفے نے اپنی چھوی کی باڑھ پر رکھ لیا۔ چھوی کا وار کھاتے ہی کتا پرے جا گرا اور تڑپنے لگا اور کچھ ہی دیر میں ٹھنڈا ہو گیا۔

گھر والے جو صحن میں سوئے ہوئے تھے، جاگ اٹھے تھے۔ بلے کے ساتھیوں میں سے کسی نے دیوار پھلانگ کر جلدی میں اندر سے کنڈیاں کھول دیں۔ سب اندر آئے، کتوں کا حشر دیکھ کر گھر والوں کے اوسان خطا ہو گئے۔

بلے نے چھوی لہراتے ہوئے کہا کہ گھر کی لالٹینیں جلاؤ۔ کچھ ہی دیر میں گھر روشن ہو گیا۔ وہ بلے ڈکیت اور اس کے گروہ کو دیکھ کر سٹپٹا گئے اور منت سماجت پر اتر آئے۔ بلے نے اعلان کیا کہ جو کچھ گھر میں روپیہ پیسہ اور زیور گہنا ہے سب ایک جگہ ڈھیر کر دو۔ مرد عورتیں اور بچے سب چیخنے لگے۔ ساہوکار اونچے سُر میں رام رام جپنے لگا۔ بلے نے چھوی لہراتے ہوئے سب سے مخاطب ہو کر کہا کہ اگر اب کسی نے منہ سے ذرا سی بھی آواز نکالی تو یاد رکھو اس چھوی کے دو منہ ہیں، میں اس کی گردن کاٹ کر پرے پھینک دوں گا۔ سارے ہی سہم کر چپ ہو گئے۔ اسی اثناء میں ساہوکار مال لانے کے لئے اندر چلا گیا اور کچھ ہی دیر میں ایک چھوٹی سی پوٹلی لے کر باہر آ گیا اور پوٹلی بلے کے حوالے کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ بلے نے پوٹلی پکڑ کر ساہوکار کے منہ پر ماردی اور اسے کہا کہ یہ مال بہت تھوڑا ہے اگر تم اپنی تجوری کا سارا مال نہیں لاؤ گے تو ہم تمہاری بیٹی کو اٹھا کر لے جائیں گے۔ ساہوکار پوٹلی لے کر دوبارہ اندر چلا گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے بلا بھی اندر چلا گیا۔ تجوری والے کمرے میں دیا جل رہا تھا۔ بلے نے ساہوکار سے کہا کہ وہ پھر سے تجوری کھولے۔ ساہوکار منت سماجت کرنے لگا اور بلے کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ بلے نے اسے ٹھوکر مار کر الگ کیا اور ڈانٹتے ہوئے کہا کہ تجوری کھولو۔ ساہوکار نے جب تجوری کھولی تو حیرت سے بلے کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

تجوری سونے چاندی کے زیورات اور نقدی سے منہ تک بھری ہوئی تھی۔ بلے نے ساہوکار کو زوردار تھپڑ رسید کیا اور کہا کہ سارا مال نکالو۔ ساہوکار گڑگڑایا اور کہا کہ مہاراج مجھ پر دیا کیجئے، رحم کیجئے۔ یہ سارا مال لوگوں کی امانتیں ہیں۔ اگر میں انہیں واپس نہ کر سکا تو لوگ مجھے مار ڈالیں گے۔

''لوگ تو تجھے تب ماریں گے جب تم میرے ہاتھ سے بچو گے''۔ بلے نے دانت پیستے ہوئے کہا اور ساتھ ہی خود تجوری سے مال نکالنا شروع کر دیا۔ وہ ایک بستر سے چادر اتار کر نیچے بچھا کر مال اس میں ڈالنے لگا۔ بلا مال ڈال ہی رہا تھا کہ باہر شور اٹھا۔ نہ جانے کیسے گاؤں والوں کو خبر ہو گئی کہ ساہوکاروں کے گھر ڈاکو گھس آئے ہیں۔ سارا گاؤں لاٹھیاں برچھیاں اور چھویاں اٹھائے ساہوکاروں کے گھر کی طرف امنڈ آیا۔ یہ نہایت اتفاق والا گاؤں تھا۔ لوگوں کا آپس میں بہت گٹھ جوڑ تھا وہ ایک دوسرے کے کام آتے تھے۔ پورے گاؤں میں دو ہی ہندو ساہوکاروں کے گھر تھے۔ گاؤں والے ان کا بہت خیال رکھتے تھے اور وہ بھی تمام گاؤں والوں کے دکھ سکھ میں برابر کے شریک ہوتے تھے۔ اس بناء پر لوگوں کا وہاں جمع ہونا فطری بات تھی۔ بلا زیورات، نقدی سے بھری پوٹلی اٹھائے صحن میں پہنچا تو دیکھا کہ لوگ گھر کے اندر بھی گھس آئے ہیں۔ شریفا وہاں نظر نہیں آ رہا تھا۔ حاضر اور نورے کو گاؤں والوں نے پکڑ رکھا تھا۔ گاؤں والے انہیں مار ڈالنے کے درپے تھے لیکن بڑے بوڑھے درمیان میں پڑ کر بیچ بچاؤ کی کوشش میں مصروف تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ قانون کو ہاتھ میں مت لو۔ سیدھا سادہ ڈاکوؤں کو پکڑ کر پولیس کے حوالے کر دیا جائے۔ بلے نے صورت حال کو بھانپتے ہوئے لپک کر ساہوکار کے پانچ

سالہ بیٹے کو بستر پر سوتے میں اٹھا لیا اور جیب سے خنجر نکال کر لوگوں کو للکارتے ہوئے کہا کہ اگر کسی نے آگے بڑھنے کی کوشش کی تو وہ بچے کی گردن اتار دے گا۔ لوگ جہاں تھے وہیں کھڑے رہ گئے۔ لڑکے کے والدین اور بہن بھائی چیخنے چلانے لگے۔

بلے نے کہا۔ "میرے بندے چھوڑ دو۔ اگر کسی نے پولیس وغیرہ کو اطلاع کرنے کی کوشش کی تو یاد رکھو اس بچے کو زندہ نہیں پاؤ گے"۔ بلا مال والی پوٹلی بھی تھامے ہوئے تھا۔

ادھر گاؤں والوں نے سر جوڑ لیے، سب سے اہم بات بچے کی سلامتی کے ساتھ بازیابی تھی۔ بچے کی جان کا خطرہ مول نہیں لیا جا سکتا تھا۔ پھر اگر مال سمیت ڈاکو فرار ہوتے ہیں تو اس میں پورے گاؤں والوں کی سبکی ہے۔ ایسی صورت میں قرب و جوار کے گاؤں والوں کی نظر میں اس گاؤں کی عزت اور وقار خاک میں مل جائے گا۔ پھر گاؤں والوں کی جانب سے بچے کی جان بچانے کے لئے یہ فیصلہ ہوا کہ بلے سے کہا جائے کہ وہ بچہ اور مال ہمیں دے دے ہم اس کے ساتھیوں کو چھوڑ دیں گے۔ ساہوکاروں کو تو اس وقت بچے کے علاوہ کچھ نظر ہی نہیں آ تا تھا۔ انہوں نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ ڈاکو بے شک ان کا مال لے جائیں لیکن بچہ ہمارے حوالے کر دیں۔

ادھر گاؤں والے بلے کا مطالبہ ماننے ہیں کہ وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ مال بھی لے جائے گا، اپنی ہتک محسوس کر رہے تھے۔ پھر تو گاؤں والے جیتے جی مر گئے ناں۔ بہتر ہے کہ سب چلو بھر پانی میں ڈوب مریں۔

"مار ڈالو سب کو کوئی بھی زندہ بچ کر نہ جائے"۔ ہر کوئی غصہ میں لال پیلا ہوا جا رہا تھا اور کچھ نہ کچھ کہے جا رہا تھا۔ ادھر شریفا بھی مشورہ دینے والوں میں آن بیٹھا تھا۔ شریفے کی بات بھی لوگ سنتے تھے۔ اب تک کسی کو

بھی معلوم نہیں تھا کہ شریفے کا تعلق بلا گروپ سے ہے۔ شریفے کی یہ شدید خواہش تھی کہ کسی طرح مال کی پوٹلی بلا لے جائے کیونکہ اس میں اس کا بھی حصہ بنتا تھا لیکن پورا گاؤں اس بات کے خلاف تھا کہ ڈاکوؤں کو مال سمیت جانے دیا جائے۔ شریفے کو ساہوکاروں یا ان کے بچے سے حتیٰ کہ گاؤں والوں کی باتوں سے ذرا بھی دلچسپی نہ تھی۔ اسے تو مال سے غرض تھی۔ تاہم اسے اس گاؤں میں رہنا تھا وہ سامنے آ کر کوئی بھی ایسی کارروائی نہیں کر سکتا تھا جو گاؤں والوں کی مرضی کے خلاف ہوتی۔

بظاہر گاؤں والوں کا نمائندہ بن کر شریفا دو ایک بار بلے سے مذاکرات (بات چیت) بھی کر چکا تھا لیکن بلے کو بمع مال بھگانے کی کوئی ترکیب اس کے ذہن میں نہیں آ رہی تھی۔ وہ سارے گاؤں والوں کی آنکھوں میں دھول کیسے جھونک سکتا تھا۔ سپیدہ سحر نمودار ہو گیا لیکن بات کوئی نہ بنی۔ بلے کی جانب سے دیئے گئے آخری وقت کا کنارا بھی قریب آ گیا۔ ساہوکار کا خاندان انتہائی پریشان تھا۔ اب انہوں نے باقاعدہ رونا دھونا شروع کر رکھا تھا۔ اچانک کیا دیکھتے ہیں کہ ایک گھوڑی پر سوار ایک شخص نے مجمعے کے قریب آ کر کھڑا ہوا اور پوچھنے لگا کہ یہاں کیا ہوا ہے۔ کسی نے اسے بتایا کہ اندر بلا ڈکیت گھسا ہوا ہے وہ گھر میں ڈاکا ڈال رہا ہے۔ اس نے ایک بچے کو یرغمال بنایا ہوا ہے۔ لوگ اس سے بات چیت کر رہے ہیں۔ جس شخص سے اس نے پوچھا وہ شریفا تھا اور پوچھنے والا شیرا تھا۔ سوار (شیرا) گھوڑی سے نیچے اتر آیا اور گھوڑی شریفے کو پکڑا کر مکان کے اندر جا گھسا۔ بلے نے اسے اور اُس نے بلے کو دیکھا اور اشاروں اشاروں میں بلے کو بتایا کہ باہر اس کی گھوڑی آئی ہوئی ہے۔ بلا بچے کو لے کر اٹھا اور دروازے کی جانب چل پڑا۔ گاؤں والے بھی اس سے ذرا فاصلہ رکھ کر کلاٹھیاں اور کلہاڑیاں لئے چل پڑے۔ ساہوکاروں کا کنبہ دھاڑیں مار کر رونے لگا۔ اردگرد کافی لوگ جمع تھے۔ شیرا مجمعے میں غائب ہو گیا۔ بلا بچے کو اٹھائے دروازے سے نکل آیا۔ شریفے نے گھوڑی کی باگ چھوڑ کر اس کے اوپر رکھ دی تھی اور خود گھوڑی سے دور جا کھڑا ہوا تھا۔ بلا لمبے لمبے ڈگ بھرتا گھوڑی کے قریب پہنچ گیا اور بچہ ایک آدمی کی طرف اچھال کر دو ایک قلانچیں بھریں اور جست لگا کر پوٹلی اور چھوی سمیت اپنی گھوڑی پر جا بیٹھا اور گھوڑی کو ایڑ لگا دی۔ لوگوں نے اپنے گھروں سے گھوڑیاں نکالیں اور بلے کی گھوڑی کا پیچھا کیا لیکن وہ اس کی گرد کو بھی نہ پا سکے اور بلا بمع گھوڑی دور افق میں غائب ہو گیا۔

یہ سب کچھ شریفے کا کیا دھرا تھا۔ وہ گاؤں والوں کے سامنے تو کچھ کر نہیں سکتا تھا لیکن درپردہ اس نے شیرے سے ملاقات کر کے بلے کی گھوڑی منگوائی اور شیرے کو سارا پروگرام بتا دیا۔ دوسرا کام یہ کیا کہ اپنے کسی آدمی کے ذریعے پیچھے رہ جانے والی تینوں گھوڑیاں ایک دوسرے گاؤں میں بھجوا دیں۔

بلا مال سمیت فرار ہو گیا تھا اور اپنے دو ساتھی گاؤں والوں کے قبضے میں چھوڑ گیا۔ بچہ زندہ سلامت مل جانے کے بعد ساہوکاروں نے دن چڑھے تھانے جا کر اپنے گاؤں ہونے والی ڈاکا زنی، بچے کو یرغمال بنائے جانے اور لاکھوں کے زیورات اور نقد رقم کی چوری (سرقہ بالجبر) کی رپورٹ لکھوا دی۔ رپورٹ میں بلا ڈکیت اور اس کے دونوں ساتھیوں حاضر اور نورے کو نامزد کیا گیا۔

پولیس نے آ کر ان دونوں ڈاکوؤں کو گرفتار کر لیا۔ بلا ڈکیت کی تلاش میں پولیس نے جگہ جگہ چھاپے مارے لیکن اس کا کوئی سراغ نہ ملا۔ بلے ڈکیت کو بستہ 'ب' کا اشتہاری قرار دے دیا گیا۔ البتہ حاضر اور نورے کو طویل مدت کی قید ہو گئی۔

***

بلاوا

میری بار کب آئے گی مولا، یہ ہر مرتبہ بلاوا راجا صاحب کو ہی کیوں آتا ہے؟

☆ .... محمد سلیم اختر

فیض عالم اپنے گاؤں کی مسجد کا خادم تھا۔ مسجد کی صفائی ستھرائی اور وضو کے لئے پانی کی فراہمی اس کے بنیادی کام تھے۔ گاؤں میں بجلی تو تھی نہیں اس لئے وہ باہر کچھ فاصلے پر بنے کنوئیں سے مشک میں پانی بھرتا اور مسجد کے اندر بنی ٹینکی میں لا ڈالتا۔ اس کی بیوی فضلاں بھی ان کاموں میں اس کی مدد کرتی۔ فیض عالم غریب اور مسکین شخص تھا۔ گاؤں میں اس کی کوئی جائیداد نہ تھی، صرف ایک کچا سا کوٹھا تھا جہاں وہ اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ رہتا۔ پکا نمازی اور پرہیز گار تھا۔ طبیعت میں انکساری اور عاجزی تھی اور قناعت پسندی بھی۔ وہ نہ صرف بڑوں بلکہ چھوٹوں کی بھی عزت کرتا۔ گاؤں کا ہر فرد اس کے خلوص اور ایمانداری کا معترف تھا۔

اس کا بیٹا جبار سب بہن بھائیوں سے بڑا تھا۔ جب جبار کچھ سمجھ دار ہوا تو وہ باپ کا ہاتھ بٹانے لگا۔ اس نے ایک ریوڑ بنایا اور گاؤں کے لوگوں کی بھیڑ بکریاں چرانے لگا جس کا اسے ہر ماہ کچھ نہ کچھ معاوضہ مل جاتا۔ پھر بھی فیض عالم کے گھرانے کی گزر بسر مشکل سے ہوتی مگر وہ ہر لحہ تقدیر پر شاکر تھا اور اوپر والے کا شکریہ ادا کرتے نہ تھکتا۔

اس کی دوستی صرف خانو کمہار سے تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے دُکھ سُکھ کے ساتھی تھے کیونکہ گاؤں میں سب سے زیادہ غریب وہ تھا یا پھر خانو کمہار۔ فارغ وقت میں وہ دونوں گپ شپ بھی لگاتے۔ خانو کمہار کا بیٹا فرید، فیض عالم کے بیٹے جبار کا ہم عمر تھا۔ وہ بھی جبار کی طرح بھیڑ اور بکریاں چراتا۔ ان کی دنیا صرف بھیڑ بکریوں، جنگل اور گاؤں تک ہی محدود تھی۔ فیض عالم کو نعتیں پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ اس نے کچھ پنجابی نعتیں یاد کر رکھی تھیں جنہیں وہ اکثر شوق اور لگن سے پڑھا کرتا۔

''کملی والے مینوں وی مدینے بلا لے''

اس کی پسندیدہ نعت تھی۔ وہ جب یہ نعت کسی محفل میں سناتا تو اس کی آنکھیں بھر آتیں اور اس کے من میں مدینہ بلائے جانے کی خواہش مچل اٹھتی۔ مگر یہ تمنا سینے میں ہی دم توڑ جاتی۔ کیونکہ مدینہ شریف جانا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ فیض عالم نے اپنی خواہش کا اظہار کبھی کسی سے نہیں کیا تھا لیکن وہ اس کی تکمیل میں لگا ہوا تھا۔ اس نے بکریوں والے باڑے میں گڑھا کھود کر ایک مٹی کا گھڑا اس میں دبا رکھا تھا۔ گاؤں والوں سے جب بھی اسے روپیہ، دو روپے ملتے وہ گھڑے میں ڈال کر منہ بند کر دیتا۔ وہ یہ رقم سفر مقدس کے لئے جمع کر رہا تھا۔ اس بھولے شخص کو معلوم نہ تھا کہ وہ معمولی رقم سے یہ مقدس سفر نہیں کر سکتا۔

گاؤں کا امیر ترین گھرانہ گاؤں کے نمبردار راجا شہباز کا تھا۔ وہ گاؤں کا نمبردار ہونے کے ساتھ ساتھ یونین کونسل کا چیئرمین بھی تھا۔ علاقہ میں سب سے زیادہ جائیداد اس کی تھی۔ امیر ہونے کے باوجود سخاوت اور ہمدردی اس سے کوسوں دور تھی۔ راجا مسجد کی شکل سال میں دو بار ہی دیکھتا یعنی عیدین کے مواقع پر۔ یونین کونسل کا چیئرمین ہونے کا وہ بھرپور فائدہ اٹھاتا۔ ترقیاتی فنڈ، زکوٰۃ فنڈ اور دیگر سرکاری رقومات ہضم کرنا اس کے لئے معمولی بات تھی۔ یہ فنڈز اور رقومات ہضم کرتے کرتے جب اس کے ضمیر کو، نیکی کا خیال ہوتا تو فوراً عمرہ یا حج کرنے روانہ ہو جاتا۔ واپسی پر اس کا استقبال اس طرح کیا جاتا جیسے وہ کوئی محاذ فتح کر کے آ رہا ہے۔ ایسے موقع پر فیض عالم کی آنکھوں کے سامنے جالا سا بن جاتا۔

''میری باری کب آئے گی مولا!'' وہ ڈبڈباتی آنکھوں سے آسمان کی طرف دیکھ کر کہتا۔ پھر اٹھ کر مشک اٹھاتا اور پانی بھرنے روانہ ہو جاتا۔ کبھی کبھار راجا شہباز تبرک تقسیم کرنے مسجد بھی آ جاتا۔ فیض عالم اسے مسجد میں دیکھ کر بہت خوش ہوتا اور اسے مبارکباد بھی دیتا۔ ایک بار فیض عالم نے راجا سے پوچھا۔ ''راجا صاحب! کتنا خرچ آتا ہے، اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے گھر کی زیارت کرنے کا؟''

''پورا ایک لاکھ روپیہ۔'' راجا شہباز فخریہ انداز سے قہقہہ لگا کر بولا۔ ''تمہیں کیا شوق چڑھا ہے، پیسے پوچھنے کا، کیا حج پر جانے کا ارادہ ہے؟'' اس کے لہجے میں رعونت بھی تھا اور طنز کی کاٹ بھی۔

''میری اتنی طاقت اور نصیب کہاں راجا صاحب!'' فیض عالم نے شکستہ لہجے میں کہا تو راجا کا سینہ کچھ اور پھول گیا۔ فیض عالم نے دیگر نمازیوں سے نظریں چرائیں اور اداس سا گھر لوٹ آیا۔ اس رات اسے نیند نہ آئی۔ اس کی سوچ پر غم واداسی کی چادر تنی رہی۔ رہ رہ کر ایک ہی آواز اس کے من میں گونجتی تھی ''میری باری کب آئے گی، میری باری کب آئے گی، میری باری کب آئے گی؟''

وہ یہی سوچتا رہا کہ راجا صاحب تو ہر سال حج کرنے چلے جاتے ہیں۔ میں گزشتہ چالیس برس سے مٹکے میں پیسے رکھتا چلا جاتا ہوں جو بڑی مشکل سے پینتیس ہزار روپے ہوئے ہیں۔ نہ جانے ایک لاکھ کب پورے ہوں گے؟ کیا چالیس برس اور...... کیا میرے نصیب میں سفر مقدس نہیں ہے؟

وہ جب بھی اپنی اس خواہش کا اظہار خانو سے کرتا تو وہ اسے کہتا۔ ''یہ تو توفیق کی بات ہے عالم! یہ تو بلاوا آنے کی بات ہے''۔

فیض عالم خالی خالی نظروں سے اسے تکنے لگتا۔ خانو اس کی کیفیت سمجھ جاتا اور کہتا۔ ''فیض عالم! مجھے یقین ہے ایک روز تمہارا بلاوا ضرور آئے گا''۔

''توفیق...... بلاوا......'' فیض عالم تھکے سے لہجے میں کہتا۔ ''یہ بلاوا ہر بار راجا صاحب ہی کو کیوں آتا

ہے؟''

''فیض عالم! اب یہ توفیق یا بلاوا نہیں''۔ خانو بولا۔

''ایسے لوگ تو زبردستی خدا اور اس کے رسولؐ کے گھر میں جا گھستے ہیں۔ پھر وہاں سے جو کچھ ہاتھ لگے، اسے حاضری کے ثبوت کے طور پر اٹھا لاتے ہیں۔ مثلاً کھجوروں کے ٹوکرے، آب زمزم کے کنستر...... یہ حاضری نہیں کہلاتی فیض عالم!'' اس کی آواز بھر جاتی۔

''لیکن ایک لاکھ بہت زیادہ رقم ہے۔'' فیض عالم ٹوٹے لہجے میں کہتا۔

تم کوشش کر کے سیڑھیاں چڑھتے چلے جاؤ انہیں گنومت''۔ خانو اس کی ہمت بندھاتا۔

گاؤں میں صرف ایک پرائمری سکول تھا جہاں لڑکے اور لڑکیاں اکٹھے پڑھتے۔ سکول میں صرف دو ہی استانیاں تھیں۔ اردگرد کے دیہات سے بھی کچھ لڑکے اور لڑکیاں اس سکول میں پڑھنے آتے۔ سکول گاؤں سے ڈیڑھ میل کے فاصلے پر تھا۔ گاؤں اور سکول کے درمیان ایک نالہ پڑتا تھا۔ اس نالے میں معمولی بارش ہونے سے بھی طغیانی آ جاتی۔ گاؤں کے بچے سکول جاتے ہوئے یہ نالہ پار کرتے تھے۔ بارشوں کے موسم میں جب نالہ پانی سے بھر جاتا تو بچوں اور والدین کو کافی پریشانی اٹھانی پڑتی...... لوگوں نے اس نالے کا نام ''خونی نالہ'' رکھ دیا تھا کیونکہ یہ ہر سال کسی نہ کسی بچے کی جان لے لیتا۔ گاؤں کے لوگوں کے مطالبے اور اصرار پر راجا شہباز نے حکومت سے نالے پر پل بنانے کی منظوری لے رکھی تھی۔ اسے فنڈ مل گیا مگر کئی برس گزر جانے کے باوجود پل نہ بن سکا۔ البتہ سرکاری فائلوں میں وہ بن چکا تھا۔ گاؤں کے لوگ جن گئے تھے کہ راجا شہباز سرکاری افسروں سے مل ملا کر پل کے لئے ملنے والی رقم ہڑپ کر چکا ہے مگر اس کے خلاف زبان کھولنے کی جرأت کسی میں نہ تھی۔ جب بھی کوئی بچہ اس خونی نالے کی بھینٹ چڑھتا، راجا شہباز گاؤں والوں کو یقین دلاتا کہ اگلے مالی سال کے فنڈ ملنے پر وہ پل کی تعمیر کرا دے گا...... لیکن اگلا سال کبھی نہ آتا۔

اس برس بھی ایسا ہی ہوا۔ فیض عالم کے دوست خانو کمہار کا پوتا اس خونی نالے کی بھینٹ چڑھ گیا۔ فیض عالم کو جب یہ خبر ملی تو وہ فوراً خانو کے کے گھر پہنچا اور اس کے گلے لگ کر خوب رویا۔ بچے کی لاش اگلے روز بہت دور سے ملی۔ اس کی نماز جنازہ پڑھتے وقت ہر آنکھ اشکبار تھی۔ فیض عالم بھی ان میں شامل تھا۔ سب سے زیادہ دکھ اسی کو ہوا۔ بچے کو دفنانے کے بعد فیض عالم نے میلی قمیص سے آنکھیں صاف کیں اور بوجھل قدموں سے گاؤں کی طرف چل پڑا۔ اس کا رخ راجا شہباز کی حویلی کی طرف تھا۔ راجا شہباز نے فیض عالم کو دیکھا تو بولا۔

''آؤ فیض عالم! خیریت سے آئے ہونا!''

''راجا صاحب!'' فیض عالم ہمت کر کے بولا۔

''ایک عرض کرنی تھی جی!'' وہ عاجزانہ انداز میں بولا۔

''کہو کیا بات ہے؟'' راجا شہباز پیشانی پر بل ڈال کر بولا۔ ''راجا صاحب! آج خانو کا پوتا خونی نالے کی بھینٹ چڑھ گیا ہے''۔ وہ زخمی الفاظ میں بولا۔ ''وہ جی...... اگر نالے پر پل بن جائے تو بچوں کو آسانی ہو جائے گی''۔

''فیض عالم!'' راجا کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور رعب دار لہجے میں بولا۔ ''تم مسجد کے خادم ہو۔ تم مسجد کی فکر کرو، یہ کام تمہارے کرنے اور سوچنے کا نہیں۔ پل والا کام ہو جائے گا۔ تمہیں کیا جلدی ہے؟''

فیض عالم نے راجا کا غصہ دیکھا تو وہ خفت اور بے چارگی کے ملے جلے احساسات لئے حویلی سے باہر نکل آیا۔ مغرب کی نماز کا وقت ہو رہا تھا۔ فیض عالم نے اس روز ناقابل بیان کیفیت میں نماز پڑھی۔ ''پل کب بنے

گا؟ کب......؟"

نماز پڑھنے کے بعد اس نے خود سے سوال کیا۔ نہ جانے وہ کون سا لمحہ تھا کہ اسے یوں لگا کہ جیسے کوئی راز ہے جس سے وہ اچانک آشنا ہو گیا۔

نماز عشاء ادا کرنے کے بعد وہ بے چین سا رہا۔ نماز ختم ہوئی تو اس نے مسجد کی لالٹین بجھائی، بڑے دروازے کو کنڈی لگائی اور گھر آ گیا۔ پھر وہ باڑے میں گیا، مٹی کا گھڑا نکال کر اسے اپنے گھر میں لے آیا اور الٹ دیا گھڑے سے برآمد کردہ ساری رقم اس نے چادر پر پھیلا دی۔ وہ ساکت نظروں سے لالٹین کی سہمی ہوئی روشنی میں رقم کو گھورنے لگا جو اس کے چالیس برس کی کمائی تھی۔ ایک، دو، پانچ، دس اور سو روپے کے نوٹ اس نے انتہائی نفاست سے الگ الگ تہہ کر کے رکھے ہوئے تھے۔ اس کے سامنے سکوں کا بھی ڈھیر تھا۔ وہ پھر اپنی جمع شدہ پونجی گننے لگا۔ چالیس ہزار روپے سے کچھ اوپر رقم بنی۔ اس کا دماغ سن ہو گیا اور سارے احساسات اور جذبات سرد ہو گئے۔ وہ اپنے آپ سے کچھ کہنے لگا۔

"کل میں یہ ساری رقم پل بنانے کے لئے دے دوں گا"۔

وہ یہ فیصلہ کر کے مطمئن ہو گیا۔ رات کو نیند بھی اسے خوب آئی۔ صبح جب وہ فجر کی نماز ادا کرنے کے لئے مسجد کی طرف روانہ ہوا تو رقم کی پوٹلی ہاتھ میں تھی۔ نماز ختم ہوتے ہی اس نے نمازیوں سے درخواست کی کہ وہ ان سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔ تمام نمازی چونک گئے۔ آج پہلی بار فیض عالم ان سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔ نہ جانے وہ کیا کہے گا کہیں مسجد کی خدمت سے تو دستبردار نہیں ہو رہا۔

"میرے بھائیو اور دوستو!" فیض عالم کپکپاتی ہوئی آواز میں بولا۔ "اس پوٹلی میں موجود رقم میری چالیس برس کی کمائی ہے...... یہ کل رقم چالیس ہزار آٹھ سو بارہ روپے بنتی ہے۔ میں نے یہ رقم حج کرنے کے لئے جمع کی تھی۔ مگر امام صاحب کے حوالے کر رہا ہوں تا کہ آپ لوگ اس سے خونی نالے پر پل بنوالیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آئندہ کوئی بچہ خونی نالے میں ڈوب کر نہ مرے۔ جب بھی کوئی بچہ نالے میں گر کر زندگی ہارتا ہے تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے میرا بیٹا مر گیا ہے۔ میں نے کئی برس آپ لوگوں کا نمک کھایا ہے"۔ فیض عالم کی آواز رندھ گئی۔ اس نے رندھی ہوئی آواز میں اپنی بات جاری رکھی۔ "میں نے اللہ اور اس کے رسولؐ کے لئے یہ رقم دی ہے۔ اللہ اسے قبول فرمائے"۔ یہ کہہ کر اس نے پوٹلی امام مسجد کے حوالے کر دی۔ سبھی نمازی بڑھ کر اسے ملتے ہوئے اظہار مسرت کرنے لگے۔ وہ بہت خوش تھے۔

فیض عالم گھر پہنچا تو اسے ایسے لگا اس نے آج صدیوں کا سفر کیا ہے اور مشقت سے اس کے پاؤں میں آبلے پڑ چکے ہیں۔ جسم تھکن سے چور ہونے کے باوجود اس کا دماغ مسلسل جمود کی حالت میں تھا۔ سارا دن وہ اسی حالت میں رہا۔ گاؤں میں جلد یہ بات پھیل گئی کہ فیض عالم نے اپنی جمع پونجی پل کے لئے عطیہ کر دی ہے۔ راجا شہباز نے فیض عالم کی اس سخاوت کا چرچا سنا تو تڑپ اٹھا تھا۔ دن بھر گاؤں کے مرد اور عورتیں فیض عالم کی خدا ترسی پر اسے داد دینے اس کے گھر آتے رہے۔ مگر راجا کے گھر سے کوئی اسے شاباش دینے نہ آیا۔ رات ہوئی تو وہ بستر پر دراز ہو کر ماضی سے حال کی طرف پرواز کرنے لگا۔ ایک...... دو...... تین...... چالیس پچاس برس کی ریاضت اور مشقت اس کے اعضاء میں سمانے لگی اور پھر ایک ہندسہ جگمگایا: "چالیس ہزار آٹھ سو بارہ روپے"۔ تب اس کے پیٹ میں گولہ سا اٹھا، سانس رکنے لگی۔ منہ سے سسکیاں نکلیں اور ہچکیاں لے لے کر رونے لگا۔ اس کا چہرہ اور داڑھی آنسوؤں سے تر ہو گئی۔

"میری باری کب آئے گی؟" مگر اب تو اس کی باری ہمیشہ کے لئے نہیں آنی تھی، اس نے اپنے پر خود ہی

کاٹ ڈالے تھے۔ روتے روتے اس کی آنکھ لگ گئی۔ اس نے نیند کے عالم میں گنبد خضریٰ کو دیکھا تو بے بسی کے احساس نے اسے اپاہج کر ڈالا۔ یہ اس نے کیا کر ڈالا؟ اپنا زادِ راہ اپنے ہاتھوں لٹا دیا۔ اسے یوں لگا کہ وہ ایک ملاح کے مانند ہے، جس نے پوری عمر سخت محنت سے منزل تک پہنچنے کے لئے کشتی بنائی پھر منزل قریب آتے ہی کشتی کو سمندر میں بہادیا۔ فیض عالم کا سانس بند ہونے لگا تو اس کی آنکھ کھل گئی۔ نہ معلوم کتنی دیر اس کی آنکھیں آنسوؤں کے سیلاب میں ڈوبی رہیں۔ حتیٰ کہ پھر آنکھ لگ گئی لیکن وہ مکمل طور پر سو نہیں پایا تھا کہ اچانک ایک پُرنور اور شفیق شکل والے اجنبی نے اسے جگا دیا۔ اجنبی نے فیض عالم کا ہاتھ پکڑا تو اسے یوں لگا جیسے زمین نیچے سے سرک گئی ہے۔ کیف و انبساط سے سرشار ہوا میں تیرتا ہوا وہ نہ جانے کہاں جا پہنچا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کا جسم روئی کے گالے کی طرح محو پرواز ہے۔ دیر بعد اس کے پاؤں زمین پر لگے تو اسے اپنے اردگرد آوازیں سنائی دیں:

"لبیک اللھم لبیک لبیک لا شریک لک لبیک ان الحمد والنعمة لک والملک لا شریک لک......"

اجنبی نے اس کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا۔ اردگرد لاکھوں کی تعداد میں لوگ سفید احرام باندھے ہوئے تھے۔ فیض عالم یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس کا لباس بھی احرام میں بدل چکا تھا۔ پھر وہ بھی مناجات کے ہجوم میں شامل ہو گیا۔

"لبیک اللھم لبیک"

اجنبی کا رحمت بھرا ہاتھ اسے لئے پھر رہا تھا۔ حتیٰ کہ گنبد خضریٰ کی جالیوں کے سامنے آ کر وہ تھم گیا۔ وہ ہاتھ باندھے سنہری جالیوں کے سامنے کھڑا رہا۔ اس نے سلام پڑھنے کی کوشش کی لیکن قوت گویائی جیسے سلب ہو گئی تھی۔ اسے یوں لگا جیسے وہ ایک ذرہ ہو اور اسے ایک بہت بڑے بگولے نے اپنے حلقہ اثر میں لے رکھا ہے۔ آس پاس موجود ہر شے بلند تھی۔ ہر شے کی حد عرش کو چھو رہی تھی اور وہ بہت چھوٹا تھا۔ اس کی گردن کافی جھکی رہی۔ اچانک زبان کی ساری بندشیں کھل گئیں اور وہ بڑے سوز کے ساتھ درود سلام پڑھنے لگا۔ نجانے کتنا عرصہ بیت گیا۔ کچھ لمحات یا چند صدیاں۔ وہ زمان و مکان سے بیگانہ کھڑا رہا کہ اجنبی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "آؤ واپس چلیں"۔

وہ نہ چاہتے ہوئے بھی واپس مڑا تو اجنبی نے ایک کھجوروں والا پیکٹ اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔ "یہ اس حاضری کی نشانی ہے، اسے ساتھ لیتے جاؤ"۔

"اچھا، اچھا"۔ فیض عالم نے خوشی سے سر ہلایا۔

اجنبی نے مسکراتے ہوئے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ایک دفعہ پھر زمین سرکی اور وہ اس طرح محو پرواز ہو گیا۔ نجانے کتنے لمحات بیت گئے۔ پھر اس نے خود کو چارپائی پر محسوس کیا۔ اجنبی وہاں موجود نہ تھا۔ فیض عالم کو تسکین کے زبردست احساس نے آ لیا۔ پلکیں کیف سے بوجھل ہو گئیں۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ گہری نیند سو گیا۔

اگلی صبح جب فیض عالم کا بیٹا اور اس کا دوست خانو دروازہ توڑ کر اندر داخل ہوئے تو انتہائی معطر خوشبو نے ان کا استقبال کیا۔ فیض عالم چارپائی پر دراز تھا۔ چہرے پر ایک خوشگوار مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ خانو اور اس کے بیٹے نے اس کا لباس دیکھ کر بے یقینی میں اپنی آنکھیں ملیں کیونکہ وہ سفید احرام میں ملبوس تھا۔ داہنا ہاتھ بند مٹھی کی صورت میں سینے پر دھرا تھا۔ خانو نے ڈرتے ڈرتے اس کی نبض پر ہاتھ رکھا مگر وہ تو نہ جانے کب کی تھم چکی تھی۔ اتنے میں خانو کی نظر فیض عالم کی بند مٹھی پر پڑی، اس میں کھجوریں دبی ہوئی تھیں۔ مکے مدینے کی کھجوریں!

◆◆◆

غزل

(ریاض عاقب کوہلر)

بغداد پہ گزری ہے جو تارتار کے ہاتھوں
اپنا بھی وہی حال ہے سرکار کے ہاتھوں

دکھ درد کے انبار ہی ہر بار ملے ہیں
اِس یار کے ہاتھوں کبھی اُس یار کے ہاتھوں

آ جاؤ کہ فرقت نے لب گور کیا ہے
اب میری بقا ہے تیرے دیدار کے ہاتھوں

اک تن ہی نہیں من بھی میاں ہار چکا ہوں
اس طور بکا ہوں میں خریدار کے ہاتھوں

مقتل جو مقدر ہے تو پھر فکر کہاں کی
اب تیر سے مرتا ہوں یا تلوار کے ہاتھوں

عاقبؔ پہ جو گزری تمھیں معلوم کہاں ہے
گفتار کے ہاتھوں ترے اطوار کے ہاتھوں

طنز و مزاح

ملفوظات خارزکا گفتار

مٹھائی کی دُکانیں شوگر کے مریضوں کے لئے تو گوار یاز ہوتی ہیں لیکن یہ چھپ چھپا کردن میں کم از کم ایک بار وہاں کا چکر ضرور لگاتے ہیں اور اگر دوستوں یار شتہ داروں میں سے کوئی دیکھ لے تو کہتے ہیں بچوں کے لئے لے جار ہا ہوں اور آگے جا کر خود بچہ بن جاتے ہیں۔

خادم حسین مجاہد

مریدوں سے ملنے والی نت نئی سوغاتوں اور مریدنیوں کی مسلسل عنایتوں کے باعث جب سے حضرت کو ذیابیطس ہوئی تھی ان کی گفتگو اکثر شوگر کے گرد ہی گھومتی رہتی تھی اور موضوع کوئی اور بھی ہو وہ بیچ میں شوگر کو لے آتے تھے۔ دراصل تحقیق و جستجو کی بدولت ان کی شوگر کے بارے میں معلومات چھوٹے موٹے ڈاکٹروں سے بھی بڑھ گئی تھیں۔ مریض آدھا ڈاکٹر تو ویسے ہی ہو جاتا ہے جبکہ یہ تو شوگر کے سپیشلسٹ ہو گئے تھے اور شوگر میں مبتلا نئے مریض اب ڈاکٹروں کی بجائے ان سے مشورہ کرنے لگے تھے اسی لئے ان کے نزدیکی ڈاکٹر ان سے شاکی تھے۔

ان کے پیٹ پر تو لات پڑ ہی رہی تھی اوپر سے انہوں نے مفت مشورہ کلینک کھول دیا تھا۔ مریضوں کو وہ ایسی تمام احتیاطیں بتایا کرتے تھے جن پر خود بھی عمل نہ کیا حتیٰ کہ شوگر بڑھتے بڑھتے آؤٹ آف کنٹرول ہو گئی اور گردوں کے ساتھ ساتھ ان کو بھی لے گئی۔ مریض بھی ان کے نبض شناس اور خوشنودی کے طالب رہا کرتے تھے اس لئے اب ان کی محفلوں میں اکثر شوگر کا ہی ذکر شر ہوتا رہتا اور وہ جی بھر کے شوگر کی برائیاں کرتے رہتے۔

ایک دفعہ کسی نے پوچھا کہ حضرت شوگر ہوتی کیوں ہے تو وہ بولے کہ "جب اللہ کسی کے گناہوں کی سزا اسے دنیا میں ہی دینا چاہتا ہے تو اسے شوگر ہو جاتی ہے ویسے انسانی جسم میں ایک پرزہ ہوتا ہے لبلبہ جو انسولین پیدا کرتا ہے جو خوراک کو توانائی میں بدلتا رہے۔ جب لبلبہ خراب ہوتا ہے تو وہ مطلوبہ مقدار میں انسولین پیدا نہیں کر پاتا اور رفتہ رفتہ ناکارہ ہو جاتا ہے جس سے خوراک جسم کو توانائی دینے کی بجائے ضائع ہو کر پیشاب کے رستے خارج ہو جاتی ہے جسے کنٹرول کرنے کے لئے دوا کی صورت میں

انسولین وغیرہ دی جاتی ہے اسی کو شوگر کہتے ہیں۔ انسولین کی کمی سے خون میں شوگر کی مقدار بڑھ جاتی ہے جس سے گردے ڈسٹرب ہو جاتے ہیں اور دوا نہ لیں تو بار بار پیشاب آتا ہے اور بندہ سکون سے کہیں بیٹھنے کے قابل نہیں رہتا۔ وہ کوئی بھی کام شروع کرنے لگتا ہے تو اسے پیشاب کی حاجت ہو جاتی ہے اس کے دن کا چین اور راتوں کی نیند بھی اسی وجہ سے حرام ہو جاتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ہر مزے دار چیز بھی اس پر حرام ہو جاتی ہے''۔

ایک اور مرید نے پوچھا کہ شوگر کے بعد کس کس چیز سے پرہیز کرنا پڑتا ہے اور کیا کیا کھا سکتے ہیں تو حضرت نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا کہ ''ہر بادی چیز سوادی ہوتی ہے لیکن ہر بادی چیز شوگر کے مریض کے لئے بربادی ہوتی ہے۔ اس میں چاول، آلو، شکرقندی، مٹر، گوبھی اور اروی ان کے تمام قریبی و دور کے رشتے دار شامل ہیں اور جن چیزوں کے کھانے کی اجازت ہوتی ہے وہ تو نری بے سوادی ہوتی ہیں یعنی کریلا، چوہنگاں، کھیرا، چنے، چقندر وغیرہ مزید بیوی سے بھی پرہیز کرنا چاہئے لیکن عموماً شوگر کے مریضوں کی پرہیز پھیکی چائے تک محدود ہوتی ہے اور وہ اس کے ساتھ برفی بھی کھا لیتے ہیں اور یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی کہ روٹی اور سبزیوں میں شوگر کیسے ہوتی ہے جو ان کا شوگر لیول بڑھا دیں نتیجتاً وہ کوئی پرہیز نہیں کرتے اور شوگر بڑھا بیٹھتے ہیں اور ساتھ ساتھ یہ شکوہ بھی کرتے رہتے ہیں کہ کبھی چینی کھائی بھی نہیں پھر نہ جانے کیوں شوگر کنٹرول نہیں ہوتی۔

دراصل شوگر کنٹرول کرنا اور اس کے ساتھ Adjustment کرنا ایک آرٹ ہی نہیں پوری سائنس ہے۔ صحت کے مطابق غذا لینی ہوتی ہے اور غذا کے مطابق دوا اگر کہیں بھی کوئی گڑبڑ ہو جائے تو ساری تپسیا غارت ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ آپ کی دو وقتوں کی جو غذا ہے اسے آدھا آدھا کر کے چار وقتوں میں کھائیں تاکہ پیٹ کسی وقت بھی خالی نہ رہے اور نہ ہی معدے پر زیادہ بوجھ پڑے۔ جو اس کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ ہر وقت کھاتے رہنا ہے وہ شوگر بھی بڑھا بیٹھتے ہیں اور معدہ بھی فارغ کر لیتے ہیں۔

شوگر کے مریضوں کے لئے لازم ہے کہ دوا ہر وقت جیب میں رکھیں تاکہ اگر کہیں بد پرہیزی کر بیٹھیں تو ساتھ ہی اس کے مطابق گولی کھا لیں ورنہ سکون سے بیٹھنے کے قابل نہ رہیں گے اسی طرح جیب میں کوئی میٹھی ٹافی بھی رکھیں کیونکہ پیٹ خالی ہونے کی صورت میں شوگر یک دم لو ہو کر نروس بریک ڈاؤن بھی ہو سکتا ہے لیکن یہ دونوں چیزیں ایک ہی جیب میں نہ رکھیں، یہ نہ ہو کہ جب دوا کی ضرورت ہو تو ٹافی کھا لیں اور جب ٹافی کھانی ہو تو دوا کھا لیں ورنہ لینے کے دینے بھی پڑ سکتے ہیں۔

شروع شروع میں پیشاب بار بار آتا ہے جس سے گردے کمزور ہو کر خود بخود پیشاب خارج کرنے کے قابل نہیں رہتے اور اس کے لئے بھی پیشاب آور گولی لینا پڑتی ہے حتیٰ کہ نوبت صفائی تک جا پہنچتی ہے لیکن ایک بار dialysis شروع ہو جائے تو بندہ جلد پرلوک سدھار جاتا ہے۔

مٹھائی کی دکانیں ویسے تو شوگر کے مریضوں کے لئے نو گو ایریاز ہوتی ہیں مگر شوگر کے مریض ہر روز ایک چکر وہاں کا ضرور لگاتے ہیں اور اگر کوئی دوست یا رشتہ دار دیکھ لے تو کہتے ہیں کہ بچوں کے لئے جا رہا ہوں اور آگے جا کر خود بچہ بن جاتے ہیں۔ اس سے فوری نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ زوروں کا پیشاب آتا ہے اور جو ہے جہاں ہے کی بنیاد پر سب چھوڑ کر فطرت کی آواز پر لبیک کہنا پڑتا ہے۔

شوگر میں ایک اور خرابی یہ ہے کہ اس کی دوا سے

پہلے پیلا اور بالآخر کالا یرقان بھی ہو جاتا ہے اور شوگر اور ہیپا ٹائٹس کی دوا سے شوگر بڑھ جاتی ہے اور جب یہ دونوں بیماریاں اکٹھی ہو جائیں تو مریض کا نیا امتحان شروع ہو جاتا ہے جس میں مریض کم ہی کامیاب ہوتا ہے، اکثر کامیابی امراض کے حصے میں ہی آتی ہے۔

تیسرے مرید نے جب خوشامدانہ انداز میں شوگر کے بارے میں مزید کچھ ارشاد کرنے کی گزارش کی تو حضرت نے خوش ہو کر تبسم فرماتے ہوئے کچھ مزید اقوال زریں ارشاد فرمائے کہ یہ بڑا بدلحاظ مرض ہے عورتوں کو بخشتا ہے نہ مردوں کو، بچوں کو نہ بوڑھوں کو، جوانوں کو نہ ادھیڑ عمروں کو۔ مشہور ہے کہ یہ امیروں کا مرض ہے مگر اب غریبوں کو بھی ہو جاتا ہے یا انہیں غریب کر دیتا ہے۔ یہ چھوت کا مرض نہیں یعنی ایک سے دوسرے کو نہیں ہوتا لیکن دوسروں کی وجہ سے ہو سکتا ہے یعنی ٹینشن، وراثت وغیرہ سے۔ گردے خراب ہونے سے بھی شوگر ہو جاتی ہے اور شوگر ہونے سے بھی گردے خراب ہو جاتے ہیں یعنی یہ چین ری ایکشن (Chain Reaction) ہے اور یہ فیصلہ کرنا کہ بنیادی وجہ کیا ہے۔ اتنا ہی مشکل ہے جتنا یہ فیصلہ کرنا کہ مرغی پہلے آئی کہ انڈہ۔

شوگر دراصل انسانی گھن ہے جو اندر سے انسان کو کھا جاتی ہے حتیٰ کہ اس کی ہڈیوں تک کو گلا دیتی ہے جبکہ بظاہر انسان ٹھیک ٹھاک ہوتا ہے لیکن وہ اصل میں کسی کام کا نہیں رہتا نہ وہ کسی کا کچھ بگاڑ سکتا ہے۔ بڑے بڑے اتھرے شوگر کے بعد شریف مسکین ہو جاتے ہیں اور گھن کھائی لکڑی کی طرح انہیں بھی بس ذرا سے دھکے کی ضرورت ہوتی ہے اور ڈھیر ہو جاتے ہیں۔

شوگر کا ذکر سن سن کر اور علامات پر غور کرنے سے مجھے بھی شک ہونے لگا کہ شاید مجھے بھی یہ مرض ناہنجار نہ ہو گیا ہو کہ مجھے بھی ہر کام سے پہلے پیشاب آ جاتا ہے اور رات کو بھی تقاضا ہوتا تو سردی کی وجہ سے جب اٹھا نہ جاتا

کوشش

وہ قطرہ ہوتی ہے جو ایک ایک مل کر دریا بنتی ہے۔ ایک ایسا تنکا ہوتی ہے جو دوسرے تنکے کے ساتھ شامل ہو کر گھونسلا بنتی ہے۔ روشنی کی ایسی کرن ہوتی ہے جو دوسری کرنوں میں مل کر سورج بن جاتی ہے...... اور یہ ترقی کی طرف اٹھنے والا ایسا قدم ہوتی ہے جس سے دس ہزار میل کا سفر شروع ہوتا ہے۔ جو انسان پہلا قدم نہیں اٹھاتا، جو کوشش نہیں کرتا اس کا مستقبل حال سے برا ہوتا ہے اور حال ماضی سے بدتر۔

(دستگیر شہزاد)

تو خواب بھی پیشاب کے متعلق آتے رہتے یعنی خواب میں بھی پیشاب کے لئے جائے مناسب ڈھونڈتا رہتا اور جب تک اٹھ کر پیشاب کر نہ لیتا یہ سلسلہ جاری رہتا۔ جب میں نے یہ کیفیت حضرت کو بتائی تو قہقہے لگانے لگے۔ جب ذرا سکون ہوا تو بولے۔

"تمہیں شوگر نہیں ہے، بس تم چائے پانی شاید زیادہ پیتے ہو۔ جن کو شوگر ہوتی ہے ان کو تو خواب میں بھی پانی ہی نظر آتا ہے اور وہ کوئی مناسب جگہ تلاش کر کے خواب میں ہی اپنا مثانہ بستر پر ہی خالی کر دیتے ہیں۔ چوں کہ ان کے گردے زیادہ دیر تک صبر نہیں کر سکتے اس لئے شوگر کے مریضوں کو ازار بند کی جگہ الاسٹک ڈال دینا چاہئے کیونکہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ جلدی میں ازار بند کھولیں تو وہ کھلنے کی بجائے الجھ جاتا ہے اور بچپن کا تجربہ دوہرایا جاتا ہے"۔ میں نے اللہ کا شکر ادا کیا تو بولے۔

"زیادہ خوش نہ ہو بہت جلد شوگر تمہیں اپنی لپیٹ میں لے لے گی کیونکہ کھانے پینے اور ہڈحرامی میں تم میرے نقش قدم پر ہی چل رہے ہو"۔

چوتھے مرید نے شوگر کے مریض کی پہچان اور چیدہ

چیدہ نشانیاں پوچھیں تو حضرت کو ہجو گوئی کا ایک اور موقع مل گیا۔ بولے کہ شوگر کا مریض کہیں جانے سے پہلے اور آتے ہی ٹوائلٹ کا رُخ کرے گا۔ اس کا سرخ سفید رنگ یوں پیلا پڑ جائے گا کہ جیسے کسی نے خون نچوڑ لیا ہو۔ اسے پانی کو دیکھ کر بھی پیشاب آ جائے گا اور اگر ٹوائلٹ کے قریب سے بھی گزرے گا تو بھی پیشاب آ جائے گا۔ حتیٰ کہ کسی اور کو پیشاب آ گیا اور اس نے اس کا ذکر کر دیا تو بھی اس کے گروے بے چین ہو جائیں گے اور یکا یک مثانہ بھر جائے گا اور یہ بندہ کہیں بھی مہمان جائے گا تو تسلی کرے گا کہ مناسب ٹائلٹ موجود ہے یا نہیں اگر نہ ہوا تو ہرگز قیام نہیں کرے گا۔ اسے آپ میٹھی چیز پیش کریں گے تو اِدھر اُدھر دیکھ کر کھا جائے گا اور میٹھی چائے پینے کے بعد آپ کو بتائے گا۔ ”ویسے تو مجھے شوگر تھی لیکن میں نے آپ کا دل توڑنا مناسب نہ سمجھا۔ اب میرے گھر والوں کو نہ بتانا اور آئندہ چائے پھیکی ہی بنایئے گا“۔ اور جواب میں آپ پھیکی ہنسی ہنسنے کے علاوہ کچھ نہ کر سکیں گے۔

انتہا یہ کہ جب شوگر کے مریض اپنی بے احتیاطیوں کی بدولت گردوں کی صفائی تک پہنچ جاتے ہیں تو ڈاکٹر ان کو نمک مرچ چکنائی کے ساتھ ساتھ پانی بھی منع کر دیتے ہیں جس کے بعد ان کو صبح، دوپہر اور شام دوائی کی طرح پانی چمچ سے پلایا جاتا ہے اور اس کی بھی گنتی ہوتی ہے اور یہ شوگر کے مریض کا وہ آخری دور ہوتا ہے جس میں وہ دعا کرتا ہے کہ یہ دور مختصر ہو جائے کیونکہ اس دور میں مریض کو محسوس ہوتا ہے کہ یہ کوئی بیماری نہیں بلکہ عذاب الٰہی کی کوئی شکل ہے اور مجھے لگتا ہے کہ میرا یہ دور جلد شروع ہونے والا ہے“۔ حضرت یہ کہہ کر آب دیدہ ہو گئے اور محفل برخاست کر دی۔

▲

آخری سلام

مشرقی پاکستان کے میدانِ جنگ سے

میجر آفتاب احمد

1958ء اور 1971ء کے مارشل لا کو پاکستان کے دولخت ہونے کا سبب، پاک فوج کی عوام سے دوری کا باعث اور اس کی صفوں میں کردار کے بحران کا محرک گردانتے ہوئے انہوں نے اپنے حلف کے تقاضوں کے عین مطابق ملک میں ایک اور افقی اور عمودی انتشار کے نکتہ آغاز جنرل ضیاء الحق کے تیسرے مارشل لاء کے خلاف مسلح افواج کے اندر سے ہی مزاحمت کی عدیم المثال روایت ڈالنے کی جرأت رندانہ کی۔ اس ناقابل یقین، انوکھے اور منفرد ”جرم وفا“ میں وہ حبس دوام کے مستحق ٹھہرے۔ ادھر جمہوریت کی بحالی کے بعد ضمیر کی آواز بلند رکھنے کے جرم مکرر میں حاکم وقت بینظیر بھٹو نے بھی انہیں تین سال بنا مقدمہ سندھ کی جیلوں میں اسیر کیے رکھا۔

خدا اور بندے کی ذات میں ایک بڑا فرق یہ ہے کہ کسی بندے سے
بار بار مانگو گے تو وہ ناراض ہو جاتا ہے کہ میں نے تمہارا ٹھیکہ تو نہیں اٹھا رکھا لیکن
خدا تعالیٰ کی ہستی ایسی ہے کہ اس سے جو نہ مانگے وہ اس سے ناراض ہوتا ہے

روحانی علاج

اے آر رضوی

بے روزگاری پاکستان میں غریبوں کے لئے ایک بڑا مسئلہ ہے۔ ایک نوجوان کو بارہ چودہ سال تعلیم حاصل کرنے کے بعد بھی جب باعزت طور پر روزگار نہ ملے تو اس کا دل برداشتہ ہونا یقینی بات ہے۔ ان حالات میں ان نوجوانوں کے پاس محض دو تین راستے ہی ہوتے ہیں کہ یا تو اس صورت حال پر سمجھوتہ کر کے اندر ہی اندر کڑھتے رہیں یا پھر دولت کے حصول کے لئے ناجائز ذرائع اختیار کریں اور وطن دشمن عناصر کے ہاتھ میں کھلونا بن کر اپنے ہی ملک وقوم کے مفاد کے خلاف کام کرنا شروع کر دیں یا پھر خود کو اس دنیا کے قابل نہ سمجھتے ہوئے موت کے منہ میں دھکیلنے کے لئے خودکشی کر لیں۔

ناصر بھی ایک ایسا ہی نوجوان تھا۔ اس نے بمشکل ایف اے تک تعلیم حاصل کی اور پھر نوکری کے لئے تین سال تک لگاتار دھکے کھاتا رہا۔ ایک چھوٹے قصبے میں رہنے کی وجہ سے وہاں تو اسے نوکری نہ مل سکتی تھی۔ انٹرویوز کے لئے دوسرے بڑے شہروں میں خوار ہو کر وقت اور پیسہ برباد کرنے کے بعد بھی اسے نوکری نہ ملی تو آخرکار اس کی ہمت جواب دے گئی۔ غربت اور سفارش کی چٹ کا نہ ہونا اس کے لئے ہر جگہ مسئلہ بن گیا۔ اس کی والدہ اسے بہت سے درباروں اور پیروں کے پاس لے گئی اور ان سے تعویذ لے کر دیے کہ ان کی بدولت اسے فوری نوکری مل جائے گی لیکن کسی تعویذ نے اثر نہ دکھایا۔

اور پھر جب کسی انسان کے مقدر بدلتے ہیں تو قدرت اس کے لئے ازخود اسباب مہیا کر دیتی ہے۔ ایک روز ایک نورانی صورت والا فرشتہ سیرت انسان ان گلی سے گزر رہا تھا۔ ناصر کی والدہ نے دروازہ کھولا تو وہ بزرگ اس کے گھر کے دروازے کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ ناصر کی والدہ کو دیکھ کر اس نے ایک گلاس پانی مانگا جو

ناصر کی والدہ نے بخوشی لا دیا۔ بزرگ نے خوش ہو کر دعا دی اور پھر پوچھا بیٹی! مجھے تم کچھ پریشان لگتی ہو۔

بابا جی! آپ سچ کہتے ہیں۔ میرا ایک ہی جوان بیٹا ہے۔ اس کا باپ بچپن ہی میں فوت ہو گیا تھا۔ میں نے دوسروں کے گھروں میں جا کر مزدوری کر کے اسے بڑی مشقت سے ایف اے کروایا ہے مگر بے چارہ تین سال سے نوکری کے لئے دھکے کھا رہا ہے۔ اسے کہیں سے نوکری نہیں ملی۔ اب وہ ہر وقت سوچوں میں گم اور بہت پریشان رہتا ہے اور ظاہر ہے کہ اس کی وجہ سے میں بھی پریشان رہتی ہوں۔

تم ٹھیک کہتی ہو بچی! اولاد کی وجہ سے ماں کا پریشان ہونا فطری بات ہے۔ کیا نام ہے آپ کے بیٹے کا؟

جی ناصر نام ہے اس کا۔

نماز پڑھتا ہے وہ؟

جی نہیں، کبھی کبھی جب دل چاہے تب پڑھتا ہے۔

ابھی گھر پر ہے؟

جی ہاں اپنے کمرے میں ہے۔

کیا آپ اسے مجھ سے ملوا سکتی ہیں؟

کیوں نہیں بابا جی! آپ اندر تشریف لے آئیں۔ ناصر کی والدہ نے بیٹھک کا دروازہ کھول کر انہیں اندر بٹھایا اور پھر ناصر کو بلا لائی۔ ناصر نے کمرے میں آ کر بزرگ شخص کو سلام کیا تو انہوں نے ایک نظر بھر کر اسے دیکھا اور بولے جیتے رہو بیٹے کیسے رہتے ہو؟

جی، نوکری نہ ملنے کی وجہ سے پریشان رہتا ہوں۔

نماز باقاعدگی سے پڑھتے ہو۔

جی نہیں کبھی کبھی پڑھتا ہوں۔

مگر بیٹے اللہ تعالیٰ نے تو دن میں پانچ مرتبہ نماز فرض کی ہے۔ کبھی کبھی پڑھنے کا تو حکم کہیں نہیں آیا۔

بس پریشانی کی وجہ سے سستی کر جاتا ہوں۔

نہیں بیٹے! یہ غلط ہے یاد رکھو! خدا اور بندے کی ذات میں ایک بڑا فرق یہ ہے کہ کسی بندے سے بار بار مانگو گے تو وہ ناراض ہو جاتا ہے کہ میں نے تمہارا ٹھیکہ تو نہیں اٹھا رکھا لیکن خدا تعالیٰ کی ہستی ایسی ہے کہ اس سے جو نہ مانگے وہ اس سے ناراض ہوتا ہے اور جو اس سے بے حساب اور بار بار مانگے وہ اس سے خوش ہوتا ہے۔ نماز اللہ کو یاد کرنے اور اس سے مانگنے کا نام ہے۔ تم جب تک اللہ کو یاد نہ کرو گے پریشان رہو گے۔ تم آج سے نماز باقاعدگی سے باجماعت ادا کرنا شروع کر دو۔ ایک وظیفہ رات کو چالیس روز تک باقاعدہ پڑھو میں پورے یقین سے کہتا ہوں کہ اس کی برکت سے تمہاری ساری پریشانیاں دور ہو جائیں گی۔

جی میں وعدہ کرتا ہوں۔ ناصر کے نماز کی پابندی کے وعدے پر بزرگ شخص نے ایک چٹ پر ایک قرآنی آیت لکھ دی اور اس کو سمجھا دیا کہ اس نے کس طرح پڑھنا ہے۔ اگر میری ہدایت پر عمل کرو گے تو دیکھنا کہ اللہ کی ذات کس طرح اپنا فضل کرتی ہے۔ ٹھیک ہے خدا تمہیں اس وعدے پر کاربند رہنے کی توفیق عطاء فرمائے۔ آمین! یہ کہہ کر بزرگ رخصت ہو گئے۔

ناصر نے حسب وعدہ باجماعت نماز ادا کرنا شروع کر دی اور تیسرے ہی روز اسے ایک دکان پر سیلز مین کی نوکری مل گئی۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا اور محنت سے کام شروع کر دیا۔ مالک کو اس نے بتا دیا تھا کہ میں نماز کے لئے مسجد میں جاؤں گا اور مالک نیک آدمی تھا اس نے بخوشی اجازت دے دی۔ اسے اس دکان پر کام شروع کئے ہوئے ایک ہفتہ گزرا تھا کہ اس کی دکان پر ایک متمول شخص کچھ گھریلو سامان لینے آیا۔ اس نے آتے ہی سامان کی ایک لمبی فہرست نکال کر ناصر کو تھما دی۔ ناصر نے پہلے فہرست دیکھی اور پھر گھڑی کی طرف دیکھ کر بولا۔ دیکھیں ابھی نماز کا وقت ہو چکا ہے۔ میں آپ کا سامان نکالنے

میں لگ گیا تو میری جماعت نکل جائے گی۔ آپ تھوڑا انتظار کرلیں تو میں نماز سے فارغ ہو کر آپ کو اطمینان سے سامان نکال دوں گا۔

کیوں نہیں بیٹے۔ یہ اچھی بات ہے کہ آپ پہلے نماز ادا کریں اور میں چند منٹ انتظار کر لیتا ہوں۔

ناصر نماز پڑھ کر واپس آیا اور اس گاہک کا سامان نکالنے لگا۔ گاہک اس نوجوان کی جوانی دیکھ کر اور اس کے نماز کے اہتمام سے بہت متاثر ہوا تھا۔ اس نے دریافت کیا بیٹا! لگتا ہے کہ تم کچھ پڑھے بھی ہو کہاں تک تعلیم حاصل کی ہے؟

جی میں ایف اے تک پڑھا ہوں۔

تو پھر تو تمہیں کسی آفس میں ہونا چاہیے تھا۔

سر میں نے بہت کوشش کی تھی لیکن تین سال دھکے کھانے کے بعد بھی مجھے نوکری نہیں نہ سرکاری نہ پرائیوٹ۔ جس دفتر میں جاتا ہوں تو آگے سے کہتے ہیں کہ پہلے کسی کام کا کوئی تجربہ ہے جب میں نہیں کہتا ہوں تو مجھے جواب دے دیا جاتا ہے۔ اب کوئی تجربہ کہاں سے سیکھے جب آپ کسی کو موقع دیں گے تو وہ کام کر کے تجربہ حاصل کرے گا۔ بہرحال بڑی مشکل سے مجھے اب یہ نوکری ملی ہے تو خوشی سے کر رہا ہوں۔

مجھے تم قسمت کے دھنی لگتے ہو اور میرا خیال ہے کہ تم زندگی میں بہت ترقی کرو گے۔ ناصر باتوں کے دوران اس کا سودا سلف بھی نکال چکا تھا اور اس نے اڑھائی ہزار کا بل بنا کر بھی دے دیا۔ گاہک نے اس بل کی ادائیگی کردی اور اس کے ساتھ ہی اپنا ایک وزیٹنگ کارڈ نکال کر اسے دیا۔ بیٹا! یہ میرا کارڈ ہے۔ بے شک کل میرے پاس آجاؤ۔ تمہاری سروس میری ذمہ داری ہے۔

سر! آپ کا بہت شکریہ! میں ضرور آپ کے پاس آؤں گا۔

ٹھیک ہے بیٹا! پھر ملیں گے۔

فکر کریں!

اللہ کریم ورحیم نے رزق کا وعدہ سب سے کیا ہوا ہے لیکن بخشش کا وعدہ سب سے نہیں کیا۔ پھر کیوں لوگ رزق کے لئے پریشان ہیں اور مغفرت کے لئے بے فکر؟ اس بات پر سنجیدگی سے غور کریں اور اللہ سے ہمیشہ مغفرت کی دعا مانگتے رہیں۔

یہ کہ کر وہ صاحب رخصت ہوئے۔

ناصر نے گھر آکر اپنی والدہ کو یہ تفصیل بتائی تو وہ بہت خوش ہوئیں اور کہا کہ اگر قدرت نے تمہیں اپنا مستقبل بہتر بنانے کا موقع دیا ہے تو اسے ضائع مت کرو اور کل ہی لاہور چلے جاؤ لیکن ناصر تیسرے روز رخصت ہو کر لاہور چلا گیا اور کارڈ کی مدد سے شریف صاحب تک بآسانی پہنچ گیا۔ شریف صاحب لاہور میں ایک بڑی فیکٹری کے مالک تھے۔ انہوں نے گرم جوشی سے ملاقات کی اور اس کو اسی وقت نوکری کا پروانہ بنا کر تھما دیا۔ ناصر گھر واپس آیا اور والدہ کو بتایا تو وہ بہت خوش ہوئیں۔ پھر ناصر اپنے مالک کے پاس گیا اور اسے بتایا کہ مجھے لاہو میں ایک فیکٹری میں نوکری مل گئی ہے۔ اس نے بھی خوشی کا اظہار کیا اور اس کا بقایا حساب کتاب کلیئر کر دیا۔ ناصر نے اگلے روز لاہور پہنچ کر سروس جوائن کر لی۔ پھر شریف صاحب کے کہنے پر اس نے کمپیوٹر سیکھنا شروع کیا اور چھ ماہ میں کمپیوٹر پر اچھا خاصا کام کرنے کے قابل ہو گیا تو شریف صاحب نے اس کی تنخواہ میں ایک ہزار روپے اضافہ کر دیا۔ ناصر نے چالیس روز پورے کرنے کے بعد وظیفہ پڑھنا تو چھوڑ دیا تھا لیکن نماز کی پابندی لگاتار کرتا رہا۔ ملازمین کے ساتھ نرم برتاؤ اور حسن سلوک کی بدولت فیکٹری کے ورکر سے لے کر مالک تک اس نے ہر دل میں گھر کر لیا تھا۔ مالک اس کے کام سے خوش تھا اور تین سال بعد وہ فیکٹری کا کیشئر بن گیا تھا۔ اب فیکٹری کے

سارے کھاتے اور فیکٹری کی آمدن و اخراجات گوشوارے اس کے پاس تھے اور ان پر اسی کے دستخط چلتے تھے۔

پھر ایک روز شریف صاحب نے اس کے گھر جا کر اس کی والدہ سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تو ناصر ان سے پوچھنے کی خواہش کے باوجود یہ پوچھنے کی جرأت نہ کر سکا کہ وہ اس کی والدہ سے کیوں ملنا چاہتے ہیں۔ وہ شریف صاحب کی گاڑی میں جب اپنے گھر پہنچا تو اس کی والدہ بھی اس کے ساتھ اس کے "صاحب" کو دیکھ کر حیران ہوئی مگر اس نے کچھ نہیں کہا بلکہ صاحب کے لئے بہت اچھا کھانا بنایا جسے انھوں نے بڑے شوق سے کھایا اور پھر بولے بہن! میں ایک اہم کام کے لئے آپ سے ایک ضروری بات کرنے آیا ہوں۔

جی بھائی! بتائیں آپ کھل کر بات کریں۔

جی بات یہ ہے کہ میں ناصر کو اپنا بیٹا بنانا چاہتا ہوں۔

یہ اچھی بات ہے صاحب جی! لیکن ہم غریب لوگ بھلا اس قابل کہاں ہیں کہ آپ کے ساتھ اس طرح کے رشتے ناطے جوڑ سکیں۔

غربت اور امارت سب خدا کی عطاء ہیں اصل چیز یہ ہے کہ کسی انسان کے اندر کسی دوسرے کے لئے کتنی ہمدردی اور انسانیت ہے۔

آپ ٹھیک کہتے ہیں بھائی جان! لیکن اس کے باوجود ہمارا اور آپ کا اتنا فرق ہے کہ یہ رشتہ نہیں ہو سکتا۔ آپ مالک ہیں اور میرا بیٹا آپ کی فیکٹری کا ایک مزدور ہے۔

میری ایک بیٹی ہے بہن! میں اپنی آدھی فیکٹری اس کے نام لکھوا کر آدھی فیکٹری آپ کے بیٹے کے نام کر دوں گا اور غربت و امارت کی اس لکیر کو ختم کر دوں گا جس کی وجہ سے آپ انکار کر رہی ہیں۔ میری کوٹھی بھی میری بیٹی کے نام ہے اور شادی کے بعد آپ اپنے بیٹے کے ساتھ وہاں خوش و خرم رہ سکتی ہیں۔

ٹھیک ہے بھائی جان! میں سوچ کر آپ کو آگاہ کر دوں گی۔

ٹھیک ہے آپ ضرور سوچ و بچار کر لیں مگر آپ کا جواب ہاں ہی میں ہونا چاہیے وگرنہ مجھے بہت دکھ ہوگا۔

جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں بھائی جان! کیا پتہ فیصلہ آپ کی سوچ کے مطابق ہی ہو۔

ناصر کی والدہ نے اپنے عزیز و اقارب سے مشورہ کیا تو سب نے یہی رائے دی کہ اسے فوراً ہاں کرنا چاہیے۔ چنانچہ اس نے ہاں کر دی اور شریف صاحب نے حسب وعدہ اپنی فیکٹری کے پچاس فیصد شیئرز ناصر اور پچاس فیصد شیئرز اپنی بیٹی کے نام کرنے کے بعد ان کی شادی کر دی۔ ناصر اپنی والدہ کے ساتھ انھی کی کوٹھی میں منتقل ہو گیا۔ آج ناصر کے دو بچے ہیں۔ آج ناصر کی والدہ اور شریف صاحب وفات پا چکے ہیں۔ کل کا فیکٹری ورکر ناصر آج اس فیکٹری کا مالک بن کر شان و شوکت سے اپنی زندگی گزار رہا ہے لیکن اس کے باوجود وہ خدا کو نہیں بھولا۔ وہ اب بھی خدا کے حضور سجدہ ریز ہو کر اپنے بہتر مستقبل کے لئے دعا گو ہوتا ہے۔ اس کا یہ کہنا سچ ہے کہ آپ خدا کے جتنا قریب جائیں گے خدا کو اپنے اتنا ہی قریب پائیں گے۔

2014/15ء کی بہترین ایجادات

ڈاکٹر محمد عبداللہ

سال 2014ء اختتام پذیر ہوا اور اب ہم نے 2015ء میں قدم رکھ دیا ہے۔ دیکھئے نیا سال اپنے جلو میں کیا کیا لے کر آتا ہے۔ اگر 2014ء پر سرسری نظر دوڑائی جائے تو اس میں ہر شعبے میں نت نئی چیزیں، کامیابیاں، ناکامیاں غرض ہر طرح کے حالات سامنے آئے مگر چونکہ یہ عہد ٹیکنالوجی کا قرار دیا جاتا ہے تو سب سے زیادہ توجہ بھی منفرد ایجادات پر مرکوز رہی جس نے دیکھنے والوں کو حیران کر کے رکھ دیا۔

ہوور بورڈز، کھانے کے قابل فوڈ ریپرز اور بہت کچھ ایسی انوکھی ایجادات سامنے آئیں جو کہ بالکل نئی تھیں جنھوں نے اس دنیا کو مزید سمارٹ بنانے میں یقیناً مدد فراہم کی اور ان میں سے کچھ کا احوال جاننا دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔

رئیل لائف ہوور بورڈ

اسکیٹ بورڈ کی طرح نظر آنے والا یہ ہوور بورڈ درحقیقت کسی اڑن قالین جیسا ہے جس کا تصور سب سے پہلے 1989ء میں سائنس فکشن فلم "بیک ٹو دی فیوچر 2" میں سامنے آیا تھا۔ تاہم پچیس سال بعد سائنس دان اسے حقیقی شکل دینے میں کامیاب ہو سکے۔

امریکی کمپنی ہینڈو نے یہ بورڈ تیار کیا ہے جو زمین سے ایک انچ بلند ہو کر ہوا میں تیرتے ہوئے آگے بڑھ سکتا ہے وہ بھی کچھ خاص میٹریل سے بنی جگہوں پر اور اس کی بیٹری بھی پندرہ منٹ تک ہی چل پاتی ہے۔ تاہم پھر بھی یہ اس خواب کو حقیقی شکل دینے کی جانب ایک عملی قدم ضرور ہے۔ اس انوکھے بورڈ کی قیمت دس ہزار ڈالرز رکھی گئی ہے اور اب تک اس کے صرف دس ماڈلز ہی تیار کیے

گئے ہیں۔

سپر سمارٹ سپیس کرافٹ

کوئی بھی ملک پہلی کوشش میں مریخ کو چھونے میں کامیاب نہیں اب چاہے وہ امریکہ ہو یا روس یا یورپ سب اس میں ناکام رہے مگر چوبیس ستمبر کو ہندوستان ایسا کرنے میں ضرور کامیاب رہا اور یہ کمال انڈین سپیس ریسرچ آرگنائزیشن کے تیار کردہ سپر سمارٹ سپیس کرافٹ منگالیان کی بدولت ممکن ہو سکا جس کے باعث مریخ مشن کی کامیابی صرف 74 ملین ڈالرز میں ہی ممکن ہو گئی جو کہ ہولی وڈ خلائی ایڈونچر گریوٹی کی لاگت سے بھی کم تھا۔

ہر جگہ تھری ڈی پرنٹنگ

ایسی مشین جو کسی بھی چیز کو تیار کر سکتی ہے۔ سننے میں ضرور سائنس فکشن خیال لگتا ہوگا مگر تھری ڈی پرنٹرز کے سامنے آنے کے بعد اب کوئی بھی شخص ڈیجیٹل بلیو پرنٹ کی بدولت ہر چیز کو پرنٹ کر کے تیار کر سکتا ہے۔ تھری ڈی فوڈز سے لے کر گاڑیاں، انسانی اعضاء کے ٹشوز اور بھی بہت کچھ گھر بیٹھے کوئی بھی چند بٹن دبا کر تیار کر سکتا ہے بس مطلوبہ آلات و میٹریل کے علاوہ کسی اضافی خرچے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔

ایپل واچ

بیشتر سمارٹ واچز بہت کچھ کر سکتی ہیں مگر انہیں بطور موبائل فون استعمال کرنے کا تجربہ زیادہ کامیاب ثابت نہیں ہو سکا۔ تاہم ایپل واچ نے کلائی پر پہنے جانے والے کمپیوٹر کا تصور بدل کر رکھ دیا ہے۔ ٹچ سکرین اور فزیکل بٹنز کی بدولت یہ گھڑی وقت بتانے کے ساتھ ساتھ ایس ایم ایس ارسال کر سکے گی، راستے بتا سکے گی، فٹنس ٹریکنگ اور وائرلیس ادائیگیاں سب کچھ کر سکے گی اور خوبصورتی کے لحاظ سے بھی یہ بہترین ہے۔ یہ گھڑی رواں سال متعارف تو ہو گئی ہے مگر اسے فروخت کے لئے آئندہ برس پیش کیا جائے گا۔

بلیک فون سمارٹ موبائل، پرائیویسی اوّلین ترجیح

دنیا بھر میں مختلف ممالک کے خفیہ ادارے موبائل فونز پر صارفین کی نجی معلومات کو حاصل کر لیتے ہیں مگر رواں برس بلیک فون کے نام سے ایسی سمارٹ ڈیوائس تیار ہوئی ہے جس میں صارف کی پرائیویسی کو ہی اوّلین ترجیح دی گئی ہے۔ بلیک فون نامی کمپنی کے تیار کردہ اس موبائل کو امریکی ایجنٹ سنوڈن کی جانب سے موبائل فون صارفین کے ڈیٹا کے حصول کی معلومات لیک کرنے کے بعد تیار کیا گیا۔

گوگل اینڈرائینڈ آپریٹنگ سسٹم پر چلنے والے اس موبائل میں ایسے فیچرز پر خصوصی توجہ دی گئی ہے جو ڈیٹا کے حصول کو آسان بنا دیتے ہیں جبکہ اس میں کالز، ایس ایم ایس اور براؤزنگ ہسٹری کے تحفظ کے لئے کسی عام سمارٹ فون کے مقابلے میں زیادہ بہتر سافٹ ویئر استعمال کیا گیا ہے۔

کمر کو سیدھا رکھنے والی ڈیوائس

کیا آپ کو معلوم ہے کہ کمر یا گردن کو جھکائے رکھنا کمر درد کا باعث بنتا ہے؟ اسی چیز کو مدِنظر رکھتے ہوئے لیومولفٹ نامی چپ تیار کی گئی ہے جو ایک انگوٹھے کے سائز کی ہے اور اسے قمیضوں میں لگایا جا سکتا ہے۔ یہ گردن اور ریڑھ کی ہڈی کی پوزیشن کا تجزیہ کر کے وائبریشن کے ذریعے صارف کو آگاہ کرتی ہے، جب وہ درست پوزیشن پر نہ ہو۔

لیپ ٹاپ کا متبادل ٹیبلٹ

مائیکروسافٹ کا حال ہی میں متعارف کرایا جانے والا ٹیبلٹ سرفیس پرو تھری اپنی 12 انچ سکرین کے ساتھ لیپ ٹاپس کا حقیقی متبادل ثابت ہوسکتا ہے۔ اس ٹیبلٹ میں ڈیسک ٹاپ ایپلیکیشن جیسے ورڈ، ایکسل اور پاور پوائنٹ وغیرہ کو استعمال کیا جاسکتا ہے جبکہ اس کے ساتھ ایک پتلا کی بورڈ کور اور بلٹ ان سٹینڈ بھی موجود ہے جس کے ذریعے سرفیس کو ڈیسک پر بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پیشہ ور افراد جیسے ڈاکٹرز اور کاروباری لوگوں کے لئے یہ سب سے موزوں ٹیبلٹ قرار دیا جارہا ہے اور کافی بڑی کمپنیاں جیسے کوکا کولا وغیرہ اب لیپ ٹاپ کی جگہ اس کی خریداری بھی شروع کرچکی ہیں۔

ایک انگوٹھی۔ سمارٹ فون کی ضرورت نہیں

اکثر افراد خاص طور پر خواتین اپنے سمارٹ فونز کو پرس میں رکھتی ہیں جس کی وجہ سے انہیں فون کالز یا ایس ایم ایس سمیت دیگر ضروری نوٹیفکیشنز کے بارے میں معلوم ہی نہیں ہو پاتا مگر سوچے اگر ان کے ہاتھ کی انگوٹھی انہیں یہ سہولت فراہم کرے تو؟ اور یہی وہ خیال ہے جو رنگلی نامی اس منفرد انگوٹھی کے پیچھے موجود ہے جو اس وقت جگمگانے لگتی ہے جب کسی صارف کے سمارٹ فون پر کوئی ای میل، ایس ایم ایس یا فون کال آتی ہے۔ مرسینڈو کی ڈیزائن کردہ اس انگوٹھی کو بہت زیادہ پسند کیا جارہا ہے اور یہ آن لائن 195 ڈالرز میں فروخت کی جارہی ہے۔

بچوں کیلئے۔ اندھے پن سے تحفظ

سب صحارا افریقہ میں پانچ سال سے کم عمر تیس فیصد بچے بینائی ختم ہونے کے خطرے کے شکار ہیں اور اس کی ایک سادہ وجہ یہ ہے کہ ان کی غذا میں آنکھوں کے لئے ضروری وٹامن اے کی زیادہ مقدار شامل نہیں ہوتی۔ تاہم ایسے کیلے جو ری انجینئرنگ کے نتیجے میں ان کی اس کمی کو پورا کرنے کے لئے ہی تیار کئے گئے ہیں واقعی کمال ہیں۔

بل اینڈ ملینڈا گیٹس فاؤنڈیشن کے تعاون سے آسٹریلین بائیو جینیٹکس جیمز ڈیل نے وٹامن اے سے بھرپور سپر کیلے کو تیار کیا ہے جس کی آزمائش جلد امریکہ میں شروع ہو جائے گی۔ افریقہ میں اس کے بعد جلد اسے متعارف کرایا جائے گا اور وہاں کے دیہات کے لیڈرز کو دس مفت سپر کیلے پودے اگانے کے لئے اس شرط پر دیئے جائیں گے کہ وہ بعد میں اس کے بیس بیج دیگر دیہات کو دیں گے جو آگے ایسا کریں گے۔

ایبولا سے جنگ کرنے والا فلٹر

ایبولا وائرس کو دہشت ناک بنانے والی اس کے پھیلنے کی رفتار ہے۔ یہ چند روز کے اندر جسمانی دفاعی نظام کو شکست دے دیتا ہے مگر ہیموپیوریفائر نامی فلٹر میں ایسا خصوصی ڈیزائن کردہ کارٹریج استعمال کیا گیا ہے جو ایک ڈائیلاسز مشین کے ساتھ منسلک ہوتا ہے اور یہ بیماری کے خلاف توازن واپس جسم کے حق میں لانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

یہ فلٹر ایبولا وائرس کو اپنی جانب کھینچ کر اسے خون سے دور لے جاتا ہے۔ اسے اب تک صرف ایک بار ہی جرمنی میں استعمال کیا گیا ہے مگر یہ ایبولا انفیکشن کے خلاف مؤثر ثابت ہوا ہے اور مستقبل میں ڈاکٹرز کو توقع ہے کہ اس ٹیکنالوجی کو دیگر وائرس جیسے ہیپاٹائٹس کے خلاف بھی استعمال کیا جاسکے گا۔

سیلفی سٹک اور ہیئر برش

سال 2013ء کو سیلفی کا سال بھی قرار دیا جاتا ہے

اور 2014ء میں یہ رجحان ایک ثقافتی وبا بن چکی ہے اور دنیا بھر میں نوجوانوں کی زندگی اس کے بغیر نامکمل ہی سمجھی جاسکتی ہے۔ اس چیز کو محسوس کرتے ہوئے متعدد کمپنیوں نے ایسی ڈیوائسز متعارف کرائی ہیں جن کا مقصد سیلفی لینے کو آسان بنانا ہو مگر ان میں بہترین کون سی ہیں؟ ان میں سے ایک ہمبر برش ہے جس میں سمارٹ فون کو رکھ کر اپنی پسند کی سیلفی لی جاسکتی ہے مگر سب سے بہترین سیلفی سٹک ہی قرار دی جاسکتی ہے جس سے صارفین اپنے ہاتھوں کی پہنچ سے بھی سمارٹ فونز لے جاکر زیادہ بہتر زاویے سے تصاویر لے سکتے ہیں۔

ریپرز جنہیں کھایا جاسکے

کھانے کے لائق ریپرز سننے میں سائنس فکشن خیال لگتا ہے مگر وکی فوڈز کے بانی ڈیوڈ نے اسے حقیقی شکل دے دی ہے۔ انہوں نے دہی، پنیر، آئس کریم اور دیگر کے ذریعے ایسے انوکھے ریپرز تیار کئے ہیں جو چیزوں کو ڈھانپنے کے ساتھ کھائے بھی جاسکتے ہیں۔

ان ریپرز کے لئے تیار کئے جانے والے شیلز کے اجزاء خشک میوے یا دیگر قدرتی اشیاء کی مدد سے تیار کئے گئے ہیں جنہیں برقی طور پر ایک دوسرے سے جوڑ دیا گیا ہے جبکہ انہیں مضبوطی دینے کے لئے کیلشیم اور چینی کا استعمال بھی کیا گیا ہے۔ اس ایجاد کا مقصد دنیا میں پیکنگ میٹریل کے فضلے کی تعداد کو کم کرنا ہے۔

خود پارک ہوجانے والی گاڑی

معروف کمپنی بی ایم ڈبلیو نے دوسروں سے ہٹ کر کچھ مختلف پیش کرنے کی کوشش کی اور اس نے ایسی گاڑی متعارف کرائی ہے جو پارکنگ کی جگہ خود ڈھونڈنے میں مہارت رکھتی ہے۔ بی ایم ڈبلیو نے اس گاڑی میں اپنے صارفین کے لئے ریموٹ مانیٹرنگ سسٹم، سنسرز اور جدید ٹیکنالوجی جیسے فیچر رکھے ہیں جن کی مدد سے لوگوں کو پارکنگ کی جگہ تلاش کرنے کی زحمت میں مبتلا نہیں ہونا پڑے گا کیونکہ وہ اسمارٹ واچ کے ذریعے اسے کنٹرول کرکے کہیں بھی پارک کرسکتے ہیں اور ان کا ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہونا ضروری نہیں۔

شمسی لالٹینیں

اب لگتا ہے کہ مٹی کے تیل سے روشن ہونے والی لالٹینوں کا دور ختم ہونے والا ہے کیونکہ شمسی توانائی سے چلنے والی جدید لالٹینیں یہ کام کریں گی اور اس کے لئے بجلی کی بھی ضرورت نہیں۔ دنیا میں ایک ارب سے زائد افراد کو بجلی کی سہولت میسر نہیں اور ان کی مدد کے لئے ہی یہ منفرد لالٹین تیار کی گئی ہے تاکہ ایندھن کے بے جا استعمال کو بھی روکا جاسکے۔ ایم پاورڈ نامی کمپنی نے اس لالٹین کو تیار کیا ہے جو کہ دس اسکوائر فٹ کی جگہ کو بارہ گھنٹے تک روشن رکھ سکتی ہے اور اسے آٹھ گھنٹے میں چارج کیا جاسکتا ہے۔

کپڑے صاف کرنے والی الماری

ایل جی نے ایسی الماری یا وارڈروب اس نمائش میں پیش کی ہے جس میں رکھے گندے کپڑے پانی یا سرف کے بغیر ہی ٹرو اسٹیم نامی ٹیکنالوجی کی بدولت صاف ہو جاتے ہیں۔ اس الماری میں ہاٹ اسٹیم اسپرے ٹیکنالوجی کو استعمال کیا گیا ہے جس سے کپڑوں پر موجود 99.9 فیصد جراثیموں کا خاتمہ ہو جاتا ہے جبکہ داغ وغیرہ بھی غائب ہو جاتے ہیں، جبکہ اس میں ایک کوئک ریفریش بٹن ہے جن کی بدولت کپڑے مہکنے لگتے ہیں جبکہ حرکت کرتے ہینگروں کی بدولت اس میں پڑنے والی شکنیں بھی ختم ہو جاتی ہیں اور یہ استری کئے ہوئے لگنے لگتے ہیں۔

عدل کے تقاضے

جب ہم انصاف کے علمبردار تھے تو جرائم کی تعداد بہت کم تھی۔ چونکہ لوگوں کو پتہ تھا کہ جرم کرنے والا کتنا ہی بااثر ہو سزا سے نہیں بچ سکے گا

☆ -- محمد اعظم

کچھ عرصہ پہلے میری طرح آپ نے بھی ٹی وی پر خبر دیکھی ہو گی کہ ایک بچی کو ظالم وڈیرے نے کتوں سے نچوایا۔ اسی طرح کی ایک خبر میں بتایا گیا تھا کہ زمیندار نے اپنے ایک مزارے پر کتے چھوڑ دیئے، کتوں نے اُسے شدید زخمی کر دیا۔

یہ واقعات تو کثرت سے ظہور پذیر ہوتے ہیں کہ شوہر نے بیوی کے چہرے پر تیزاب پھینک دیا یا پھر کسی نامراد عاشق نے رشتہ نہ ملنے پر لڑکی پر تیزاب پھینک کر اس لڑکی کا حلیہ بگاڑ دیا۔

ان تمام واقعات میں ملزمان کو سال یا دو سال کی سزائے قید دے دی جاتی ہے جس کے بعد وہ رہا ہو کر مضروب کے سینے پر مونگ دلتے رہتے ہیں۔

مصیبت یہ ہے کہ ہم ابھی تک انگریز دور کے قوانین سے ہی عدالتی فیصلے کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان جرائم کے روک تھام کے لئے جو قوانین عطا فرمائے ہیں ان قوانین کو ہم نے پس پشت ڈال رکھا ہے اور ان سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا رہے ہیں۔ قرآن حکیم کی سورۃ المائدہ آیت نمبر 45 کا ترجمہ پیش ہے۔

''اور ہم نے ان پر یہ بات فرض کی تھی۔ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان اور دانت کے بدلے دانت اور خاص زخموں کا بھی بدلہ ہے اور پھر جو شخص اس کو معاف کر دے تو وہ اس کے لئے کفارہ ہو جائے گا اور جو شخص اللہ کے نازل کیے ہوئے (قانون) کے مطابق حکم نہ کرے تو ایسے لوگ بالکل ظلم کر رہے ہیں''۔

کیا ہم اللہ کے فرمان کی حکم عدولی کر رہے ہیں؟

جی ہاں، بالکل ایسا ہے۔ صرف ایک ایک شخص کو اللہ کے حکم کے مطابق سزا دے دی جائے تو آپ دیکھیں گے کہ

زیادتی کرنے والے کس طرح سہم جائیں گے۔

جس شخص نے ایک بچی کو کتوں سے نچوایا اس پر اسی طرح کتے چھوڑے جائیں، اس کی یہی سزا ہے۔ جو کسی لڑکی پر تیزاب پھینک کر اس کا چہرہ برباد کرتا ہے اس کے چہرے پر اس ہی طرح تیزاب پھینکا جائے۔ یہ لوگ چلتے پھرتے اشتہار ہوں اور اگر کسی کے دل میں جرم کرنے کا خیال پیدا ہوگا تو یہ لوگ اس کی آنکھوں کے سامنے آ جائیں گے اور وہ شخص جرم کرنے سے رُک جائے گا۔

جب ہم انصاف کے علمبردار تھے تو جرائم کی تعداد بہت کم تھی۔ چونکہ لوگوں کو پتہ تھا کہ جرم کرنے والا کتنا ہی بااثر ہو سزا سے نہیں بچ سکے گا اور پھر آج کی طرح وکیلوں کی ایک فوج بھی موجود نہیں تھی جو جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ ثابت کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے ہیں۔

قانون پر عمل اور فوری فیصلے کے چند واقعات قارئین کی خدمت میں پیش ہیں۔

عدلِ جہانگیری

مغل شہنشاہ جہانگیر کا اصل نام شہزادہ سلیم تھا۔ اکبر بادشاہ کی موت کے بعد وہ تخت پر بیٹھا۔ اُس نے ایک گھنٹی محل کے اندر لگوادی اور گھنٹی کی زنجیر محل کے باہر لٹکتی رہتی تھی۔ جب کسی شخص کی فریاد کہیں نہ سنی جاتی تو وہ بادشاہ کے دربار میں فریاد لے کر پہنچ جاتا یوں سمجھ لیں بادشاہ ملک کا چیف جسٹس بھی ہوتا تھا۔

شہنشاہ جہانگیر کو اپنی ملکہ نور جہاں سے بہت محبت تھی۔ ملکہ ایک دن شکار کے لئے گئی، جنگل میں ملکہ کو ایک ہرن نظر آ گیا، اس نے ہرن پر تیر چلایا، ہرن تو بھاگ گیا لیکن تیر ایک شخص کو جالگا جو جنگل میں لکڑیاں کاٹ رہا تھا۔ وہ شخص تیر لگنے سے مر گیا۔ اُس شخص کے بیٹے بھی جنگل میں موجود تھے، وہ موقع پر پہنچ گئے اور انہیں معلوم ہو گیا کہ ان کا والد ملکہ نور جہاں کے تیر سے فوت ہوا ہے۔ وہ شہنشاہ کے دربار میں گئے اور شہنشاہ سے انصاف کے طالب ہوئے۔ شہنشاہ جہانگیر نے ملکہ کو دربار میں طلب کیا اور ماجرا دریافت کیا۔ ملکہ کے پاس انکار کی کوئی گنجائش نہیں تھی، اس لئے اُس نے قتل کا اقرار کرلیا۔ چونکہ جہانگیر اللہ کے احکام سے خوب واقف تھا اس لئے اس نے نور جہاں کے لئے سزائے موت کا حکم سنا دیا۔ ملکہ کا رنگ زرد پڑ گیا، وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ جہانگیر جو اُس سے بہت محبت کرتا تھا اس طرح کا حکم جاری کردے گا۔ دربار میں خاموشی چھائی ہوئی تھی ہر شخص اس حکم پر حیران تھا۔ مقتول کے بیٹوں نے آپس میں کھسر پھسر کی اور پھر کہا کہ انہوں نے ملکہ کو اپنے باپ کا خون معاف کردیا ہے۔

جہانگیر بھی پریشان تھا۔ مقتول کے ورثاء کی بات سن کر ملکہ نے بادشاہ کی طرف دیکھا۔ بادشاہ نے کہا کہ اگر تم لوگ ملکہ کو معاف کرتے ہو تو دعا کرو کہ اللہ بھی اُسے معاف فرما دے۔ چنانچہ بادشاہ نے ورثاء کو خون بہا عطا کر کے رخصت کردیا۔ علامہ شبلی نعمانی نے اس واقعہ کو نظم کیا ہے اور اس نظم کا آخری مصرع مجھے یاد ہے، وہ یوں ہے۔

تُو گر کشتہ شدی آہ چہ می کردم من
یعنی تُو گر قتل کردی جاتی تو آہ میں کیا کرتا۔

نور جہاں کے متعلق کچھ معلومات قارئین تک پہنچانا چاہتا ہوں۔ جہانگیر کے دادا ہمایوں نے ایران کے بادشاہ کی مدد سے اپنا تخت واپس لیا تھا۔ اس کے بعد اہل ایران کی آمد و رفت ہندوستان میں شروع ہوگئی تھی۔ نور جہاں کا اصل نام زیب النساء تھا اور اس کا والد روزگار کی تلاش میں دلی آیا اور اُسے محل میں ملازمت مل گئی۔ زیب النساء محل ہی میں جوان ہوئی ادھر جہانگیر جو اُس وقت شہزادہ سلیم تھا، اُسے پسند کرنے لگا۔ اللہ نے زیب النساء کو صورت بھی بہت اچھی عطا کی تھی لیکن شہنشاہ اکبر نے ایک ملازم کی بیٹی سے شہزادے کی شادی کرنے سے انکار

کر دیا اور زیب النساء کی شادی ایک فوجی کمانڈر علی قلی خان سے کر دی۔ شہنشاہ اکبر نے اُسے بنگال بھیج دیا۔ اُسی دوران اکبر مر گیا اور شہزادہ سلیم جہانگیر کے لقب کے ساتھ تخت نشین ہو گیا۔ علی قلی خان ایک فوجی معرکے میں مارا گیا۔ کچھ عرصے بعد جہانگیر نے زیب النساء کو دلی طلب کر لیا اور اُسے محل میں رہنے کو جگہ دے دی اور اُس سے شادی کرنا چاہی لیکن زیب النساء کو شک تھا کہ جہانگیر نے اُس کے خاوند کو جان بوجھ کر مروایا ہے وہ کچھ عرصہ اپنی بات پر قائم رہی لیکن آخر زیب النساء نے اسی میں عافیت سمجھی کہ وہ شہنشاہ کی بات مان لے۔ چنانچہ جہانگیر نے اُس سے شادی کر لی اور اُسے نور جہاں کا خطاب عطا کیا اور اس طرح وہ تاریخ میں نور جہاں کے ہی نام سے مشہور ہوئی۔

ایک دوسرا واقعہ بھی شہنشاہ جہانگیر کے انصاف کا ہی ہے۔ ایک شہزادہ ہاتھی پر سوار آبادی سے گزر رہا تھا۔ ہاتھی کافی اونچا ہوتا ہے ایک گھر کے صحن میں خاتونِ خانہ نہا رہی تھی۔ شہزادے کے ہاتھ میں گلاب کا پھول تھا جو اُس نے اُس خاتون کی طرف اچھال دیا۔ خاتون نے جلدی سے جسم کو پاس پڑے کپڑوں کے ذریعے چھپانے کی کوشش کی لیکن وقت گزر چکا تھا۔ ہاتھی آگے نکل گیا تھا۔ خاوند گھر آیا تو اُس عورت نے اپنے شوہر سے واقعہ کا ذکر کیا۔ شوہر شکایت لے کر شہنشاہ کے دربار میں پہنچ گیا۔ شہزادے کو بلا لیا گیا۔ شہزادے سے غلطی ہوئی تھی اس لئے اس نے الزام کی تفصیل سن کر سر جھکا لیا۔ شہنشاہ نے حکم دیا کہ کل شہزادے کی بیوی اُسی گھر میں اُسی مقام پر نہائے گی اور شکایت کنندہ اُسی طرح ہاتھی پر گزرے گا اور اُسی طرح گلاب کا پھول شہزادی کی طرف اچھالے گا۔ مدعی کو انصاف مل گیا تھا اس لئے اس نے شہزادے کو معاف کر دیا اور بادشاہ نے اس کی تالیفِ قلب کے لئے انعام و اکرام عطا کر کے رخصت کر دیا۔

خلیفہ ہارون الرشید کا انصاف

اب کچھ ذکر خلیفہ ہارون الرشید کا۔ ہارون الرشید عباسی خاندان کا سب سے مشہور و معروف خلیفہ گزرا ہے۔ اس کے دور کا ایک واقعہ ہے۔ ایک لکڑہارا اپنے گدھے پر لکڑیاں لادے بازار میں بیچنے آیا۔ گدھے پر لکڑیاں لادنے کے لئے اس نے لکڑی کا ایک سٹینڈ بنا رکھا تھا جسے گدھے پر رکھ کر دونوں طرف لکڑیاں لاد لیا کرتا تھا۔ ایک نائی نے اُس سے لکڑیاں خریدیں اور ساتھ ہی اُس سے وہ لکڑی کا سٹینڈ بھی رکھوا لیا اور کہا کہ یہ بھی لکڑی کا بنا ہوا ہے اور میں نے گدھے پر موجود تمام لکڑیاں خریدی ہیں۔ لکڑہارے نے مجبوراً سٹینڈ سمیت لکڑیاں نائی کے حوالے کر دیں۔ لکڑہارا خلیفہ ہارون الرشید کے دربار میں چلا گیا اور خلیفہ کو تمام واقعہ سنا دیا۔ خلیفہ نے لکڑہارے کو پاس بلایا اور آہستہ آہستہ کچھ باتیں کیں۔ لکڑہارا خوشی خوشی گھر چلا گیا۔

اگلے روز لکڑہارا صرف گدھے کو لے کر بازار میں گیا۔ گدھا دور باندھ دیا اور اکیلا نائی کی دُکان پر گیا اور نائی کو کہا۔ ''میرے اور میرے ساتھی کے بال کاٹنے میں کتنے پیسے لو گے؟'' نائی نے جو دو آدمیوں کے بال کاٹنے کا ریٹ تھا اُسے بتا دیا۔ لکڑہارا بیٹھ گیا اور کہا۔ ''پہلے میرے بال کاٹ لو پھر میں اپنے ساتھی کو بلاتا ہوں''۔ نائی نے لکڑہارے کے بال کاٹے اور اُسے کہا۔ ''اپنے ساتھی کو بلا لاؤ''۔ لکڑہارا گیا اور اپنے گدھے کو لے کر نائی کی دُکان پر آ گیا۔ نائی نے جب گدھے کو دُکان کے اندر گھستے دیکھا تو شور مچا دیا کہ گدھے کو کیوں لے آئے ہو، اپنے دوسرے ساتھی کو بلاؤ لیکن لکڑہارے نے کہا کہ یہی میرا دوسرا ساتھی ہے اور تم کو اسی کے بال کاٹنے ہوں گے۔

جھگڑا بڑھ گیا، نائی کسی طور گدھے کے بال کاٹنے کو تیار نہیں تھا۔ لکڑہارا سیدھا خلیفہ ہارون الرشید کے دربار

میں پہنچ گیا اور تمام واقعہ گوش گزار کر دیا۔ دراصل یہ تمام پروگرام خلیفہ ہی نے لکڑہارے کو سمجھایا تھا۔

خلیفہ نے نائی کو دربار میں بلا لیا اور پوچھا۔ اس لکڑہارے کے ساتھی کے بال کاٹنے سے تم نے کیوں انکار کر دیا ہے۔ نائی کہنے لگا۔ ”جناب والا کسی انسان کا ساتھی ایک گدھا کیسے ہو سکتا ہے؟“ خلیفہ نے کہا۔ ”اگر جلانے والی لکڑی کا ساتھی گدھے پر رکھا سٹینڈ ہو سکتا ہے تو انسان کا ساتھی گدھا کیوں نہیں ہو سکتا“۔ نائی کو یاد آ گیا کہ ایک دن پہلے اُس نے لکڑہارے کے ساتھ زیادتی کی تھی۔ خلیفہ نے حکم دیا۔ ”ایک کھلے میدان میں لوگ جمع ہوں اور سب لوگوں کے سامنے نائی گدھے کے بال صاف کرے“۔ اور نائی کو ایسا کرنا پڑا۔

خلیفہ ہارون الرشید ایک محل تعمیر کروا رہا تھا۔ محل کی زد میں کچھ گھر آ رہے تھے۔ باقی لوگوں نے تو معاوضہ لے کر گھر خالی کر دیئے ایک بڑھیا نے گھر کا معاوضہ لینے اور گھر خالی کرنے سے انکار کر دیا اور قاضی کی عدالت میں پہنچ گئی۔ قاضی نے خلیفہ کو عدالت میں طلب کر لیا اور خلیفہ کو حکم دیا کہ بڑھیا کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچنا چاہئے۔ خلیفہ ہارون الرشید نے عدالت کا حکم مان لیا اور اس مقام پر دیوار ٹیڑھی بنی۔

بیان کردہ خلیفہ ہارون الرشید اور نائی کا واقعہ ایک چھوٹا اور معمولی جرم تھا بلکہ آج کل تو ایسے واقعات کو جرم سمجھا ہی نہیں جاتا۔ نائی جب اتنے لوگوں کے سامنے گدھے کے بال صاف کرتا رہا ہو گا تو شرمندگی کے مارے اس کا کیا حال ہوا ہو گا اور دیکھنے والوں کو بھی عبرت نصیب ہوئی ہو گی کہ اگر اتنے چھوٹے جرم پر سزا دی جاتی ہے تو کسی بڑے جرم پر تو مجرم کو چھوڑا ہی نہیں جائے گا۔

اللہ تعالیٰ ہمارے حکمران طبقے کو توفیق دے کہ انگریزی قانون کو چھوڑ کر اسلامی سزاؤں کا قانون نافذ کر سکیں۔

دہشت گردوں کے نام

نازیہ لیاقت
ایم اے انگلش

تم ظلم کیئے جاؤ مگر یہ جان لو کل ہم
خود تم جیسے بھگتو گے وہ خمیازہ ہی ہوں گے

جو بام شواہد سے کسا جائے گا تم پر
ہم نطق حقیقت کا وہ آوازہ ہی ہوں گے

رستوں پہ جو بکھرے ہوئے دھبے ہیں لہو کے
کل عارضِ گیتی پہ یہی غازہ ہی ہوں گے

ہر دور میں تم ٹھہرو گے معیار ہوس کا
وطن سے محبت کا ہم اندازہ ہی ہوں گے

تم پھوٹ کے پھیلو گے مگر کوڑھ کی صورت
ہم زخم کی مانند تر و تازہ ہی ہوں گے

یک چشمی کماندار بابا کھڑا کچھ یوں دیکھ رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو کہ
جنگ میں اپنے جذبات واحساسات احکام کے تابع رکھنا لازمی ہے۔

☆ --- شازیہ محسن

کیا جنگ کے دوران محبت کرنے کے لئے وقت ہوتا ہے؟ یقیناً انسان جنگ میں تو کسی دشمن سے محبت کر ہی نہیں سکتا۔ زمانہ جنگ میں یہ ایک گناہ ہی تو ہوتا ہے لیکن ایک دوست یا محبوبہ کے ساتھ محبت؟ دوسروں کے سامنے کسی دوست یا محبوبہ سے بھی محبت نہیں کی جا سکتی۔ جنگ کے دوران تو صرف احکام کی بجا آوری ہر ایک کا ایسا قومی فریضہ ہوتا ہے جسے پورا نہ کرنے والا ایسے جرم یا گناہ کا مرتکب ہوتا ہے جس کی سزا صرف موت ہوتی ہے۔ مقامی چھوٹے کمانداروں اور خاص کر محاذ جنگ پر اگلی صفوں کے بڑے کمانداروں کے سامنے کسی ایک کا کسی دوسرے کے لئے محبت کا اظہار اس کے خلاف شکوک و شبہات کی بنیاد اور اس کے کم ہمت، ڈرپوک اور جنگ سے خائف ہونے کی دلیل کے زمرے میں آ سکتا ہے۔

جنگ کے زمانے میں خود کسی کو اپنے محسوسات یا اپنی خواہشات کا نشانہ نہیں بننا چاہئے بلکہ لازم ہے کہ ہر کوئی احکام کی پابندی کرے اور اگر کوئی احکام کی پابندی نہیں کر سکتا تو اسے اپنے جذبات ومحسوسات کو احکام کے تابع لانا چاہئے۔ ان کے ہاں حاکموں نے یہی جنگی اصول اپنا رکھا تھا۔

صوفیہ اور زربان کے لئے ایسا کرنا ممکن ہی نہیں ہو پا

رہا تھا حالانکہ وہ دونوں اچھی عمر کے تھے۔ ریان تیس سال کا اور صوفیہ چھبیس برس کی تھی۔

ملکی تحفظ کی جنگ میں ریان اس حد تک مفلوج ہو چکا تھا کہ اب اسے اپنی باقی ماندہ تھوڑی سی زندگی ویل چیئر پر ہی بسر کرنی تھی۔ انسانی ہمدردی کی دو تنظیموں نے اسے اپنے ملک سے باہر کسی دوسرے پُرامن ملک میں پناہ دلوانے میں مدد مہیا کی۔ صوفیہ پہلے ہی اپنے خاندان کے ساتھ یہاں رہ رہی تھی۔ ان دونوں کی ملاقات بھی اسی ملک میں ہوئی تھی جو ایک دوسرے کے لئے دوستی میں بدل گئی۔ اس نئے ملک میں وہ دونوں اکثر و بیشتر ایسے مظاہروں میں اکٹھے شامل ہوتے جو ان کے آبائی ملک کے خلاف جاری دہشت گردی کی جنگ کے خلاف ہوتے تھے۔ ریان کو ان مظاہروں میں دوسروں کے لئے ایک مثال بلکہ عبرت کے لئے لے جایا جاتا تھا۔ جنگ نے اس کی دونوں ٹانگیں مفلوج کر دی تھیں اور خود اس نے اپنے لئے اور لوگوں کے لئے اپنی زندگی خود بھاری کر لی ہوئی تھی۔

صوفیہ دیکھنے میں کافی خوبصورت اور پُرکشش تھی۔ ایسے مظاہروں کے دوران وہی ریان کی ویل چیئر مضبوطی سے تھامے آگے آگے چلاتی جاتی اور ریان پر نگاہ بھی رکھتی تھی۔ ایسے کرتے ہوئے وہ اپنی گردن جھکا کر ریان کے چہرے کو بھی دیکھتی اور اس کے اندر چھپے ہوئے درد و کرب کو محسوس بھی کرتی اور ساتھ ساتھ اسے ویل چیئر پر مضبوطی سے بٹھائے رکھنے کے لئے رک کر اس کی بے جان ٹانگوں کو اِدھر اُدھر کرتی اور اسے پہلو بدل کر بیٹھنے میں مدد بھی کرتی تھی۔

''ریان! بس تم سیدھے آگے دیکھو، ناک کی سیدھ میں بالکل سامنے''۔ صوفیہ کئی بار ریان کو ایسی ہدایات دیتی۔ وہ اکثر ریان کو ویل چیئر پر گھمانے پھرانے لے جاتی تھی۔ جب کوئی مظاہرے وغیرہ نہیں ہوتے تھے وہ اسے شہر کے کیفے ٹیریوں اور تفریحی پارکوں میں لے جاتی اور پھر وہاں بیٹھے گھنٹوں باتیں کرتے رہتے۔ اپنے وطن کی باتیں، سیاسی حالات پر بحثیں اور کچھ اپنے بارے میں باتیں۔

کئی بار وہ اسے اپنے ساتھ اپنے گھر بھی لے گئی اور اس کے والدین بھی ریان کے لئے یوں فراخ دلی اور پیار کا اظہار کرتے جیسے وہ ان کا اپنا ہی بیٹا ہو۔ آخر وہ بھی تو ایک ہیرو تھا، ان کے اپنے ملک کا جنگی ہیرو اور پھر ایک دن ریان نے صوفیہ کے باپ سے اپنے لئے صوفیہ کا رشتہ مانگا۔ پہلے تو اس نے اسے کھا جانے والی گہری خاموش نظروں سے یوں دیکھا کہ جیسے اسے سماعت پر یقین ہی نہ ہو کہ اس نے وہی کچھ سنا تھا جو ریان نے کہا تھا اور پھر فوراً ہی اس کا غصہ یوں اُمڈ آیا گویا وہ میدانِ جنگ میں ہو۔

میرا داماد، ویل چیئر پر بیٹھے رہنے والا اور دوسروں کا دست نگر، محتاج اپاہج ہوگا۔ اس نے سوچا یہ تو میرے خاندان کے وقار اور میری بیٹی کے معیار و عزت کے سراسر خلاف ہوگا۔ اس نے صوفیہ کو دوسرے کمرے میں جانے کو کہا اور اپنے چھوٹے بیٹے کو بلایا۔

''اسے اس کی ویل چیئر سمیت اس کے گھر چھوڑ آؤ''۔ اس نے بیٹے سے کہا اور پھر ریان کو مخاطب کر کے کہا۔ ''اور ہاں تم یاد رکھو کہ صوفیہ آئندہ تمہاری صورت نہ دیکھے اور یہ بھی یاد رکھنا کہ تم کبھی اس گھر میں آئے ہی نہیں ہو۔ یہ بات تمہیں کبھی نہیں بھولنی چاہئے''۔

وہ ابھی تک پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ صوفیہ کو اس کے کمرے میں بند کر دیا گیا تھا اور اس کی ماں کمرے کے دروازے کے باہر سر جھکائے بت بنے بیٹھی تھی۔ شام کو صوفیہ کے باپ نے، اس کی ماں کے ساتھ بات کر کے صوفیہ کو سزا دینے کے لئے اس کی شادی فوری طور پر ایک دوسرے آدمی سے کر دینے کا فیصلہ کیا جو انہی کے قبیلے

سے تھا اور اسی شہر میں رہتا تھا۔ وہ انہی کی طرح مہاجر تو تھا ہی لیکن ریان کی طرح اپاہج اور مفلوج نہیں تھا لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ اتنے مختصر سے وقت میں کیا ہو چکا تھا۔

صوفیہ اپنے کمرے کی کھڑکی سے بھاگ گئی تھی اور سیدھی ریان کے مکان پر پہنچ کر اسے جلدی سے ویل چیئر پر بٹھا کر قریبی پولیس سٹیشن لے گئی تھی۔ جہاں ان دونوں نے اپنے لئے تحفظ کی استدعا کی اور مقامی اسلامک سینٹر کے سربراہ کے ہاں پناہ لینے کے لئے مدد مانگی جو فراہم کر دی گئی۔ اب نصف شب سے پہلے ان دونوں کی شادی ہو چکی تھی۔

ادھر صوفیہ کے گھر میں کہرام مچا ہوا تھا اور اس کا باپ اپاہج ریان کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ محلے کے تمام مہاجر کنبوں کے مردوں میں حرکت آ گئی تھی اور وہ ایک اکائی کی صورت میں یکمشت جنگ زدہ ریان کی کھوج میں نکل پڑے تھے۔ ان سب کی رہنمائی ایک بوڑھا مہاجر کر رہا تھا۔ جو خود اپنے ملک میں محاذ جنگ پر ایک بڑا کمانداررہ چکا تھا اور دشمن کی گولی لگنے سے اپنی دائیں آنکھ کھو چکا تھا۔ اس کے بارے میں اس کے بھی ہم وطن اس بات پر متفق تھے کہ کچھ بھی ہو کماندار ہر کسی کو ایک آنکھ سے دیکھتا ہے اور اس کی نظر میں سب برابر ہیں۔

صوفیہ اور ریان کی تلاش کا سلسلہ بڑی رازداری کے ساتھ کئی دنوں تک جاری تو رہا لیکن ان دونوں کا کوئی سراغ نہ مل سکا اور پھر ایک دن شہر کے مضافات سے ایک اور مہاجر جو یہاں نئے ملک میں آنے سے پہلے اپنے ملک میں ایک مقامی کماندار کا ماتحت رہ چکا تھا اور چھوٹا کماندار کے نام سے جانا جاتا تھا، وہ یک چشمی بڑے کماندار بابا کے ہاں آیا اور اسے بتایا کہ اس نے ریان اور صوفیہ دونوں حرامیوں کا سراغ لگا لیا ہے۔ بڑا کماندار اسے اپنے ساتھ لے کر صوفیہ کے باپ کے گھر پہنچا اور

کرپشن

کرپشن عصمت فروشی سے بھی زیادہ خطرناک ہے کیونکہ عصمت فروشی چند افراد کو تباہ کرتی ہے جبکہ کرپشن پوری قوم کو تباہ کر دیتی ہے۔

(حکیم ممتاز۔ میانوالی)

صوفیہ کے باپ نے اپنے دونوں چھوٹے بیٹوں کو محلے میں رہنے والے اپنے ہم وطنوں اور اپنے ملک کی آزادی اور تحفظ دفاع کرنے والے مہاجر سابق کمانداروں کو بلا لانے کے لئے بھیجا۔

اگلے دن پولیس کی بھاری نفری شہر کے باہر مضافات میں ایک پرانے نالے کے دونوں کناروں پر کھڑی تھی اور کچھ غوطہ خور نالے سے دو لاشیں باہر نکال رہے تھے۔ پولیس کو کسی مقامی شہری نے نالے پر کچھ انہونی کی اطلاع دی تھی جس کے بعد یہ کارروائی کی گئی۔ لوگوں کی بھیڑ میں کھڑا ایک اخباری فوٹوگرافر پکچرز میں لت پت دونوں لاشوں کی تصویریں اتار رہا تھا۔ وہ ان میں سے ایک کو بڑی اچھی طرح پہچانتا تھا۔ یہ تو اسی جنگی ہیرو ریان کی نعش ہے جسے علاج اور آبادکاری کے لئے خود ہماری حکومت لائی تھی جو امن مظاہروں میں پیش پیش رہتا اور صف اوّل میں ہوتا تھا۔

فوٹوگرافر اپنے قریب کھڑے پولیس افسر سے کہہ رہا تھا۔ ریان اور صوفیہ کی لاشیں اب ایمبولینس میں رکھی جا رہی تھیں لیکن ریان کی ویل چیئر کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ البتہ ذرا فاصلے پر کھڑا وہی بوڑھا یک چشمی کماندار بابا کھڑا کچھ یوں دیکھ رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو کہ جنگ میں اپنے جذبات و احساسات احکام کے تابع رکھنا لازمی ہے۔

❋❋❋

مرحومہ سے خطاب

ڈاکٹر مظفر حسن ملک

اے مری امید کی دنیا مرے دل کی قرار
اے محبت کی خدا اے عشق کی پروردگار
اے مری عمرِ رواں کی راہِ منزل آشنا
میرے بحرِ زندگی کی موجِ ساحل آشنا
میری لغزش کا سہارا میری نظروں کی سکوں
تیرے پائے ناز پر تھا حسنِ فطرت سرنگوں
اے میری روحِ نگاہ و دل مری وجہٗ حیات
میری دنیا کی سحر میرے جہاں کی چاند رات
تُو کہاں ہے؟ میرے جذباتِ وفا کی قدرداں
میں ہوں قیدِ زندگی میں اور تُو جنت نشاں؟
تُو کہاں ہے؟ میری چشمِ شوق کی مرکز تھی تُو
مجھ کو صحرا میں لئے پھرتی ہے تیری جستجو
دردِ فرقت کی مسیحا دل بہت غم کوش ہے
محفلِ ہستی میں سازِ زندگی خاموش ہے

اسرائیلی خفیہ ایجنسی موساد کی اندرونی کہانی

غیر مقدس میثاق

موساد کے سربراہ کو ریڈیو کے ذریعے پہلے ہی اطلاع مل چکی تھی کہ وین کے اندر چھ راکٹ موجود تھے۔ اب وہ یہ جاننا چاہتا تھا کہ کہیں دوسری جگہ پر تو کوئی ایسی صورت حال موجود نہیں ہے؟

قسط: 11 ☆ ---------------------0300-4154083--------------------- میاں محمد ابراہیم طاہر

اسرائیل کے قیام کے وقت سے ہی اُس کا ہر وزیرِاعظم پوپ کے غیر معمولی اختیارات اور خودمختارانہ تاحیات حقِ حکمرانی پر اظہارِ تعجب کرتا رہا تھا۔ پوپ دنیا کا واحد حکمران تھا جو اپنے الیکشن کے بعد کسی دعالت اور پارلیمنٹ کے سامنے جوابدہ نہیں تھا۔ وہ اپنے لامحدود اور شاہانہ اثر و رسوخ کو نہ صرف کیتھولک مذہب کے ماننے والوں کی زندگیوں پر بلکہ دنیا کی سیاست اور معیشت پر بھی اپنے خفیہ نظریات کے ذریعے اثرانداز ہوتا تھا۔ ڈیوڈ بن گوریاں نے ایک دفعہ شکایتاً کہا تھا۔ ''اس بات کو نہ دیکھو کہ کتنے بے معنی اور فضول شعبے پوپ کے ماتحت کام کرتے ہیں، صرف اس بات کو پیش نظر رکھو کہ اپنی ایک آواز پر وہ کتنے لوگوں کو اپنی مدد کے لئے متحرک کرسکتا ہے''۔

ویٹیکن کی حکومت موساد کے لئے ایک سربستہ راز تھی۔ یہ ایک انتہائی منظم اور خفیہ طریق کار تھا اور پاپائے اعظم کا ہر اقدام کئی پردوں میں چھپا ہوتا تھا۔ بعض اوقات مہینے گزر جاتے تھے کہ پوپ کی کسی سفارتی کوشش کی بھنک باہر آتی تھی بلکہ پوری کہانی پھر بھی سربستہ راز ہی رہتی تھی۔ موساد کا سربراہ اس بات پر پریشان رہتا تھا دبیز پردوں کے پیچھے کس طرح سرایت کیا جائے۔ اسرائیلی حکومت اور موساد کی ویٹیکن حکومت کے ساتھ کسی قسم کے سیاسی تعلقات پیدا کرنے کی تمام کوششیں نہایت مہذب انداز لیکن محکم طریقے سے رد کی جاچکی تھیں۔

حقیقت یہ تھی کہ پاپائے اعظم کے حکومتی سیکرٹریٹ میں ایک طاقتور اور منظم بیرونی تعلقات کے شعبے کے افسروں کا گروپ اسرائیل کے سخت خلاف تھا۔ مذہبی جنونیوں کا یہ گروپ مغربی کنارے اور غزاء کی پٹی کا حوالہ دیتے اسے ''مقبوضہ علاقہ'' اور ''گولان ہائٹ'' کو شام سے چھینا ہوا علاقہ قرار دیتا تھا۔ یہ لوگ شام کے وقت اپنی ننھی سی سلطنت کے چھوٹے چھوٹے دفاتر سے نکل کر اپنی گاڑیوں میں روم کے علاقے ''وایا کنڈوتی'' کا رخ کرتے تھے جہاں امیر اور خوش حال عربوں کی رہائش گاہیں ہیں اور وہاں ان کی محفلوں میں شامل ہوکر اسرائیل کو صفحۂ ہستی سے مٹادینے کے خواب دیکھا کرتے تھے۔

پادری اپنی بات چیت میں بڑا محتاط رویہ اختیار کرتے تھے۔ ان کو یقین تھا کہ یہودی حکومت نے ہر جگہ اپنے جاسوس چھوڑے ہوئے ہیں جو اُن کی نگرانی کرتے، گفتگو سنتے اور حتیٰ کہ ریکارڈ بھی کرتے تھے اور تصویریں بھی اتار لیتے تھے۔ ویٹیکن حکومت کے سیکرٹریٹ میں ہر نئے آنے کو یہ انتباہ ملتا تھا۔ ''جن ملکوں کو ویٹیکن نے سفارتی طور پر تسلیم نہیں کر رکھا تھا، ان کے ایجنٹوں کی جاسوسی اور تخریب کاری سے ہوشیار رہا جائے''۔

ان ناپسندیدہ ملکوں کی فہرست میں اسرائیل کا نام سب سے اوپر تھا۔ 1978ء میں اپنے الیکشن کے بعد پوپ جان پال دوم نے بھی اس فہرست کو جوں کا توں رکھنے پر رضامندی کا اظہار کیا تھا، تاوقتیکہ پوپ اسرائیل کو مکمل سفارتی درجہ دینے کا فیصلہ کرے۔

اسرائیل کے متعلق پوپ پال کو جو بھی خبریں پہنچائی جاتی تھیں اُن میں زیادہ تر عربوں سے سنی سنائی باتیں شامل ہوتی تھیں کیونکہ پادری اُن سے رابطے میں رہتے تھے۔ روم میں ان کی نقل و حرکت پر پوپ کے محل کی تیسری منزل پر واقع پُرہجوم سفارتی مشن کے چھوٹے سے دفتر، جہاں مصنوعی روشنی اور کوئی روشندان نہ تھا، کے کارندے گہری نظر رکھے تھے۔ اسے ''ایکسٹرا آرڈینری افیئرز سیکشن'' کہا جاتا تھا، یہ دفتر پاپائے روم کی سفارتی پالیسی پر عمل درآمد کا ذمہ دار تھا۔ اس دفتر میں دنیا کے ہر ملک کے دفتر خارجہ کی طرز پر 20 ڈیسک تھے اور اُسی طرح ہر قسم کا پیپر ورک انجام پاتا تھا جیسے کسی بڑے ملک کی وزارتِ خارجہ کا ہوتا تھا۔ روز بروز پاپائے روم کے فارن آفس کی سرگرمیوں میں اضافہ ہو رہا تھا اور دنیا بھر

کی سفارتی سرگرمیوں پر نظر رکھی جاتی تھی۔

''مڈل ایسٹ ڈیسک'' چھوٹے چھوٹے ایسے دفاتر پر مشتمل تھا جہاں سے ''سان دماسو'' (San Damaso) کا حسین اور خوبصورت صحن صاف نظر آتا تھا، جو پاپائے روم کے محل کے عین درمیان میں واقع تھا۔ اس ڈیسک نے نومنتخب پولش پوپ کی خدمت میں جو پہلی دستاویز پیش کی وہ انتہائی محنت اور محتاط الفاظ میں تحریر کردہ تجویز تھی جس میں یروشلم کو بین الاقوامی شہر کا رتبہ دینے، وہاں یونائیٹڈ نیشن کی فوج تعینات کرنے اور تمام عیسائی خانقاہوں کا انتظام ویٹیکن کے زیر انتظام دینے کی تھی۔ اس تجویز کی خبر 1979ء کے شروع میں تل ابیب پہنچ گئی تھی۔ اس کی نقل روم میں رہائش پذیر ایک لبنانی سرمایہ دار عیسائی سے موساد کے مخبر کے ہاتھ لگی تھی کیونکہ اس شخص کے عملے میں موساد کا ایک ایجنٹ بھی شامل تھا۔ یروشلم کو بین الاقوامی شہر قرار دینے کی تجویز نے اسرائیل کے وزیراعظم مناشم بیگن کو مشتعل کردیا۔ اُس نے موساد کے اس وقت کے چیف یزہاک ہوفی کو حکم جاری کردیا کہ وہ ویٹیکن کے ساتھ رابطوں کے لئے اپنی کوششیں دوگنی کردے۔

دونوں کو اچھی طرح پتہ تھا کہ موساد کی ایسی کوششوں کا اُس وقت کیا حشر ہوا تھا جب سابقہ وزیراعظم گولڈا میئر نے ویٹیکن کا سرکاری دورہ کیا تھا۔

آخرکار 1972ء کے خاتمے کے قریب گولڈا میئر کو پوپ پال ششم کی طرف سے جواب آ ہی گیا کہ وہ میڈم کو مختصر طور پر حاضری کی اجازت دینے پر تیار ہے۔ اس سال دسمبر میں وزیراعظم نے اپنے ہفتہ وار اجلاس کے دوران اپنی کابینہ کو اس امر سے آگاہ کیا۔ کابینہ کے ارکان اس بات پر متعجب تھے کہ ان کی پوپ سے ملاقات کسی قسم کے کوئی نتائج پیدا کرسکے گی۔ میڈم پاپائے روم کے مذہبی نظام حکومت کے سحر میں جلا تھی۔ پہلی بات یہ تھی کہ پوپ کے پاس مالیات کی بے مثال طاقت تھی۔ پھر اُس کی حکومت میں کوئی مخالف پارٹی یا ٹریڈ یونین نہ تھی۔ تمام نظام ایک خاص نظم وضبط کے تحت چل رہا تھا۔ مجلس ردما تمام بشپس کو کنٹرول کرتی تھی۔ بشپ اہل کلیسا کو کنٹرول کرتا تھا اور اہل کلیسا عوام الناس کو کنٹرول کرتے تھے۔ غرضیکہ مختلف قسم کے سیکرٹریٹ، کمیشنوں اور تنظیموں کے ذریعے جاسوسی اور اطلاعات جمع کرنے کا ایک منظم نظام قائم تھا۔

پاپائے روم سے ملاقات کے لئے 15 جنوری 1973ء کی صبح کا وقت طے کیا گیا تھا۔ اسرائیلی وزیراعظم میڈم گولڈا میئر کو آگاہ کردیا گیا تھا کہ ملاقات کا وقت 35 منٹ ہوگا۔ اس کے بعد شخصیات تحائف کا تبادلہ کریں گی۔ اس میٹنگ کے لئے کوئی مقررہ ایجنڈا نہ تھا لیکن گولڈا میئر کو امید تھی کہ وہ پوپ کو اسرائیل کے سرکاری دورے پر آمادہ کرلیں گی۔ اس کی سرکاری وجہ یہ تھی کہ جب پوپ وہاں لاکھوں لوگوں کو بشمول عرب کرسچین کو دیدار دیں گے اور دعائیہ تقریب کا انعقاد کریں گے تو پوری دنیا میں دھوم مچ جائے گی اور اُس کی اپنی مقبولیت میں بھی بے پناہ اضافہ ہوجائے گا۔

سکیورٹی خدشات کی وجہ سے اس میٹنگ کا پہلے سے کوئی اعلان نہیں کیا گیا تھا۔ پیرس میں سوشلسٹوں کی ایک بین الاقوامی کانفرنس میں شرکت کے بعد گولڈا میئر روم کے لئے پرواز کریں گی اور اسرائیلی ائرلائن ایل ال (Elal) کے چارٹرڈ جہاز میں سفر کریں گی۔ دوران پرواز اُن صحافیوں کو جو اُس کے ساتھ سفر کررہے ہوں گے، بتایا جائے گا کہ ہم ویٹیکن جارہے ہیں۔

موساد کا اُس وقت کا سربراہ زدی ضمیر حفاظتی انتظامات چیک کرنے کے لئے بذریعہ ہوائی جہاز روم پہنچا۔ اُس وقت یہ شہر یورپ اور مشرق وسطیٰ کے دہشت گردوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ ... موساد نے بھی اپنے

جدید ترین جاسوسی کے آلات کی مدد سے خفیہ گفتگو سننے اور میونخ اولمپک کے قتل عام کے ذمہ داروں کو ہلاک کرنے کا مرکز بنا رکھا تھا۔

ضمیر نے یہاں اپنے قابل ترین جاسوس مارک ہیسز کو تعینات کر رکھا تھا تا کہ وہ شہر کی بہت بڑی عرب آبادی کو کھنگال سکے۔ میلان شہر میں، جو دہشت گردوں کی سرگرمیوں کا دوسرا بڑا مرکز تھا، موساد کے سربراہ نے وہاں شائی کولی جو ایک نہایت تجربہ کار جاسوس تھا، تعینات کر رکھا تھا۔ جب ضمیر نے دونوں جاسوسوں کو آئندہ ہونے والے دورے کے بارے میں ہدایات دیں تو وہ دونوں ضمیر کے ہمراہ ویٹیکن کو چل پڑے۔

10 جنوری 1973ء کو جبکہ ایک ڈرائیور تینوں کو اپنی گاڑی میں ویٹیکن کی طرف، شہر روم کے اندر سے گزرتے ہوئے لے کر روانہ ہوا تو تینوں کی پوپ کے ایک خفیہ ایجنسی کے ساتھ پرانے تعلقات بارے معلومات اپنے میزبانوں سے بھی زیادہ تھیں۔

روم میں متعین آفس آف دی سٹریٹجک سروس (OSS) جو امریکن انٹیلی جنس ایجنسی سی آئی اے کا پیش رَو شعبہ ہے کے سٹیشن کمانڈر جیمز جیسس اینگلٹن (James Jesus Angleton) کے مطابق 1945ء پوپ پوئس XII اور ان کے ساتھ اینگلٹن سے کہتے تھے کہ وہ کمیونسٹوں اور صلیبیوں کے مخالفین کے مقابلے میں اٹلی میں کرسچین ڈیموکریٹک پارٹی کو برسراقتدار لانے میں ان کی مدد کریں۔ چنانچہ اینگلٹن جو کہ ایک پکا مذہبی کیتھولک تھا، اپنے تمام وسائل جو اُس کے اختیار میں تھے، اٹلی کے ووٹروں کو رشوت دینے، بلیک میل کرنے اور ڈرانے دھمکانے میں لگا دیئے تھے، اُسے ویٹیکن کے اندر، ہر شعبے تک رسائی حاصل تھی اور اٹلی سے ویٹیکن کے نمائندوں اور پادریوں کی خفیہ رپورٹیں بھی اُسے دکھائی جاتی تھیں، جو وہاں کے کمیونسٹوں کی سرگرمیوں کے بارے میں ہوتی تھیں۔ جو رپورٹیں اور خفیہ اطلاعات اینگلٹن تک پہنچتی تھیں وہ انہیں واشنگٹن روانہ کر دیتا تھا۔

وہاں سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ ان خفیہ اطلاعات اور رپورٹوں کے تجزیے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ سوویت یونین، یورپ کے لئے حقیقی خطرہ بن چکا تھا۔ وہاں سے اینگلٹن کو ہدایات جاری کی گئی تھیں کہ وہ اٹلی میں کمیونسٹ پارٹی اور کمیونسٹوں کی تحریک مزاحمت کو ہر قیمت پر برسراقتدار آنے سے روکیں۔ پوپ کی طرح اینگلٹن بھی اس خدشے کا شکار تھا کہ کمیونسٹ دنیا کو دو بلاکوں ''سوشلسٹ'' (Socialist) اور ''کیپٹلسٹ'' (Capitalist) میں تقسیم کر دیں گے جو کبھی بھی پُرامن طور پر نہیں رہ سکیں گے اور یہی بات سٹالن خود بھی کہہ چکا تھا۔

پوپ کو اس بات کا یقین ہو چکا تھا کہ اٹلی کے کمیونسٹ اس بات پر تلے ہوئے تھے اور مہم چلا رہے تھے کہ وہ ہر قیمت پر چرچ کا خاتمہ کر کے دم لیں گے۔ پوپ پوئس اور اینگلٹن کے درمیان ملاقاتیں باقاعدگی سے ہونے لگیں جہاں انہیں کمیونزم کا خطرہ کئی گنا بڑا نظر آتا۔ پوپ ہمیشہ اینگلٹن پر زور دیتا رہتا تھا کہ وہ امریکہ کو کہہ کر اس بڑھتے ہوئے خطرے کا تدارک کرائے۔ مذہبی رہنما جو دنیا میں امن و آشتی کی علامت تھا، امریکی خارجہ پالیسی کا کل پرزہ بنا چاہتا تھا جو سرد جنگ کے بڑھاوے کا باعث بن رہی تھی۔

1952ء تک روم میں سی آئی اے سٹیشن کا انچارج ایک اور کٹر رومن کیتھولک ولیم کولبی (Walliam Colby) تھا جو بعدازاں ویتنام میں سی آئی اے کی سرگرمیوں کا نگران تھا۔ کولبی نے ویٹیکن کے اندر ہر شعبے میں اور سیکرٹریٹ کے ہر حصے میں جاسوسوں اور مخبروں کا ایک محکم نظام قائم کر دیا تھا۔ حتیٰ کہ مذہبی تقریبات اور

ٹریبونل بھی محفوظ نہ تھے۔ اس نے انہیں روس کی جاسوسی اور تخریب کاری کے لئے دنیا بھر میں استعمال کیا۔ دنیا بھر سے پادری ویٹیکن کو حالات کی تبدیلی کی رپورٹیں بھیجتے رہتے تھے۔ فلپین جیسے ملک میں جہاں کی اکثریت سچے کیتھولک عیسائیوں پر مشتمل تھی، کمیونسٹ تخریبی سرگرمیوں میں مصروف تھے۔ وہاں ان کے خلاف سی آئی اے نے نہایت کامیابی سے حملوں کا آغاز کیا۔ پوپ نے اس بدامنی کو ایک اہم ضرورت قرار دے دیا کیونکہ اس کی نظر میں اگر امریکہ یہ سب کچھ نہ کرتا، ''جو اگرچہ ناپسندیدہ لیکن ناگزیر تھا'' تو دنیا نے دہائیوں تک دکھوں اور مصیبتوں میں مبتلا رہنا تھا۔

1960ء میں روم میں سی آئی اے کے سٹیشن کمانڈر کو ایک اور کامیابی اس وقت ملی جب ملان کے کارڈینل مونٹینی نے جو بعدازاں تین سال کے بعد پوپ پال VI بنا، سی آئی اے کو امریکہ میں موجود ایسے پادریوں کی ایک فہرست دی جو ویٹیکن کے خیال میں کمیونزم کے بارے میں نرم گوشہ رکھتے تھے۔ اس وقت سرد جنگ اپنے عروج پر تھی اور واشنگٹن پر ایک جنونی کیفیت طاری تھی۔ ایف بی آئی والے شکاری کتوں کی طرح ان پادریوں کے پیچھے پڑ گئے اور بہت سوں کو ملک چھوڑ کر سینٹرل اور جنوبی امریکہ کی طرف نکل گئے۔ سی آئی اے کے پاس ایسے بھاری خفیہ فنڈ موجود تھے جن سے وہ کیتھولک خیراتی اداروں، سکولوں اور یتیم خانوں کو دل کھول کر امداد دیتے تھے تاکہ وہ اپنے چرچوں اور اداروں کی عمارتوں کی تعمیر و مرمت کرا سکیں جو ویٹیکن کی ملکیت میں تھیں۔ یہ رقوم ''پروجیکٹ منی'' کہلاتی تھیں۔ ان پادریوں اور ننوں کو باتنخواہ چھٹیاں دی جاتی تھیں۔ جن کے بارے میں یقین ہوتا تھا کہ وہ دل و جان سے امریکہ کے وفادار تھے۔ اٹلی کے پادریوں اور بشپ کو شمپین (شراب) کے بکسے اور کھانے پینے کی اشیاء بطور گفٹ بھجوائی جاتی تھیں کیونکہ ملک میں

ابھی تک اشیائے خورد و نوش نایاب تھیں کیونکہ ملک ابھی تک دوسری جنگ عظیم کے اثرات سے باہر نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ویٹیکن کی نظروں میں سی آئی اے کا سٹیشن کمانڈر اٹلی میں امریکن سفیر سے زیادہ اہمیت رکھتا تھا۔

جب 1958ء میں جان XXIII (تیئسواں) پوپ منتخب ہوا تو اس نے کوریا، سول انتظامیہ کو یہ بتا کر پریشان کر دیا کہ کمیونزم کے خلاف صلیبی مہم تقریباً ناکام ہو گئی ہے، لہٰذا اس نے اٹلی کے بشپوں کو حکم دیا کہ وہ سیاسی طور پر غیر جانبداری اختیار کر لیں۔ سی آئی اے اُس وقت آپے سے باہر ہو گئی جب پوپ جان نے حکم دے دیا کہ ویٹیکن میں بیرونی مداخلت فوراً ختم کر دی جائے۔ امریکہ کی جاسوس ایجنسی اس وقت اور بھی سٹپٹا گئی جب اُسے یہ معلوم ہوا کہ پوپ نے خفیہ طور پر سوویت لیڈر (روسی صدر) نیکیتا خروشیف کے ساتھ مذاکرات شروع کر رکھے تھے۔ اٹلی میں سی آئی اے کے سٹیشن کمانڈر کے بقول ویٹیکن اب مکمل طور پر امریکن سسٹم کا محتاج نہیں رہا تھا۔ مقدس پاپائے روم نے امریکہ سے معاندانہ رویہ اپنا لیا تھا لہٰذا ہمیں بھی اب اُس کی سرگرمیوں کے بارے میں ویسا ہی طرزِ عمل اختیار کرنا ہوگا۔

واشنگٹن میں سی آئی اے کے تجزیہ کاروں نے بڑی محنت اور جانفشانی کے ساتھ ایک خفیہ رپورٹ تیار کی جس کو چونکا دینے والے والا یہ عنوان دیا گیا۔ ''ویٹیکن اور کمیونزم کے خفیہ روابط''۔

1963ء کے موسم بہار کے آخر میں اٹلی میں سی آئی اے کے چیف نے یہ رپورٹ واشنگٹن بھجوائی۔ ''پاپائے روم، روس کے ساتھ مکمل سفارتی تعلقات قائم کرنے جا رہا ہے''۔

سی آئی اے کے ڈائریکٹر جنا میک کون نے فوری طور پر جہاز پکڑا اور روم پہنچ گیا اور پھنکارے مارتا ہوا پوپ سے ملنے چلا گیا اور بتایا کہ وہ امریکہ کے پہلے

کیتھولک صدر جان ایف کینیڈی کے اصرار پر ملاقات کے لئے آیا ہے۔ اس نے تحکمانہ لہجے میں پوپ سے کہا۔ ''چرچ فوری طور پر کیمونزم کی طرف اپنے جھکاؤ کو ختم کرے، یہ انتہائی خطرناک اور ناقابل قبول ہے کہ کریملن کے ساتھ تعلقات قائم کئے جائیں۔ کیمونزم ٹروجن ہاؤس ہے، جیساکہ اٹلی میں بائیں بازو (کیمونسٹ) پارٹیوں کی الیکشن میں جیت سے ثابت ہوا ہے۔ حکومت میں آتے ہی کیمونسٹوں نے اُن سب پالیسیوں کا جھٹکا کر دیا ہے جنہیں کیتھولک پارٹیاں سپورٹ کرتی تھیں''۔

مکمل دس منٹ تک میک کون انتہائی جارحانہ انداز میں پھنکارتا رہا، کسی نے اس کی گفتگو میں مداخلت نہیں کی۔ آخرمحل کے دربار عام میں خاموشی چھاگئی۔ کئی لمحوں تک بوڑھا پوپ اپنے لمبے تڑنگے ''تارک الدنیا'' مہمان کا جائزہ لیتا رہا۔ پھر جان نے انتہائی نرم لہجے میں وضاحت کی کہ جس چرچ کی وہ قیادت کررہا ہے اس کا ایک فوری ''فرض'' ہے۔ ذلیل غربت کا خاتمہ اور انسانی حقوق کی حفاظت، جنگلی جھونپڑوں اور کچی آبادیوں کا خاتمہ، اسی نسل پرستی اور سیاسی دباؤ کا قلع قمع۔ وہ ہراُس شخص، حکومت یا طاقت سے گفتگوکرنے کو تیار ہے جو ان مقاصد کے حصول میں اس کی مدد کرے، بشمول سوویت یونین۔ کیمونزم کے چیلنج کا مقابلہ کرنے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ دلیل اور حجت سے اُس کا سامنا کیا جائے۔

اس پر میک کون اپنے غصے پر مزید قابو نہ رکھ سکا اور بولا۔ ''میں یہاں بحث ومباحثہ کرنے نہیں آیا''۔ سی آئی اے کے پاس بے شمار ایسے ثبوت موجود تھے کہ جب پوپ ماسکو کے ساتھ اپنے تعلقات کو بہتر بنانے کی کوشش کررہا تھا، کیمونزم سوویت بلاک میں پادریوں کو سزائیں دے رہا تھا اور یہی کچھ ایشیا اور جنوبی امریکہ میں ہورہا تھا۔ پوپ جان نے کہا کہ سوویت روس سے بہتر تعلقات قائم کرنے کا یہ بھی ایک سبب تھا۔ شکست خوردہ میک کون یہ احساس لے کر واپس واشنگٹن چلا گیا کہ ''اپنے پیشرووں کی نسبت جان پال، کیمونزم کے بارے میں سب سے زیادہ نرم گوشہ رکھتا تھا''۔

پوپ جان کی غیر متوقع موت سے کیونکہ وہ تیزی سے پھیلنے والے کینسر میں مبتلا تھا، میک کون اور صدر کینیڈی نے اطمینان کا سانس لیا تھا۔

جب میلان کا مونٹینی پال ششم کے نام سے پوپ بنا تو واشنگٹن میں بڑے اطمینان کا اظہار کیا گیا۔ 1963ء کے آخر میں اپنی حلف برداری کے دو روز بعد نئے پوپ نے تخلیئے میں صدر امریکہ کینیڈی سے ملاقات کی۔ میک کون باہر، ویٹیکن کے باغیچے میں اس طرح چہل قدمی کررہا تھا جیسے ان زمینوں کا مالک ایک عرصے کے بعد گھر لوٹا ہو۔

پال کی لمبی پاپائیت اُس کی صحت کی خرابی اور بین الاقوامی سطح پر ویتنام جنگ کی وجہ سے مرجھانے لگی تھی۔ اُن کو یقین تھا کہ امریکی صدر لنڈن بی جانسن نے 1966ء میں ویتنام کی جنگ میں تیزی لانے کا جوحکم دیا تھا وہ غلط تھا اور عیسائیت کے روحانی پیشوا کو بحالی امن کے لئے کردار ادا کرنا چاہئے تھا۔ امریکہ میں برسراقتدار آنے کے تین مہینے بعد رچرڈ نکسن پوپ سے ملنے کے لئے ہوائی جہاز سے روم پہنچا۔ صدر نے پوپ کو بتایا کہ اس کی تجویز ہے کہ ویتنام میں اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرے۔ ایک دفعہ پھر ویٹیکن سے سی آئی اے کو کوئی حمایت نہ مل سکی۔

یہ سارا قصہ کہانی موساد کے سربراہ زوی ضمیر نے اپنے واشنگٹن کے ایجنٹ سے سنا تھا۔ اب جبکہ موساد کے چوٹی کے جاسوس ویٹیکن کی طرف محوسفر تھے تاکہ گولڈا میئر کی سیکیورٹی کے انتظامات کو چیک کریں۔ 10 جنوری 1973ء کی اس خوشگوار صبح کو زوی ضمیر کو یقین تھا کہ

وزیراعظم گولڈا میئر کے اس دورے کے بعد امریکن سی آئی اے کی جگہ ویٹیکن کے انٹیلی جنس کے معاملات میں موساد کا عمل دخل شروع ہو جائے گا۔

پوپ کے محل کے دروازے پر ان کے انتظار میں ویٹیکن کی سکیورٹی کا انچارج، ایک دراز قد سنجیدہ چہرے والا، گہرے نیلے رنگ کے سوٹ میں ملبوس، جو ویٹیکن سکیورٹی سروس کی یونیفارم کا رنگ تھا، منتظر کھڑا تھا۔ وہ کئی گھنٹوں تک تینوں جاسوسوں کو ویٹیکن کی اندرونی ننھی منی ریاست میں گھماتا پھراتا رہا تاکہ وہ اطمینان کر سکیں کہ کہاں کوئی عرب بندوق بردار چھپ سکتا تھا تاکہ گولڈا میئر کو ہلاک کر سکے۔ ویٹیکن کے سکیورٹی چیف کی نظر بچا کر زوی ضمیر ایسی جگہوں کا انتخاب بھی کرتا جا رہا تھا جہاں انٹیلی جنس روابط بحال ہونے کی صورت میں بگنگ ڈیوائسز، جاسوسی کے آلات نصب کئے جا سکیں۔ ویٹیکن سٹیٹ کے سکیورٹی انتظامات کو تسلی بخش پا کر زوی ضمیر واپس تل ابیب پرواز کر گیا۔ اہم بات یہ تھی کہ اس نے پوپ کے رویے میں اسرائیل کے متعلق نرمی محسوس کی تھی۔

قبل اس کے کہ زوی ضمیر کا جہاز اسرائیل میں اترتا، گولڈا میئر کے دورے کی تمام تفصیل ''بلیک ستمبر'' کے ہاتھوں میں تھی جو ہمکنہ طور پر سیکرٹریٹ میں کام کرنے والے عربوں کے ہمدرد کسی پادری نے افشاء کی تھیں۔ علی حسن سلامیح کے لئے، جو بلیک ستمبر نامی دہشت گرد گروپ کا لیڈر تھا اور جس نے اولمپک گیمز کے دوران اسرائیلی کھلاڑیوں کے قتل عام کی منصوبہ بندی کی تھی، اگرچہ اس حادثے کے بعد موساد سے چھپتا پھر رہا تھا لیکن وہ گولڈا میئر کے اس دورے کو نظرانداز نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے منصوبہ بندی کی گولڈا میئر کے جہاز کو روم کے لیونارڈ دوانسی ائرپورٹ پر اترتے وقت میزائل مار کر تباہ کر دیا جائے۔ اس کو امید تھی کہ اس طرح وہ نہ صرف اسرائیلی وزیراعظم کو ہلاک کرے گا بلکہ اس کے ساتھ آنے والے وزراء، حکومت کے سینئر حکام اور جہاز میں جو موساد کے اہم ارکان بھی اس کا شکار بنیں گے۔ سلامیح کو امید تھی کہ قبل اس کے اسرائیل اس ضرب شدید کے گہرے صدمے سے باہر نکلتا وہ روس کی مہیا کردہ خفیہ پناہ گاہوں میں جا چھپیں گے جس کے بارے میں روس سے بات چیت چل رہی تھی۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد جو نئی نسل پیدا ہوئی اس نے 1968ء سے مختلف تنظیموں کے نام سے سوسائٹی کے خلاف جنگ شروع کر رکھی تھی، ان میں اٹلی کی ''ریڈ بریگیڈ''، جرمنی کی ''ریڈ آرمی فیکشن''، ترکی کی ''پیپلز لبریشن آرمی''، سپین کی ای ٹی اے اور فلسطین کی پی ایل او روس نے ان کی اہمیت کو تسلیم کر رکھا تھا اور امپیریلزم کی تباہی کے لئے ان کی امداد کرتا تھا اور اسرائیل کے خاتمے کے لئے بھی۔

عرب دہشت گردوں کے اس گروپ کو روس کی انٹیلی جنس ایجنسی کے جی بی (KGB) کی مدد اور تعاون حاصل تھا، اس لئے دوسروں کی نسبت یہ گروپ زیادہ دلیر، غدر اور تباہی مچانے میں کامیاب تھا۔ اب اس کا واسطہ موساد سے تھا جس کے بارے میں دونوں دہشت گرد اور کے جی بی کو معلوم تھا کہ خفیہ کارروائیاں کرنے میں اور بے رحمی میں اس کا کوئی مدمقابل نہیں تھا۔ کے جی بی نے سب سے پھرتیلے اور تیز طرار عرب دہشت گردوں کی تربیت اور ٹریننگ کا پٹرائس لومبا یونیورسٹی، ماسکو میں انتظام کیا تھا۔ یہ کوئی معمولی قسم کا کیمپس نہ تھا بلکہ دہشت گردوں کی ٹریننگ کا جدید ترین ادارہ تھا۔ جہاں انہیں نہ صرف دنیا بھر میں ہونے والی سیاسی تبدیلیوں سے آگاہ کیا جاتا تھا بلکہ کے جی بی کے ایجاد کردہ جدید ترین آلات کے استعمال، اپنے ہدف کے انتخاب اور قتل کے نئے طریقوں کی ٹریننگ بھی دی جاتی تھی۔ اسی کیمپس

میں سلامیح نے میونخ میں اسرائیل کے کھلاڑیوں کے قتل کے منصوبے کو آخری شکل دی تھی۔ اس کامیاب کارروائی کے بعد گروپ کے زندہ بچ رہنے والے ممبروں نے روس سے خفیہ پناہ گاہ کی درخواست کی تھی لیکن اس واقعہ کے بعد دنیا بھر میں اتنی کھلبلی مچ گئی تھی کہ اب کریملن بھی انہیں اپنے ہاں چھپانے میں ہچکچاہٹ کا اظہار کر رہا تھا۔ اس نے سلامیح اور اس کے ساتھیوں کو بتا دیا تھا کہ ان کی سیاسی پناہ کی درخواست زیر غور تھی۔

تاہم روس نے موساد کی طرف سے میونخ کے قتل عام کے ذمہ داروں کی تلاش کے دوران کسی قسم کا تعاون نہیں کیا تھا اور نہ ہی اس بات کا انکشاف کیا تھا کہ دہشت گردوں نے ایک روسی میزائل یوگوسلاویہ میں چھپا رکھا تھا، ''بلیک ستمبر'' نے اسے گولڈا میئر کے طیارے کو مار گرانے کے لئے استعمال کرنا تھا۔

یہ منصوبہ بھی سلامیح کے دیگر منصوبوں کی طرح انتہائی سادہ لیکن دلیرانہ تھا۔ میزائل کو یوگوسلاویہ کی بندرگاہ ڈبرونک سے کشتی میں چھپا کر اٹلی کی بندرگاہ ''باری'' (Bari) جو روم کے مشرق میں واقع تھی، لایا جانا تھا۔ وہاں سے سڑک کے ذریعے گولڈا میئر کے جہاز کی آمد سے کچھ ہی دیر پہلے، روم لایا جانا تھا۔ سلامیح کو پٹرانس یونیورسٹی میں یہ اہم سبق یاد کرا رکھا تھا کہ دشمن کی توجہ ہمیشہ ہدف سے کسی طرف الجھائے رکھو۔ سلامیح کے لئے ضروری تھا کہ موساد کی تمام تر توجہ روم کی بجائے کسی اور طرف لگا دے۔

28 دسمبر 1972ء کو بلیک ستمبر کے ایک گروپ نے بنکاک میں واقع اسرائیلی سفارتخانے پر حملہ کر دیا۔ سفارتخانے کی عمارت پر پی ایل او کا پرچم لہرا دیا گیا اور چھ اسرائیلیوں کو یرغمال بنا لیا گیا۔ فوراً بعد ہی پانچ سو کے قریب تھائی پولیس اور فوجیوں نے عمارت کے گرد گھیرا ڈال لیا۔ دہشت گردوں نے مطالبہ کیا کہ اسرائیل اپنی جیلوں سے پی ایل او کے چھتیس قیدیوں کو فوری رہا کرے ورنہ وہ یرغمال بنائے گئے اسرائیلیوں کو قتل کر دیں گے۔

اُدھر تل ابیب میں دوانتی کارروائی کا آغاز ہو گیا۔ کابینہ کا ہنگامی اجلاس بلایا گیا جس میں یہ بحث شروع ہو گئی کہ اپنے آپ کو ثابت قدم دکھایا جائے یا دہشت گردوں کے آگے سر جھکا کر ان کا مطالبہ مان لیا جائے۔ موساد کے سربراہ زوی ضمیر نے بتایا کہ بنکاک جانے کے لئے لاجسٹک سپورٹ ضروری ہے لیکن وہ اس لمبے روٹ پر موجود نہیں ہے۔ اسرائیلی سفارتخانہ بنکاک شہر کے مرکز میں واقع ہے اور تھائی حکومت کسی صورت یہ برداشت نہیں کرے گی کہ وہاں ایک گولی بھی چلے۔ تب غیر متوقع طور پر تھائی افسروں کے ساتھ مختصر مذاکرات کے بعد اس بات پر آمادہ ہو گئے کہ انہیں یرغمالیوں کی رہائی کے بدلے ملک سے بحفاظت نکل جانے دیا جائے گا۔ ایک گھنٹے بعد ہی بلیک ستمبر کے دہشت گرد قاہرہ کی طرف محوِ پرواز تھے جہاں پہنچ کر وہ سب غائب ہو گئے۔

تل ابیب میں ضمیر کا یہ اطمینان کہ کوئی اسرائیلی بنکاک میں ہلاک نہیں ہوا، شک و شبے میں بدل گیا۔ بلیک ستمبر گروپ کے ارکان انتہائی تربیت یافتہ اپنے مقصد کے حصول کے لئے پختہ کار اور مالی طور پر کسی کے محتاج نہ تھے اور ثابت کر چکے تھے کہ اپنی حربی تدابیر میں انتہائی مکار اور ہوشیار تھے۔ انہیں کسی حکومت پر دباؤ ڈال کر گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کرنے سب طور طریقے آتے تھے۔ سو اس دفعہ وہ اتنی جلدی ہمت کیوں ہار گئے؟ بنکاک سفارتخانے پر قبضہ دنیا بھر میں شہرت حاصل کرنے اور اپنے مقاصد کے لئے دنیا بھر کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لئے بہترین موقع تھا۔ اُن کا یہ ہدف یونہی بے سوچے سمجھے نہ تھا۔ یقینی طور پر گروپ جو بھی کارروائیاں کرتا تھا ان کے پیچھے ایک واضح اور سوچا سمجھا حملہ ہوتا تھا۔ سفارتخانے کی عمارت کے اندر وہ اپنے گورو چی گویرا (Guru Che

(Guevara کی اس ہدایت پر عمل پیرا تھے کہ دشمن سے نفرت کو اپنی انتہاؤں پر رہنا چاہئے۔ چنانچہ سفارتخانے کے اندر یرغمالیوں کو یہودیوں سے سخت قسم کی نفرت کا نشانہ بنایا جاتا رہا تھا۔ کیا سب کچھ ایک دکھاوا اور ڈرامہ ہی تھا؟ یا واقعی ان کے طرز عمل میں کسی تبدیلی کا اشارہ تھا؟ کیا دنیا میں کسی دوسری جگہ اسرائیل کے خلاف آپریشن کی منصوبہ بندی کی جا رہی تھی؟ کب اور کہاں؟ ضمیر کے دل و دماغ میں ابھی یہی سوالات گردش کر رہے تھے کہ اُسے گولڈا میئر، وزیر اعظم اسرائیل کے ساتھ پیرس کی کانفرنس کے لئے محو پرواز ہونا پڑا۔ وہاں سے بھی وہ ان سوالات کے جوابات کی کھوج میں جتا رہا۔

14 جنوری 1973ء کو صبح سویرے جواب مل گیا۔ محکمہ ٹیلی فون کے روم کے سینٹرل ایکسچینج میں کام کرنے والے ایک اسرائیلی ایجنٹ نے ایک ایسے علاقے کے پے فون سے دو کالیں پکڑیں جہاں اکثر عرب اور فلسطینی دہشت گرد آ کر ٹھہرا کرتے تھے۔ پہلی کال باری کو تھی اور دوسری اوستیا کو۔ دونوں کالیں عربی زبان میں تھیں جو اسرائیلی ایجنٹ جانتا اور سمجھتا تھا۔ ٹیلی فون کرنے والے نے کہا۔ ”یہ مناسب وقت ہے کہ یوم پیدائش کی موم بتیاں حوالے کر دی جائیں تاکہ برتھ ڈے کی خوشی منائی جا سکے“۔

ضمیر فوراً سمجھ گیا کہ یہ ایسے کوڈ ورڈ ہیں جن میں تازہ اور فوری دہشت گردی کے حملے کا حکم دیا گیا تھا۔ یوم پیدائش کی شمعوں سے مراد ہتھیار ہو سکتے تھے۔ کینڈل کا مفہوم ایک راکٹ بھی ہو سکتا تھا اور ایک ہی ایسا مکمل اور بہترین ہتھیار ہو سکتا تھا جس سے گولڈا میئر کا جہاز تباہ کیا جا سکتا تھا۔

گولڈا میئر کو انتباہ کرنا فضول تھا، وہ ایک ایسی عورت تھی، خوف و خطر جس کے پاس سے بھی نہیں گزرتا تھا۔ ویٹیکن کو آگاہ کرنے سے یہ دورہ ہی منسوخ ہو سکتا تھا اور آخری بات یہ تھی کہ پوپ کے اپنے عرب دوستوں سے تعلقات متاثر ہو سکتے تھے۔

ضمیر نے ہیسنر اور کولی کو ٹیلیفون کیا۔ یہ دونوں جاسوس اُس کے ساتھ ویٹیکن کے حفاظتی انتظامات کا جائزہ لینے گئے تھے۔ اُس نے کولی کو میلان سے بلا کر روم میں متعین کر دیا۔ پھر ضمیر نے اپنے موساد کے ایجنٹوں کی مختصر ٹیم، جو گولڈا میئر کے ساتھ سفر کر رہی تھی، لے کر پہلے ہی روم پہنچ گیا۔ اس کی حس مزاح اس کے اس ایک فقرے سے عیاں تھی۔ ”یہ شہر گولڈا میئر کی بقائے دوام کا موجب بن سکتا ہے“۔

روم میں ضمیر نے اپنے خطرات کا اظہار اٹلی کی انسداد دہشت گردی کی تنظیم ڈگیوز (Dgos) سے کیا۔ ڈگیوز کے افسروں نے اپارٹمنٹ بلاک کے اُس علاقے میں ریڈ کیا جہاں سے فون کالیں باری اور اوستیا کو کی گئی تھیں۔ ایک مکان کی تلاشی کے دوران اُن کے ہاتھ روس کا میزائل چلانے کے بارے میں ہدایت نامہ یا انسٹرکشن مینول لگ گیا۔ پوری رات ڈگیوز کے افسر، موساد کے جاسوسوں کو ساتھ لے کر علاقے کے فلسطینیوں کے گھروں پر چھاپے مارتے اور تلاشیاں لیتے رہے لیکن مزید کوئی چیز نہ مل سکی جس سے ضمیر کے خدشات کی تصدیق ہوتی۔ صبح صادق کے وقت اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ائرپورٹ اور اس کے گرد و نواح پر اپنی تمام تر توجہ مبذول رکھے گا کیونکہ گولڈا میئر کے جہاز کی آمد میں چند گھنٹے ہی باقی رہ گئے تھے۔

طلوع آفتاب کے کچھ ہی دیر بعد ہیسنر (Hessner) کو، جہاز کے اترنے کے راستے سے تھوڑی دور کھیتوں میں ایک فیٹ وین کھڑی نظر آ گئی۔ اس نے ڈرائیور کو حکم دیا کہ وہ کیبن سے باہر نکلے۔ ڈرائیور کی بجائے اچانک پچھلا دروازہ کھلا اور گولیوں کی ایک بوچھاڑ آئی۔ ہیسنر تو اپنے آپ کو بچا گیا لیکن اس کی

جوابی فائرنگ سے وین کے پیچھے کھڑے دو دہشت گرد بُری طرح زخمی ہو گئے۔ ہیسنر نے بھاگتے ہوئے ڈرائیور کو اُس قابو کر لیا جبکہ وہ اس کار کو اغوا کرنے کی کوشش کر رہا تھا جسے کوئی چلا کر لایا تھا۔ دونوں جاسوسوں نے بدقسمت دہشت گرد کو باندھ کر کار میں ڈالا اور تیزی سے ڈرائیو کرتے ہوئے اس جگہ آ گئے جہاں ضمیر نے اپنی عارضی کمانڈ پوسٹ بنا رکھی تھی جو کہ ایک ٹرک تھا۔

موساد کے سربراہ کو ریڈیو کے ذریعے پہلے ہی اطلاع مل چکی تھی کہ دین کے اندر چھ راکٹ موجود تھے۔ اب وہ یہ جاننا چاہتا تھا کہ کہیں دوسری جگہ پر تو کوئی ایسی صورت حال موجود نہیں ہے؟ دین ڈرائیور کی بے رحمی سے پٹائی اور ٹھکائی کی گئی تب اس نے دوسری جگہ پر راکٹوں کی موجودگی بارے انکشاف کر دیا۔ ضمیر کو شک تھا کہ یہ ڈرائیور بھی اُن لوگوں میں سے ایک تھا جنہوں نے میونخ اولمپک کے دوران اسرائیلی کھلاڑیوں کے قاتلوں کی مدد کی تھی۔ تینوں، ضمیر، ہیسنر اور کولی اور تینوں کے درمیان نیم مردہ دہشت گرد، انتہائی تیز رفتاری سے ٹرک بھگاتے ہوئے شمال کی جانب دوڑے۔

انہیں سڑک کنارے کھڑی ایک دوسری وین نظر پڑی۔ وین کی چھت میں تین میزائلوں کی نوزلی بلاشک و شبہ باہر کو جھانک رہی تھیں اور اسی طرح بلاشک و شبہ سورج کی روشنی میں گولڈا میئر کے جہاز 747 کے نشانات دکھائی دے رہے تھے جو بلندی سے نیچے آ رہا تھا۔ ضمیر نے اپنا ٹرک پوری رفتار سے وین سے ٹکرا دیا۔ میزائل وین کے اندر گر پڑے اور اندر بیٹھے دو دہشت گرد ان سے کچلے گئے۔

زخمی اور نیم بے ہوش ڈرائیور کو وین کے قریب ہی سڑک پر پھینک کر ضمیر اپنا ٹرک لے کر آگے بڑھ گیا تاہم ڈیگوز کو خبردار کر دیا کہ اس جگہ ایک دلچسپ حادثہ ہوا ہے وہ آ کر اس کا جائزہ لے لیں۔ ضمیر نے پہلے سوچا تھا کہ دہشت گردوں کو قتل کر دیں لیکن پھر اس نے اس خیال سے اپنا ارادہ بدل دیا کہ اس سے گولڈا میئر کو پوپ کے سامنے شرمندگی اٹھانی پڑے گی۔ (کہ موساد کے لوگ دوسرے ملکوں اور شہروں میں مخالفین کو قتل کرتے پھر رہے ہیں)

پوپ سے ملاقات کے بعد گولڈا میئر کا احساس تھا کہ دنیا بھر کی بھاری ذمہ داریوں کے بوجھ نے اس کے کندھوں کو جھکا دیا تھا اور اس کا سرخ و سفید رنگ ماند پڑ چکا تھا۔ اس نے کہا کہ وہ سرزمین مقدس (یروشلم) کا دورہ کرے گا اور مقامات مقدسہ کی زیارت کو اپنی خوش قسمتی سمجھے گا۔ جب گولڈا میئر نے پوچھا کہ اسرائیل کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم کرنے کے بارے میں اس کا کیا ارادہ تھا تو پوپ نے گہری سانس لی اور جواب دیا۔ ''موجودہ وقت اس کے لئے مناسب نہیں ہے''۔ گولڈا میئر نے پوپ کو چمڑے کی جلد میں محفوظ کیا ہوا ارضِ مقدس کا نقشہ اور تاریخ کی کتاب پیش کی۔ جواب میں پوپ نے اسرائیلی وزیراعظم کو پاپائیت بارے تاریخی کتاب کا تحفہ پیش کیا۔

ویٹیکن سے باہر آتے ہوئے گولڈا میئر نے ضمیر کو بتایا کہ پوپ کے پاس جو کلاک تھا وہ پوری دنیا سے مختلف تھا۔

دہشت گرد تنظیم بلیک ستمبر کے زخمی ارکان کو جو میونخ اولمپک گیمز کے دوران اسرائیلی کھلاڑیوں کے قتل میں بھی ملوث تھے کو ہسپتال لے جایا گیا اور جب وہ صحت یاب ہو گئے تو پرواز کر کے لیبیا جانے کی اجازت دے دی گئی لیکن چند ماہ میں ہی وہ سب موساد کے قاتلوں کے ہاتھوں مارے گئے۔

بائبل کا یہ قول کہ ''آنکھ کے بدلے آنکھ'' کی سزا کو پوپ پال نے اپنی مدت اقتدار میں نظرانداز کرتے ہوئے صرف معاف کرنے پر زور دیا، اس لئے گولڈا میئر

نے پوپ سے فاصلہ رکھنے کا حکم دیا۔ اس کے پی ایل او سے اس نے اپنے تعلقات مضبوط بنانے کا عمل بھی جاری رکھا اور پھر یہی پالیسی نئے پوپ جان پال دوم نے 1978ء میں اپنے انتخاب کے بعد بھی جاری رکھی۔

اس کے بعد پوپ جان پال نے متعدد بار یاسر عرفات اور اس کے قریبی ساتھیوں سے طویل ملاقاتیں کیں اور ہر دفعہ اپنے اس عزم کو دہرایا کہ وہ فلسطینی ریاست کے قیام کے لئے اپنی کوششیں جاری رکھے گا۔ پی ایل او نے اب اپنا مرکز تیونس میں قائم کرلیا تھا اور اس کا ایک رابطہ دفتر ویٹیکن سٹیٹ کے سیکرٹریٹ میں قائم تھا اور اسی پوپ کا نمائندہ فادر عیدی عیاض تنظیم کے ساتھ رابطہ رکھتا تھا۔

اپنے مخصوص سیاہ لباس میں ملبوس عیاض، دونوں پوپ اور یاسر عرفات کی یکساں وفاداری اور خلوص سے خدمت کرتا تھا۔ اس نے 1980ء میں عرفات کی ایک خط لکھنے میں مدد کی تھی جس میں یاسر عرفات نے پوپ کو لکھا تھا۔

"براہ کرم مجھے ایسا خواب دیکھنے کی اجازت دیجئے کہ آپ فلسطینی مہاجرین کی ارضِ مقدس میں واپسی کی قیادت کرتے ہوئے یروشلم تشریف لا رہے ہیں اور لوگ زیتون کی شاخیں آپ کے قدموں کے نیچے بچھاتے جا رہے ہیں"۔

عیاض نے دونوں رہنماؤں کو یہ تجویز پیش کی تھی کہ وہ ایک دوسرے کے مقدس ایام کے مواقع پر ایک دوسرے کو تہنیت اور مبارک باد کے پیغامات ارسال کیا کریں۔ چنانچہ یاسر عرفات نے جان پال کو کرسمس کارڈ بھیجنا شروع کر دیا تھا جب کہ جواب میں پوپ نے پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے یوم پیدائش پر مبارکباد کا پیغام دینا اپنے اوپر لازمی کرلیا تھا۔ ان تھک اور محنتی فادر عیاض کی کوششوں سے ہی پی ایل او کے وزیر

مقامِ شرم

دنیا میں ہر پانچواں انسان مسلمان ہے۔ ایک یہودی کے مقابلے پر 107 مسلمان ہیں تو دوسری طرف عہدِ حاضر کی تاریخ کے موورز اینڈ شیکرز میں سے کوئی ایک بھی مسلمان کیوں نہیں؟ البرٹ آئن سٹائن، سگمنڈ فرائڈ، کارل مارکس اور ملٹن فریڈ مین ویکسی نیٹنگ سوئی سے لے کر پولیو ویکسین تک، خون کے سرطان سے ہیپاٹائٹس سی کے علاج تک، گردوں کے ڈیالیسس، نیورو سیکولر وغیرہ سے کے موجد یہودی ہیں۔ گزشتہ 105 سال میں 80 یہودیوں نے نوبل پرائز لئے جبکہ سینکڑوں گنا زیادہ مسلمانوں کے حصے میں صرف 3 نوبل پرائز آئے۔ (دستگیر شہزاد)

خارجہ اور ویٹیکن کے خارجہ امور کے انچارج کارڈینل کاسارولی کے درمیان مذاکرات ممکن ہوئے تھے۔ اس کے بعد ہی یہ ممکن ہوا تھا کہ پوپ نے دنیا بھر میں اپنے سفیروں کو حکم دیا تھا کہ وہ اپنے متعلقہ ممالک کی حکومتوں کو پی ایل او کی حصولِ وطن کی کوششوں میں سپورٹ اور مدد پر آمادہ کریں۔ پوپ کے یہ سب اقدامات اسرائیل کے لئے باعثِ خوف اور تشویش تھے۔ اُس کے ویٹیکن کے روابط بہت محدود تھے اور اگر کوئی سرکاری افسر ویٹیکن کا دورہ کرتا بھی تھا تو پوپ کی خدمت میں حاضری کے لئے اُسے صرف چند منٹ ہی دیئے جاتے تھے۔

دونوں طرف کے تعلقات میں سرد مہری کا آغاز اسرائیل کی 1948ء میں پیدائش کے فوراً بعد ہی ایک معمولی حادثے سے ہوگیا تھا۔ ویٹیکن کے اس وقت کے سیکرٹری آف سٹیٹ نے اپنا ایک سفارتی نمائندہ اسرائیل کے اٹارنی جنرل ہائم کوہن (Haim Cohn) کے پاس اس درخواست کے ساتھ بھیجا تھا کہ اسرائیل کرائسٹ (حضرت عیسیٰؑ) کے خلاف مقدمے پر نظرِ ثانی کر کے

فیصلے کو منسوخ کرے۔ اگر اسرائیل یہ کرے گا تو جواب میں ویٹیکن اسرائیل کو باقاعدہ جائز ریاست تسلیم کرلے گا۔ کوہن کو اس اہم سفارتی تعلق کا کوئی احساس نہ تھا اور اس کا جواب بھی بڑا غیر ذمہ دارانہ اور سفارتی ادب و آداب سے عاری تھا۔ ''ایسا ٹرائل بے معنی اور فضول ہے۔ ہمارے پاس زیادہ اہم معاملات حل طلب پڑے ہیں۔ ہمیں اپنی بقاء کے لئے اپنے ہمسایہ عربوں کو ختم کرنا ہے۔ کرائسٹ کی ہڈیوں کو کھڑکھڑانا اور ان کی سوانح کو پھرولنا ہماری ترجیحات میں بہت نیچے کی چیز ہے''۔

سفارتی نمائندے کو کوہن کی طرف سے جس توہین آمیز سلوک کے ساتھ رخصت کیا گیا تھا اس کے بعد ویٹیکن نے اسرائیل سے منہ موڑ لیا تھا۔

اس کے بعد ویٹیکن اور اسرائیل کے درمیان سفارتی تعلقات قائم کرنے کی صرف امید ہی زندہ رہی لیکن تعلقات قائم نہ ہو سکے۔ تاوقتیکہ جان پال کے جانشین فریل البینو لوسیانو (Albino Luciano) جسے صرف 33 دن ہی سینٹ پیٹر کے تخت پر بیٹھنے کا موقع مل سکا، اشارتاً کہا تھا کہ وہ اسرائیل کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم کرنے کے بارے میں سوچے گا لیکن وہ جلد ہی اپنی ذمہ داریوں کے بوجھ تلے دب کر ہارٹ اٹیک کا شکار ہو گیا۔ اس کے بعد الیکشن کے نتیجے میں کیرول وجٹیلا پوپ منتخب ہو گیا۔ اس کی پاپائیت کے دور میں ویٹیکن کے تانبے کے دروازے اسرائیل کے لئے مزید سختی سے بند ہو گئے۔

پوپ نے بین الاقوامی سیاسی معاملات میں زیادہ ملوث کر لیا اور امریکن سی آئی اے سے بھی نئے سرے سے رابطے قائم ہو گئے۔

1981ء میں ایک کٹر کیتھولک عیسائی ولیم کیسی (Walliam Casey) سی آئی اے کا ڈائریکٹر تھا۔ وہ ان اوّلیں لوگوں میں سے تھا جنہیں نئے پوپ نے اپنا دیدار کرایا اور تخلیئے میں ملاقات کی۔ کیسی نے پولش پوپ کے سامنے گھٹنے کے بل جھک کر اس کی فشر مین رنگ کو بوسہ دیا۔ سی آئی اے کا ڈائریکٹر ہر لحاظ سے ایک عاجزی و انکساری کا نمونہ نظر آتا۔ برعکس، اپنے پیشروؤں کے جو نک چڑھے، تند خو اور تکبر و غرور کا مجسمہ نظر آتے تھے لیکن کیسی بھی کمیونزم کے خوف کی وجہ سے پوپ پر مکمل بھروسہ کرنے کو تیار نہ تھا۔ (کیونکہ پولینڈ کمیونسٹ ملک تھا)۔

دونوں شخصیات نے تنہائی میں ایک گھنٹہ تک اپنے اپنے پسندیدہ موضوعات پر گفتگو کی۔ اب پوپ کی سیاست کیا رخ اختیار کرے گی؟ پولینڈ کی حکومت بلکہ پورا سوویت بلاک، چرچ میں آنے والی تبدیلیوں پر کیا ردِعمل ظاہر کرے گا؟ کیسی ملاقات کے کمرے سے یہ تاثر لے کر نکلا کہ جان پال وہ پوپ تھا جس سے کسی قسم کی مراعات حاصل کرنا آسان نہ تھا۔ اسی چیز نے اسے ایک سحر انگیز شخصیت بنا دیا تھا۔ اس کے ایمان کی پختگی ہی سٹالن کے اس گھسے پٹے سوال کا جواب تھا کہ پوپ کے پاس کتنے ڈویژن (فوج) ہے۔ کیسی کو یقین تھا کہ جان پال نے ثابت کر دیا تھا کہ ایمان کی طاقت فوجی قوت سے بڑی طاقت ہے۔

کیسی اپنی رپورٹ صدر ریگن کو دینے کے لئے واپس واشنگٹن چلا گیا۔ صدر نے سی آئی اے کے ڈائریکٹر کو حکم دیا کہ وہ واپس روم جائے اور پوپ کو بتائے کہ ایک ''خفیہ انتظام'' کے تحت، جس کی صدر نے منظوری دی ہے، آج کے بعد امریکہ کی ہر سیاسی، اقتصادی اور ملٹری پالیسی کے بارے میں پوپ کو پوری طرح آگاہ رکھا جائے گا۔

اس کے بعد ہر جمعہ کی شام کو روم میں سی آئی اے کا چیف دنیا جہان سے سٹیلائٹ سننے والے الیکٹرانک ذرائع اور فیلڈ ایجنٹوں کی بھیجی ہوئی خفیہ معلومات و اطلاعات کو لے کر پوپ کے محل میں حاضری دے کر پیش کرتا تھا۔ دنیا کے کسی دوسرے رہنما کو جاسوسی اور سراغ رسانی کی ایسی

معلومات تک رسائی حاصل نہ تھی جیسی کہ پوپ کو حاصل تھی۔ اس سے پوپ اس قابل ہو گیا کہ نہ صرف چرچ کو اپنے سیاسی اثرات سے متاثر کر سکے بلکہ سیکولر دنیا پر بھی اپنا اثر ڈال سکے۔ اس طرح پوپ جدید دور کا سب سے بااثر سفارتی، سیاسی اور مذہبی رہنما بن کر دنیا کے ہر چھوٹے بڑے معاملے پر اثر انداز ہونے لگا اور ویٹیکن کی بیورو کریسی اپنی پانچ سو سالہ تاریخ کی سب سے زیادہ فعال، مؤثر اور متحرک و منظم شکل اختیار کر گئی، جو دنیا کے ہر اہم معاملے پر اثر انداز ہونے لگی تھی۔ دنیا کے معاملات میں پوپ کی یہی سرگرمیاں آخر کار تقریباً سینٹ پیٹر سکوائر میں، 13 مئی 1981ء کو اس کے قتل پر منتج ہونے لگی تھیں۔

تقریباً دو سال کے بعد 15 نومبر 1983ء کو جب کہ روم شہر کہر اور سردی کی دبیز چادر اوڑھے ہوئے تھا، پوپ جان پال کو، اپنے دماغ میں کلبلانے والے اس سوال کا جواب مل گیا کہ ''میرے قتل کا حکم کس نے دیا تھا؟'' اس واقعہ کا ایک ایک لمحہ پوپ کے دل و دماغ میں تا حال تازہ تھا اور اپنے جسم میں پیوست ہونے والی گولی کا زخم اسے اس ہولناک لمحے کی یاد تازہ کرتا رہتا تھا۔

13 مئی 1981ء کی اس سہ پہر کو بروز بدھ ایک لاکھ سے زائد افراد سینٹ پیٹر سکوائر میں پوپ کے دیدار کے لئے جمع تھے۔ ان کے درمیان سے اس راستے کو رکاوٹیں کھڑی کر کے محفوظ کیا گیا جہاں سے پوپ جان پال کی موبائل وین نے گزر کر اس پلیٹ فارم تک پہنچنا تھا جہاں کھڑے ہو کر اس نے اپنا ہفتہ وار خطاب کرنا تھا۔ ماحول انتہائی خوشگوار اور شگفتہ تھا اور کچھ لوگ جو پوپ کے منتظر کھڑے تھے یہ بھی سوچ رہے کہ پوپ اس وقت اپنی رہائش گاہ میں کیا کر رہا ہوگا۔

اس وقت ایک سیاہ فام ترک نوجوان مہمت علی اغکا (Mehmet Ali Agca) کے دماغ میں کیا کھلبلی مچی تھی، کسی کو بھی معلوم نہ تھا۔ وہ دوپہر کے بعد کسی وقت ہجوم میں داخل ہوا تھا اور اپنا راستہ اس جگہ تک بنانے میں کامیاب ہو گیا جہاں سے پوپ کی سواری نے گزرنا تھا۔ اغکا ترکی کے ایک ایسے دہشت گرد گروپ کا کارکن تھا جو اپنے آپ کو گرے وولف (بھورا بھیڑیا) کہلاتا تھا۔ وہ اپنے اس گروپ کو چھوڑ کر مشرقِ وسطیٰ چلا گیا تھا، جہاں اس نے انتہا پسند مسلمان گروپوں کے کیمپ سے تربیت حاصل کی تھی۔ اب وہ اپنے سفر کی منزل کے قریب تھا۔ اغکا سینٹ پیٹر سکوائر میں پوپ کی تعظیم واحترام کے لئے بلکہ اسے قتل کرنے کے لئے موجود تھا۔

چار بجے جان پال نے کپڑے تبدیل کئے اور اپنا تازہ استری شدہ سفید ریشمی چغہ زیب تن کیا سی آئی اے کے مشورے پر چغے کے نیچے نظر نہ آنے والی بلٹ پروف جیکٹ پہننے کے لئے بنائی گئی تھی۔ پوپ کے محل کے اپنے آخری دورے میں سی آئی اے کے ڈائریکٹر کیسی نے پوپ کو انتباہ کیا تھا کہ ''آج کل کے پُرفتن دور میں پوپ بھی حملوں سے محفوظ نہیں ہے''۔ میں نے پوپ کو بتایا کہ اگرچہ ہمارے پاس کوئی حتمی ثبوت نہیں تھا کہ وہ واقعی خطرے میں تھا لیکن پوپ جان پال ایک بہت زیادہ متنازعہ شخصیت بن چکا تھا لہٰذا کوئی بھی جنونی شخص اسے قتل کرنے کی کوشش کر سکتا تھا''۔

پوپ جان پال نے حفاظتی جیکٹ پہننے سے انکار کر دیا تھا۔ اس نے اپنے انگریزی زبان کے سیکرٹری مونسیگنور جان میگی (Monsignor John Magee) کو بتایا یہ چیز اس کی پاپائیت کی روایت کے خلاف ہے۔

پوپ جان پال اپنے محل کے سان داماسو نامی صحن میں 4:50 بجے برآمد ہوا۔ پوپ کے محافظ دستے کے انچارج کامیلو کبن نے پوپ کی لمحہ بہ لمحہ نقل وحرکت کو لکھنا شروع کر دیا جو کہ ویٹیکن کی روایت تھی۔ سیبن کے روایتی سٹیل گرے رنگ کے سوٹ کے نیچے ایک

حفاظتی جیکٹ تھی جس کے اندر ایک طاقتور سیل فون (موبائل فون) تھا جس کا مسلسل رابطہ روم کے پولیس ہیڈ کوارٹرز سے تھا لیکن پوپ کی حفاظت کی فوری ذمہ داری نیلے رنگ کے سوٹ میں ملبوس وگلی کے ہاتھوں میں تھی۔ ویٹیکن کی سوس گارڈز کے انتہائی تربیت یافتہ اور عقابی نگاہوں والے ارکان پہلے ہی سینٹ پیٹرز سکوائر میں اپنی پوزیشنیں سنبھالے کھڑے تھے۔

صحن میں پوپ کی گاڑی جو کیمپا گنولہ (Campagnola) کہلاتی تھی، اپنی چمڑے کی سفید سیٹوں اور پوپ کے کھڑے ہو کر پکڑنے والے دستے کے ساتھ کھڑی تھی، جس پر پوپ نے اپنا دیدار کراتا تھا۔ گاڑی کے اردگرد اس کے سینئر حکام کھڑے تھے۔ میکی کو یاد ہے کہ اُس روز پوپ معمول سے زیادہ خوش اور مسرور تھا“۔

5 بجے شام پوپ کی گاڑی صحن سے باہر نکلی۔ اس سے پہلے سینٹ پیٹرز سکوائر استقبالیہ نعروں سے گونجنے لگا۔ جیسے ہی گاڑی گھنٹیوں والی محراب کے نیچے پہنچی، وگلی شہری پولیس کے دستے میں شامل ہو گیا جو گاڑی کے آگے اور پیچھے چل رہا تھا۔ جیسے ہی گاڑی منظرِ عام پر آئی، ہجوم کے نعروں کی گونج بھی بلند آہنگ ہو گئی۔ جان پال ہاتھ ہلا کر مسکراتے ہوئے ہجوم کے نعروں کا جواب دے رہا تھا۔ چونکہ پوپ جان پال نوجوانی میں ایک ایکٹر رہا تھا اس کا وہ تجربہ اس وقت کی ایکٹنگ میں اس کے کام آ رہا تھا۔ فی میل دو گھنٹے کی رفتار سے چلنے والی گاڑی میں کبھی ایک طرف منہ کر کے اور کبھی دوسری طرف مسکراتا ہوا چہرہ گھما کر میدان میں کھڑے معری پیروکاروں کی طرف توجہ مبذول کی اور ان کے نعروں کا جواب دیا۔ 5:15 بجے ”کیمپگولا“ نے سپن کی عقابی نگاہوں کے سامنے دوسرا چکر شروع کر دیا۔ سکیورٹی چیف گاڑی کے پیچھے اپنی مستعد نظروں سے اردگرد کے ماحول پر گہری نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ نعروں کی آوازیں اور بھی بلند ہو گئی تھیں۔

اچانک پوپ نے ایک ایسی ناقابل فہم حرکت کی جو ہمیشہ ہی اس کے سکیورٹی چیف کے لئے ہراس کا باعث بن جایا کرتی تھی۔ پوپ گاڑی سے اتر کر ہجوم میں داخل ہو گیا اور ایک بچے کو گود میں اٹھا لیا۔ اس نے بچی کو چوما، پیار کیا، سینے سے لگایا اور واپس حیران و ششدر کھڑی بچی کی ماں کے حوالے کر دیا۔ پوپ اکثر ایسا کیا ہی کرتا تھا اور اس کے معمول میں شامل تھا۔ سپن کی پریشانی ہمیشہ یہ ہوتی کہ ہجوم کے دھکم پیل کی وجہ سے کہیں بچہ ہمکتا ہوا نیچے نہ گر جائے اور کسی حادثے کا باعث بن جائے لیکن پوپ جان ایسی باتوں کو قطعاً کوئی اہمیت نہیں دیتا تھا۔

5:17 بجے جان پال نے ایک اور بچی تک پہنچ کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا، جو سفید لباس میں ملبوس تھی۔ پھر اس نے سیدھے ہو کر ہجوم کی طرف نگاہ اٹھائی کہ اب وہ کس کے سر پر دستِ شفقت پھیرے۔ اپنے پیروکاروں کے دلوں کے قریب ہونے کا یہ اس کا اپنا طریقہ اور طرز عمل تھا، ہجوم خواہ کتنا ہی بڑا ہو۔

اس وقت پوپ پال کا ذہن ان خطرات سے یکسر خالی تھا جو قبل ازیں کئی بڑے بڑے اجتماعات میں پیش آ چکے تھے۔ ابھی تین ماہ قبل ہی 16 فروری 1983 کو پاکستان کے شہر کراچی میں، میونسپل سٹیڈیم کے اندر، پوپ کے اپنے پیروکاروں سے خطاب سے کچھ ہی پہلے، بم کا دھماکہ ہو گیا تھا۔ جنوری 1980ء میں فرانس کی خفیہ ایجنسی نے اسے انتباہ کیا تھا کہ کمیونسٹ اس کے قتل کی منصوبہ بندی کر رہے تھے۔ پوپ کی زندگی کو لاحق بے شمار خطرات میں سے یہ چند ایک تھے جن کی اطلاعات ویٹیکن کو پہنچتی رہتی تھیں۔ سب کے بارے میں ممکنہ حد تک تحقیق و تفتیش بھی کی جاتی تھی بعد ازاں میکی نے بتایا۔ ”ہم زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتے تھے کہ بیٹھ کر انتظار کریں۔ ہماری کوشش تھی کہ مقدس باپ جب پبلک میں جائے تو اسے بلٹ پروف پنجرے میں بند کر دیں لیکن اس کی وہ کبھی منظوری

نہیں دیتا تھا۔ اس کے علاوہ ہم کر بھی کیا سکتے تھے"۔

5:18 بجے سینٹ پیٹرز سکوائر میں پہلے فائر کی آواز سنائی دی۔

جان پال اب بھی سیدھا کھڑا تھا اور اس نے اپنے سامنے کے ڈنڈے کو مضبوطی سے دونوں ہاتھوں سے پکڑا ہوا تھا۔ پھر اس نے نیچے کی طرف بیٹھنا شروع کر دیا۔ مہمت علی اغکا کی پہلی گولی پوپ کے پیٹ کے نچلے حصے میں چھوٹی آنت کو چیرتی ہوئی، بڑی آنت کے نچلے حصے کو زخمی کرتی ہوئی پیٹ کی دیوار تک پہنچ گئی تھی۔ فوراً پیٹ سے نکلنے والے خون کو روکنے کے لئے پوپ نے زخم کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ لیا تھا۔ اس کے چہرے سے درد و کرب اور تکلیف کے آثار ہویدا ہو رہے تھے اور اس نے بے ہوش ہونا شروع کر دیا تھا۔ ابھی گولی لگے چند سیکنڈ ہی گزرے تھے، اغکا کی دوسری گولی پوپ کے دائیں ہاتھ میں لگی جو بیکار ہو کر ایک طرف گر گیا۔ اس کا سفید چغہ خون سے لال ولال ہو گیا۔ 9 ایم ایم پستول کی تیسری گولی نے اس کا دایاں بازو بے کار کر دیا۔

کیمپگنولا کے ڈرائیور نے سر گھما کر دیکھا تو اس کا منہ گھبراہٹ اور حیرت سے کھلے کا کھلا ہی رہ گیا اور اس کے منہ سے آواز تک نہیں نکل رہی تھی۔ سیکن اس پر چیخ چلا رہا تھا کہ آگے بڑھے۔ پوپ کے ایک مددگار نے اپنے جسم کے ساتھ پوپ کو سہارا دیا۔ گاڑی آگے بڑھنے لگی ہجوم بھی اس طرح دوڑنے لگا جیسے اسے کوئی تیز آندھی اڑائے لئے جا رہی ہو۔ دنیا کی مختلف زبانوں میں ایک ہی فقرہ دہرایا جا رہا تھا۔ "پوپ کو گولی لگ گئی ہے"۔

ویٹیکن کا چیف سیکیورٹی آفیسر سیکن اور اس کے معاونین، روم کی پولیس کے جوان اپنی بندوقیں لہرا لہرا کر ہجوم میں ڈسپلن اور نظم و ضبط پیدا کرنے کی کوشش کر رہے تھے اور حملہ آور کو ڈھونڈ رہے تھے۔ اغکا نے اپنا پستول دائیں ہاتھ میں لہراتے ہوئے اور ہجوم میں سے راستے بناتے ہوئے تیز رفتاری سے دوڑنا شروع کر دیا۔ اس کے ہاتھ میں پستول دیکھ کر لوگ خود ہی اس کے راستے سے ہٹتے جاتے تھے۔ اچانک اس نے اپنا پستول ہوا میں اچھال دیا۔ اچانک کسی نے اسے ٹانگوں سے قابو کر کے نیچے گرا لیا۔ یہ روم کی پولیس کا ایک افسر تھا۔ کچھ دیر دونوں گتھم گتھا رہے اتنے میں باقی پولیس والے بھی ان کے اوپر آن گرے اور یہ رگبی گیم جیسا منظر لگ رہا تھا۔ اغکا کی کئی پولیس والوں نے لاتوں اور مکوں سے خوب دھلائی کی اور پھر اُسے باندھ کر پولیس وین میں ڈال کر لے گئے۔

پوپ کی موبائل وین سُست روی کے ساتھ ویٹیکن کے تانبے سے بنے گیٹ کی طرف چلتی رہی تاکہ وہاں کھڑی ایمبولینس میں زخمی پوپ کو منتقل کیا گیا۔ اس طرح بہت سا قیمتی وقت ضائع ہو گیا۔

روشنیاں جگمگاتی اور سائرن بجاتی ہوئی ایمبولنس، ویٹیکن کے قریب ترین ہسپتال "روم جیملی ہسپتال" (Rome's Gemelli Hospital) میں آٹھ منٹ میں پہنچ گئی۔ اس سفر کے دوران پوپ نے کسی مایوسی، نا امیدی یا غصے کا اظہار نہیں کیا۔ صرف یہ دعائیہ کلمات اس کی زبان پر جاری "مریم، میری پیاری ماں! مریم، میری پیاری ماں!"

ہسپتال میں زخمی پوپ کو 9ویں منزل پر پہنچا دیا گیا۔ جہاں ابتدائی طبی امداد، آپریشن تھیٹر، بحالی صحت اور انتہائی نگہداشت کے کمرے موجود تھے۔ یہاں پر انتہائی ہنگامی صورتِ حال کے باوجود کسی قسم کا خوف و ہراس اور افراتفری نہ تھی۔ نہ وقت کا ضیاع اور نہ الفاظ کی تکرار۔ ہر چیز انتہائی منظم اور خاموشی سے انجام پا رہی تھی۔ یہاں زخمی پوپ کو زندہ بچ جانے کی امید نظر آنے لگی تھی۔

پوپ کا خون آلود چغہ، نیچے پہنا ہوا لباس، زیر جامہ، بنیان، انتہائی ماہرانہ انداز سے کاٹ کر جسم سے الگ کر دیئے گئے تھے۔ سرجیکل تولیوں سے اس کے جسم

کے مخصوص حصوں کو ڈھانپ دیا گیا۔ اس کے ہاتھوں پر پہنے ہوئے دستانے اتار دیئے گئے اور سرجری اور جراحی کے وہ تمام آلات میز پر سجا دیئے جن کے استعمال سے ماہرین کی ٹیم پوری طرح آگاہ تھی۔

چھ گھنٹے کی لگاتار سرجری کے بعد جب پوپ جان پال ہوش میں آیا تو ان کا پختہ ایمان تھا کہ ان کا زندہ بچ رہنا بھی دنیائے کیتھولک کا ایک زندہ معجزہ تھا جس میں کنواری فاطمہ کی ذاتی رضا، دعا، خواہش اور نیک تمنا شامل تھی کیونکہ اس کی ضیافت کا دن بھی وہی تھا جس روز میری جان لینے کی کوشش کی گئی۔

اپنی صحت یابی کے لمبے عرصے کے دوران پوپ جان پال مسلسل یہ سوچتا رہا کہ میرے قتل کا حکم کس نے دیا تھا؟ اس نے پولیس کی تفتیش، مختلف انٹیلی جنس ایجنسیوں کی رپورٹوں اور سی آئی اے کی مختلف النوع اطلاعات کا مطالعہ کرنے کی کوشش کی۔ نیز جرمنی کی خفیہ ایجنسی بی این ڈی، ترکی سکیورٹی سروس اور آسٹریا کی انٹیلی جنس ایجنسی کی رپورٹیں ملاحظہ کیں۔ ان تمام رپورٹوں، اطلاعات اور تجزیات سے ہزاروں صفحے بھرے ہوئے تھے جن سب کا مکمل مطالعہ پوپ کے لئے ممکن نہ تھا۔

لیکن کسی ایک دستاویز میں بھی جان پال کے سوال کا جواب موجود نہ تھا۔ ''کون چاہتا تھا کہ اُسے قتل کر دیا جائے؟'' پوپ اسی شش و پنج میں تھا کہ روم کی عدالت انصاف میں جولائی 1981ء کے آخری ہفتے میں اغکا کا مقدمہ شروع ہو گیا۔ تین دن کی مسلسل سماعت کے بعد بھی ملزم کا پوپ پر حملے کا اصلی مقصد سامنے نہ آ سکا۔ اغکا کو عمر قید کی سزا دی گئی۔ سزا بھگتنے کے دوران، اچھا رویہ اختیار کرنے کی صورت میں وہ 2009ء میں پیرول پر رہائی کا حقدار ہو گا۔

اغکا کو سزا سنائے جانے کے دو سال بعد پوپ جان پال کے دل و دماغ میں کلبلائے جانے والے سوال کا جواب مل گیا۔ یہ جواب اس پادری کی طرف سے آیا جسے پوپ ہمیشہ دوسروں پر فوقیت اور ترجیح دیا کرتا تھا۔ ویٹیکن میں اس کا عہدہ ''نُنزیو آپوسٹولیکو کون انکاریچی سپیشلی'' (Nunzio Apostolico Con Incarichi) تھا۔ اس کے الفاظ سے کوئی حقیقی سراغ تو نہیں ملتا تھا۔ آرچ بشپ لوئیگی پوگی (Archbishop Luigi Poggi) پوپ کی خفیہ سیاسی سرگرمیوں کا قدرتی والی وارث تھا جس کی خصوصی ذمہ داری پوپ کے کیمونسٹ ممالک کی انٹیلی جنس اطلاعات جمع کرنا تھا۔ ویٹیکن کے اندر کام کرنے والے لوگ عموی طور پر اسے پوپ کا جاسوس کہہ کر پکارتے تھے۔

کئی ماہ سے پوگی موساد کی خفیہ سرگرمیوں میں شامل تھا۔ ابھی کچھ ہی عرصے پہلے جب ان کے تعلقات میں کافی گہرائی پیدا ہو چکی تھی، اس نے پوپ کو بتا دیا کہ وہ کس قسم کی سرگرمیوں میں ملوث رہا تھا۔ جان پال نے اسے اجازت دے دی کہ وہ اپنا خفیہ مشن جاری رکھے۔ اس وقت سے پوگی کی موساد کے افسروں سے میٹنگیں اور ملاقاتیں ویانا، پیرس، وارسا اور صوفیہ بلغاریہ میں چل رہی تھیں۔ پادری اور موساد کے ایجنٹ دونوں سودا بازی میں لگے تھے۔ پیشکش کیا ہے؟ اور بدلے میں کس کام کی توقع ہے؟ ہر ملاقات کے بعد اگلے اقدام کی سوچ بچار کے لئے دوبارہ ملنے کے وعدے پر رخصت ہو جاتے تھے۔

کچھ روز قبل ان کی ویانا میں ملاقات ہوئی۔ یہ وہ شہر تھا جسے پوگی اور موساد کے افسر اپنے رابطوں کے لئے سب سے موزوں جگہ سمجھتے تھے۔

یہ اس میٹنگ سے پوگی کا ویٹیکن واپسی کا ذکر ہے، یہ نومبر 1983ء کی برفانی رات تھی۔ پوگی اپنے ساتھ پوپ کے سوال کا جواب بھی لا رہا تھا کہ ''کس نے اغکا کو اسے قتل کرنے کا حکم دیا تھا؟''

☆☆☆